وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

اور جو رسول تمہیں دے تو وہ لے لو اور جس سے تم کو منع کریں تو اس سے باز آجاؤ (الحشر: ۷)

مقالاتِ حدیث

رقم

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی

تقدیم

فضیلۃ الشیخ مولانا ارشاد الحق اثری — فضیلۃ الشیخ عبد اللہ ناصر رحمانی

تحقیق وتخریج

حافظ شاہد محمود

فاضل مدینہ یونیورسٹی

مقالات حدیث

از قلم
شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

تحقیق وتخریج
حافظ شاہد محمود
فاضل مدینہ یونیورسٹی

Pakistan
Umm-ul-Qura Islamic Universty
Commissioner Road
Fattomand, Gujranwala
Ph: 0333-8110896 0321-6417723
www.umm-ul-qura.org

Coventry
Maktabah Ahlul Hadeeth
P.O Box 3070
Coventry Cv6 5WL
England U.K
Maktabah ahlulhadeeth@hotmail.com

Madinah
Zulfiker Ibrahim Al-Memoni Al-Atharee
Islamic University
P.O Box 10133, Madinah
Kingdom of Saudi Arabia
Mob: (00966) (0)553462757
Tel: (00966) (04) 8283701
www.madeenah.com

Coventry *(Distibuters)*
Islamic Bookshop Coventry
801 Foleshill Road
Foleshill
Coventry Cv6 5WL
England U.K.
Mob: (0044) (0) 7970070578
Tel: (0044) (0) 2476-725881

کمپوزنگ .... محمد سفیان 0333-8134035
طبع اول .... فروری 2009ء
تعداد 1100
قیمت ....

ام القریٰ پبلی کیشنز
کمشنر روڈ فتومنڈ گوجرانوالہ فون: 0333-8110896,0321-6466422
www. umm-ul-qura.org

فہرست

امام بخاری کا مسلک

حدیث شریف کا مقام حجیت

حدیث علمائے امت کی نظر میں

جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور مدیر فاران کراچی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذبات ثلاثہ

عجمی سازش کا فسانہ

عجمی سازش کا تجزیہ، واقعات کی روشنی میں

ایک سوال ...... دو جواب

امام محمد بن مسلم زہری قرشی اور تحریک انکار حدیث

مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ

واقعہ افک کے متعلق نئی تمنائی ریسرچ

تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

مسئلہ درایت وفقہ راوی کا تاریخی وتحقیقی جائزہ

مقدمہ

"نصرة الباري في بيان صحة البخاري"

تقدیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم إلى يوم الدين، أما بعد:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور اس سلسلہ نبوت کا آخری تاجدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بنایا، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا یہ تقرر کس لیے تھا؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کی وضاحت فرما دی ہے کہ:

﴿وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله﴾ [النساء: ٦٤]

''ہر رسول صرف اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

یہ اطاعت ایمان وعقیدہ میں، عبادات میں اور ان تمام معاملات میں مطلوب ہے، جس کی وضاحت ''رسول'' نے کی ہے، بلکہ دین کی تمام تر بنیاد ''رسول'' پر ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کی تمام تر صفات پر ایمان، جنت، دوزخ، قیامت کا اقرار اس بات پر ہے کہ ان کی خبر اس ''رسول'' نے دی ہے، جس کی زبان اقدس سے کبھی غلط بات نہیں نکلی، جس کا اعتراف آپ کے دشمنوں کو بھی تھا۔ ''رسول'' نے بتلایا کہ اللہ ہے اور یہ اللہ کا پیغام ہے، اگر ''رسول'' کی اطاعت نہیں، تو اللہ اور اس کے پیغام کو تسلیم کر لینے کی صحیح دلیل کون سی ہے؟ یہ کس قدر ستم ظریفی ہوگی کہ رسول کے بتلانے پر اللہ اور اس کے پیغام کو تو تسلیم کیا جائے، مگر رسول یا اس کے پیغام کا انکار کر دیا جائے، ''رسول'' تو ہے ہی اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اگر کوئی ''رسول'' تسلیم کر کے اس کی

اطاعت سے انکار کرتا ہے، تو وہ دراصل رسالت کے مقصدِ حقیقی کا ہی انکار کرتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اتمام حجت کے لیے ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وما كنا معذبين حتى نبعث رسولاً ﴾ (الإسراء: ۱۵)

''اور ہم اس وقت تک کسی کو عذاب کرنے والے نہیں، جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیں۔''

ایک اور مقام پر چند انبیائے کرام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ رسلاً مبشرين ومنذرين لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل ﴾ (النساء: ۱٦٥)

''ہم نے سب رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اس لیے بھیجے کہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کا کوئی عذر اللہ کے سامنے باقی نہ رہے۔''

ان پر اتمام حجت ہوجائے اور پھر یہ کوئی عذر نہ کرسکیں، کہ ہمیں کسی نے خبردار نہیں کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تقریباً چھ سو سال کا عرصہ گزر چکا، یہود و نصاری نے دین میں تحریف کر دی اور شرائع اسلام کو بدل ڈالا، ان کی ان نالائقیوں پر انھیں خبردار کیا اور فرمایا:

﴿ يآ أهل الكتاب قد جاءكم رسولنا يبين لكم على فترة من الرسل أن تقولوا ما جاءنا من بشير ولا نذير فقد جاءكم بشير و نذير والله على كل شيء قدير ﴾ (المائدہ: ۱۹)

'' اے اہل کتاب! رسول ایسے وقت میں تمھارے پاس آیا ہے اور دین کی واضح باتیں بتلاتا ہے، جب کہ رسولوں کی آمد کا سلسلہ ایک مدت سے بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا، بلاشبہ وہ بشارت دینے اور ڈرانے والا آ گیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

فرعون کے پاس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو بھیجا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی، تو اس جرم کی پاداش میں اسے مع اس کے حواریوں کے غرق کر دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فعصىٰ فرعون الرسول فأخذناه أخذاً وبيلا﴾ (المزمل: ١٦)

''فرعون نے رسول کی نافرمانی کی، تو ہم نے اسے بڑے وبال میں دھر لیا۔''

صحیفۂ ہدایت تورات تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کی بربادی کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی، اس لئے اگر رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کا ہی انکار کر دیا جائے، تو یہ درحقیقت اس حجت کا ہی انکار ہے، جو اللہ تعالیٰ نے رسول کی صورت میں اپنے بندوں کے لیے مقرر کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اتمام حجت کے لیے بھیجا ہو، یہ کیا بدبختی ہے کہ اس کے بارے میں ''امت'' کے کچھ افراد یہ فیصلہ دیں کہ وہ قابل اعتماد نہیں اور ان کی بات حجت نہیں، یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دور میں تو لائق اعتماد تھے، مگر موجودہ ترقی یافتہ دور میں لائق اعتماد اور قابل التفات نہیں، روشن خیالی کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور ترقی کی راہ میں یہ رکاوٹ ہیں۔

بلکہ دانشوری کے خمار اور روشن خیالی کے غرور میں کہا جا رہا ہے کہ قرآن نے شراب کو کہیں حرام قرار نہیں دیا، ریشم اور سونا مردوں کے لیے پہننا قرآن نے حرام نہیں ٹھہرایا، اس کی ممانعت تب ہے جب تکبراً پہنا جائے، زنا بالرضا قابل حد نہیں ہے، حدود کو تبدیل کیا جا سکتا ہے، سود کھانا حرام ہے، سود دینا حرام نہیں، ناچ گانا اور ڈھول ڈھمکا بھی حرام نہیں، یہ تو آرٹ اور ثقافت ہے، یہ صرف اس وقت حرام ہے، جب اس کے ساتھ شراب کی محفل سجے اور بدکاری کا ارتکاب ہو، اسلام میں پردہ نہیں، نہ کوئی اس کے بارے مستقل حکم ہے، یہ تو بس ایک خاص زمانے کا کلچر تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نوعیت کی ساری کاروائی قرآن مجید کی آڑ میں سر

انجام دی جاتی ہے اور اسے قرآنی تعلیمات باور کرایا جاتا ہے، حالانکہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی ہدایات و ارشادات اور معمولات کو نظر انداز کر کے اپنی خواہشات و ہوسات کی تسکین کی جاتی ہے، قرآن پاک کو اپنی مرضی اور من مانی کے معنی پہنانے بلکہ اپنی بدعملی اور بد اطواری کے لیے جواز پیدا کرنے کے لیے احادیث مبارکہ کو عجمی سازش باور کرانے کی سعی نامشکور کی جاتی ہے، ماضی قریب میں اس فکر کے سرغنے اسلم جیراجپوری، تمنا عمادی اور غلام احمد پرویز وغیرہ تھے۔

یہ حضرات اور ان کے مستشرق مرشدوں کی پوری کوشش رہی ہے کہ ذخیرہ احادیث پر تنقید کے ساتھ ساتھ بالخصوص حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، امام زہری، امام طبری اور صحیح بخاری کو ہدف تنقید بنایا جائے، کیونکہ کثرت روایات میں سب سے زیادہ بلند مقام حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے، احادیث کے مدون اول امام زہری ہیں اور تاریخ و تفسیر کا سب سے بڑا مرجع امام ابن جریر ہیں اور حدیث کی سب سے معتبر کتاب امام بخاری کی صحیح بخاری ہے، اگر ان کی حیثیت کو مجروح اور ناقابل اعتبار ثابت کر دیا جائے، تو اسلام کی فلک بوس عمارت دھڑم سے زمین بوس ہوجائے گی، یہ بالکل اسی نوعیت کی کوشش ہے جو قرون ماضیہ میں بعض زندیقوں اور بدعی فرقوں نے صحابہ کرام کے بارے میں اختیار کی کہ معاذ اللہ انھیں منافق، خودغرض اور فسق و فجور کا مرتکب ثابت کر دیا جائے، تاکہ حفاظت قرآن اور سنت میں ان پر اعتماد ختم ہوجائے۔ أعاذنا اللہ من شرورهم!

مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر دور میں اپنے کچھ بندوں کو اس کی توفیق بخشی کہ وہ ان باطل پرستوں کی سرکوبی اور ان کے باطل نظریات کی بیخ کنی کریں۔

﴿ليهلك من هلك عن بينة ويحيى من حي عن بينة﴾

انہی خوش نصیبوں میں ایک استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ تھے، جنھوں نے دفاع سنت کا بیڑا اٹھایا اور اس کا حق ادا کیا، منکرین

حدیث کو آڑے ہاتھوں لیا، تمنا عمادی اور غلام احمد پرویز کے تشکیکی پروپیگنڈا کے ڈھول کا پول کھولا، حدیث کے مقام و مرتبہ کو براہین قاطعہ سے واضح کیا، جزاہ اللہ عنا وعن سائر المسلمین!

ہمارے فاضل دوست جناب مولانا حافظ شاہد محمود صاحب فاضل مدینہ یونیورسٹی لائق صد مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس حوالے سے حضرت سلفی مرحوم کی نگارشات کو ہی نہیں بلکہ حدیث وسنت سے اور مسلک محدثین کے متعلق ان کے متنوع مقالات کو جمع کرنے کی سعادت حاصل کی اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کر کے شائقین کو ان سے استفادے کی تقریب باہم پہنچائی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بلکہ اس ضمن میں حضرت سلفی مرحوم کی تائید اور تمنا عمادی کے باطل دعاویٰ کو تشت از بام کرنے کے لئے استاذی مکرم حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب محدث فیصل آبادی بانی إدارة العلوم الأثریہ نے جو مضمون رقم فرمایا تھا، اسے بھی شامل اشاعت کر دیا، تاکہ کسی پہلو سے بحث تشنہ نہ رہے۔

ان مقالات میں جہاں ضرورت محسوس کی وہاں احادیث اور تاریخ کے حوالوں کی مراجعت کر کے انھیں اجاگر کر دیا، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور مزید اپنی مرضیات سے نوازے، آمین

وصلی اللہ علی حبیبہ محمد وآلہ وبارك وسلم.

خادم العلم والعلماء
ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

(۱۳ ذوالقعدہ ۱۴۲۹، ۱۲ نومبر ۲۰۰۸)

تقدیم

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی أشرف الأنبیاء والمرسلین وعلی آله وصحبه ومن اقتدی بهدیه ونهج بنهجه واستن بسنته إلی یوم الدین. أما بعد:

قارئین کرام! ''مقالاتِ حدیث'' کے نام سے جو ضخیم اور علمی دفتر آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ درحقیقت شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمه الله تعالیٰ ونوّر مرقده وتغمده بلطفه ورضوانه، کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جسے ہمارے فاضل بھائی حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ نے مختلف مجلّات و رسائل اور مخطوطات و مطبوعات سے حاصل کر کے اشاعت کی سعادت حاصل کی ہے اور یوں خدمتِ حدیث کی فہرست میں ایک انتہائی لطیف اور نفیس تألیف کا اضافہ عمل میں آ گیا ہے، ضاعف الله مثوبته ووفقه لمزید ما فیه حبه ورضاه!

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی ذاتِ متنوع صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں، عالمِ اسلام کے علمی حلقے اور بالخصوص وہ لوگ جنھیں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے علماً و فہماً و درایتاً و عملاً و إعمالاً شغف و اشتغال کی توفیق میسر ہے، وہ ان کے قلمِ سیال کی روانی و جولانی (بالخصوص دفاعِ سنت کے تعلق سے) سے بخوبی آگاہ ہیں، جس کا انتہائی روشن اور بین ثبوت زیرِ نظر مجموعہ مضامین ہے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی دیگر تألیفات بھی اس پر شاہد عدل ہیں۔

کتابِ ہذا بہت سے علمی مضامین پر مشتمل ہے، جن میں حجیتِ حدیث، حجیتِ أخبارِ آحاد، کتابتِ حدیث، اصولِ محدثین اور ان کا اصول فقہاء سے مقارنہ جیسے علمی

موضوعات قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں کتابِ ہذا علمی ردود اور جدال بطریقِ احسن کی بھی انتہائی خوبصورت مثال ہے۔ قرونِ اولی اور بعد کے تمام ادوار کے اہل الحدیث کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ اہلِ بدعت کے پیدا کردہ اوہام وشبہات کی تردید وتفنید کو اپنا اولین فریضہ قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ ﷫ نے اپنی کتاب "درء تعارض العقل والنقل" میں صحیح اور حقیقی داعی اس شخص کو قرار دیا ہے، جو تحریراً یا تقریراً مبتدعین کی بدعات وخرافات کے رد کے لیے مناظرہ کے منہج پر عملاً قائم ہو۔

بحمداللہ مؤلف ﷫، سلف صالحین کے اس منہج کا پوری طرح درک رکھتے تھے اور طریقِ سلف صالحین ہی کی روشنی میں رد وقدح کے مبارک عمل پر قائم تھے، چنانچہ تعاقب کا یہ سلسلہ ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہوتا اور استدلال واستنباط پر قائم ہوتا۔

کتابِ ہذا کا مطالعہ کرنے والا یقیناً اس حقیقت کا معترف ہوگا کہ حضرت شیخ الحدیث ﷫ نے حدیث پر وارد ہونے والے شبہات اور مطاعن کے ازالہ کے لیے کیسا نفیس انداز اختیار کیا ہے، آپ کا تعاقب دلائل کی قوت سے مالا مال ہوتا ہے، لیکن جن شخصیات کی طرف سے وہ اوہام وشبہات سامنے آتے ہیں، ان کے ذکر میں اکرام واحترام کا پہلو کس قدر غالب ہوتا ہے۔

کتابِ ہذا میں کچھ اہل قلم مثلاً اصلاحی صاحب، مودودی صاحب اور تمنا عمادی صاحب کے بعض مقالات کا علمی رد موجود ہے اور وہ تمام کا تمام مذکور منہج کی روشنی میں ہے، یعنی دلائل ساطعہ اور براھین قاطعہ کی بھرمار، لیکن لہجہ انتہائی پروقار اور مٹھاس سے بھرپور، گویا ﴿ جادلهم بالتي هي أحسن﴾ اور ﴿ ادفع بالتي هي أحسن﴾ کی عملی تصویر ہے اور یہی وہ منہج مستقیم ہے جو نبی مکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا انتہائی لائق توجہ اور قابلِ اتباع پہلو ہے۔ ﴿ فبما رحمة من الله لنت لهم ولو

کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولك﴾ ﴿إنك لعلى خلق عظيم ﴾

قارئین کرام! رسول اکرم ﷺ دو امانتیں اپنی امت کو سونپ کر اس دنیا سے تشریف لے گئے: "ترکت فیکم أمرین ......" اور انہی دو امانتوں کے ساتھ حقیقی و مضبوط تعلق و تمسک کو ثبات و استقامت کی علامت قرار دیا:

" ترکت فیکم ما إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبدا کتاب اللّٰه و سنتي "

پوری زندگی انہی دو چیزوں کا پرچار کرتے رہے:

" أما بعد: فإن خیر الحدیث کتاب اللّٰه و خیر الهدي هدي محمد صلی اللّٰه علیه وسلم " اور " ألا إني أوتیت القرآن ومثله معه "

قرآن و حدیث کے ساتھ تمسک کی یہ وصیت و تلقین اُصحاب رسول ﷺ کے لیے خاص نہ تھی، بلکہ قیامت کی دیواروں تک آنے والے آخری فرد تک کے لیے ان دو چیزوں کا قبول کرنا ضروری ہے۔ قوله تعالیٰ: ﴿ لأنذرکم به ومن بلغ ﴾ اور قوله تعالیٰ: ﴿ وما أرسلنٰك إلا کافة للناس بشیراً ونذیراً ﴾ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان: " وکان النبي یبعث إلی قومه خاصة وبعثت إلی الناس کافة " کا عموم اسی حقیقت کا مظہر اُتم ہے کہ قرآن و حدیث کی اتباع کی حجت رہتی دنیا تک ہر فرد پر قائم ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق کی جو مزعومہ صورتیں اپنا لی گئی ہیں، وہ سب کی سب باطل ہیں، شریعت میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں ہے، مستدرک حاکم میں مروی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: " ولن یتفرقا حتی یردا علي الحوض " انتہائی قابل غور اور لائق اعتناء ہے، یہ جامع و مانع فرمان بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ قرآن و حدیث ہر دور میں اور تا قیامِ قیامت ساتھ ساتھ رہیں گے اور ان کے مابین تفریق کی کوئی صورت روا نہیں۔

یہ حدیث جماعت اہلحدیث کی صداقت و حقانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، یہی

وہ جماعت ہے، جس کے اصول و مناہج ہر دور میں عدم تفریق کے اسی مبارک منہج پر قائم رہے، ہمارے نزدیک احادیث صحیحہ وثابتہ کی تشریعی حیثیت مثل قرآن ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان: " ألا إني أُوتيت القرآن ومثله معه " اسی عظیم قاعدہ کی اساس ہے، یہ ہمارا قابل فخر اثاثہ ہے، جبکہ دیگر تمام جماعتوں کے مناہج اس تعلق سے کسی نہ کسی انحراف کا شکار ہیں، چنانچہ کچھ جماعتوں نے تفریق کی یہ صورت اپنائی کہ احادیثِ رسول ﷺ کا کھلم کھلا انکار کر بیٹھے، ہمارے نزدیک یہ عمل کفر ہے۔

اہل الرائے حدیث کے کھلم کھلے انکار کی جرأت تو نہ کر سکے، لیکن انھوں نے اپنی رائے کے تمیز و تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے ایسے قواعد وضع کر لیے، جن سے درحقیقت انکارِ حدیث کا دروازہ کھلتا ہے اور یہ قرآن و حدیث میں تفریق کی انتہائی گھناؤنی سازش ہے، نور الأنوار کی عبارت " لو عملنا بكل حديث لانسد باب الرأي " کتنے خطرناک عزائم کی ترجمانی کر رہی ہے۔ واللہ المستعان!

اہل الرائے کے قواعد قیاس کا خبر واحد پر مقدم ہونا، خبر واحد اگر اصول وقواعد کے خلاف ہو تو اس کا مردود ہونا، خبر واحد اگر عقل کے خلاف ہو اور اسے روایت کرنے والا صحابی غیر فقیہ ہو، تو اس حدیث کا مردود ہونا، جو حدیث کوئی ایسا حکم بیان کرے، جو نص قرآنی سے زائد ہو، اس کا مردود ہونا، عموم قرآن میں خبر واحد کے ذریعہ تخصیص کے عدم جواز کا قاعدہ وضع کرنا اور اہل مدینہ کے عمل کو حدیث صحیح پر تقدیم وترجیح دینا، جیسے قواعد کتنے ہولناک ہیں، جن کا مقصد صرف ردِّ حدیث ہے!

الحمدللہ کہ منہج اہل الحدیث ان تخرصات سے یکسر پاک اور بری ہے، زیر نظر مجموعہ مضامین اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے، تعسف اور تعصب کی عینک اتار کر ان کا مطالعہ کرنے والا یقیناً اسی امر کا معترف ہوگا۔

حدیث رسول ﷺ ہر باب میں فہمِ دین کی بنیاد ہے، اس مبارک مجموعہ سے

عمل کی راہ ہموار ہوتی ہے اور نبی ﷺ کی احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں اہل الحدیث کی حجت ہی غالب رہے گی، بقول امام شافعی رحمہ اللہ: " من طلب الحديث فقد قويت حجته"

جملہ مبتدعین و متخرصین کی سرکوبی حدیث ہی کے ذریعہ ممکن ہے، امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کیا خوب فرما گئے:

" سيأتي قوم يجادلونكم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن، فإن أصحاب السنة أعلم بكتاب الله عزوجل"

ہم اس نفیس کتاب کے پیش کرنے پر اپنے بھائی حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ کے مشکور بھی ہیں اور مزید جہود و مساعی صرف کرتے رہنے کے متمنی بھی، نیز استقامت و ثبات کے لیے دعاگو!

اس موقع پر عزیز القدر بھائی محمد حسن کی مخلصانہ کوششوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جن کی بدولت کتاب ہذا زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

فجزى الله تعالى مؤلفه و جامعه و ناشره وكل من بذل جهدا في سبيل خدمة السنة المطهرة على صاحبها ألف ألف تحية، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وأهل طاعته أجمعين!

وكتب ذلك

عبداللہ ناصر رحمانی

مقدمة التحقيق

قرآن مجید کے ساتھ احادیث نبویہ کا شریعت اسلامیہ میں کیا مقام ہے، اس بارے کسی مسلمان کی دو رائے نہیں ہو سکتیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت اور کتاب و حکمت دونوں ہی کو بنیادی شرعی مآخذ اور مصادر قرار دیا ہے، جس پر بے شمار آیات و احادیث شہادت و دلالت کرتی ہیں، قرآن مجید اگرچہ اعجاز و ثبوت میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے، لیکن اطاعت و انقیاد میں دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء و رسل کی اطاعت میں تفریق اور دوئی کو قرآن مجید میں قطعی کفر قرار دیا گیا ہے۔ (النساء: ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲)

یہی امت مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے، جس پر اسلامی تاریخ شاہد عدل ہے، امت مسلمہ کی تاریخ میں بڑے بڑے فتن و مفاسد کا ظہور ہوا ہے، خصوصاً احادیث نبویہ کے متعلق تاویل و تشکیک کے ان گنت جال بُنے گئے، ہر ہویٰ پرست فرقے اور شخص نے اپنے افکار و نظریات کی مخالف احادیث کو مختلف حیلوں اور خود ساختہ اصول و قواعد کی بھینٹ چڑھایا، لیکن کسی دور میں کسی ایسے نظریہ کا سراغ نہیں ملتا، جو کلیتًا حدیث و سنت کے انکار و وجود پر مبنی ہو اور اسے مستقل شرعی مصدر و ماخذ تسلیم کرنے سے انکاری ہو، چنانچہ یہ امر فتنہ انکارِ حدیث کی بیخ کنی اور فساد کی ایک زندہ دلیل ہے۔

فتنہ استشراق اور اس کے اثرات:

امت مسلمہ کے مذکورہ بالا اجماعی عقیدے کے برعکس گزشتہ صدی سے بعض نام نہاد مفکرین اور دانشور حضرات نے، جو اسلام کی طرف نسبت اور تعلق کا دعویٰ کرتے ہیں، اسلامی معاشرے میں ایسے افکار و نظریات کی داغ بیل ڈالی، جو مقام رسالت

سے انحراف اور احادیث نبویہ کے انکار پر مبنی ہیں، جنھیں درحقیقت دشمنان اسلام مستشرقین یورپ کی فکری و عملی سرپرستی حاصل ہے، جو ہر دو کے افکار و نظریات کا مطالعہ و مقارنہ کرنے کے بعد نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہے، اگر ہم مستشرقین اور ان کے نام نہاد مسلم تلامذہ کے افکار و آراء کا جائزہ لیں، تو ہمیں حیرت انگیز طور پر وہاں مکمل فکری یکسانیت نظر آتی ہے، آج مسلم معاشرہ میں مقامِ رسالت ، حفاظتِ حدیث، احادیث نبویہ کی جمع و تدوین اور محدثین کرام کی جہود و مساعی کے متعلق جن شکوک وشبہات کی ترویج واشاعت ہو رہی ہے، یہ دراصل مستشرقین یورپ کی آراء و افکار ہی کا چربہ ہے، جس کی ''تحقیق و دانش'' کے نام پر ترویج کی جا رہی ہے۔

﴿ يريدون أن يطفئوا نور الله بأفواههم ويأبى الله إلا أن يتم نوره ولو كره الكفرون﴾ (التوبة: ۳۲)

برصغیر پاک و ہند میں عبداللہ چکڑالوی پہلا شخص تھا، جو احادیث نبویہ کی تشریعی حیثیت کا مکمل انکاری تھا، سرسید احمد خان کا نام بھی اسی گروہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، لیکن وہ حدیث نبوی کا بالکلیہ انکار نہیں کرتا تھا، بلکہ جو حدیث اس کی نیچر اور عقل کے موافق ہوتی، اسے قبول کرتا اور جو حدیث اس کی نیچر کے مخالف ہوتی، اس کا انکار کر دیا کرتا تھا۔

بعد ازیں اس فکر کو پروان چڑھانے میں عبداللہ چکڑالوی کے تلامذہ اور مستفیدین: مستری محمد رمضان، مولوی حشمت علی، مولوی رفیع الدین، مولوی احمد دین امرتسری، حافظ اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز اور تمنا عمادی کا نام نمایاں ہے۔

فتنۂ انکار حدیث اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کی جہود و مساعی:

''حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ مسلک اہلحدیث کے ترجمان، تقریر و خطابت، تحریر و انشاء اور درس و تدریس کے شہسوار تھے اور جماعت اہلحدیث کے متعلق اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے تھے، پاکستان میں جمعیت اہلحدیث کے وہ پہلے

ناظم اعلیٰ اور، پھر امیر مرکزیہ کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوئے، اہلحدیث کانفرنس میں ان کی عموماً گفتگو حجیت حدیث، مقام حدیث، مسلک اہلحدیث، تاریخ اہلحدیث اور خدمات اہلحدیث کے عنوان پر ہوتی اور اکثر و بیشتر ان کی تحریر کے عنوانات بھی یہی ہوتے، وہ جہاں ایک قادر الکلام خطیب تھے، اس کے ساتھ ساتھ تحریر و انشاء میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ درس و تدریس اور جماعتی مصروفیتوں کے باعث وہ خواہش کے مطابق چنداں لکھ تو نہ سکے، مگر جس قدر بھی لکھا، اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا، جس میں ثقاہت، زبان کی لطافت، بیان کی نزاکت اور سنجیدگی کا سب نے اعتراف کیا، وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے نازک فقہی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں، ایک طبیب حاذق کی طرح نشتر بھی چلاتے ہیں، مگر کہیں ٹیس محسوس نہیں ہونے دیتے، اپنے مخاطب کا بھرپور تعاقب کرتے ہیں، مگر اس کے ادب و احترام کے منافی کوئی چیز نوک قلم پر نہیں لاتے۔" [1]

فتنۂ انکار حدیث کے تدارک میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی جہود مبارکہ اور مساعی جمیلہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں، جس کی زندہ دلیل ان کی مبارک تحریرات اور اقران و اماثل کی شہادت ہے۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی دفاع حدیث کے باب میں لکھی جانے والی تحریروں کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کا اچھوتا اندازِ بیان اور نادر المثال طرز استدلال ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبیداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ بنام مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ اپنے ایک نجی مکتوب میں فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مقالے حجیت حدیث کے متعلق بالکل جدید اور نرالے ہیں، شاید اس سے پہلے یہ طرز استدلال اختیار نہیں کیا گیا ہے، خوب لکھا ہے، متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ

[1] "مسلک اہلحدیث اور تحریکات جدیدہ" عرض ناشر از مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (ص:۳)

ونفعهم بعلومه ومعارفه إلى يوم القيامة" (الاعتصام، یکم دسمبر، ۱۹۵۰ء)

فتنۂ انکار حدیث کے تدارک میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی جہود و مساعی کو مندرجہ ذیل مختلف اور متنوع جہات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

ا۔ تحریر و انشاء:

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی تحریر و انشاء کا پسندیدہ موضوع حفاظت حدیث، حجیت حدیث، جمع و تدوین حدیث اور محدثین کرام کی خدمات جلیلہ کے دفاع و اعتراف پر مبنی ہوا کرتا تھا، بلکہ بقول استاد محترم حضرت حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ جب حضرت سلفی رحمہ اللہ حدیث نبوی اور محدثین کرام کے خلاف کوئی تحریر دیکھ لیتے، تو اس وقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھتے تھے، جب تک اس کا جواب نہ دے لیتے۔ حدیث و سنت اور مسلک سلف سے محبت اور شیفتگی ہی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کے قلم سے ایسی بے مثال تحریرات منصۂ شہود پر آئیں، جو ہر دور میں اعداءِ سنت کے لیے تازیانہ اور راہِ حق سے بھٹکے افراد کو جادۂ حق کی طرف گامزن کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ نے دفاع حدیث میں جو قلمی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ انتہائی وقیع اور تحقیقی مقالات و مضامین پر مبنی ہے، جو ان کی زندگی ہی میں رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں چند مقالات کتابی شکل میں بھی اشاعت پذیر ہوئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① سنت قرآن کے آئینہ میں:

یہ حضرت سلفی رحمہ اللہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو ہفت روزہ ''الاعتصام''[1] میں شائع ہوئے اور بعد ازاں حضرت سلفی رحمہ اللہ کی مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوئے۔

---

[1] دیکھیں: الاعتصام (۴ اگست ۱۹۵۰ء)

۲ حدیث آنحضرت کی سیرت کی روشنی میں:

یہ بھی حضرت سلفی رحمہ اللہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' کی دو اقساط میں طبع ہوئے۔ (الاعتصام: ۲۰ اکتوبر، ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

۳ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث:

یہ کتاب مولانا مودودی کے مضمون '' مسلک اعتدال'' اور اس کی تائید و تصویب میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لکھے گئے ایک مضمون پر نقد وتبصرہ ہے۔ یہ مضامین پہلے تو '' الاعتصام'' (۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء) کی متعدد اقساط میں شائع ہوئے اور بعد ازاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی تقدیم و اہتمام کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور سے کتابی شکل میں طبع ہوئے۔

۴ حدیث کی تشریعی اہمیت:

یہ مقالہ در اصل ایک تقریر تھی، جو جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں کی گئی اور بعد ازاں ہفت روزہ '' الاعتصام'' (۲ مارچ ۱۹۶۲ء) میں '' احکام شریعت میں حدیث کا مقام'' کے عنوان سے متعدد اقساط میں شائع ہوئی۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کے یہ چاروں مقالات بعد ازیں فاران اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام '' حجیت حدیث'' کے عنوان سے یکجا کتابی شکل میں شائع کیے گئے، اسی عنوان سے ان مقالات کا حال ہی میں جدید ایڈیشن مکتبہ اسلامیہ لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔

ان مقالات اربعہ کے علاوہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے دفاع حدیث اور فتنۂ انکارِ حدیث کے سدِ باب میں جو تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، وہی اب '' مقالات حدیث'' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، اس مجموعہ میں شامل تمام مقالات و مضامین کی تفصیل بھی آگے آرہی ہے۔

۲۔ تقریر و خطابت:

حضرت سلفی رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بے مثال اندازِ بیان اور انتہائی مؤثر طرز خطابت سے نوازا تھا، چنانچہ قدرت کی ودیعت کی ہوئی اس صلاحیت کو بھی انھوں نے دفاع حدیث و سنت کے باب میں استعمال کیا اور حسب موقع خطبات و تقاریر میں منکرین قرآن و حدیث کے شکوک وشبہات کا انتہائی مؤثر ازالہ فرمایا۔

حدیث نبوی کی اہمیت میں ان کا رسالہ ''حدیث کی تشریعی اہمیت'' دراصل ان کی ایک تقریر تھی، جو جامعہ سلفیہ کانفرنس فیصل آباد میں کی گئی اور بعد ازاں احباب جماعت کے اصرار کی بدولت مزید اضافہ جات کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

۳۔ تحریض و ترغیب:

حضرت سلفی رحمہ اللہ جہاں خود حفاظت حدیث کے ضمن میں حسب ضرورت قلم اٹھاتے، وہاں دوسرے اہل قلم اور اصحاب علم کو بھی دفاع حدیث و سنت اور منکرین قرآن و سنت کے شکوک وشبہات کے ازالے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونیکی ترغیب وتلقین کیا کرتے۔ چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''حدیث کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع ہو رہا ہے اور جس عجلت سے شائع ہو رہا ہے اور جس لب ولہجہ سے شائع کیا جا رہا ہے، وہ اصحابِ سنت سے مخفی نہیں اور اس کے متعلق جس قدر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے، جو قرآن اور سنت کو تاویل اور تقلید کے بغیر مانتے ہیں، وہ بھی ارباب سنت و حدیث پر عیاں ہے اور اس میں جس قدر تساہل برتا جا رہا ہے، وہ بھی پوشیدہ نہیں، زندہ جماعتوں کے لیے اس قسم کا اغماز اور تساہل جس قدر مضر ہے، اس سے بھی آپ حضرات بے خبر نہیں۔''
>
> (حجیت حدیث، ص:۹)

اسی طرح حضرت سلفی رحمہ اللہ اپنے ہم عصر علماء کو گراں قدر مشورہ جات سے

نوازتے اور دیگر اہل قلم کی تحریرات پر مقدمہ جات لکھ کر ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔

چنانچہ " نصرة الباري في بيان صحة البخاري" کے مؤلف مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ رسالہ [نصرة الباری] جو آپ کے زیر نظر ہے، پہلے ایک مقالہ تھا، جسے مولانا آزاد رحمانی صاحب مدیر" الہدیٰ" کی فرمائش پر میں نے" الہدیٰ" کے بخاری نمبر کے لیے ۱۹۵۵ء کے اوائل میں لکھا تھا، جسے دیکھ کر گرامی قدر مولانا محمد داود راز صاحب خطیب بمبئی اور شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے اسے بصورت رسالہ شائع کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ میں نے اس مشورہ کے پیش نظر اس مقالہ میں مزید عرق ریزی کر کے ترتیب وتہذیب سے کام لیتے ہوئے اپنی حد تک ترتیب وتہذیب میں پوری سعی وکوشش کر کے اس کا مسودہ تیار کیا اور اپنے بزرگ بھائی نخبة الأقران فخر الأماثل حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی خدمت میں روانہ کر دیا، آپ نے کثیر مشاغل کے باوجود اس پر ایک بہترین مقدمہ لکھا اور پورے مسودہ پر بھی نظر ثانی فرمائی اور خبر واحد اور جرح وتعدیل کی بحثوں میں اختصار کا خاص طور پر مشورہ دیا۔" (نصرة الباري، ص: ٦)

مقالاتِ حدیث:

زیر نظر مجموعہ مضامین" مقالاتِ حدیث" حضرت سلفی رحمہ اللہ کے" حجیتِ حدیث" نامی کتاب میں مطبوعہ مقالات اربعہ کے علاوہ دفاع حدیث کے ضمن میں لکھی جانے والی ان کی تحریرات پر مشتمل ہے، جس میں مندرجہ ذیل مقالات شامل ہیں:

① امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک:

یہ رسالہ امام بخاری رحمہ اللہ اور صحیح بخاری کے منہج ومسلک کا عابرانہ اور غائرانہ مطالعہ اور جائزہ ہے، جس میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے جہاں امام بخاری رحمہ اللہ کے اچھوتے طرزِ استدلال، فقاہت وذکاوت، دقتِ نظر، بے نظیر استنباط واجتہاد اور

مسائل خلافیہ میں دقیق نکتہ آفرینی کا تذکرہ کیا ہے، وہیں صحیح بخاری کی مزایا و خصائص پر ایسی سیر حاصل بحث کی ہے کہ صحیح بخاری کے طالب علم کو کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی، ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے تبصرہ نگار اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب ''امام بخاری کا مسلک'' بظاہر ایک کتابچہ سا معلوم ہوتا ہے، لیکن امام صاحب رحمہ اللہ کے بارہ میں یہ بہترین مواد کا مجموعہ ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کی شخصیت اور ان کے مقام تحقیق و تنقید کی وضاحت کے بعد ان اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے، جو ایک حلقہ کی طرف سے حضرت امام رحمہ اللہ پر وارد کیے جاتے ہیں، اس میں امام کا طریق بحث، اختلافی مسائل، بعض الناس، امام کی شافعیت، فقہ الحدیث اور فقہ الرای، قیاس، اجتہاد کی شرائط، خبر واحد وغیرہ امور پر بحث کی گئی ہے، یہ بحث کتنی جچی تلی اور مدلل و محقق ہوگی؟ یہ معلوم کرنے کے لیے اس کے فاضل مصنف مولانا محمد اسماعیل صاحب کا اسم گرامی ایک ضمانت کی حیثیت رکھتا ہے، مولانا کو اس باب میں جو درک و انہاک ہے، اس سے کون واقف نہیں؟'' (الاعتصام، ۲۳ نومبر ۱۹۵۶ء)

یہ رسالہ در اصل ایک مقالہ تھا، جو حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ادارہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، انڈیا کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ ''الہدیٰ'' (مارچ ۱۹۵۶ء، جلد: ۸، شمارہ: ۱۱، ص: ۷۔۲۰) کے ''بخاری نمبر'' کے لیے تحریر کیا تھا۔

بعد ازیں یہ مقالہ ۱۹۵۶ء میں شعبہ نشر و اشاعت جمعیت طلباء اہل حدیث مغربی پاکستان کے زیر اہتمام قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری رحمہ اللہ کے پیش لفظ کے ساتھ چوالیس صفحات میں کتابی شکل میں طبع ہوا۔

۲ حدیث شریف کا مقام حجیت:

اس مضمون میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے حدیث نبوی کا مقام تشریع و احتجاج بیان فرمایا ہے اور بدلائل واثقہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ روایت و اسناد کے لحاظ سے قرآن و

حدیث میں تفاوت موجود ہے، لیکن مرتبہ احتجاج میں دونوں یکساں ہیں، کیونکہ دونوں کا منبع وحی الٰہی ہے اور ایک حاکم کے دو حکموں میں تفاوت نہیں ہو سکتا۔

یہ مضمون ماہنامہ ''صحیفہ اہلحدیث'' کراچی (مئی ۱۹۴۹) کی متعدد اقساط میں ''حضرت محبوب رب العالمین کی حدیث شریف کا مقام حجیت، مولانا مودودی صاحب کے مضمون ''مسلک اعتدال'' پر ایک مخلصانہ نظر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ''صحیفہ اہلحدیث'' کے فاضل مدیر مولانا عبدالجلیل دہلوی رحمہ اللہ اس مضمون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل بات یہ ہے کہ مولانا مودودی نے ''مسلک اعتدال'' پر ایک مضمون لکھا تھا، اس میں حدیث شریف کے مسلک اعتدال سے اعتزال واقع ہوا، قلم سے کچھ ایسے الفاظ سرزد ہوئے، جس سے حدیث نبوی اور اس کے حاملین کے وقار پر ٹھیس لگی، مولانا محمد اسماعیل صاحب شکر اللہ سعیہ نے حدیث شریف اور اس کے حاملین کرام کی حمایت و ہمدردی میں مندرجہ ذیل مضمون لکھا، جس میں مولانا صاحب نے بدلائل واثقہ ثابت کیا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں منزل من اللہ ہیں، ماننے، امر و نہی کرنے، حجت پکڑنے میں دونوں یکساں ہیں، نیز قرآن مجید محفوظ ہے اور حدیث نبوی کی بھی حفاظت کی گئی ہے۔'' (صحیفہ اہلحدیث، مئی ۱۹۴۹)

۳ حدیث علمائے امت کی نظر میں:

اس مضمون میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے قرآن و حدیث اور تاریخی شواہد کے ساتھ صحابہ کرام اور دیگر علمائے امت کے نزدیک حدیث نبوی کا مقام و مرتبہ بیان فرمایا ہے، اسی ضمن میں انھوں نے بعض ان آثار کا تذکرہ بھی کیا ہے، جو ظلماً و زوراً حدیث نبوی کے استخفاف کے پیش نظر بعض صحابہ کرام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، بعد ازاں انھوں نے نقلی و عقلی دلائل اور واقعاتی شواہد کے ذریعہ ان آثار کی حقیقت تشت ازبام کی ہے، مزید برآں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ان سطور کے آخر میں ان علوم و

فنون کا بھی ذکر فرمایا ہے، جو علماءِ امت نے خدمتِ حدیث اور سنت کی حفاظت کے لیے استعمال کیے اور کس طرح انھوں نے بیسیوں علوم ایجاد کیے، لاکھوں تصانیف سے امت کو مالا مال کیا اور ایسے آثار باقیہ چھوڑے، جن پر رہتی دنیا ناز کرے گی۔

یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۱۴ جون ۱۹۵۰) میں شائع ہوا۔

④ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور مدیر فاران کراچی:

حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مولانا مودودی کے مضمون ''مسلک اعتدال'' اور اس کی تائید و تصویب میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لکھے گئے ایک مضمون پر تعاقب کیا، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء) کی متعدد اقساط میں شائع ہوا اور بعد ازاں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی تصدیر و اہتمام کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور سے طبع ہوا۔

یہ رسالہ جہاں اپنوں کی نگاہ میں بنظر استحسان دیکھا گیا، وہاں جماعت اسلامی کے رسائل و جرائد میں اس پر نقد و تبصرہ بھی کیا گیا، چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ کے ''فاران'' کراچی میں مولانا ماہر القادری نے بھی اپنا حق وفاداری نبھاتے ہوئے مذکورہ بالا رسالہ کا تنقیدی جائزہ لیا۔

جس کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ماہنامہ ''رحیق'' (فروری ۱۹۵۷ء) میں مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا، جس میں انھوں نے ماہر صاحب کے اشکالات و اعتراضات کا جائزہ لیا اور زیر بحث موضوع کے کئی پہلوؤں کو قرآن و حدیث کے دلائل اور ائمہ لغت و اصول کے اقوال و آراء سے مبرہن کیا۔

⑤ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذبات ثلاثہ:

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں صحیح بخاری کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذبات ثلاثہ والی حدیث کا اپنی دانست میں مخالف قرآن ہونے کی بنا پر انکار کیا، تو

ایک سائل نے حضرت سلفی رحمہ اللہ سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا، جس کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے قرآنی دلائل اور عقلی ولغوی شواہد کے ذریعہ اس حدیث کا مبنی برحق ہونا ثابت فرمایا اور اس کا انکار قلتِ نظر اور استدلال کی سطحیت کا نتیجہ قرار دیا، اس مضمون کے آخر میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مولانا مودودی کو ''مشورہ'' دیا کہ تفسیر قرآن اور فقہ الحدیث ان کا میدان نہیں، انھیں چاہیے کہ وہ ان راہوں سے کترا کر گزر جایا کریں، کیونکہ جب بھی وہ علم کی ان متعارف راہوں سے گزرتے ہیں، تو ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتے ہیں، جیسے متعہ کا مسئلہ، مسلک اعتدال، حیات مسیح و دجال وغیرہ مسائل کے متعلق ان کی جدت نوازیاں کامیاب نہیں ہوئیں، کیونکہ ان کے رہوار قلم کی جولانیوں کا میدان بالکل دوسرا ہے۔

جب حضرت سلفی رحمہ اللہ کا یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا، تو جماعت اسلامی کے تنظیمی جرائد میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، جس میں زیر بحث حدیث، مسلک اہلحدیث اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کے علم وفضل کو رد وقدح کا نشانہ بنایا گیا، چنانچہ ان احوال میں زیر بحث حدیث کے دفاع، مسلک اہلحدیث کے محامد و محاسن کو اجاگر کرنے اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کی حمایت میں جماعت اسلامی ہی کے ایک سابق رکن اور نامور محقق عالم دین قاضی مقبول احمد صاحب ایم۔ اے نے قلم اٹھایا اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۸، ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء، جلد: ۱۹، شمارہ: ۱۹، ۲۰) کی دو اقساط میں متعلقہ مباحث پر بھرپور روشنی ڈالی اور کئی نئے پہلو اجاگر کیے۔ چنانچہ اسی افادیت کے پیش نظر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا مضمون کے حواشی میں یہ مضمون بھی درج کر دیا گیا ہے۔

⑥ عجمی سازش کا فسانہ:

منکرین قرآن وحدیث کی طرف سے عموماً یہ شبہ پھیلایا جاتا ہے کہ عہد نبوی

میں احادیث کی جمع و تدوین کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، احادیث کا موجودہ ذخیرہ عجمی سازش کی پیداوار ہے، جو انتقامی جذبے کے پیش نظر اعدائے دین کی جانب سے مسلمانوں میں رائج کیا گیا۔

اعداءِ سنت کی جانب سے یہ نظریہ بڑی ڈھٹائی اور جرأت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس کی تائید و تصدیق میں قرآن مجید تو درکنار کوئی ایک بھی ایسا مستند تاریخی حوالہ ذکر نہیں کیا جاتا، جو اس خود ساختہ سازش کی تصویب کرتا ہو۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون میں اسی فاسد نظریہ کی بیخ کنی فرمائی ہے اور تاریخی دلائل اور واقعاتی شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اس ناممکن الوقوع سازش کا تصور چند علم و عقل کے یتامیٰ کا پیدا کردہ ہے، حقیقت اور واقع میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، بلکہ یہ حضرت خود ایک ''عجمی سازش'' کا شکار ہوئے ہیں!

یہ مضمون ہفت روزہ 'الاعتصام' (۱۷ فروری ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا۔

⑦ عجمی سازش کا تجزیہ، واقعات کی روشنی میں:

''طلوع اسلام'' (جولائی ۱۹۵۷ء) کے شمارے میں مولوی ابراہیم صاحب ناگی امرتسری کا ایک سوال نما مضمون شائع ہوا، جس میں انھوں نے احادیث نبویہ کو عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیا اور سوال اٹھایا کہ آخر حدیث کی جمع و تدوین فارسی الاصل علماء ہی نے کیوں کی اور کتب صحاح کے مصنف عرب کیوں نہیں؟

چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اس سوال کے جواب میں ماہنامہ ''رحیق'' (ستمبر ۱۹۵۷ء) میں مذکورہ بالا مضمون لکھا، جس میں انھوں نے مولوی ابراہیم ناگی کے اٹھائے ہوئے سوال کا اطمینان بخش جواب لکھا اور تاریخی دلائل کے ساتھ اس ''سازش'' کے تارو پود بکھیر دیے۔

⑧ ایک سوال، دو جواب:

یہ مضمون دراصل مذکورہ بالا جواب ہی کا اختصار ہے، جو ہفت روزہ

"الاعتصام" (۲۳ اگست ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا، بعض اضافی فوائد اور نتائج کے پیش نظر اسے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

⑨ امام محمد بن مسلم زہری قرشی اور تحریک انکار حدیث:

ماہنامہ "طلوع اسلام" (ستمبر، ۱۹۵۰ء) میں تمنا عمادی کا ایک مضمون امام زہری رحمہ اللہ کے متعلق شائع ہوا، جو بعد ازاں "امام زہری اور امام طبری، تصویر کا دوسرا رخ" نامی کتاب کے ضمن میں کراچی سے طبع ہوا، یہ مضمون مندرجہ ذیل مغالطات اور اوہام پر مبنی تھا:

① امام زہری رحمہ اللہ قرشی اور عرب نہیں ہیں، تاکہ اس کے نتیجے میں خدمت حدیث میں امام زہری رحمہ اللہ کی جہود و مساعی کو عجمی سازش کا شاخسانہ قرار دیا جا سکے۔

② امام زہری رحمہ اللہ مدنی نہ تھے، بلکہ ایلہ (شام) کے باشندے تھے۔

③ موالی عموماً فارسی الاصل تھے، عربوں کے ہاتھوں فارسی حکومت کا خاتمہ ہوا، اسی لیے موالی انتقامی جذبہ کے تحت احادیث کی وضع و تخلیق کا کام کرتے تھے، امام زہری پر بھی یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔

④ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو جمع احادیث کا حکم دیا، یزید بن عبدالملک نے ان کی شہادت کے بعد ابوبکر بن حزم کو معزول کر دیا، چنانچہ احادیث کی جمع و تدوین بھی وہیں رک گئی۔

⑤ امام زہری کی مراسیل اور ان کے شیوخ کا تذکرہ۔

⑥ کتابت و تدوین حدیث کے متعلق شکوک و شبہات۔

مندرجہ بالا اوہام و اشکالات کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا، جو الاعتصام (۸ دسمبر ۱۹۵۰ء) کی متعدد اقساط میں شائع ہوا۔

ماہنامہ "صحیفہ اہلحدیث" کراچی کے شمارہ "حجیت حدیث نمبر" (مارچ ۱۹۵۶)

میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کی تائید میں ''امام زہری رحمہ اللہ کا شجرہ نسب'' کے عنوان سے مولانا عبداللہ لائل پوری رحمہ اللہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے کتب رجال اور انساب کی روشنی میں امام زہری کے نسب پر تمنا عمادی کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا اور امام زہری رحمہ اللہ کا قطعی طور پر عربی النسل اور مدنی ہونا ثابت کیا، موضوع سے تعلق اور افادیت کے پیش نظر اسے بھی متعلقہ مباحث کے حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔

⑩ مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ:

ماہنامہ ''اسلامی زندگی'' (مئی ۱۹۴۹ء) کے شمارے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک مضمون ظن کے مفہوم کے متعلق شائع ہوا تھا،[1] جس کے جواب میں تمنا عمادی نے ماہنامہ ''البیان'' (جنوری ۱۹۵۰ء) میں ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں ظن کے مفہوم اور حدیث نبوی کے مقام احتجاج کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کیے گئے، چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے تمنا عمادی کے مذکورہ بالا تنقیدی مضمون کے جواب الجواب میں مندرجہ بالا مضمون لکھا، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۳ مارچ ۱۹۵۰ء) کی پانچ اقساط میں شائع ہوا، ان سطور میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے فتنۂ انکار حدیث کا پس منظر، اغراض و مقاصد، سنت کا جدید مفہوم، سنت کے مواقع استعمال، حدیث کا تشریعی استقلال، مقام رسالت، حفاظت سنت، ظن اور خبر واحد کی حجیت وغیرہ کئی دیگر امور پر روشنی ڈالی۔

تمنا عمادی کے مذکورہ بالا مضمون کے جواب میں مولانا عبداللہ لائل پوری رحمہ اللہ نے بھی ہفت روزہ ''الاعتصام'' (جلد: ۱، شمارہ: ۳۰، ۳۱) کی دو اقساط میں ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، جس میں انھوں نے علم حدیث اور علم اسماء الرجال کے متعلق عمادی شبہات کا ازالہ کیا، افادیت کے پیش نظر اسے بھی حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔

⑪ واقعہ افک کے متعلق نئی تمنائی ریسرچ:

''طلوع اسلام'' (اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء) کے شمارے میں تمنا عمادی کا ایک مضمون

[1] بصد افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود ہمیں یہ پرچہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے تحریر کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے متعلق صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث افک موضوع اور عجمی سازش کی پیداوار ہے، چنانچہ انھی اوہام کے ازالے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ اس مضمون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پرویزی فرقہ کے علامہ تمنا عمادی صاحب پرویزیوں کے لیے جو علم کلام تصنیف فرما رہے ہیں، اس سلسلے کی تازہ کڑی ان کی یہ نئی دریافت ہے کہ قرآن و حدیث میں مذکور واقعہ افک کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ معاذ اللہ وہ ایک افسانہ ہے۔ احقر ایک دن ایک بک سٹال پر پڑے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ فرقہ پرویزیہ کے آرگن ''طلوع اسلام'' لاہور پر نظر پڑی، تو اس میں یہ ''افسانوی'' مضمون نظر آیا۔

بمصداق ''لکل فرعون موسی'' احقر نے وہ پرچہ مخدومی مولانا محمد اسماعیل صاحب امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث مغربی پاکستان کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ حضرت! اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور قسما قسم کی ذمہ داریوں سے کچھ وقت نکال کر ''تمنائی اپچ'' پر تنقیدی مقالہ تحریر فرما دیجیے!

حضرت ممدوح نے از راہ نوازش اس درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور چند دنوں میں یہ علمی اور تحقیقی مقالہ تحریر فرما دیا۔'' (الاعتصام، ۲۶ فروری ۱۹۶۵ء)

سب سے پہلے یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۶ فروری ۱۹۶۵ء) کی پانچ اقساط میں شائع ہوا اور بعد ازاں اس تحقیقی مقالہ کے محرک اول مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے حسب خواہش محترم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب نے اسے ''واقعہ افک'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں ادارہ ندوۃ المحدثین کے زیر اہتمام کتابی شکل میں طبع کیا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء!

⑫ مسئلہ درایت وفقہ راوی کا تاریخی وتحقیقی جائزہ:

یہ مقالہ دراصل مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ کی کتاب "حسن البیان فیما في سیرة النعمان" پر لکھا گیا مقدمہ ہے، جس میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے درایت و فقاہت راوی کی آڑ میں احادیث نبویہ کے استخفاف و استحصال کا جائز لیا ہے۔

قبل ازیں یہ مقدمہ بنارس انڈیا سے علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے مقالات پر مشتمل کتاب ''حجیت حدیث'' میں بھی شائع ہو چکا ہے، یہ مقدمہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو تحریر کیا تھا۔

⑬ مقدمہ نصرة الباری في بیان صحة البخاري:

یہ مضمون بھی دراصل حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک مقدمہ ہے، جو انھوں نے مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری رحمہ اللہ کی کتاب "نصرة الباري في بیان صحة البخاري" کے لیے لکھا تھا۔

ان سطور میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مقام رسالت، تدوین حدیث کے مختلف ادوار، صحیح بخاری کا مقام و مرتبہ، احادیث صحیحین کی قطعیت وغیرہ امور پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں منکرین حدیث کے معیار صداقت کے مطابق احادیث نبویہ سے دو ایسی واقعاتی شہادتیں پیش فرمائی ہیں، جو نظریہ انکار حدیث کے ابطال اور فساد پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ مقدمہ ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ مذکور کتاب کے اولین ایڈیشن مطبوعہ دہلی سے معلوم ہوتا ہے۔

مفقودات:

مذکورہ بالا مقالات ان تحریرات پر مشتمل ہیں، جو حضرت سلفی رحمہ اللہ نے دفاع حدیث کے ضمن میں لکھیں اور ہمیں دستیاب ہوئیں اور جنھیں اب ''مقالات حدیث'' کے نام سے جمع کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت سلفی رحمہ اللہ کی دفاع حدیث کے باب ہی میں بعض ایسی نگارشات بھی موجود تھیں، جن کا ذکر بعض رسائل و جرائد میں

تو ملتا ہے، لیکن تلاش بسیار بعد از بسیار کے باوجود ہمیں دستیاب نہیں ہو سکیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① مقام حدیث قرآن کی روشنی میں:

ہفت روزہ "الاعتصام" (جلد: ۸، شمارہ: ۵۱) میں قاضی محمد اسلم فیروز پوری رحمہ اللہ کی طرف سے اس کتاب کا اشتہار دیا گیا ہے اور حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اپنے مقالہ "حدیث کی تشریعی اہمیت" میں بھی ذکر کیا ہے کہ "مقام حدیث" کے نام سے ان کا ایک رسالہ شائع ہو چکا ہے۔ (حجیت حدیث: ۲۲)

علاوہ ازیں بعض اصحاب قلم نے دفاع حدیث میں لکھی گئی مؤلفات کے ضمن میں بھی مذکورہ بالا رسالہ کا تذکرہ کیا ہے۔ [1]

② ظن کا مفہوم:

حضرت سلفی رحمہ اللہ کا یہ مضمون ماہنامہ "اسلامی زندگی" لاہور (مئی ۱۹۴۹) میں شائع ہوا تھا، جیسا کہ مولانا حنیف ندوی رحمہ اللہ نے ہفت روزہ "الاعتصام" (۳ مارچ ۱۹۵۰ء) میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کے مضمون "مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ" کے ابتدائی نوٹ میں ذکر کیا ہے اور حضرت سلفی رحمہ اللہ نے خود بھی اس مضمون کے آغاز میں اس مضمون کا تذکرہ کیا ہے۔ مذکورہ ماہنامہ لاہور سے مولانا حنیف ندوی کی زیر نگرانی اور ملک محمد رفیق کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔

③ إضاحة الحق:

یہ رسالہ دراصل مولانا عبدالحق قریشی میانوالی کا ترتیب دیا ہوا ایک کتابچہ ہے، انھوں نے جماعت اسلامی کے نظریہ حدیث کے متعلق ایک سوال نامہ تیار کیا اور مختلف علماء کرام کی خدمت میں جواب کے لیے ارسال کیا۔

---

[1] دیکھیں: ماہنامہ محدث، فتنۂ انکار حدیث نمبر، اگست، ستمبر ۲۰۰۲ء (ص: ۲۴۴)

چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے بھی ان سوالات کا جواب لکھا، جو مذکورہ رسالہ میں شائع ہوا، جیسا کہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۹ نومبر، ۱۹۵۷ء جلد: ۹، شمارہ: ۱۸) کے تبصرہ نگار نے مذکورہ رسالہ پر اپنے تبصرہ میں ذکر کیا ہے۔

ہر امکانی جگہ پر ان تحریرات کی تلاش کی گئی ہے، لیکن ہمیں کوئی مضمون دستیاب نہیں ہو سکا، لہٰذا اب حضرت سلفی رحمہ اللہ کے موجودہ مقالات ہی کو شائع کیا جا رہا ہے، اگر کسی وقت مفقودہ تحریرات دستیاب ہوئیں، تو انھیں بھی اگلے ایڈیشن میں شاملِ اشاعت کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ

بنا بریں اگر کسی بھائی کو ان مضامین کے متعلق کوئی اطلاع ہو، تو ہمیں ضرور مطلع فرمائے، تاکہ اس نقص کا تدارک کرتے ہوئے ان تحریرات کو اگلی طباعت میں شامل کیا جائے۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کا اسلوب نگارش:

کرنے لگی زمین ستاروں پر تبصرہ !

''آفتاب آمد دلیل نہار'' کے مصداق حضرت سلفی رحمہ اللہ کے اسلوب نگارش اور طرز کلام کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریرات و نگارشات ہی کافی ہیں، تاہم حضرت سلفی رحمہ اللہ کی اردو انشاء پردازی کے متعلق اہل علم کی آراء وتبصرہ جات فہم کلام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں، اسی بنا پر انھیں ذیل میں ذکر کیا جا رہا ہے۔

۱۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو باری تعالیٰ نے گوناگوں خوبیوں سے نوازا ہے، بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو بیک وقت تقریر، تحریر اور تدریس میں مہارت تامہ رکھتے ہوں، بسا اوقات ایک اچھا مقرر اچھا مدرس نہیں ہوتا اور اچھا مدرس اچھا مقرر نہیں اور پھر بہت ہی کم اچھا مقرر اور اچھا مدرس ماہر انشا پرداز

بھی ہوتا ہے، لیکن خالق فیاض نے مولانا المحترم کو ان تینوں چیزوں سے حصہ وافر عطا کیا ہے، خطابت اور تدریس تو آپ کا روز کا کام ہے، لیکن اپنی بے شمار مصروفیات اور ذمہ داریوں کی بنا پر لکھنے کے لیے کم وقت نکال پاتے ہیں، لیکن جب بھی لکھتے ہیں، تو خوب لکھتے ہیں، تحقیق و تدقیق کے ساتھ ساتھ عبارت میں دلکشی، دلآویزی اور ہلکا پھلکا طنز آپ کی تحریر کا خاصہ ہے۔" (الاعتصام، ۲۰ اکتوبر، ۱۹۶۷ء، ص: ۸)

۲۔ مولانا ارشاد الحق اثری ﷾ حضرت سلفی ؒ کے طرز نگارش کے متعلق لکھتے ہیں:

"وہ جہاں ایک قادر الکلام خطیب تھے، اس کے ساتھ ساتھ تحریر و انشاء میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے تھے، درس و تدریس اور جماعتی مصروفیتوں کے باعث وہ خواہش کے مطابق چنداں لکھ تو نہ سکے، مگر جس قدر بھی لکھا، اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہوگیا، جس میں ثقاہت، زبان کی لطافت، بیان کی نزاکت اور سنجیدگی کا سب نے اعتراف کیا، وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے نازک فقہی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں، ایک طبیب حاذق کی طرح نشتر بھی چلاتے ہیں، مگر کہیں ٹیس محسوس نہیں ہونے دیتے، اپنے مخاطب کا بھرپور تعاقب کرتے ہیں، مگر اس کے ادب و احترام کے منافی کوئی چیز نوک قلم پر نہیں لاتے۔"

۳۔ حضرت سلفی ؒ کی سوانح نگار محترمہ سعدیہ ارشد حضرت سلفی ؒ کے انداز تحریر کے متعلق لکھتی ہیں:

"اردو انشا پردازی میں آپ صاحب طرز تھے، جس میں روانی، سلاست، برجستگی، الفاظ کا چناؤ اور پھر ان کا جڑاؤ اور پھر محل کے مطابق اشعار کی آمد، امام الہند مولانا ابوالکلام کی طرح آیات قرآن کا برمحل استعمال اور فارسی، عربی اور اردو اشعار کو عبارت میں نگینہ کی طرح جڑتے ہیں، ان کی تصانیف سے ان کے عمیق مطالعہ، تحقیقی

اسلوب اور علمی بصیرت کا بھرپور تاثر ملتا ہے، اپنی تحریر میں بے معنی طوالت سے گریز کرتے ہیں، لمبی سے لمبی بات کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، آپ کی تحریر میں تخیل کی رفعت، زبان و بیان کی رعنائی اور ادبی شان پائی جاتی ہے، ہلکے پھلکے مختصر اور خوبصورت جملے آپ کا مخصوص طرز نگارش ہے۔

مولانا کی سادہ اور بے ساختہ تحریروں میں چونکہ جذبے کی سچائی اور خلوص ہے، اس لیے ان کی بات دلوں میں اتر جاتی ہے، انھوں نے جذباتی پیرائیہ بیان کرنے کی بجائے منطقی استدلال سے کام لیا ہے اور ہر موضوع پر علمی و تحقیقی نقطہ نظر سے لکھا ہے، مولانا کی تحریریں علمی رفعت و بصیرت کی حامل ہیں، آپ قاری میں بھی علمی بصیرت کی وہی روشنی پیدا کرنا چاہتے ہیں، جس سے وہ خود بہرہ یاب ہیں، مولانا اصحاب الرائے اور تقلید جامد کے خلاف بے باک نقاد ہیں، مگر تنقید اس انداز سے کرتے ہیں کہ فریق مخالف برا ماننے کے بجائے قائل ہوجاتا ہے، اپنی تحریروں میں مولانا قاری کو قائل کر لیتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے اور سچائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تحقیق ہے نہ کہ تقلید، اختصار ان کے بیان میں بڑا حسن پیدا کرتا ہے، وہ بے ضرورت جزئیات کو ہمیشہ نظر انداز کر دیتے ہیں، بعض علماء کی تحریروں میں طنز وسوقیانہ الفاظ وفقرے ملتے ہیں، مگر حضرت سلفی رحمہ اللہ کی تحریروں میں متانت اور وقار ہے، طنز وتعریف کے بجائے مزاح کی چاشنی پائی جاتی ہے، جو جامعیت مولانا کی تحریروں میں ہے، وہ آپ کے معاصرین میں نظر نہیں آتی۔'' (مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ، ص: ۹۴)

جی تو چاہتا ہے کہ حضرت سلفی رحمہ اللہ کے طرز نگارش کی مذکورہ بالا مزایا اور صفات کو ان کی تحریرات سے مبرہن کیا جائے، لیکن معروضات کا دامن پہلے ہی کافی پھیل چکا ہے، اس لیے مندرجہ بالا آراء ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے اور پھر اس حقیقت کو

عیاں کرنے کے لیے زیرِ نظر مجموعہ میں شامل حضرت سلفی رحمہ اللہ کی تحریرات ہی کافی اور وافی ہیں۔

اسلوبِ تحقیق:

① حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اکثر مواقع پر قرآنی آیات سورت کے نام اور آیت نمبر کے بغیر ہی ذکر کی تھیں، البتہ بعض مقامات پر سورت کا نام ذکر کیا تھا، لیکن آیت نمبر درج نہیں کیا تھا، کتاب کے حواشی میں تمام مقامات پر متعلقہ سورت کا نام اور آیت نمبر ذکر کیا گیا ہے۔

② کتاب میں مذکورہ احادیث کی تحقیق و تخریج کر دی گئی ہے، حدیث اگر صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے، تو بیشتر مقامات پر انھی دونوں کتب کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر حدیث سنن اَربعہ میں سے کسی کتاب میں ہے، تو سنن اَربعہ کی بقیہ کتب کا حوالہ بھی ذکر کر دیا گیا ہے، صحیحین اور سنن اَربعہ کی شہرت اور تداول کے پیشِ نظر بیشتر مقامات پر حوالہ جات میں انھی کتب پر اکتفا کیا گیا ہے، اکثر مقامات پر حدیث کی تصحیح و تضعیف میں محدثین کرام کے اقوال ذکر کیے گئے ہیں، جس حدیث کی علت پر اطلاع ہوئی، وہاں کتبِ رجال کو مدِنظر رکھتے ہوئے بحث و تحقیق کی گئی ہے۔

③ بیشتر مقامات پر کتاب میں مذکورہ آثار کی تحقیق و تخریج کی گئی ہے۔

④ جو مقامات مزید تفصیل اور توضیح کے محتاج تھے، وہاں پر حواشی میں مزید تفصیل ذکر کی گئی ہے۔

⑤ کتاب میں مذکورہ مصادر و مراجع کو مدِنظر رکھتے ہوئے عبارات کا تقابل کیا گیا ہے۔

⑥ کتاب میں منقولہ عبارات کا اصلی مصادر کو مدِنظر رکھتے ہوئے تقابل و اصلاح

کی گئی ہے، جس سے عبارات کے درمیان کئی سقم دور ہو گئے ہیں۔

ھ کتاب میں مذکورہ فارسی اور عربی اشعار کا حواشی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے، جس کے لیے میں مخلص دیرینہ برادرم حافظ عبدالجبار ﷾ کا مشکور ہوں۔

اظہار تشکر:

میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں، جس نے ان جواہر منثورہ کو یکجا کتابی شکل میں پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی، بعد ازیں اس کتاب کی تکمیل میں جن احباب و اخوان نے میرے ساتھ تعاون کیا اور میری رہنمائی کی، میں ان تمام حضرات کا مشکور ہوں، خصوصاً:

① اس کتاب کی تیاری میں مولانا عطاء اللہ حنیف لائبریری لاہور سے سب سے زیادہ استفادہ کیا گیا، میں اس لائبریری کے اصحاب انتظام کا مشکور ہوں، جنھوں نے مجھے اس لائبریری سے استفادہ کے مواقع فراہم کیے۔

② محترم جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب، جنھوں نے بے شمار مواقع پر مجھے اپنی لائبریری سے استفادہ کے مواقع فراہم کیے اور کئی رسائل کی نقول مہیا کیں اور مفید مشورہ جات سے نوازا۔

③ فضیلۃ الشیخ مولانا ارشاد الحق اثری ﷾، جنھوں نے اپنے انتہائی قیمتی وقت اور علمی و تحقیقی مشاغل سے فرصت نکال کر اس کتاب پر مقدمہ لکھا اور اکثر مواقع پر مجھے انتہائی مفید مشورہ جات اور قیمتی تجاویز و آراء سے نوازا، جو میری حوصلہ افزائی کا باعث بنیں۔

④ فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی ﷾، جنھوں نے اپنے انتہائی قیمتی وقت اور دعوتی مشاغل سے فرصت نکال کر اس کتاب پر بہترین مقدمہ لکھا۔

۵ محترم بھائی محمد حسن، ذوالفقار ابراہیم اثری اور علی حسن خان، جن کی مشاورت اور تعاون قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔

علاوہ ازیں میں ان تمام بھائیوں کا مشکور ہوں، جنھوں نے کتاب کے تکمیلی و طباعتی مراحل میں کسی مرحلہ میں میرے ساتھ کسی قسم کا تعاون کیا اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال میں اخلاص ودیعت فرمائے اور ہمیں خدمت دین کے مزید مواقع فراہم کرے، جو ہماری اخروی نجات اور بلندی درجات کا باعث بن سکیں۔

وأخيرا رحم الله امرءا أسدىٰ إلي عيوبي، فإن الرجوع إلى الحق خير من التمادي في الباطل!

شاھد محمود

٢٨ ذوالحجہ ١٤٢٩ھ

بمطابق ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸

0333.8110896 / 0321-6466422

سوانح

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ

خاندان کا اجمالی تعارف:

حضرت مولانا محمد اسماعیل السّلفی رحمہ اللہ کا خانوادہ برصغیر پاک و ہند کے قدیم باشندگان سے تعلق رکھتا ہے، دس بارہ پشت قبل یہ خاندان دولتِ اسلام سے مالا مال ہوا اور ﴿وجعلنا کم شعوباً وقبائل﴾ کے مصداق اس خاندان کا تعلق راجپوتوں کی جنجوعہ شاخ سے ہے۔

مرورِ ایام کے ساتھ یہ خاندان حوادثاتِ زمانہ کا شکار رہا، حکومتوں کے رد و بدل سے متاثر ہوا، آخر کار مولانا کے جد امجد مولانا محکم دین موضع ڈھونیکے تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں قیام پذیر ہوئے، اس خاندان کی خاص علمی و جاہت تھی، فن کتابت وحکمت کی بدولت انھیں خاصی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

حکیم عبداللہ (حضرت سلفی رحمہ اللہ کے دادا جان)

حضرت مولانا محکم دین کے اکلوتے صاحبزادے حکیم عبداللہ تھے، یہ بڑے پائے کے طبیب تھے، اپنے زمانے کے بہت بڑے نباض تھے، رب العزت نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی، مخلوق خدا کو ان کی حکمت سے بہت فائدہ پہنچا، ان کی شہرت اور ہر دلعزیزی سے جل کر کسی حاسد نے حکیم عبداللہ صاحب کو کوئی زہریلی چیز کھلا دی، جس سے ان کی موت واقع ہوگئی، حکیم عبداللہ صاحب کے چار صاحبزادے تھے، جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا محمد ابراہیم صاحب، (۲) مولانا احمد دین صاحب، (۳) مولانا عبدالعزیز صاحب، (۴) مولانا محمد عالم صاحب۔ مولانا عبدالعزیز اور مولانا محمد عالم لا ولد فوت ہوئے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب (حضرت سلفی رحمہ اللہ کے والد گرامی)

حضرت مولانا محمد ابراہیم بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے، اپنے خاندانی ورثہ یعنی فن کتاب و حکمت میں ید طولی رکھتے تھے، فن نسخ اور نستعلیق دونوں میں ماہر تھے، آپ نے خاندانی روایات کے پیش نظر کتابت اور حکمت کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنایا، چونکہ آپ نے صغر سنی میں ہی کتابت میں مہارت حاصل کر لی تھی، اس وجہ سے آپ نے حکمت پر کتابت کو ترجیح دی اور آغاز جوانی میں فن کتابت سے منسلک ہوگئے۔

اسی زمانے میں شیخ محی الدین صاحب دلی دروازہ لاہور میں اشاعت کتب کا کاروبار کرتے تھے، جناب محی الدین نو مسلم تھے اور سکھ مت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا، نہایت متقی اور پرہیز گار انسان تھے، مولانا محمد ابراہیم فرمایا کرتے تھے کہ اذان کے بعد شیخ موصوف اپنا کاروبار بند کر دیتے تھے اور نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے تھے، ان شیخ محی الدین صاحب کے پاس مولانا محمد ابراہیم خوش نویسی کا کام کرتے تھے۔

استاذِ پنجاب حافظ عبدالمنان رحمہ اللہ صاحب سے رابطہ:

جناب صاحبزادہ فیض الحسن صاحب مرحوم کے اجداد میں سے کوئی صاحب اس علاقہ کے پیر تھے، یہ پیر صاحب اکثر حکیم عبداللہ صاحب مرحوم کے گھر قیام فرماتے، جب حکیم عبداللہ صاحب کی وفات کے بعد یہ خاندان معاشی تنگ دستی کا شکار ہوا، تو حکیم صاحب کے صاحبزادے پیر صاحب کی کفالت سے دست کش ہوگئے، اس وجہ سے حضرت پیر صاحب سخت ناراض ہوگئے، انھوں نے اپنی ناراضگی کا

اظہار اس انداز سے کیا کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب دل برداشتہ ہوئے اور وزیر آباد تشریف لے آئے۔

اسی زمانے میں استاذِ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ ، وزیر آباد ہی میں متمکن تھے، سارا علاقہ ان کی علمی ضیا پاشیوں کی وجہ سے بقعہ نور بن رہا تھا، خوش نصیبی سے مولانا محمد ابراہیم رحمہ اللہ بھی ان کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگے، پھر باقاعدہ زانوئے تلمذ طے کیا اور استاذِ پنجاب سے علم حدیث میں دسترس حاصل کی، پھر اسی تلمذ نے اتنی قربت حاصل کی کہ گھریلو معاملات بھی استاد اور شاگرد کے درمیان زیر بحث آنے لگے۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی ولادت باسعادت:

اس وقت تک مولانا محمد ابراہیم کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، آپ نے اپنے استاد گرامی حضرت مولانا حافظ عبدالمنان رحمہ اللہ صاحب سے دعا کی درخواست کی کہ اللہ رب العزت انھیں اولاد عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت حافظ صاحب کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور حافظ صاحب کو مولانا محمد ابراہیم کے ہاں ایک فرزند ارجمند کی ولادت کی بشارت دی گئی، اس بشارت کا ذکر حضرت حافظ صاحب نے اس سند میں بھی کیا ہے، جو تحصیل علم کے بعد انھوں نے مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ کو عطا فرمائی تھی، اس سند میں حافظ صاحب نے مولانا کو "الولد الصالح" کے نام سے یاد کیا ہے۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ کی پیدائش ۱۳۱۴ھ بمطابق ۱۸۹۵ء تحصیل وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں ڈھونیکے میں ہوئی۔

مولانا محمد ابراہیم اور مسلک اہل حدیث:

استاذِ پنجاب حضرت مولانا حافظ عبدالمنان رحمہ اللہ وزیر آبادی سے تلمذ اور مجالست کا اثر یہ ہوا کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب نے حنفیت کی بجائے مسلک اہل

حدیث اختیار کر لیا، ان کے سلفی العقیدہ ہونے کی بنا پر ان کو گاؤں کی مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا، وہ کئی برس اپنے گھر میں نماز ادا فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو عزیمت سے نوازا تھا اور متوکل تھے، توحید کی برکات کی وجہ سے انھوں نے اس ناروا مقاطعے کا مردانہ وار مقابلہ کیا، آپ صاحب حیثیت زمیندار تھے، صاحبِ فن کاتب تھے اور اعلیٰ پائے کے طبیب بھی تھے، طبیب حاذق ہونے کی وجہ سے گاؤں والے آپ کے محتاج تھے، آخر کار یہ مقاطعہ اپنی موت آپ ہی مر گیا اور آپ گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز ادا کرنے لگے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب پر تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی کتابت کو صرف قرآن و حدیث تک محدود کر دیا، ان کی کتابت کے شاہ کاروں میں ایک مولانا وحید الزمان کے ترجمہ والا قرآن مجید ہے، دوسرا متداول شہکار تحفۃ الاحوذی ہے، یہ ترمذی شریف کی شرح ہے، یہ شرح جناب مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھی ہے، اس کے چار حصے ہیں، مسودات ان کے پاس مبارکپور سے آئے تھے، پھر وہ کتابت شدہ کاپیاں بذریعہ ڈاک واپس بھیجتے تھے، مبارک پور (یو۔ پی۔ انڈیا) سے مسودات کی ڈھونیکے آمد کی صرف ایک وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب عالم بھی تھے اور کاتب بھی، اس وجہ سے کتابت کی غلطیاں نہیں ہوتی تھیں، بلکہ بعض دفعہ تو مؤلف کی فروگزاشت کو درست کر دیتے تھے۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کا آغازِ تعلیم:

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے، انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی مولانا محمد ابراہیم سے حاصل کی، اسی گھریلو ماحول میں ایک عالم باعمل حضرت مولانا عمر الدین وزیر آبادی سے استفادہ کا موقع بھی آیا، آپ نے چھوٹی عمر میں صرف ونحو کی ابتدائی کتب پر عبور حاصل کر

لیا، صرف ونحو کی ان ابتدائی کتب کے ساتھ آپ نے گلستان، بوستان اور دیگر فارسی کتب بھی پڑھیں۔

باقاعدہ تعلیم کا آغاز:

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے بعد آپ نے حضرت مولانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی رحمہ اللہ کی خدمت میں باقاعدہ زانوئے تلمذ طے کیا، حضرت حافظ صاحب نے بڑی محبت اور شفقت سے آپ کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا، استاد موصوف نے تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی خصوصی توجہ فرمائی، مولانا سلفی رحمہ اللہ نے استاذ پنجاب سے صحاح ستہ مکمل اور اصولِ حدیث میں شرح نخبة الفكر اور تفسیر جلالین پڑھی، حضرت حافظ رحمہ اللہ صاحب نے بکمال مہربانی وتلطف مولانا سلفی رحمہ اللہ کو روایت کی اجازت دی اور سند بھی عطا فرمائی، یہ سند آپ کو ۱۳۳۳ھ میں دی گئی۔

دلّی روانگی:

وزیر آباد سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ دلّی تشریف لے گئے، دلّی ان دنوں علوم وفنون کا مرکز تھا، یہاں پر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کی تحریک علمی کے گہرے نقوش تھے، آپ نے پھاٹک حبش خان میں مدرسہ نذیریہ میں قیام کیا، یہ مدرسہ شیخ الکل سید نذیر حسین رحمہ اللہ دہلوی کی یادگار تھا، اس مدرسہ میں آپ نے شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار عمر پوری رحمہ اللہ اور بعض دوسرے شیوخ سے علمی جواہر اکٹھے کیے۔

امرتسر میں آمد:

ان دنوں امرتسر میں علوم وفنون کا چرچا تھا، اکابرین خاندان غزنویہ علوم وفنون کا منبع بن چکے تھے، مدرسہ غزنویہ میں آپ نے حضرت مولانا عبدالغفور غزنوی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالرحیم غزنوی رحمہ اللہ سے استفادہ کیا، قیام امرتسر کے دوران آپ نے

حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمہ اللہ (جو قیام پاکستان کے بعد جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی ہوئے) سے فنون کی کتابیں پڑھیں، آپ مفتی صاحب موصوف سے بہت متاثر تھے، فنون میں ان کے ذوق اور طریق تدریس کی بہت تعریف فرماتے تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فنون میں میری دلچسپی اور درک حضرت مفتی صاحب کے طریق تدریس کا فیض ہے۔

سیالکوٹ میں آمد:

سیالکوٹ زمانہ قدیم سے علم وفضل کا گہوارہ رہا ہے، اس سرزمین میں علامہ عبدالحکیم رحمہ اللہ سیالکوٹی اور نابغہ روزگار علامہ اقبال جیسی ہستیاں ہوئی ہیں، چنانچہ امرتسر سے فراغت کے بعد حضرت سلفی رحمہ اللہ سیالکوٹ تشریف لے گئے، ان دنوں وہاں حضرت علامہ محمد ابراہیم میر رحمہ اللہ سیالکوٹی کی علمیت کا چرچا تھا، مولانا سلفی نے ان سے بھی کسب فیض کیا۔

جس طرح زمانہ قدیم کے علماء علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے دور دراز کا سفر کرتے تھے، اسی طرح حضرت سلفی رحمہ اللہ نے کئی قدیم دینی مراکز کے سفر کیے اور ان سب مدارس سے علمی جواہر اکٹھے کیے، حضرت سلفی کا سلسلۂ علم سند کے لحاظ سے چوبیس واسطوں سے جناب شارع علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔

حضرت علامہ ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کے والد کے ہم نام تھے، انھوں نے حضرت سلفی رحمہ اللہ کی ذہانت و فطانت کو آن واحد میں پہچان لیا اور انھیں اپنا روحانی بیٹا قرار دیا، علامہ سیالکوٹی مرحوم نے اپنی عظیم الشان لائبریری مولانا سلفی کی تحویل میں دیدی اور اس طرح مولانا مرحوم کو قدیم تفاسیر اور نادر علمی کتابوں سے استفادہ کا موقعہ حاصل ہوا۔

گوجرانوالہ میں تقرر:

آپ ۱۳۳۹ھ بمطابق ۱۹۲۱ء میں بمعیت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ

گوجرانوالہ آئے، ان ایام میں گوجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث چند نفوس پر مشتمل تھی، حضرت سیالکوٹی نے جماعت کے اراکین سے کہا کہ میں ایک درشہوار تمہارے سپرد کرنے آیا ہوں، اس کو حفاظت سے رکھنا۔ اس کے بعد آپ نے شہر گوجرانوالہ کو ایسا وطن بنا لیا کہ اس شہر میں منبر ومحراب کو الحمدللہ چار چاند لگا دیئے، گزشتہ نصف صدی میں کئی انقلاب آئے، مگر آپ اپنے جادہ مستقیم پر رواں دواں رہے، آپ کے پائے عزیمت میں کبھی لغزش نہیں آئی، مقام ومرتبہ کی چاہت اور دولت کی طلب آپ کو اپنے مقام سے نہ ہلا سکی۔

مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ نے شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد کی معرفت آپ کو مدینہ منورہ بلوا بھیجا، مگر آپ نے گوجرانوالہ میں قیام کو ترجیح دی اور اپنی جگہ حضرت العلام جناب مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ کو بھجوا دیا۔

گوجرانوالہ کی جامع اہل حدیث میں آپ نے مدرسہ محمدیہ کی بنیاد رکھی، یہ مدرسہ نصف صدی تک نہ صرف گوجرانوالہ اور اس کے مضافات بلکہ متحدہ پنجاب کے دور دراز کے طلبہ کو علوم اسلامیہ اور ادب عربی سے لبریز کرتا رہا، اس مدرسہ میں موصوف نہ صرف خود پڑھاتے تھے، بلکہ وقت کے بہترین اساتذہ متعین فرماتے تھے، ملک کے بڑے بڑے فاضل یگانہ لوگ اس مدرسہ محمدیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔

قومی و جماعتی خدمات:

اسی سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ جریدہ ''الاعتصام'' لاہور کے اداریہ کا ایک ٹکڑا نقل کر دیا جائے، جو یکم مارچ ۱۹۶۸ء کو شائع ہوا۔

''گزشتہ نصف صدی میں جماعت اہل حدیث کی کسی بھی قسم کی مذہبی و سیاسی سرگرمی میں مولانا محمد اسماعیل صاحب بدستور ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل

رہے، نوجوانی میں سعی و ہمت کا یہ حال تھا کہ ۱۹۲۴ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراڈالا، جس کے صدر استقبالیہ ہمارے بزرگ مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ تھے، ہمارے مولانا کو جماعت منظم کرنے کی بڑی دھن تھی، انجمن اہل حدیث پنجاب کا قیام عمل میں آیا، تو اس میں مولانا مرحوم کا بہت دخل تھا، ۱۹۳۱ء میں شاہ محمد شریف گھڑیالوی کی سربراہی میں جمعیت تنظیم اہل حدیث پنجاب وجود میں آئی، تو اس کے روح رواں آپ ہی تھے، چنانچہ اس کا دفتر بھی مولانا کی سرپرستی میں گوجرانوالہ میں تھا، ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاضی عبدالرحیم تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اہل حدیث کانفرنس دہلی میں بلائی گئی، تو آپ اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے، قیام پاکستان کے بعد جہاں تک مغربی پاکستان کی جمعیت اہل حدیث کا تعلق ہے، یہ مولانا سلفی رحمہ اللہ کی مساعی و شبانہ روز محنت و ہمت کی رہین منت ہے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ کو ملکی سیاست کی دلدل سے نکال کر جماعت کی سربراہی کے لیے مولانا نے ہی آمادہ کیا تھا، پھر آخر تک حضرت موصوف کا ساتھ نبھایا۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے مطالبے میں ہر قدم پر مولانا غزنوی کے ساتھ جماعت کی نمائندگی کی، چنانچہ اس کمیٹی کے آپ رکن تھے، جو ۱۹۵۲ء میں اسلامی آئین کی تشکیل کے لیے بنائی گئی تھی، ۱۹۵۳ء کی تاریخی تحریک ختم نبوت کے دوران مجلس عمل تحفظ ختم نبوت میں جمعیت کے تین نمائندے تھے: (۱) مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ، (۲) مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمہ اللہ، (۳) مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ۔ تاہم اس سلسلے میں قید و بند کا شرف حضرت مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ کے حصے میں آیا۔

۱۹۲۴ء میں ہندوستان میں شدھی تحریک شروع ہوئی اور مسلمانوں کو ہندو بنانے پر زور دیا جانے لگا، تو پنجاب سے ایک تبلیغی وفد ملکانوں کے علاقہ میں تبلیغ کے لیے گیا، اس وفد میں حضرت مولانا سرفہرست تھے۔

عام معمولاتِ زندگی:

حضرت مولانا اتنی مصروف زندگی گزارتے تھے کہ حیرت ہوتی ہے کہ آپ ان فرائض سے کیسے عہدہ برآ ہوتے تھے، مسجد کے خطیب اور پانچوں نمازوں کے امام بھی تھے، آپ نے مدت العمر قرآن کا درس اس اہتمام سے دیا کہ ناغہ شاذ و نادر ہی ہوا ہو، تبلیغی اور تنظیمی سفر پر تشریف لے جاتے، تو کوشش یہی فرماتے کہ سفر جلد ختم ہو، تاکہ درس قرآن حکیم کے تسلسل میں فرق نہ پڑے، گوجرانوالہ میں آتے ہی مولانا نے فجر کے بعد درس قرآن شروع کر دیا تھا، جو سنتالیس برس تک تواتر کے ساتھ جاری رہا، درس کے یومیہ سامعین دو اڑھائی سو سے کم نہ ہوتے تھے، رمضان المبارک میں یہ تعداد پانچ سو کے قریب ہو جایا کرتی تھی، درس قرآن مجید اور خطبہ میں بھی ترتیب کے ساتھ دوسرے دور کا اٹھارواں پارہ قریب الختم تھا۔ اس درس کے بعد تجار اور کاروباری لوگوں کی ایک جماعت آپ سے باترجمہ قرآن مجید پڑھتی تھی، بعد ازاں مدرسہ محمدیہ کے اسباق شروع ہو جاتے تھے اور آپ بہت اہم کتابیں خود پڑھاتے تھے۔

اثنائے مصروفیت میں ہی مضمون نویسی، مقالہ نگاری، خطوط کے جواب اور فتویٰ تحریر فرماتے تھے، شہر کی سیاسی و معاشرتی تحریکوں میں حصہ بھی لیا جاتا تھا، ملک کی تحریکوں میں پورے انہماک کے ساتھ حصہ لیتے تھے اور حوادث میں باحسن وجوہ خدمات سرانجام دیتے تھے۔

خطابت:

میدان خطابت کے آپ ایسے شاہسوار تھے، جن کی نظیر ہماری دینی جماعتوں میں شائد کوئی پیش نہ کر سکے، آپ کی تقریر کا اسلوب ابتدا ہی سے یگانہ اور منفرد تھا، ۱۹۲۱ء کے بعض سامعین اس بات کے شاہد ہیں کہ اس وقت بھی آپ کا اندازِ بیان نرالا تھا، آخری دور میں تو خصوصاً پوری کی پوری تقریر حشو و زوائد سے پاک نیز بے

ربط جملوں، غلط تلفظ اور وضعی حکایتوں سے پاک ہوتی تھی، دوران تقریر آواز کا زیرو بم، موزوں الفاظ کا انتخاب اور پھر عربی و فارسی اشعار کی ایسی آمد کہ عوام وخواص جھوم جھوم جاتے تھے۔

تصنیف وتالیف:

تفسیر قرآن حکیم کے بعد حضرت کا پسندیدہ موضوع حدیث، حجیت حدیث، تدوین حدیث اور محدثین کرام کے کارنامے تھا، اسی بناء پر مولانا کو محدثین کرام رحمہم اللہ اور مسلک اہل حدیث سے محبت اور شیفتگی تھی، جس کا بین ثبوت حضرت کی مؤلفات اور زیر تصنیف تالیفات ہیں، اردو انشاء پردازی میں صاحب طرز تھے، جس میں روانی، سلاست بیانی، الفاظ کا چناؤ، ان کا جڑاؤ، طنز کی پھوار اور پھر محل کے مطابق اشعار کی آمد اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہوتی تھی، باوجودیکہ حضرت کثیر الاشغال تھے اور ایک ہی نشست میں شاید ہی کوئی مضمون رقم فرمایا ہو، لیکن پھر بھی موضوع سے ربط اور تسلسل بدستور قائم رہتا تھا، شاید بہت کم حضرات کو علم ہو کہ اردو انشاء پردازی کے ساتھ ساتھ آپ کو عربی زبان اور اس کے لب ولہجہ پر بھی پورا عبور حاصل تھا، اس کی لطافتوں، نزاکتوں اور شیرینی کو برقرار رکھتے ہوئے اہل زبان سے ہمیشہ خط وکتابت رکھتے تھے، مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف کی تعداد مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ اسلامی حکومت کا مختصر خاکہ
۲۔ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث
۴۔ تحریک آزادی فکر
۵۔ حدیث کی تشریعی اہمیت
۶۔ مقام حدیث قرآن کی روشنی میں
۷۔ مسئلہ زیارت قبور
۸۔ سبعہ معلقہ کا مکمل ترجمہ مع حل لغات اور اس کا پرمغز مقدمہ

۹۔ رسول اکرم کی نماز

۱۰۔ مشکوۃ المصابیح کے تقریباً نصف اول کا ترجمہ وتحشیہ

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی کتابوں کے عربی تراجم:

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی اکثر تالیفات چونکہ عالمانہ، محققانہ اور مدلل ہوتی ہیں، اسی وجہ سے بعض عرب شیوخ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ایسی نابغہ روز گار شخصیت کی کتب کا عربی میں ترجمہ ہونا چاہیے، تاکہ عرب دنیا بھی آپ کے علوم سے استفادہ کر سکے، ویسے بھی کویت ، سعودی عرب اور یمن کے علاقوں میں سلفیت کا غلبہ ہے، اس وجہ سے بھی وہ چاہتے ہیں کہ ایک صحیح العقیدہ سلفی عالم کا ورثہ عالم عرب کی طرف بھی منتقل ہونا چاہیے۔

چنانچہ ہندوستان کے دو معروف عربی زبان و ادب کے ادیبوں نے مولانا کی حسب ذیل کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، حضرت مولانا کی یہ کتب دارالسیاسۃ الکویت کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔

① جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث، ایک تنقیدی جائزہ، اس کتاب کی تعریب و تقدیم وتعلیق صلاح الدین مقبول احمد نے کی ہے اور عربی میں اس کا نام "موقف الجماعة الإسلاميه من الحديث النبوي " دراسة نقدية مسلك الاعتدال للشيخ المودودی، رکھا ہے

② تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی، اس کتاب کی تعریب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن الازہری نے کی ہے اور عربی نام " حركة الانطلاق الفكري و جهود الشاه ولي الله في التجديد " رکھا ہے۔

③ رسالہ حیاۃ النبی کی تعریب ہو چکی ہے اور مترجم دکتور مقتدیٰ حسن ازہری ہیں، اس کتاب کا نام " رسالة في مسألة حياة النبي صلى الله عليه وسلم " ہے۔

⑥ مولانا کی کتاب زیارت قبور کتاب وسنت کی روشنی میں۔

اس کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے کیا ہے اور یہ کویت میں چھپی ہے، اس کتاب کا عربی نام "مسألة زيارة القبور في ضوء الكتاب والسنة" ہے۔

مولانا کی دیگر کتابیں حسب ذیل عنوانوں سے عربی میں منتقل کی جا رہی ہیں:

① السنة في ضوء القرآن

② مكانة السنة في التشريع الإسلامي

③ صفة صلاة النبي صلى الله عليه وسلم

④ تخطيط وجيز للحكومة الإسلامية

⑤ مذهب الإمام البخاری

مولانا کی ان عربی کتب کو ہندوستان کا ایک ادارہ جس کا نام "إدارة البحوث الإسلامية والدعوة والإفتاء" (جامعہ سلفیہ ہند) بھی شائع کرنے کا اہتمام کر رہی ہے، نیز حکومت سعودی عرب کی طرف سے بھی مولانا کی بعض کتابوں کے عربی تراجم مفت تقسیم کیے جاتے ہیں، اس طرح عرب دنیا بھی حضرت سلفی رحمہ اللہ کے ملفوظات سے سیراب ہو رہی ہے۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی عادات وخصائل:

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد گوجرانوالہ کے موقر جریدہ "قومی دلیر" کی ایک خصوصی اشاعت مورخہ یکم مارچ ۶۸ء میں مولانا کے صاحبزادے جناب محمود بن اسماعیل نے "آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند" کے عنوان سے آپ کی عادات وخصائل اور محاسن اخلاق پر روشنی ڈالی تھی، حضرت کی قناعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ابتدا میں حضرت کی تنخواہ صرف پچیس روپے تھی، مگر کبھی تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ نہیں فرمایا، بارہا زیادہ تنخواہ پر ملک وبیرون ملک سے پیشکش ہوئی، تو فرماتے کہ منڈی

یا مارکیٹ میں نہیں آیا ہوں کہ میری قیمت مقرر کی جائے۔

علم کے ساتھ حلم کا جوہر بھی حضرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، ایک دفعہ مولانا حاجیوں کو رخصت کرنے کے لیے لاہور تشریف لے گئے، نماز کا وقت ہو گیا، سٹیشن کے بالا میدان میں جماعت کرانے لگے، تو ایک بوڑھے نے کہا کہ میری نماز آپ کے پیچھے نہیں ہوتی، آپ نے رومال اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور پیچھے ہٹ گئے اور کہا بابا جی آپ جماعت کرائیں، میری نماز آپ کے پیچھے ہو جاتی ہے، وہ بوڑھا شرمندہ ہو گیا اور معافی مانگی اور پھر اصرار کر کے حضرت کی اقتدا میں جماعت ادا کی۔ ہم عصر علماء سے آپ کا برتاؤ مثالی تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص آپ کے پاس بیٹھے اور اثر قبول نہ کرے، دوران جیل آپ کی معیت مولانا ابو الحسنات کو نصیب ہوئی، آپ مسجد وزیر خان کے امام اور پکے بریلوی تھے اور اہل حدیث کو کافر تک کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے، مگر جب والد گرامی سے ملاقات ہوئی، تو ایسے گرویدہ ہوئے کہ کئی دفعہ گوجرانوالہ میں ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

حضرت میں بعض جواہر ایسے تھے، جو ہم عصر علماء میں نہ تھے، مردم شناس ایسے تھے کہ دیکھتے ہی تہ تک پہنچ جاتے تھے، خود پسندی اور نخوت سے نفرت تھی۔

اخلاص اور بے مثال مستقل مزاجی:

گوجرانوالہ تشریف لانے پر اہل حدیث ہونے کی پاداش میں ہر طرح کی مخالفت کا سابقہ پیش آیا اور بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آپ نے استقلال، قناعت، جرأت اور اخلاص سے پوری نصف صدی گزار کر علماء کے سامنے ایک درخشاں مثال قائم کی، آپ کی برکات اور فیض کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ جب حضرت گوجرانوالہ تشریف لائے تھے، تو شہر میں صرف ایک مسجد تھی اور سات آدمیوں کے وجود کا نام جماعت اہل حدیث تھا، لیکن اپنی وفات سے چند دن پیشتر ۵۴ ویں

مسجد کا سنگ بنیاد بدست خود رکھا اور آبادی کے تناسب سے تو جماعت شاید پورے پاکستان میں بے مثال ہو۔

بہر حال اگر اختصار کے ساتھ آپ کے محاسن پر نظر ڈالی جائے، تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مولانا کو اپنے زمانے کے اکثر معاصرین پر برتری حاصل تھی، مگر اس کے باوجود وہ درویشی، سادگی، فروتنی اور تواضع کا مرقع تھے، قدرت نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کے حامل تھے، ان کا آئینہ قلب صاف تھا، مومنانہ زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہوئے، گمنامی کی صفوں سے اٹھے اور اپنی سعی و جستجو، عمل پیہم، خلوص، مسلسل محنت، لیاقت و قابلیت اور علمی لگن سے شہرت کے آسمان تک گئے۔

بیماری اور وفات:

حضرت مولانا کے فرزند ارجمند پروفیسر محمد صاحب رقمطراز ہیں کہ والد گرامی چند سالوں سے اعصابی مریض چلے آرہے تھے، تاہم حالت کچھ ایسی تشویشناک نہ تھی، پس ۲۵/ ذوالقعدہ ۱۳۸۷ھ بمطابق ۲۰/ فروری ۱۹۶۸ء منگل کے دن نماز عصر کے بعد یکا یک طبیعت بگڑی اور راہ گزر عالم جاوداں ہوئے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون!

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۲۵ ذیقعدہ کو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وفات ہوئی تھی۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک سوانحی مکتوب:

مرکز اسلامی لائبریری نور پور متصل بہاولپور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ سے تعلق رکھنے والے پانچ سو مستند اکابر علماء کے سوانح حیات بنام ''تذکرہ علمائے ربانیین'' مرتب کر رہی تھی، اس سلسلے میں مولانا محمد رشید احمد صاحب نے جو اس لائبریری کے ناظم تھے، انھوں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے بھی رابطہ کیا، چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ۸۔۹۔۶۷ کو رشید صاحب کے نام ایک سوانحی مکتوب

ارسال کیا، ذیل میں وہ مکتوب گرامی پیش کیا جا رہا ہے:

''جناب علماء کا تعارف کرانا چاہتے ہیں اور میں شائد ان میں سے نہیں ہوں،

یہاں تو ''چار پائے و کتابے چند'' کی صورت پر عبداللہ بن سہل کا ارشاد ہے:

''من لم یعمل فلیس بعالم''

البتہ ان لوگوں سے محبت ہے، جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے عمل کی توفیق مرحمت فرمائی۔

أحب الصالحین ولست منهم
لعل الله یرزقني صلاحاً

تعمیل ارشاد میں چند حروف لکھ رہا ہوں، مسقط رأس ڈھونیکی از مضافات وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ ہے، ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں پائی، وزیر آباد میں حضرت الامام حافظ عبدالمنان صاحب محدث نے نصرت العلوم کے نام سے مدرسہ جاری فرمایا۔ صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولوی عمر الدین صاحب مرحوم سے پڑھیں، جو اسی مدرسہ میں پڑھاتے تھے، نحو کی اوپر کی کتابیں ابن عقیل، شرح جامی، الفیہ، آجرومیہ حضرت حافظ صاحب سے پڑھیں، حدیث اول تا صحیحین حضرت حافظ صاحب سے پڑھی، حضرت حافظ صاحب مرحوم سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کے اکابر تلامذہ میں سے تھے، شیخ حسین بن محسن انصاری رحمہ اللہ سے بھی آپ کو اجازت حدیث تھی، مولانا عبدالحق بنارسی رحمہ اللہ شاگرد امام شوکانی رحمہ اللہ سے بھی شرف تلمذ تھا، تفسیر بیضاوی حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے پڑھی، ادب اور معقولات کی کتابیں مولانا محمد حسن (امرتسری) کے مدرسہ میں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، شرح وقایہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب سے پڑھی، مطول، مختصر المعانی، ہدایہ اولین و آخرین علامہ محمد حسین ہزاروی سے پڑھی، جو مدرسہ غزنویہ امرتسر میں پڑھاتے تھے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے حسب حکم مناظرات کی طرف توجہ رہی، قادیانی، عیسائی اور چکڑالوی حضرات سے کئی جگہ گفتگو ہوئی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مرض سے نجات دے دی، رسمی مناظرات بالکل ترک کر دیئے، اب طبیعت کی ان مناظرات کے ساتھ قطعاً موزونیت نہیں اور اس راہ کو باعث تسکین سمجھتا ہوں۔

۱۹۲۱ء سے گوجرانوالہ جامع مسجد میں مقیم ہوں، درس و تدریس کا مشغلہ مسلسل چل رہا ہے، مدرسہ محمدیہ کے نام سے جاری ہے، اس کے ساتھ شعبہ حفظ و تجوید بھی ہے، اس وقت مدرسین کی تعداد تقریباً ۹ ہے، حجیت حدیث کے متعلق چند رسائل لکھے ہیں:

1. حدیث کی تشریعی اہمیت
2. جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث
3. مقام حدیث قرآن کی روشنی میں
4. نیز تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی وغیرہ،

ایڈیٹری بالکل نہیں کی، خطابت کا سلسلہ گوجرانوالہ جامع اہل حدیث میں مسلسل جاری ہے، جمعیت کی تاسیس ۱۹۴۸ء میں ہوئی، اس وقت سے اس کے ساتھ تعلق ہے، اب بھی " کبرني موت الكبراء " کے مصداق تعلق قائم ہے، دعا ہے کہ اسی راہ سے اللہ دین کی خدمت اور کتاب وسنت کی اشاعت کا موقع بہم پہنچا دے اور انجام بخیر ہو۔ والسلام

فقط

محمد اسماعیل کان اللہ لہ [1]

حضرت سلفی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کے تلمیذ مکرم مولانا محمد خالد

---

[1] ماخوذ از "مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ" ترتیب محترمہ سعدیہ ارشد صاحبہ

گرجاکھی رحمہ اللہ نے حضرت سلفی رحمہ اللہ کے سوانح حیات کے بارے ایک کتابچہ شائع کیا تھا، جسے بعض اضافی معلومات کی بنا پر ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

حضرت استاذی المکرم مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمہ اللہ دوسرے اکثر علماء کی طرح قدیم ہندوستان کے باشندوں میں سے تھے، مولانا حکیم عبدالمجید صاحب فرماتے تھے کہ قریباً دس بارہ پشت پہلے ہمارے آباء و اجداد مسلمان ہوئے تھے، نیز فرماتے تھے کہ میری پھوپھی صاحبہ بتایا کرتی تھیں کہ ہم راجپوت گھوت سے تعلق رکھتے ہیں، اغلباً جنجوعہ راجپوت تھے، ہمارے والد مرحوم کی بے وقت اور اچانک موت سے انتظام درہم برہم ہوگیا اور ایک سال میں ہمارے گھر میں تین دفعہ چوری ہوئی، اس میں خصوصاً کتابوں اور کاغذات کی چوری سے بہت نقصان ہوا۔

ہمارے نواح میں ایک پیر صاحب تھے، چونکہ پریس کا زمانہ نہیں تھا، کتابیں قلمی ہوتی تھیں، پیر صاحب نے کوئی کتاب مانگی، نہ دینے پر انھوں نے چوری کرائی، جس میں خصوصاً کتابیں اور کاغذات ہی چوری ہوئے، یہاں تک کہ پرانے مسودے خچروں پر لاد کر لے جائے گئے۔

حکیم عبدالمجید صاحب کی روایت سے ہی خاندان کا جو پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ کے پردادا محکم دین صاحب تھے، قریباً دس پشت سے علمی خاندان چلا آرہا تھا، جن میں سے یہ بزرگ بھی تھے، کتابت اور حکمت ورثہ میں آرہی تھی، سابقہ مقام سوہدرہ میں تھا، وہاں پر مغل حکومت کی طرف سے مدار المہام کے عہدہ پر فائز تھے، حوادثات زمانہ اور حکومتوں کے انقلابات نے ہمیں کولو تارڑ پہنچا دیا، وہاں پر بھی ایک حادثہ کی وجہ سے نکل کر حضرت کیلیانوالہ آگئے، پھر رتہ تنی میں رہے، وہاں سے ڈھونیکے آگئے، ان لوگوں نے ان کی بہت قدر کی اور دو کنویں مع

اراضی ان کو تاحین حیات دے دیے۔

محکم دین کے لڑکے عبداللہ تھے، یعنی مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ کے دادا، عبداللہ جوانی میں ہی فوت ہو گئے، جس کا محکم دین صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور قریباً گھر سے نکل کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی اور زیادہ عرصہ بھروکی میں رہے۔

مولانا اسماعیل سلفی صاحب رحمہ اللہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے تھے، جبکہ ان کے چچیرے بھائی حکیم عبدالمجید صاحب آٹھ بھائی بہن تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ کے والد مولانا ابراہیم صاحب بہت صالح اور عابد و زاہد تھے، کتابت میں ماہر تھے، مولانا وحید الزمان صاحب کا مترجم قرآن مجید اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمہ اللہ کی تصنیف تحفۃ الاحوذی انھیں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے اور آج تک اسی کتاب کی فوٹو سے کتاب ہمارے ہاتھوں میں چل رہی ہے، جو کہ اب متعدد مرتبہ ہندوستان، بیروت اور پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب رحمہ اللہ راقم الحروف (خالد گرجاکھی) کے استاد بھی ہیں، میں نے ان سے فارسی کتب کریما، نام حق، شیخ عطار، گلستان اور غالباً بوستان کے کچھ سبق بھی پڑھے تھے، غالباً یہ ۳۴۔۱۹۳۳ء کے واقعات ہیں۔

حکیم عبدالمجید صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا ابراہیم صاحب کے ہاں اولاد نہیں تھی، اسی وجہ سے اکثر وہ گھر سے باہر وزیر آباد مدرسہ میں حافظ عبدالمنان صاحب استاذ پنجاب کے پاس ہی رہا کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنی خواہش اولاد کے لیے حضرت حافظ صاحب سے دعا کروائی، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں لڑکا عنایت فرمایا، مولانا اسماعیل صاحب کا نام بھی حضرت حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ ہی نے رکھا اور وعدہ لیا کہ اس کو دین کے لیے وقف رکھیں، یہ اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔

مولانا کا پہلا مکتب ان کے باپ تھے، ابتدائی تعلیم کے بعد انھیں وزیر آباد حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ کے مدرسہ میں داخل کرایا گیا اور ۱۹۱۶ء میں حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کی رحلت تک وہیں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کچھ مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے پاس امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اس کے بعد سیالکوٹ حضرت مولانا ابراہیم صاحب میر رحمہ اللہ کے پاس تعلیم کے لیے چلے گئے۔

گوجرانوالہ کی جامع مسجد اہلحدیث چوک نیائیں کی بنیاد قریباً ۱۸۷۶ء میں رکھی گئی، جس کے پہلے خطیب مولانا علاؤ الدین صاحب مقرر ہوئے، ۱۹۰۸ء تک گوجرانوالہ میں صرف تین اہلحدیث کی مساجد تھیں، لیکن جمعہ صرف چوک نیائیں والی مسجد میں ہی ہوتا تھا، ۱۹۱۴ء میں باقاعدہ انجمن اہلحدیث بنائی گئی، جس کے محرک حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب تھے، چنانچہ اسی انجمن کے تحت پہلا جلسہ بابو عطا محمد صاحب کی کوٹھی پر ۱۹۱۵ء میں ہوا، جس میں مولوی ثناء اللہ صاحب، حافظ عبدالمنان صاحب رحمہ اللہ، مولانا محمد علی صاحب بوپڑوی، مولانا ابراہیم صاحب رحمہ اللہ سیالکوٹی، مولانا عبدالعزیز بن مولانا غلام رسول صاحب رحمہ اللہ قلعہ میاں سنگھ والے بھی تشریف لائے۔

۱۹۲۰ء میں انجمن نے پاس کیا کہ وہاں پر ایک مدرسہ قائم کیا جائے، مولانا ابراہیم صاحب میر رحمہ اللہ سیالکوٹی سے مدرس طلب کیا، تو انھوں نے مولانا اسماعیل سلفی کو خود لا کر مقرر کیا گئے۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب سلفی رحمہ اللہ ۱۹۲۱ء میں مسجد اہلحدیث میں تدریس پر مقرر ہوئے اور قریباً چھ ماہ بعد مولانا علاؤ الدین صاحب وفات فرما گئے، تو انجمن نے خطابت و امامت بھی ان کے سپرد کر دی۔

مولانا نے جس خوبی سے اس خدمت کو سرانجام دیا، اسے لوگ جانتے ہیں کہ

مولانا کی طبیعت نہایت سادہ اور خدمت گزار تھی، اکثر صبح کی نماز سے پہلے خود اپنے ہاتھ سے ویل پمپ سے وضو کے لیے پانی بھرتے، مسجد کا کام ایک جذبہ سے کیا اور طبیعت ایسی رسا تھی کہ جو طالب علم صرف ایک سال تعلیم حاصل کرتا، وہ ضرور اہلحدیث ہو جاتا، حالانکہ آپ نے کبھی کسی کو ترغیب نہیں دی، لیکن آپ کی طبیعت سے متاثر ہو کر مسلک اہلحدیث اختیار کر لیتے۔

طبیعت میں لالچ نہیں تھا، بلکہ کام کرنے کا جذبہ تھا اور اپنے طلبا کو کہا کرتے تھے کہ بیٹا روٹی کے پیچھے نہ جانا، بلکہ جہاں اللہ تعالیٰ کام کرنے پر لگا دے، وہاں سے اٹھنا نہیں، دوسری جگہ خواہ کتنے زیادہ پیسے ملیں، جگہ چھوڑنی نہیں، کیونکہ جو کھیتی لگائی جاتی ہے، اس کی رکھوالی نہ کی جائے، تو پھل نہیں دیتی۔

جب مدینہ یونیورسٹی بنی تو سعودی حکومت نے پیش کش کی کہ آپ وہاں تعلیم پر مقرر ہو جائیں اور تین ہزار روپیہ تنخواہ دینے کو تیار تھے، مولانا نے فرمایا میں اپنے بڑھاپے میں بکاؤ مال نہیں بننا چاہتا، حالانکہ اس وقت مولانا کی کی تنخواہ صرف ۱۷۵ روپے تھی۔

غالباً ۱۹۶۰ء کی بات ہے، آپ نے مجھے کہا مولوی خالد چلو بھائی سیالکوٹ چلیں، میں ساتھ چل پڑا، بس کا ٹکٹ لینے لگے، تو میں نے کہا حضرت میں لیتا ہوں، انھوں نے کہا نہیں میں لیتا ہوں، میں نے کہا اگر جمعیت کے خرچ پر جانا ہے، تو آپ لے لیں، ورنہ میں لیتا ہوں، فرمانے لگے مولوی خالد تم نے کیا کہا؟ آج کل میری تنخواہ سوا دو صد روپیہ ہے، قریباً ستر پچھتر روپے میرے سفر خرچ میں ماہوار صرف ہو جاتے ہیں اور قریباً اتنے ہی روپے ڈاک پر خرچ ہو جاتے ہیں اور تنخواہ کی باقی رقم مہمانوں پر خرچ ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بچوں کو معقول کاروبار دیا ہوا ہے، گھر میں مجھے خرچ نہیں دینا ہوتا اور تنخواہ ساری انہی کاموں پر لگ جاتی ہے۔

مولانا نے تحریک خلافت سے لے کر تحریک آزادی تک تمام تحریکوں میں کام کیا اور متعدد بار جیل گئے اور تحریک ختم نبوت کے مرکزی مجلس عاملہ کے [illegible] تھے

مولانا نے پہلا حج ۱۹۲۶ء میں کیا، کیونکہ سعودی حکمران شاہ عبدالعزیز ۱۹۲۵ء میں حجاز پر قابض ہوئے اور ۱۹۲۶ء میں علماء اہلحدیث انھیں مبارک باد وغیرہ کے لیے گئے، خصوصاً مولانا اسماعیل صاحب غزنوی کی تحریک پر بہت سے اہلحدیث حج کو گئے، ہمارے والد صاحب مولانا نور حسین صاحب رحمہ اللہ گھرجاکھی نے بھی پہلا حج ۱۹۲۶ء میں ہی کیا۔

مولانا صاحب تعلیم میں اتنے مشغول رہتے کہ میں نے ایک مرتبہ کہا مولانا اب دوبارہ حج کو جانے کا ارادہ نہیں؟ فرمایا حج ایک ہی مرتبہ فرض ہے، اب اس کے علاوہ اور دینی فرائض بہت ہیں، بہر حال دوسرا حج پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۴۹ء میں کیا۔

پاکستان بننے سے پہلے اہلحدیث اجتماعی طور پر ''اہلحدیث کانفرنس'' کے نام سے کام کرتے رہے، جس میں اکثر طور پر سالانہ کانفرنس اور باہمی مشاورت وغیرہ سے آئندہ سال تک کے لیے کچھ پروگرام طے کیے جاتے۔

پاکستان بن جانے کے بعد خود حضرت صاحب کو جماعتی نظم کا خیال پیدا ہوا، تو حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کو ملے، دونوں نے مل کر جمعیت اہلحدیث کو منظم کرنے کی کوشش کی، چنانچہ ۱۹۴۹ء میں ہی ایک باقاعدہ باڈی بنا دی، جس کے پہلے صدر (بعد میں امیر کے لفظ سے تبدیل کر دیا گیا) حضرت مولانا داود صاحب غزنوی رحمہ اللہ اور ناظم اعلیٰ مولانا اسماعیل صاحب رحمہ اللہ سلفی مقرر ہوئے۔

مولانا ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک ناظم اعلیٰ رہے اور مولانا داود صاحب کے فوت ہونے پر ۱۹۶۲ء سے تاحیات ۱۹۶۸ء تک امیر کے عہدہ پر فائز رہے اور ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کے تیسرے پہر فوت ہوئے۔

علمی مشاغل:

مولانا صاحب جب سے گوجرانوالہ تشریف لائے، اس وقت سے ہی تعلیم و تدریس میں مشغول رہے اور پاکستان بن جانے کے بعد تک قریباً ۱۹۶۲ء تک چالیس سال متواتر تعلیم دیتے رہے، مولانا کے دستِ راست حضرت حافظ محمد صاحب رحمہ اللہ گوندلوی بھی گوندلانوالہ سے آکر روزانہ تدریس دیتے رہے اور دراصل یہ دو ہی مدرس تھے، ان کے علاوہ بعض اوقات کوئی نہ کوئی اور مدرس بھی رکھ لیتے تھے، میرے دورانِ تعلیم ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۱ء حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب کھدووالوی جو پاکستان میں بہاول نگر آکر فوت ہوئے، مولانا عبدالرحیم صاحب، مولانا ابراہیم صاحب گوندلوی، مولانا محمد عبداللہ صاحب حال مہتمم جامعہ محمدیہ، مولانا عبدالحمید صاحب حال صدر مدرس جامعہ محمدیہ بھی تعلیم پر مقرر رہے، جو کہ جامع مسجد نیائیں میں ہی زیر اہتمام حضرت سلفی صاحب رحمہ اللہ کے کام کرتے رہے۔

اس کے علاوہ آپ قلمی کام بھی کرتے رہے، تحریر میں غضب کا زور اور نہایت شیریں طنز فرماتے، آپ کی کتاب تحریک "آزادیٔ فکر" دراصل آپ کے مضامین کا ہی مجموعہ ہے، زبان میں اللہ تعالیٰ نے قوت بیان کا وافر حصہ نصیب فرمایا تھا، خطبہ میں جو حالات پر تبصرہ فرماتے، دوسرے دن اس کی اصلاح ہو چکی ہوتی، حکومت پر تنقید فرماتے، لیکن نہایت جچے تلے الفاظ میں، جن پر سخت تنقید کے باوجود گرفت نہ ہو سکتی تھی۔

ساری زندگی ہر کسی کی خیر خواہی کو مقصد زندگی بنا رکھا تھا، بلکہ خیر خواہی والی بات منہ پر کرنے سے بھی ہچکچاتے نہ تھے، ایک دفعہ گکھڑ کے نارمل سکول سے کچھ علماء آئے، تعارف کروانے والے نے ان کا تعارف کروایا کہ بہت پرہیز گار نمازی آدمی ہیں، آپ نے کہا یہ کوئی ان کی تعریف نہیں ہے، نماز تو ہمارا علماء کا پیشہ ہے، اگر ہم لوگ نماز نہ پڑھیں، تو دنیا والے ہی ہمیں جینے نہ دیں، علماء کی اچھائی کا معیار یہ ہوتا ہے کہ لین دین کے معاملات میں کھرا ہو اور دنیا دار جو لوگ دکانیں کرتے

ہیں، وہ اکثر لین دین کے معاملات میں کھرے ہوتے ہیں، ان کی اچھائی کا معیار نماز ہوتی ہے۔

ایک دفعہ میں نے کچھ تبلیغی اشتہار چھپوائے، اگرچہ ان میں کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن چونکہ مرکز اور صوبہ پنجاب دونوں میں شیعہ منسڑ تھے، انھوں نے کھینچا تانی شروع کی، مولانا صاحب رحمہ اللہ نے مجھے بلایا اور فرمایا اگر کوئی پوچھے تو یہ کاروائی میرے ذمہ لگا دینا، میں نے کہا، حضرت یہ تو نہیں ہو سکتا، البتہ آپ میری ثابت قدمی کے لیے دعا فرمائیں، پھر انھوں نے مجھے کچھ دفاعی تدابیر ارشاد فرمائیں۔

استذی المکرّم حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ پر قتل کا مقدمہ بن گیا، تو مولانا صاحب شہر کے چیدہ چیدہ حضرات سے روپے اکٹھے کر کے کیس کی خود پیروی کرتے رہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کر دیا۔

۱۹۴۷ء کی پارٹیشن پر مقامی لوگوں پر اچھا خاصہ پریشانی کا دور آیا، مولانا صاحب رحمہ اللہ ایسے افراد کے پاس خود جا کر تسلی دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ حوادثات سے گھبرانا نہیں چاہیے، یہ بھی زندگی کے تجربات میں سے ہیں۔

عام حالات میں بھی اگر کبھی دو چار دن گزر جائیں، تو مجھ جیسے تہی دامن کے پاس بھی خود چل کر آجاتے اور فرماتے برخوردار ملتے رہا کرو، نہ ملنے سے طبیعت اُداس ہو جاتی ہے۔

خود ستائی سے شدید متنفر تھے، ایک دفعہ کانفرنس میں فوٹو گرافر آگئے، تو انھوں نے کیمرہ والوں کی طرف چہرہ پر ہاتھ رکھ لیے اور فرمایا میں اسے ناجائز سمجھتا ہوں، لیکن کیمرہ والے بھی لوگ ایسے ہوئے ہیں کہ ان کی زندگی کی متعدد تصاویر لے ہی لیں۔

دین و دانش کا مرقع آدمی کے روپ میں
اس طرح بن کر اٹھا تھا پاسبانی کے لیے

جس طرح سے گلستان میں طائرانِ خوشنما
چہچہاتے ہیں صبا کی ہمزبانی کے لیے

پاکستان بن جانے کے بعد اخبار الاعتصام جو کہ مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے جاری فرمایا تھا، ۱۹۴۹ء میں اسے جماعتی تحویل میں دے دیا گیا، جس میں وقتاً فوقتاً مضامین جاری فرماتے رہے، باوجود عالم دین ہونے کے طبیعت میں زہد و تقویٰ تھا اور شب بیداری عادت ثانیہ بن چکی تھی، اکثر دن کو بھی ذکر واذکار میں مشغول رہتے، یا پھر اپنے دفتر مسجد چوک نیائیں میں اپنا وقت تحریر پر صَرف فرماتے تھے۔

آخری وقت غالباً ۱۹۶۷ء میں فالج کا حملہ ہوا تھا، جس کی وجہ سے طبیعت پر کمزوری کا اثر تھا، لیکن چند دنوں میں ہی افاقہ ہوا اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے، بالآخر دوسرا حملہ فالج کا ہی ہوا، ۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو چائے نوش فرمانے لگے تھے کہ حملہ ہوا، ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی اور چند لمحوں میں ہی عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

رات بھر بارش کی وجہ سے جنازہ خانہ کی گراونڈ میں پانی ہونے کی وجہ سے جنازہ سٹیڈیم میں لے جایا گیا، اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی یہی تھی، کیونکہ جنازہ میں موسم کی خرابی کے باوجود اتنے کثیر افراد نے شمولیت کی کہ دیکھنے والے حیران تھے کہ اتنے آدمی کہاں سے آ گئے، سٹیڈیم میں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی، بلکہ جی ٹی روڈ اور سیالکوٹ روڈ دونوں بند ہو چکی تھیں، جنازہ گھر سے روانہ ہوا اور ابھی تک لوگ گھر سے چل رہے تھے، جبکہ جنازہ سٹیڈیم میں پہنچ چکا تھا، قریباً میل لمبا جنازہ تھا، ایک آدمی بازار دیگاں والا میں اپنی دکان کے سامنے کھڑا جنازہ دیکھ رہا تھا، کہنے لگا ''جینا بھی ان لوگوں کا اور مرنا بھی ان لوگوں کا، ہم تو نکمی موت ہی مرتے ہیں!''

ایک نصیحت آمیز مکتوب:

حضرت مولانا سلفی رحمہ اللہ کو ان کے ایک تلمیذ نے خط ارسال کیا، جس کا حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل جواب لکھا، مکتوب الیہ نے حضرت سلفی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ خط الاعتصام ۲۳ اگست ۱۹۶۸ء میں افادۂ عام کے نقطہ نظر سے شائع کرایا، جسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم — گوجرانوالہ۔ ۶۶۔۸۔۱۱

محترم مولانا صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کئی دن ہوئے خط ملا تھا، مصروفیت اور علالت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا، تبلیغ میں الفاظ کی شدت اور فتویٰ بازی سے پرہیز کریں، اس سے نفرت بڑھتی ہے، ﴿وجادلهم بالتي هي احسن﴾ پر عمل کریں۔ لوگوں سے ذاتی تعلقات بڑھائیں، غم وخوشی میں ان سے مناسب ربط قائم رکھیں، یہ بے حد مؤثر چیز ہے۔

اخراجات محدود رکھیں اور قناعت سے کام لیں، قرض اور سوال دونوں میں آبرو کو خطرہ ہے، اکثر علماء اسی وجہ سے بدنام ہوتے ہیں، اپنے اخراجات کا کنٹرول کرنے سے ان دونوں چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

منتظمین سے تعاون فرمائیں، جماعت میں پارٹی بازی نہ ہونے پائے، اس کا پورا پورا خیال رکھیں، بعض لوگ برائے اختلاف کے عادی ہیں، ان سے اغماض کرنا چاہیے، نماز باجماعت اور رات کو بیداری کی عادت ڈالیں، اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل گوجرانولہ [1]

---

[1] الاعتصام ۲۳ اگست ۱۹۶۸ء

امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک

یہ رسالہ در اصل ایک مقالہ تھا، جو حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ادارہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، انڈیا کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ ''الہدی'' (مارچ ۱۹۵۶ء، جلد: ۸، شمارہ: ۱۱، ص: ۷۔۲۰) کے ''بخاری نمبر'' کے لیے تحریر کیا تھا۔

بعد ازیں یہ مقالہ ۱۹۵۶ء میں شعبہ نشر و اشاعت جمعیت طلباء اہلحدیث مغربی پاکستان کے زیر اہتمام قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری رحمہ اللہ کے پیش لفظ کے ساتھ چوالیس صفحات میں کتابی شکل میں طبع ہوا۔

امام بخاری کا مسلک

اسلام ایک زندہ اور متحرک مذہب ہے، وہ ہر ایک تعبیر کی اجازت دیتا ہے، جو اس کے اصول اور اساسی تعلیمات سے متصادم نہ ہو۔ احناف، شوافع، موالک، حنابلہ اور اہل حدیث یہ اسلامی تعلیمات کی مختلف تعبیرات ہیں، ان کے علاوہ اور ائمہ تھے، جن کی تعبیرات سنت ہی کے ماحول میں تھیں، ان کے مذاہب آج بھی ائمہ سنت اور فقہاء حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔

فقہی فروع میں جو بھی تعبیرات ان بزرگوں نے کی ہیں اور جس قسم کے قوانین ملت کو دیئے ہیں، اسلام ایسے زندہ اور متحرک مذہب میں ان کے لیے گنجائش موجود ہے۔ ان مسائل پر ایک دوسرے کی تکفیر یا تفسیق نامناسب مشغلہ ہے اور دماغی توازن کی خرابی کا اثر یا پھر اصول ادلہ سے جہالت کا نتیجہ، البتہ ترجیح اور اختیار اہل علم کا فرض ہے۔

مسلک اہل حدیث:

مسلک اہل حدیث ان تمام مسلم اور سنی المسلک جماعتوں میں سب سے زیادہ وسیع ہے، جس میں مصالح دینیہ کی سب سے زیادہ مراعات رکھی گئی ہیں، کتاب و سنت کی موجودگی میں کسی خاص آدمی کے طریق فکر کا لزوم اس میں یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، ہر عالم کو، مجتہد ہو یا غیر مجتہد، حق پہنچتا ہے کہ کتاب و سنت کو پڑھے اور سمجھے، ائمہ سنت و صنادیدِ سلف کی روشنی پر چلتے ہوئے کتاب و سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

تاریخ کی روشنی میں:

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، تحریک اہل حدیث محض فروعی مسائل اور فقہی مسالک تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ صفات باری تعالیٰ، جبر و قدر، خروج و تشیع ایسے منازعات میں اس نے اپنے نظریات کو پورے اعتدال سے پیش کیا، جنھیں آج قبول کرنے کے لیے دنیا تیار ہی نہیں بے قرار ہے، مگر معشر اہل حدیث!

تمھیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اصول دیانت کے اس استحکام کے بعد جس قدر وسعت اور ظروف و احوال کی رعایت اس مسلک میں ہے، دوسری جگہ کافی حد تک ناپید ہے۔ اس لئے مجھے عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ مسلک اہل حدیث اسلامی تعلیمات کی صحیح ترین تعبیر ہے اور تحریک اہل حدیث کے داعیوں نے ہر دور میں جس احتیاط سے اپنے فرائض کو سر انجام دیا ہے، دشمن بھی اسے سراہنے پر مجبور ہیں، فتووں میں جس قدر اعتدال ائمہ حدیث نے قائم رکھا، اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے، یہی وہ خوبیاں ہیں، جن کی بناء پر میں مسلک اہل حدیث کو ترجیح دیتا ہوں اور پورے ادب کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے اہل حدیث احباب خصوصاً نوجوان علماء سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے موقف کو پہچانیں، اپنے ماضی کی تاریخ اور اپنے بزرگوں کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔

آج کی ضرورت:

حزبی پابندیوں سے دنیا تنگ آ چکی ہے، اسلامی وسعتیں آپ کی منتظر ہیں، جمود و تقلید کی ظلمتیں آپ سے روشنی کی آرزو مند ہیں۔ یعنی آج آپ کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، جتنی کہ چند سال پہلے آپ کی ضرورت تھی، اسی سنت کی شمع کو ہاتھ میں لے کر ایک اجتماعی تحریک کی حیثیت سے کام کیجیے، نئی اور پرانی تحریکات

میں اصول کے تقاضوں کے مطابق تعاون کیجیے، مگر خدا کے لیے گداگری چھوڑ دیجیے، احساس کمتری اس ماحول میں پھٹکنے نہ پائے، پہلے اپنے مسلک کو سمجھیے، اپنے ماضی اور اسلاف کے مساعی اور کارناموں پر غور کیجیے اور مخلص رفقاء کو ہمراہ لے کر پابرکاب ہوجائیں، اللہ تعالیٰ آپ کا حامی اور ناصر ہے۔

تحریک اہل حدیث کے داعیوں نے صرف فقہی گروہ بندیوں ہی میں اعتدال نہیں پیدا کیا اور نہ صرف اعتزال و تجہم اور جبر و قدر کی پر پیچ زلفوں کو درست کیا، بلکہ اپنے وقت کی سیاسیات پر کڑی نگرانی کی، سیاسین سے اگر لڑنے کا موقع آیا، تو پوری جرأت اور بے جگری سے لڑے اور جب وہ سیدھے ہوگئے، تو پوری دیانت داری سے ان کے ساتھ تعاون کیا، فجزاهم الله عنا وعن المسلمين أحسن الجزاء! اور اس ساری کشمکش میں کوئی ذاتی مقصد پیش نظر نہیں رہا۔

مقدّس قافلہ سالار:

اس تحریک کے مقدس داعی اور قافلہ سالار امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ ہیں، جن کی مایۂ ناز تصنیف ''صحیح بخاری'' اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، یہی ایک پاکیزہ نوشتہ ہے، جس سے ہمیں حضرت امام رحمہ اللہ کے مسلک کا پتہ چلتا ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ مسلک اہل حدیث کی ملّی اصلاحات کا دامن کہاں تک وسیع ہے، ایمان، عبادات، معاملات، معاشیات، اخلاق، محاربات، بین الاقوامی تعلقات، بدعات سے اجتناب کس قدر اہم گوشے اس کی پہنائی میں آگئے ہیں، یہی پروگرام ہے جسے تکمیل تک پہنچانا آج بھی ہر جماعت کا فرض ہے اور ایسے مقاصد میں ان کی تکمیل ہی اسلام کے مقاصد ہیں اور یہی تحریک اہل حدیث کا موقف۔

ایمان:

امام بخاری ایمان کو مرکب سمجھتے ہیں اور اعمال کو جزو ایمان تصور فرماتے ہیں، "تصدیق محض" جسے بعض اوقات "بسیط" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، امام رحمہ اللہ اسے شرعاً خارج از بحث سمجھتے ہیں، شرع نے جس ایمان کو مدار نجات قرار دیا ہے، وہ تصدیق بسیط یا محض تصدیق نہیں، بلکہ اعمال کو اس کا جزو قرار دیا ہے، اس مقام میں کلامی اور منطقی مباحث سے تعرض نہیں فرمایا۔

کیونکہ گفتگو ایمان کے مصالح میں ہے، جسے شرعاً انسان کے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، منطق اور کلام کی اصطلاحات کو علی الاطلاق شرعی کہنا مشکل ہے۔

پھر مناظرانہ طعن و تشنیع سے بچتے ہوئے امام رحمہ اللہ نے تقریباً ۳۹ ذیلی ابواب منعقد فرمائے ہیں[1]، جن میں نصوص سے ثابت فرمایا ہے کہ کس کس عمل کو شارع حکیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جزو ایمان ظاہر فرمایا ہے، یہ بحث کا سادہ طریق ہے، جس میں موشگافیوں سے بچ کر انسان صحیح بات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، خود قرآن حکیم نے توحید، نبوت اور اثباتِ الوہیت میں اس قسم کا سادہ راہ اختیار فرمایا، ائمہ حدیث اور فن حدیث میں قرآن کے اس طریق بحث کا تتبع فرمایا گیا ہے۔

متکلمین کی راہ بھی یقیناً مسئلہ سمجھنے میں معاون ہو سکتی ہے، ممکن ہے بعض طبائع کا رجحان اس طرف ہو، مگر جو سادگی اور اثر اس طریق میں پنہاں ہے، وہاں ناپید ہے اور مخالف کو اس پر ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں، یہی تبلیغ کی صحیح راہ ہے۔ ان ذیلی ابواب سے مقصد یہ ہے کہ یہ تمام اعمال حقیقتاً ایمان کے لیے ضروری ہیں، ان کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوگا۔

---

[1] کتاب الإیمان میں ذکر کردہ ابواب کی تعداد بیالیس (۴۲) ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں پچاس احادیث ذکر کی ہیں، دو ابواب بغیر عنوان و ترجمہ کے ذکر کیے گئے ہیں۔

ایمان کے متعلق چار مذہب:

ایمان اور اعمال کا باہم کیا تعلق ہے؟ اس میں چار نظریات ہیں: (۱) خوارج اور (۲) معتزلہ اعمال کو جزو ایمان سمجھتے ہیں، خوارج ارتکاب کبیرہ کو کفر سمجھتے ہیں، معتزلہ کفر نہیں سمجھتے، (۳) مرجیہ کا خیال ہے کہ اقرار کے بعد عمل کی ضرورت ہی نہیں، (۴) اہل سنت کے نزدیک اعمال ایمان کے لیے ضروری ہیں، ائمہ حدیث اعمال کو جزو ایمان سمجھتے ہیں۔ اس کی وضاحت حضرت امام رحمہ اللہ نے صحیح کے ذیلی ابواب میں فرمائی ہے، اس مقام پر علمی مباحث جو بھی ہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے، لیکن محدثین کے مسلک کی حمایت ظاہر قرآن سے ہوتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يآ أيها الذين آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون ۝ كبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون ﴾ [1]

ایمان والو! جو تم کرتے نہیں کہتے کیوں ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہت ہی رنجش کی بات ہے کہ جو تم کہو تمھارا عمل اس کے مطابق نہ ہو۔

اہل ایمان کو مخاطب فرما کر اعمال کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ بے عمل آدمی کا ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

ایمان آج کے معاشرہ میں:

آج معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم لوگ اہل سنت کہلانے کے باوجود مرجیہ کی طرح زندگی گزار رہے ہیں، اعمال ایمان کا جزو ہوں، تو اس سے فی الواقع دنیا کا انداز ہی بدل جاتا ہے، ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم بے عملی اور بدعملی کو ایمان کا جزو سمجھتے ہیں، یورپین تعلیم نے جس طرح زندگی کا دنیا میں آغاز کیا ہے، اس

[1] سورة الصف: ۲، ۳

میں بے عملی زندگی کا جزو بن کر رہ گئی ہے۔

اس لئے اگر دنیا میں آپ کو کوئی انقلاب بپا کرنا ہے اور ایک فعال قوم کی طرح زندہ رہنا ہے، تو اس کی بنیاد امام بخاری رحمہ اللہ کے نظریے پر رکھنا ہوگی اور امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی نظریہ تھا کہ ایمان عمل کے بغیر ناتمام ہے، توحید اور نبوت کو محض ایک نظریہ کے طور پر تسلیم کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔

امام رحمہ اللہ نے کتاب الایمان کے ذیلی ابواب میں جن چیزوں کو ایمان کے اجزاء میں شمار فرمایا، ایک ایک کو زندگی میں پورا کرے، ائمہ حدیث اور جماعت اہل حدیث نے زندگی کے مختلف ادوار میں اسی فریضہ کی دعوت دی ہے۔ دنیا میں کوئی مسلک بھی محض اقوال ونظریات سے زندہ نہیں رہ سکتا، جب تک پوری زندگی کی تعمیر عملاً اس کے مطابق نہ ہو، اسلامی مقاصد کی یہ صحیح ترین تعبیر ہے، جس سے سیرت بنتی ہے۔

کتاب العلم :

اس ضمن میں امام رحمہ اللہ نے پچاس کے قریب ذیلی ابواب منعقد فرمائے ہیں،[1] ان میں بعض اہم علمی مسائل کا تذکرہ فرمایا، علم کی ضرورت و برتری کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ذکر فرمایا:

"تفقهوا قبل أن تُسوَّدوا"[2]

---

[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب العلم میں ترپن (۵۳) ابواب قائم کیے ہیں، جن میں چھہتر (۷۶) احادیث ذکر کی ہیں۔

[2] صحیح البخاري: کتاب العلم، باب الاغتباط في العلم و الحکمة. امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر بغیر سند کے (مجزوما تعلیقاً به) ذکر کیا ہے، جسے امام ابن ابی شیبہ (۵/ ۲۸٤) امام دارمی (۱/ ۹۱) امام ابوخیثمہ (کتاب العلم: ۸) اور امام بیہقی رحمہ اللہ (شعب الإیمان: ۲/ ۲۵۳) نے موصولاً ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (فتح الباري: ۱/ ۱٦٦) نیز دیکھیں: تغلیق التعلیق (۲/ ۸۱)

سیادت اور برتری تک پہنچنے سے پہلے علم سیکھو۔

جس کا مقصد یہ تھا کہ بعض اوقات سیادت اور بزرگی علم سے مانع ہوتی ہے، اس لیے اسے مانع نہیں ہونا چاہیے۔

مگر ظاہر الفاظ سے ذہن اس طرف بھی منتقل ہوسکتا تھا کہ شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہو کہ بچپن کی عمر ہی علم کے لیے مناسب اور موزوں ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے " وبعد أن تسودوا " (اور بزرگی کے بعد بھی علم سیکھو) کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منشا کو بھی واضح فرمایا کہ اصل منشا یہ ہے کہ انسان بچپن سے بڑھاپے تک علم میں مشغول رہے، نیز فرمایا:

"قد تعلّم أصحاب النبي صلی اللہ علیہ وسلم في كبر سنهم"

" صحابہ نے بڑی عمر میں علم سیکھا۔"

علم کی ضرورت، علم کی خوبی اور اس کا شوق ان ارشادات سے ظاہر ہے، یہی ایسی نعمت ہے، جس میں ریس اور غبطه [1] کی اجازت فرمائی گئی ہے۔

کتابت:

بعض کم فہم حضرات نے ایک مسئلہ اس انداز سے پھیلایا، جس کا مقصد علم دشمنی کے سوا کچھ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو کسی وقت منع فرمایا تھا کہ وہ قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اکٹھا نہ لکھا کریں۔ (مجمع الزوائد: ۱/ ۱۵۰) [2]

---

[1] کسی شخص پر کوئی نعمت دیکھ کر یہ خواہش کرنا کہ مجھے بھی اس جیسی نعمت حاصل ہو جائے اور دوسرے شخص پر بھی یہ نعمت باقی رہے۔ (النهاية لابن الأثير: ۳/ ٦۳۳)

[2] امام ہیثمی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم راوی ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱/ ۱۵۱، رقم الحديث: ٦۷۲) نیز دیکھیں: العلل لأحمد (۲/ ۱۳۵) تاریخ ابن معین: ۱/ ۱۵۱ (۵۲۷)، تهذيب التهذيب (٦/ ۱٦۱) مزید برآں ←

روایت بالمعنی کے طور پر بعض الفاظ سے کتابت حدیث کے متعلق نہی ظاہر ہوتی تھی، لیکن اہل حدیث نے اس نہی کو وقتی سمجھا اور بالآخر اس پر اجماع ہوگیا کہ جس طرح قرآن مجید لکھنا درست ہے، حدیث لکھنا بھی درست ہے۔ ❶

← جن احادیث و آثار میں کتابت حدیث کی ممانعت کا ذکر ہے، ان کا معنی حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے یہی بیان کیا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کو اکٹھا نہ لکھا جائے، کیونکہ ابتداءِ وحی میں التباس و اختلاط کا خدشہ تھا، دیکھیں: تقييد العلم (ص: ٤٩) مقدمه ابن الصلاح (ص: ١٠٣) شرح مسلم للنووي (١/ ٢٤٥)

❶ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ سے کتابتِ حدیث کی اجازت اور ممانعت دونوں کے بارے میں صحیح احادیث مروی ہیں، لیکن اجازت والی احادیث متاخر ہیں، لہٰذا یہ ممانعت والی احادیث کی ناسخ متصور ہوں گی، کیونکہ:

① نبی ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ابو شاہ رضی اللہ عنہ کے مطالبہ پر اپنا خطبہ لکھنے کی اجازت دی تھی۔

② اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو بھی کتابت حدیث کی اجازت دی تھی اور یہ حدیث ممانعت والی حدیث سے بعد کی ہے، کیونکہ وہ اپنی وفات تک احادیث لکھتے رہے، یہاں تک کہ جب انھوں نے وفات پائی، تو ان کا لکھا ہوا ''صادقہ'' نامی صحیفہ ان کے پاس موجود تھا، اگر کتابت حدیث سے ممانعت والی حدیث آخر کی ہوتی، تو عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی وجہ سے اپنی لکھی ہوئی احادیث کو مٹا دیتے، لہٰذا جب انھوں نے احادیث کو مٹایا نہیں، بلکہ باقی رکھا ہے، تو ثابت ہوا کہ کتابت حدیث کی اجازت والی احادیث ممانعت والی احادیث سے متاخر ہیں اور بحمد اللہ یہ بات اچھی طرح واضح ہے۔

③ اور نبی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے مرض وفات میں اپنے فرامین لکھوانے کے لیے قلم اور دوات طلب کی تھی، یہ صرف آپ کی اجازت اور حکم کی وجہ سے آپ کا کلام لکھنے کے لیے تھا۔

④ اور نبی ﷺ نے عمرو بن حزم کو بڑا عظیم الشان صحیفہ لکھ کر دیا تھا، جس میں دیات اور زکاۃ وغیرہ کے احکام مندرج تھے۔ علاوہ ازیں نبی علیہ السلام کے صدقات میں دیگر صحائف بھی معروف ہیں، جیسے صحیفہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور صحیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو انھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا، جس میں دیات وغیرہا کے احکام لکھے ہوئے تھے۔ ←

آج صدیوں کے بعد منکرین حدیث نے ان روایات کو اس طرح ذکر فرمایا کہ حدیث لکھنا ممنوع ہے، احادیث کے جو دفاتر اس وقت موجود ہیں، یہ آنحضرت ﷺ کے منشا کے خلاف ہیں۔ امام رحمہ اللہ نے اس آنے والے فتنہ کا سد باب پہلے ہی کر دیا اور کتابتِ علم اور مناولہ [1] کے ابواب منعقد فرمائے۔

فقہا رحمہم اللہ نے "كتاب القاضي إلى القاضي" [2] کے متعلق عجیب سی شرائط

← نبی ﷺ نے ابتداءِ اسلام میں قرآن کے علاوہ کسی چیز کو لکھنے سے صرف اس لیے منع کیا تھا کہ مبادا قرآن مجید کا کسی دوسری چیز سے اختلاط والتباس پیدا ہو جائے، لیکن جب قرآن مجید کا اچھی طرح علم اور امتیاز پیدا ہوگیا، وہ حفظ وضبط کی گرفت میں آ گیا اور اختلاط کا خطرہ نہ رہا، تو کتابت حدیث کی اجازت دے دی گئی، بعض علما نے کہا ہے کہ کتابت کی صرف ایک مخصوص کیفیت سے منع کیا گیا تھا کہ قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو ایک ہی صحیفے میں اکٹھا تحریر نہ کیا جائے، تاکہ التباس پیدا نہ ہو، پھر بھی سلف میں کچھ لوگ کتابت کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور بعض لوگ کتابت کی رخصت دیتے تھے، لیکن حفظ کرنے کے بعد اس کو مٹا دیتے۔ لیکن اب کتابت کے جواز اور اسے باقی رکھنے پر اتفاق ہو چکا ہے اور اگر کتابت نہ ہوتی، تو آج ہمارے پاس سنت کا بہت تھوڑا حصہ موجود ہوتا۔" (حاشية ابن القيم على سنن أبي داود: ١٠/ ٥٥، مع العون)

علاوہ ازیں کئی دیگر علماء نے بھی کتابتِ حدیث کے جواز اور استحباب پر اجماع نقل کیا ہے، دیکھیں: مقدمه ابن الصلاح (ص: ١٠٣) شرح مسلم للنووي (١/ ٢٤٥) جامع الأصول لابن الأثير (٨/ ٣٣) سير أعلام النبلاء (٣/ ٨٠) فتح الباري (١/ ٢٠٤) عون المعبود (٥/ ٣٤٨) كتاب العلم لأبي خيثمة (ص: ١١٥) تعليق العلامة الألباني رحمه الله

[1] حدیث نبوی کو نقل کرنے اور سیکھنے کے آٹھ طریقے ہیں، جن میں ایک طریقہ "مناولہ" ہے، جس میں استاد اپنے شاگرد کو کتاب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم مجھ سے یہ احادیث بیان اور نقل کر سکتے ہو، دیکھیں: الكفاية (١/ ٣٢٦) الإلماع (ص: ٧٩) مقدمه ابن الصلاح (ص: ٩٤) تدريب الراوي (٢/ ٤٤) فتح المغيث (٢/ ١١٢)

[2] یعنی کوئی قاضی کسی دوسرے علاقے میں رہنے والے شخص کے خلاف فیصلہ لکھ کر اس علاقے ←

عائد فرمائی تھیں، امام نے اس مسئلہ کو اس سادگی سے ذکر فرمایا کہ ایک طرف اہل قرآن کا شبہ اور مغالطہ درست ہوگیا، دوسری طرف کتابت کی حجیت کے متعلق جو مشکلات فقہاء کے پیش نظر ہیں، ان میں اعتدال کی راہ ظاہر فرما دی اور ظاہر فرمایا کہ ان شبہات کا ازالہ قرائن سے ہو سکتا ہے، یہ نزاع قرآن سے حل ہو جاتی ہے، اس کے ساتھ ہی کتابتِ حدیث کے جواز کے متعلق ایک مستند اور صحیح ذخیرہ جمع فرما کر اس بحث کو ہمیشہ کے لیے ختم فرما دیا۔

تحمل حدیث:

خود ائمہ حدیث میں یہ مسئلہ **ما به النزاع** تھا کہ علم کے تحمل اور آغاز کے لیے کون سا وقت زیادہ صحیح اور مناسب ہے؟ امام رحمہ اللہ نے اس کے متعلق دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں:

① ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت، جس میں انھوں نے منیٰ کے میدان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شرکت کی اور اپنی سواری کو صف کے آگے چرنے کے لیے چھوڑ دیا، اس میں وہ ذکر فرماتے ہیں: "وقد ناهزت الاحتلام" میں قریب البلوغ تھا۔[1]

② دوسری روایت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کی ہے، انھوں نے پانچ سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، آپ نے ان کے منہ پر پانی ڈالا۔[2]

← کے قاضی کی طرف نفاذ کے لیے وہ فیصلہ تحریری شکل میں بھیجے۔ ایسی تحریر کی حجیت اور حدودِ اطلاق پر فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں: المبسوط للسرخسي (٦/ ٣٦٤) المغني لابن قدامة (١٠/ ٤٥٨) زاد المستقنع (ص: ٢٣٨)

[1] صحيح البخاري، كتاب العلم، باب متى يصح سماع الصغير، رقم الحديث (٧٦)

[2] مصدر سابق، رقم الحديث (٧٧)

مقصد یہ ہے کہ جب طالب علم استاد کی بات کو جانتا اور سمجھتا ہو، وہی عمر درس و تعلیم کے لیے درست ہے، اصل چیز فہم و بصیرت ہے، سالوں کا شمار اصل مقصود نہیں۔ ❶

عورتوں کی تعلیم:

عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی صراحت فرمائی کہ مشترکہ مجالس میں اگر عورتوں کا مقصد حاصل نہ ہوتا، تو آنحضرت ﷺ اپنے خطبات میں عورتوں کو الگ وقت دیتے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ علم کی نعمت میں مرد اور عورتیں برابر کی حصہ دار ہیں۔ تعلیم کے متعلق کس قدر روایتیں ہیں، جن کی وضاحت ضمنی ابواب میں حضرت امام رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔

مختلف عنوانوں میں امام نے مختلف فیہ مسائل کے متعلق اپنا مسلک واضح فرمایا ہے، ان تمام مسائل میں امام کی نظر ایک مجتہد کی طرح ہے، جو مصالح شرعیہ کی روشنی میں سوچتا ہے اور جو ان کی سمجھ میں آئے، اس کے مطابق فیصلہ دیتے ہیں۔

نماز کے مسائل:

علم کے بعد طہارت کی مختلف اقسام کا ذکر فرما کر نماز کے مسائل شروع کر دیے ہیں، یہ مسائل قریباً پانچ سو ذیلی ابواب میں پھیلا دیے گئے ہیں۔ ان میں تعمیر مساجد اور آداب مسجد کے ابواب بھی ہیں، ان میں وہ اختلافی مسائل بھی ہیں، جنھیں فروعی مسائل سمجھ کر جدید ذہن گھبراتا اور بدکتا ہے۔ آج کی جمہوری سیاست میں اگر کرسیاں چل جائیں، مغلظ گالیاں دی جائیں، جھوٹ بولا جائے، تو جدید تہذیب میں یہ ترقی کے نشانات ہیں، قتل ہوں، پارٹیاں گرفتار ہو کر جیل کی سیر کریں، تہذیب جدید

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیں: الکفایة (ص: ٥٤) الإلماع (ص: ٦٢) مقدمة ابن الصلاح (ص: ٧) فتح المغیث (٢/٣) نیز دیکھیں: دوام حدیث (١/ ١٤٥۔ ١٤٦)

کے چہرے پر اس سے کوئی شکن نہیں پڑتا، اخبارات خریدے جائیں اور تحریری جھوٹ اطراف عالم میں پھیلایا جائے، یہ نئی روشنی کی خوشگوار علامات ہیں۔ دین اور مذہب کی گفتگو ہو، چند آدمی اس میں شریک ہوں، گفتگو میں آواز اونچی ہو جائے، تو چہرے پر تیوریاں شروع ہو جائیں گی، مذہب کو بدنام کیا جائے گا، علم اور علماء پر طعن شروع ہو جائے گا۔

امام رحمہ اللہ کا طریق بحث:

امام رحمہ اللہ نے "الجامع الصحیح" میں ان تمام فروعی مسائل پر قریباً گفتگو فرمائی ہے، اپنے مسلک کے مطابق جو معلومات ضروری تھیں، فراہم کی ہیں، مگر کسی مخالف کا نام تک ذکر نہیں فرمایا، کسی پر طعن کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، بعض اوقات دونوں فریق کے دلائل ذکر فرمائے اور ترجمۃ الباب، میں صحیح مسلک کی طرف رجحان کے قرائن رکھ دیے۔ بعض اوقات تبویب میں مختلف نظریات ذکر فرمائے، اس کے مطابق احادیث ذکر فرما دیں، دونوں امر شرعاً درست تھے، ترجیح کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ مقصد یہ ہے کہ امت پر کشادگی رہے، مثلاً ران کا ڈھانپنا ضروری ہے یا نہیں؟ بعض روایات تعلیقاً ذکر فرمائیں اور بعض مع اسانید بیان فرمائیں اور طویل بحث کا فیصلہ دو حرفوں میں فرمایا:

"حدیث أنس أسند و حدیث جرهد أحوط" (الجامع الصحیح: ۵۳)[1]

حضرت انس کی روایت سند کے لحاظ سے مضبوط ہے اور جرہد کی حدیث "الفخذ عورة" (ران پردہ ہے) میں احتیاط ہے۔

تمام پہلوؤں پر نہایت احتیاط سے گفتگو فرمائی۔

---

[1] صحیح البخاري: کتاب الصلاة، باب ما یذکر في الفخذ (۱/ ۱٤٥)

مناظرات میں اعتدال:

امام رحمہ اللہ نے عام علماء اور جدید تہذیب میں مباحثات کے متعلق ایک نقطہ اعتدال قائم فرمایا ہے۔ اختلافِ فہم انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اس کا ظہور بہر حال ہوگا، اس سے بچنا مشکل ہے، لیکن اس میں تلخی نہیں آنی چاہیے، دوسرے فریق کی امانت پر اسی قدر اعتماد کرے، جس قدر اپنی دیانت پر ہے اور فروع و اصول تمام مختلف فیہ مسائل میں تحقیق کی کوشش کرے، جو مسئلہ حق معلوم ہو جائے، اس پر عمل کرے اور بلا وجہ مخالف کی تکفیر یا تفسیق نہ کرے۔

بعض الناس:

امام نے بعض اہل علم کی فقہیات میں تعارض ذکر فرمایا ہے، " **قال بعض الناس** " کے عنوان سے ان مختلف فقہی جزئیات کا ذکر فرمایا ہے، جو ان مستندات میں مرقوم ہیں، لیکن نہ کسی کا نام نہ ان کی مستندات کا تذکرہ فرمایا۔ بعض حضرات کو امام کی یہ روش از بس ناگوار ہے، ان کا خیال ہے کہ شاید حقارت کے سبب نام نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ مقصد اشخاص اور ان کے ناموں کا تذکرہ نہیں، بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ طریق بحث کی غلطی ظاہر ہو جائے۔ امام نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ کسی مخالف کا نام ذکر کیا جائے۔ ﴿**التی هو فی بیتها**﴾ [1] اور ﴿**امرأة العزیز**﴾ [2] ایسے مبہم ارشادات سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ اس طریق بحث سے علماء کو سبق حاصل کرنا چاہیے، اس سے مسئلہ صاف ہو جاتا ہے اور ناخوشگوار گرمی کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت امام رحمہ اللہ نے "**الجامع الصحیح**" کے علاوہ بعض مسائل پر مختلف اجزاء

---

[1] یوسف: ۲۳

[2] یوسف: ۳۰

بھی لکھے ہیں[1]، اس میں صحیح کی شرائط سے بالا ہوکر مسئلہ پر کسی قدر بسط سے بحث فرمائی ہے، لیکن وہاں بھی دلائل سے تجاوز نہیں ہونے پایا، بحث ذرا پھیل گئی، لیکن کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔

آج کل مذہبی مباحثات میں یہ انداز پیدا کرنا چاہیے، تلخی اور تیزی سے بالکلیہ پرہیز کرنا چاہیے، اس کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ بہترین پیشوا ہیں اور یہ صرف امام بخاری رحمہ اللہ ہی پر بس نہیں، اس دور کے علماء کا عموماً مباحث میں یہی طریق تھا، وہ متعلقاتِ بحث میں وقت ضائع نہیں کرتے، دلائل ذکر کرنے کے بعد فتویٰ بازی پر نہیں اترتے، بلکہ پورا زور دلیل پر ہوتا ہے، یہی بحث کا صحیح طریقہ ہے۔

اختلافی مسائل:

صحیح بخاری تمام اہل سنت میں پڑھی جاتی ہے، ہر ایک شوافع، احناف، حنابلہ اس کتاب سے مستفید ہوتے ہیں اور کتاب میں بعض مروجہ مذاہب کے خلاف دلائل بھی موجود ہیں۔ اوقاتِ نماز، نماز میں طمانیت، صفوں کو ملانا، رفع الیدین، امام کے پیچھے سورہ فاتحہ، آمین بالجہر، بستیوں میں جمعہ، تکبیرات عیدین، جمعہ میں عورتوں کی حاضری، اس قسم کے سینکڑوں اختلافی مسائل صحیح بخاری میں موجود ہیں، اہل علم ان کو پڑھتے ہیں، مخالفت بھی کرتے ہیں، مگر اس سے نہ تکلیف ہوتی ہے نہ رنج، حالانکہ ان مسائل پر گفتگو کرنے سے ہمارے علماء بھی جھجکتے ہیں، ان مسائل کی اشاعت کو فرقہ پروری کی دلیل سمجھتے ہیں، لیکن حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں چھوٹے بڑے مسائل کا تذکرہ فرمایا، بلکہ اصل یہ ہے کہ لب و لہجہ کو درست رکھنا چاہیے اور برداشت کی عادت سیکھنا چاہیے، اپنی کہہ سکے، مخالف کی سن سکے، مسائل میں تحقیق کی یہی راہ ہے، نہ ان مسائل میں غلو ہونا چاہیے، نہ ان مسائل پر گفتگو

[1] مثلاً: جزء رفع الیدین، جزء القراءۃ خلف الإمام

کرنے سے گھبرانا چاہیے۔

جو لوگ زندگی کے ہر گوشے میں دین کو سرسبز اور قائم دیکھنا چاہتے ہیں اور اقامت دین کا وظیفہ زندگی سمجھتے ہیں، معلوم نہیں ان سنتوں کے لیے ان کے ہاں بھی کوئی گوشہ ہے یا نہیں؟ امام بخاری رحمہ اللہ اور ان کے اُتباع یعنی اعیان اہلحدیث کے نزدیک تو زندگی کے ہر زاویہ میں دین کے پائے جانے کا یہی مطلب ہے کہ وہ اصول، فروع، فرائض، نوافل، سنن اور واجبات سب کو دین کا جزو سمجھتے ہیں اور حسبِ مرتبہ اور حسبِ ضرورت ان مسائل کی اشاعت فرماتے ہیں۔

مخلص نوجوانوں سے گزارش:

نیم مذہبی اور سیاسی تحریکات نے دینی ذوق کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ اچھے اچھے اہل علم بھی توحید و سنت پر گفتگو کو فرقہ پرستی تعبیر کرتے ہیں، ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے، جو نڈر ہو کر کتاب و سنت کی اشاعت کریں، اصول اور فروع پر خود عمل کریں اور عامۃ المسلمین کو ان مسائل کی طرف متوجہ کریں اور اس کے لیے بہتر اسلوب اختیار کر سکیں، مناظرانہ طعن و تشنیع سے بچ کر جدال احسن اور تبلیغ کے لیے اچھی زبان اختیار کریں۔ امام بخاری رحمہ اللہ خصوصاً اور ائمہ حدیث عموماً اس باب میں بہترین اسوہ ہیں، انھوں نے محض نمائشی طور پر نہیں حقیقتاً زندگی کے ہر گوشے پر نظر رکھی ہے اور معیشت کے ہر زاویے پر شریعت اور دین کی روشنی میں ہدایات دی ہیں اور یہی اصل دین ہے۔ امام بخاری کی صحیح، امام ترمذی کی جامع، امام احمد کی مسند اس کی بہترین ضامن ہیں کہ ائمہ حدیث کیا ہیں؟ ان کا مذہب اور ان کا طریق استدلال کیا ہے؟ اختلافی مسائل کے بیان میں ان کا اسلوب کیا ہے؟ اور کس طرح قول بلیغ سے انھوں نے دلوں تک پہنچنے کی کوشش فرمائی ہے۔

بعض تحریکیں:

اس ملک میں کئی تحریکات ہیں، جن کا منشور یہ ہے کہ وہ پورے اسلام کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں اور زندگی کے ہر گوشے اور ہر موڑ کے لیے ان کے پاس شمع ہدایت ہے، لیکن عملاً وہ ایک آدھ مسئلہ میں اس طرح الجھے کہ برسوں تک دوسرے مسائل کی طرف توجہ ہی نہیں ہو سکی، لٹریچر شائع کیا تو مخصوص طبقہ کے لئے اور کبھی عوام کو خطاب کیا، تو اس زبان اور لہجہ میں کہ اسے ملک کی اکثریت نہ سمجھ سکے۔

میری رائے یہ ہے کہ زندگی کا پورا پروگرام صرف انبیاء ہی دے سکتے ہیں اور سارے دین پر صرف اللہ ہی کی نظر ہو سکتی ہے اور اس کے انبیاء جو علوم کو براہ راست آسمان سے اخذ کرتے ہیں، آسمانی علوم ان پر غیر مشتبہ طور نازل ہوتے ہیں، حال اور مستقبل کی تمام امراض ان پر عیاں ہوتی ہیں، یا پھر مکمل پروگرام وہ لوگ دے سکتے ہیں، جنھوں نے آسمانی علوم کی حفاظت کی ذمہ داری لی، آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو سنا، یاد کیا، لکھا اور پہنچایا، علوم سنت کی نشر و اشاعت کے لیے زندگیاں وقف فرمائیں۔

أهل الحديث هم أهل النبي
وإن لم يصحبوا نفسه أنفاسه صحبوا[1]

ان کے علاوہ کوئی سیاسی، معاشی، دینی یا نیم سیاسی تحریک بعض مخصوص حصوں کی اصلاح کر سکتی ہے، خاص قسم کے پروگرام دے سکتی ہے، مکمل پروگرام کتاب و سنت اور اس کے خدّام ہی دے سکتے ہیں۔ اس کی زندہ دلیل اس دور واپسیں کی غالباً آخری تحریک ہے، جسے سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کی قیادت کا فخر حاصل

[1] اہل حدیث ہی نبی ﷺ کے حقدار ہیں، اگرچہ انھیں آپ ﷺ کی ذات کی صحبت حاصل نہیں ہوئی، لیکن آپ ﷺ کی سانسوں (فرامین) کی صحبت تو انہی کو حاصل ہوئی ہے!

ہے، اسی تحریک نے میدان جنگ سے لے کر اندرون خانہ تک اپنے ماننے والوں کی راہنمائی فرمائی۔ افسوس ہے کہ حالات کی رفتار پر انضباط نہ ہو سکا، ورنہ آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا، اس ملک کی حدود پاک و ہند سے بھی زیادہ وسیع ہوتیں. میں محسوس کرتا ہوں کہ میں موضوع سخن سے کسی قدر آگے نکل گیا ہوں، مگر

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ❶

مقصد یہ ہے کہ پوری زندگی کی اصلاح علوم سنت سے ہوسکتی ہے اور مکمل راہنمائی صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں، جن کا دامن راہ گذر کی آلائشوں سے پاک ہے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی چٹان بھی ان کا راستہ نہیں روک سکی۔ اس مسلک کے اولین راہنما آنحضرت ﷺ فداه أبي و أمي ہیں اور آپ کے خدام میں سب سے اعلیٰ مقام امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کا ہے، یہی ایک مسلک ہے، جب بھی دنیا نے اسے اپنایا، اپنی مشکلات کا زیادہ سے زیادہ حل اس میں پایا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے مذہب کی مزید وضاحت:

حال کی گزارش میں ہم نے عرض کیا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور ائمہ حدیث صحیح حکیم ہیں، یہی زندگی کے تمام شعبوں میں ہدایت دینے کی اہلیت رکھتے ہیں، مزید گزارش ہے کہ فقہی فروع اور اجتہادی مسائل میں امام بخاری رحمہ اللہ دنیا کے مروجہ مسالک سے بالکل آزاد ہیں، وہ مروجہ طرق فکر سے کسی کے بھی پابند نہیں۔

اکثر مروجہ طریقہ ہائے فکر نے امام رحمہ اللہ کو اپنانے کی کوشش فرمائی ہے، امام الأدباء علامہ حافظ عینی رحمہ اللہ سے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری اور استاذ العلماء سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ تک یہ کوشش جاری معلوم ہوتی ہے کہ اولاً تو خود امام بخاری رحمہ اللہ کو حنفی بنا لیا جائے، ورنہ کم از کم صحیح بخاری تو ضرور حنفی ہو جائے، لیکن علمی

❶ گفتگو مزیدار تھی، اس لیے طویل ہوگئی۔

حلقے خوب جانتے ہیں کہ نہ صحیح بخاری حنفی ہو سکی، نہ امام بخاری اپنے مقام سے نیچے اتر سکے اور یہ کوشش ﴿حاجة في نفس يعقوب﴾ [1] کا مصداق ہو کر رہ گئیں۔

حضرات علماء دیوبند کا اضطراب:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اس صراحت کے بعد کہ:

" اعلم أن الناس قبل المائة الرابعة كانوا غير مجمعين على التقليد الخالص لمذهب واحد بعينه" (١/ ١٢٢) [2]

لوگ چوتھی صدی سے قبل خاص مذہب کی تقلید پر جمع نہ تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ان سکول ہائے فکر کو جو قبولیت چوتھی صدی کے بعد حاصل ہوئی، وہ اس سے پہلے نہ تھی، نہ حنفی، شافعی کہلانے کا بطور مذہب رواج تھا، تلمذ اور استفادہ کی وجہ سے بعض مسائل میں اساتذہ کی طرف رجحان تھا اور یہ قدرتی بات ہے اور ہمیشہ رہا ہے، لیکن ان طرق کو بطور مذہب یا بطور سکول فکر چوتھی صدی سے پہلے قبولیت حاصل نہ تھی۔ حضرت استاذ الاساتذہ مولانا سید انور شاہ رحمہ اللہ کے ارشادات گرامی میں عجیب اضطراب ہے، فیض الباري (١/ ١٧٨، ٣٠١) ملاحظہ فرمایئے، [3] وہ ائمہ حدیث کو ان مختلف سکول ہائے فکر میں تقسیم فرمانا چاہتے ہیں، جن کا

---

[1] یوسف : ٦٨ (یعقوب کے دل میں ایک خواہش)

[2] حجة الله البالغة (١/ ١٥٢)

[3] محولہ بالا صفحہ (١/ ١٧٨) میں انور شاہ صاحب کشمیری نے امام لیث بن سعد مصری کو "حنفی" قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے استاد محترم حافظ عبدالمنان نور پوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"امام لیث بن سعد الفقیہ الحافظ ایک مجتہد ہیں، وہ حنفی مقلد نہیں اور ابن خلکان کا کہنا کہ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ وہ حنفی ہیں، ان کے حنفی مقلد ہونے کی دلیل نہیں، کیونکہ قاضی ابن خلکان نے نہ اس کتاب کا نام لکھا ہے، جس میں انھوں نے یہ بات دیکھی ہے اور نہ اس کے مصنف اور نہ یہ بات کہنے والے کا نام ہی ذکر کیا ہے، البتہ عینی نے کہا ہے کہ "ہمارے لوگوں نے ان ←

رواج چوتھی صدی کے بعد ہوا، حالانکہ ائمہ حدیث اس دور کی پیداوار ہی نہیں۔

جب تقلید نے اجتماعی قبولیت کی صورت اختیار کی، وہ دل سے چاہتے ہیں کہ اس سکول فکر کی تعداد جہاں تک کم ہو سکے کم کر دیں، جس کی پابندی اہل علم چوتھی صدی سے پہلے کرتے تھے، کہیں تو یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید قطان کو حنفی ظاہر فرماتے ہیں، [1] کہیں ابو داود اور نسائی کو حنبلی فرمایا ہے [2]، بعض جگہ ترمذی کو شافعی

← (لیث بن سعد) کو اصحاب ابی حنیفہ میں شمار کیا ہے''، تو ابن خلکان نے ایک حنفی کی کتاب میں دیکھ کر یہ بات نقل کر دی ہے، لہٰذا جب ان کا حنفی ہونا ہی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا، تو ان کا امام ابو حنیفہ کا مقلد ہونا کس طرح ثابت ہو سکتا ہے؟ مزید برآں جس سند کو دلیل بنا کر امام لیث رحمہ اللہ کا حنفی ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس میں احمد بن عبدالرحمٰن، طحاوی کا استاد ہے۔''

بعد ازیں استاد محترم حافظ عبدالمنان نور پوری حفظہ اللہ نے اس راوی پر ابن عدی، ابن حبان، ابن یونس سے بحوالۂ میزان مختلف جروح اور دیگر ائمہ کے بعض اقوال نقل کیے ہیں، مزید لکھتے ہیں:

''صاحب فیض الباری نے ابو یوسف سے تلمذ کی بنا پر لیث بن سعد کو حنفی قرار دیا ہے، تو امام احمد بن حنبل جو ابو یوسف کے شاگرد ہیں، کیا صاحب فیض الباری اور ان کے حواری کہیں گے کہ احمد بن حنبل بھی حنفی ہیں؟!''

اسی طرح شافعی نے اصحاب ابی حنیفہ سے روایت کی ہے، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ شافعی بھی حنفی ہیں؟! اگر ان کی یہ بات دلیل بن سکتی ہے، تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ محمد بن حسن شیبانی مالکی ہیں، کیونکہ وہ تو امام مالک کے بلا واسطہ شاگرد ہیں، پھر امام ابو حنیفہ خود بھی حماد بن ابی سلیمان کے شاگرد ہیں، تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ ابو حنیفہ، حماد بن ابی سلیمان کے مقلد ہیں؟ بعض اہل علم نے، جن میں ذہبی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، صراحت کی ہے کہ ابو حنیفہ نے مالک سے روایت کی ہے، تو کیا ابو حنیفہ بھی مالکی تھے؟ (إرشاد القاري إلی نقد فیض الباري: ۲/ ۳٦٥، مختصراً)

[1] فیض الباری (۱/ ۱٦۹) اس پر نقد کرتے ہوئے محدث العصر امام حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ دور کی کوڑی لانا ہے، ان سب کا حنفی ہونا ایسا خیال ہے، جس کا ہر وہ عقل انکار کرے گی، جس نے ان ائمہ کے حالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ انھوں نے تو أصحاب الرأي پر انتہائی شدید نقد کیا ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے وکیع رحمہ اللہ سے [جنھیں صاحب فیض الباری نے متعصب حنفی قرار دیا ہے] ←

ظاہر فرمایا[1]، ایک مقام پر امام بیہقی کے متعلق فرماتے ہیں:

"والبيهقي أيضا لم يقدح في أبي حنيفة ـ رحمه الله تعالىٰ ـ مع كونه متعصبا" (١/ ١٦٩)[2]

بیہقی نے تعصب کے باوجود حضرت امام ابوحنیفہ پر جرح نہیں فرمائی۔

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"وما اشتهر أنه شافعي فلموا فقته إياه في المسائل المشهورة و إلا فموا فقته للإمام الأعظم ليس أقل مما وافق فيه الشافعي" (١/ ٥٨)

اور مشہور خیال کہ امام بخاری شافعی ہیں، یہ اس لئے کہ وہ مشہور مسائل میں امام شافعی کے موافق ہیں، ورنہ احناف کے ساتھ ان کی موافقت کم نہیں۔

وہ اس کے بعد فرماتے ہیں:

"فعده شافعيا باعتبار الطبقة ليس بأولى من عده حنفيا" (١/ ٥٨)

طبقہ کے لحاظ سے امام بخاری کو شافعی کہنا حنفی کہنے سے کچھ زیادہ نہیں ۔

وكل يدعي وصلا لليلى
وليلىٰ لا تقر له بذاكا[3]

← اهل الرأى خصوصاً ابوحنیفہ پر سخت رد ذکر کیا ہے [سنن ترمذی، كتاب الحج، باب إشعار البدن] اور ابن معین نے " إذا قرأ فأنصتوا " والی زیادتی کو ضعیف قرار دیا ہے، جیسا کہ امام نووی نے ذکر کیا ہے اور یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ ایمان، قول اور عمل کا نام ہے، جو کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے۔"
(حواشي الإمام المحدث الحافظ محمد الكوندلوي على فيض الباري، نسخة تعليم الإسلام أودانواله: ١/ ١٦٩) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: إرشاد القاري إلى نقد فيض الباري (٢/ ٢٨٨)

[2] فيض الباري (١/ ٥٨، ٣٠١) نیز دیکھیں: إرشاد القاري إلى نقد فيض الباري (٣/ ٣٩٠)

[1] فيض الباري (١ص ٥٨) نیز دیکھیں: مقدمة تحفة الأحوذي (ص: ٣٥٣)

[2] نیز دیکھیں: إرشاد القاري إلىٰ نقد فيض الباري (٢/ ٣٢٧)

[3] ہر کوئی لیلیٰ کو پانے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن لیلیٰ ان سے کسی کو بھی ہاں نہیں کرتی!

مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ نے امام کے متعلق غیر مشکوک طور پر اپنی رائے کا اظہار فرما دیا ہے:

" واعلم أن البخاري مجتهد لا ریب فیه "[1] بخاری بلا شک مجتہد ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کسی کے مقلد نہیں۔

ایک مقام پر غالباً علامہ سبکی کے متعلق فرماتے ہیں:

" ومن عده (أي أبا داود) من الشافعیة فكأنه لم یقصد به إلا تكثیر السواد ولا ریب أنه حنبلي "[2]

جن لوگوں نے امام ابوداود کو شافعی ظاہر کیا ہے، ان کا مقصد محض اپنی جماعت کی نمائش کرنا ہے، یقیناً وہ حنبلی ہیں۔

حضرت انور شاہ صاحب کی عادت پر غور کیا جائے، تو وہ اپنی جماعت کی تکثیر کے علاوہ اپنے مخالف کے سواد کی تقلیل بھی چاہتے ہیں، حضرت کے مقام کا بے حد احترام ہے، لیکن حنفیت کی محبت میں اپنے مقام سے کہیں نیچے اتر گئے۔

رحمه الله وتجاوز عن مسامحاته!

امام کی شافعیت:

امام بخاری رحمہ اللہ پر سب سے زیادہ دعویٰ حضرات شوافع کا ہے، مگر واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے، "الجامع الصحیح" میں کئی جگہ وہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے اختلاف فرماتے ہیں:

(۱) شوافع کا مسلک ہے کہ زکوۃ جہاں سے وصول کی جائے، وہیں کے فقرا میں تقسیم

---

[1] فیض الباري (۱/ ۵۸)

[2] فیض الباري (۱/ ۳۰۱) نیز دیکھیں: إرشاد القاري (۳/ ۳۹۰)

کی جائے، دوسری جگہ تقسیم کرنا درست نہیں[1]، امام فرماتے ہیں:

" باب أخذ الصدقة من الأغنياء وترد في الفقراء حيث كانوا "[2]

(صحیح بخاری: ۱/ ۲۰۲، مطبوعہ ھند)

اغنیاء سے صدقہ لے کر فقراء کو دیا جائے، جہاں ہوں۔

اس میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت کے عموم سے استدلال فرمایا ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا۔

② حضرات شوافع کا خیال ہے کہ زکوۃ ان تمام مصارف پر خرچ ہونی چاہیے، جن کا ذکر قرآن حکیم نے فرمایا ہے[3]، لیکن امام فرماتے ہیں یہ ضروری نہیں، ایک مصرف میں بھی صرف کی جا سکتی ہے، فرماتے ہیں:

" باب استعمال إبل الصدقة وألبانها لأبناء السبيل "[4] (۱/ ۲۰۳)

اس میں قبیلہ عرینہ کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ میں آ گئے، ان کو استسقاء کا مرض ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں باہر صدقہ کے اونٹوں میں بھیج دیا کہ ان کا دودھ وغیرہ استعمال کریں، یہ لوگ مسافر تھے، یہاں صدقہ صرف "أبناء سبیل" (مسافروں) پر استعمال فرمایا۔

③ حیوانات کے سؤر[5] اور حلت و حرمت کے متعلق موالک کے مشہور مسلک کی

---

❶ دیکھیں: المجموع للنووي (۶/ ۲۲۰) فتح الباري (۳/ ۳۵۷)

❷ صحیح البخاري: كتاب الزكاة، باب أخذ الصدقة......، قبل الحديث (۱۴۲۵)

❸ دیکھیں: المجموع للنووي (۶/ ۱۸۶)

❹ صحیح البخاری: كتاب الزكاة، باب استعمال إبل الصدقة ......، قبل الحديث (۱۴۳۰)

❺ باقی ماندہ پانی۔

مخالف فرمائی۔

④ شوافع کے نزدیک جمعہ کے لیے کم از کم چالیس آدمیوں کا اجتماع ضروری ہے،[1] امام نے ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بارہ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی۔[2] یہ مسلک حضرات شوافع کے خلاف ہے۔ (صحیح بخاری: ۱/ ۱۲۸)

⑤ حنابلہ کا مشہور مسلک ہے کہ جمعہ قبل الزوال بھی درست ہے،[3] امام رحمہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے:

"باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس" (صحیح بخاری: ۱/ ۱۲۳)

صحیح بخاری پر نظر رکھنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ امام رحمہ اللہ کی مذاہب اربعہ سے کسی کی موافقت یا مخالفت کا انحصار دلیل پر ہے، اس لئے ان کی شافعیت یا حنبلیت کا دعویٰ صرف خوش فہمی ہے، موالک اور احناف نے اچھا کیا کہ خواہ مخواہ انھیں اپنانے کی کوشش نہیں فرمائی، اگر ایسا کیا جاتا تو معاملہ بڑا ہی غیر معقول ہوتا۔

مولانا انور شاہ صاحب نے اس تلخی کے باوجود جو انھیں اہل حدیث یا ائمہ حدیث سے ہے اور اس مفرط محبت کے باوجود جو انھیں حنفیت سے ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کے متعلق جچی تلی رائے قائم فرمائی ہے:

"إن البخاري عندي سلك مسلك الاجتهاد ولم يقلد أحدا في

---

[1] المجموع للنووي (٤/ ٥٠٢) فتح الباري (٢/ ٤٢٣)

[2] صحيح البخاري: كتاب الجمعة، باب إذا نفر الناس عن الإمام في صلاة الجمعة فصلاة الإمام ومن بقي جائزة، رقم الحديث (٨٩٤)

[3] المغني لابن قدامه (٢/ ١٤٤) زاد المستقنع (ص: ٦٠)

کتابه بل حکم بما حکم به فهمه" (فیض الباري:۱/ ۳۳۵)

اسی طرح (ج:۱،ص: ۳۲۵) میں شاہ صاحب نے صراحت فرمائی ہے اور یہ صراحت اس سے پہلے سخاوی رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی فرمائی ہے، بلکہ شیخ الاسلام نے تو انھیں مجتہد مطلق فرمایا ہے۔[1]

اجتہاد کی شروط:

ملکہ اجتہاد میں کسب کے باوجود موہبت الٰہی کو بہت حد تک دخل ہے، مگر فقہا رحمہم اللہ نے اجتہاد کے متعلق جن اصطلاحی اور فنی قیود کا تذکرہ اصول فقہ کی مستندات میں فرمایا ہے، اس نے تو اجتہاد کو بے حد ہیبت ناک بنا دیا ہے، ممکن ہے وقتی مصالح کا تقاضا کچھ اسی قسم کا ہو، ائمہ اربعہ اور حضرت امام بخاری اور اکثر ائمہ اجتہاد ان صنفی فنون کی تصنیف سے بہت پہلے اس مقام پر فائز ہو چکے تھے، یہ پیمانے بہت بعد میں ایجاد ہوئے اور ان فنون پر لکھنے والے قریباً اس نعمت سے محروم تھے، ان کی نگاہ میں مقام اجتہاد تک پہنچنا قریب قریب اتنا ہی مشکل ہے، جیسے مقام نبوت تک رسائی، حالانکہ نبوت محض موہبت ہے اور اجتہاد کافی حد تک کسبی، اس لئے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اور بعض دوسرے اہل علم جن پر متاخرین کی مصنوعی قیود کا اثر ہے، مجمل طور پر تو حضرت امام رحمہ اللہ کو مجتہد فرما گئے، مگر مجتہد مطلق کی صراحت صرف امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمائی، کیونکہ وہ متاخرین کی مصنوعی اصطلاحات سے مرعوب ہیں نہ متاثر،

لسعة علمه وغزارة فهمه رحمه الله رحمة واسعة تملأ بها السموات والارض!

بہر حال جب تک دنیا میں صحیح بخاری موجود ہے، امام رحمہ اللہ کے مسلک کے تعین میں کوئی مشکل نہیں، وہ مروجہ مذاہب سے قطعی متاثر نہیں، حضرت سید انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو امام سے شکوہ ہے، فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: طبقات الشافعية (۲/ ۲۱۲) مقدمه تحفة الأحوذي (ص: ۳۵۷)

”وهذه منة عظيمة من المصنف رحمه الله تعالىٰ على رقاب الناس وعلينا أنه يستعمل القرآن في كل موضع ممكن وإن لم يكن راضيا عن إمامنا الأعظم رحمه الله تعالىٰ وأرى جماعة من أصحاب محمد وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ يروي عنهما المصنف رحمه الله في كتابه ثم لم تخرج منقبة عن قلمه للائمة الثلاثة فيا للعجب!“ (فيض الباري: ١/ ٧)

یعنی مصنف (امام بخاری) کا ہم پر اور عامۃ المسلمین پر بہت بڑا احسان ہے کہ وہ حسب امکان آیات کا ذکر فرماتے ہیں، گو وہ ہمارے امام اعظم سے خوش نہیں، اور میرا خیال ہے کہ امام بخاری امام محمد اور ابو یوسف کے تلامذہ سے روایت فرماتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے قلم سے ان تین بزرگوں کے متعلق کوئی تعریف کا کلمہ نہیں نکلا، تعجب ہے!!

فقہ الحدیث اور فقہ الرای:

فقہ الحدیث اور فقہ الرای، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ میں فرمایا[1]، دو الگ الگ طریق فکر ہیں، یہ دونوں اپنے اپنے طریق پر دین کی خدمت کی مختلف راہیں ہے، جو بہر حال مختلف ہیں۔ اس لئے امام بخاری اور ائمہ حدیث نے فقہاءِ کوفہ رحمہم اللہ کے متعلق جو راہ اختیار فرمائی ہے، اس سے زیادہ کی توقع رکھنا کوئی اچھی اور قابل تعریف امید نہیں اور نہ ہی یہ شکوہ کچھ معقول ہے، ہم نے یہ حوالہ ”تعرف الأشياء بأضدادها“[2] کے اصول پر نقل کیا ہے، تاکہ امام بخاری اور ائمہ حدیث کا مسلک متعدد وجوہ سے ظاہر ہو جائے، ورنہ یہ عبارت بالکل بے جوڑ

---

[1] حجة الله البالغة (١/ ١٤٧)

[2] اشیاء کی معرفت ان کی مخالف چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔

ہے۔فیض الباری حضرت شاہ صاحب کے امالی [لکھوائے ہوئے شذرے] ہیں، جن پر محنت فرما کر مولانا بدر عالم صاحب نے شائع فرمایا، مولانا کے اعتبار پر اس عبارت کی نسبت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی طرف کی جا رہی ہے، ورنہ ایسی بے جوڑ عبارت کی نسبت شاہ صاحب کی طرف کرنے کو ذہن اباء کرتا ہے، غور فرمائیے:

(1) امام بخاری رحمہ اللہ حسب امکان ابواب میں آیات ذکر فرماتے ہیں، لیکن وہ ہمارے امام سے خوش نہیں!

(2) امام بخاری رحمہ اللہ ائمہ ملت کے تلامذہ سے روایت کرتے ہیں، ان کے مناقب بیان نہیں فرماتے!

غور فرمائیے! اگر بخاری سے یہ شکوہ کیا جائے، تو ائمہ ثلاثہ نے اپنے اساتذہ اور رواۃ کے مناقب میں کون سی کتاب لکھی؟ یہ صرف احساس کمتری ہے، جس کی نسبت حضرت شاہ صاحب کی بجائے کاتب امالی کی طرف زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے۔

فیض الباری کے مطبوعہ نسخہ میں اور بھی بہت سی بے جوڑ چیزیں ہیں، جو شاہ صاحب کے مقام سے موزوں نہیں، یہ شکوہ کوئی کرے، کسی وجہ سے ہو، امام کے مسلک کی اس سے وضاحت ہو جاتی ہے اور احساس پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مسلک صحیح ہے اور اسے دنیا میں رکھنا ضروری ہے، اس کی مخالفت اتنے اونچے مقامات سے اس بے جوڑ اور بھدے طریق سے ہو رہی ہو، تو آیا اسے تغافل کی نذر کر دیا جائے؟ ملک کی موسمی اور وقتی تحریکات پر اسے قربان کر دیا جائے اور ایسے ستم ظریف حضرات واقعی اس کے اہل ہیں کہ تاریخ کے صفحات میں انھیں کوئی مناسب مقام دیا جائے؟!

میری پاکستان اور ہندوستان کے اہل حدیث علماء اور ہونہار طلباء سے گزارش ہے کہ وہ اپنے موقف کو پہچانیں اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں ؎

كل امرئ تحسبين امرأً ونار توقد بالليل ناراً [1]

---

[1] تم ہر مرد کو مرد اور ہر آگ کو جو رات کو جلائی جاتی ہے، آگ سمجھ لیتے ہو!

معاملات:

اسلام چونکہ زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے، اس لئے اس نے بیوع، اجارات، شرکت، نکاح اور طلاق کے متعلق مخصوص ہدایات دی ہیں، ان ہدایات کا آغاز عبادات میں بہت زیادہ جامع اور محیط ہے، وہاں قیاسات کے لیے بہت کم گنجائش دی گئی ہے، عبادات کے اوضاع، اطوار اور وظائف میں پوری پابندی فرمائی، قیاس، ظن اور تخمین کو مداخلت کا کوئی موقع نہیں دیا، ان حدود کی پابندی شرعاً ضروری ہے، جو شارع حکیم نے عبادات کے متعلق فرمائی۔

معاملات کا انداز عبادات سے بالکل مختلف تھا، ان کا حصر کرنا ناممکن تھا، ظروف واحوال کی تبدیلی سے معاملات میں تنوع یقینی امر تھا اور تنوع کی صورت میں اس کے حکم کی نوعیت بھی مختلف ہونا قدرتی اور فطرتی امر ہے، اس لیے عبادات کی طرح پابندی نہیں بلکہ ایک گونہ کشادگی رکھی گئی، سیاسیات میں اس سے بھی زیادہ وسعت عطا فرمائی گئی۔ فقہاء رحمہم اللہ نے اس معاملہ میں الفاظ کی ہیرا پھیری سے اسے ایسا مغلق بنا دیا، جو اسلام کی مزاجیت کے ساتھ چنداں مناسب نہ تھا، واقعات اور ان کے پس منظر، اَلسنہ محاورات اور ان میں تنوع اور اختلاف قریباً نظر انداز کر دیا گیا، فقہ حنفیہ میں ساری دنیا کو مخصوص محاورات کا پابند کرایا گیا اور وہ بھی علماء خراسان اور ماوراء النہر کی زبان میں، اس سے عجیب ضیق اور تنگی سی پیدا ہوگئی تھی، تقلید کی پابندی اور مذاہب اربعہ کی باہمی آویزشوں نے اور بھی دقت پیدا کر دی۔ نکاح اور اس کی شروط، انعقاد نکاح کے لیے الفاظ، صحیح استفادہ، فریقین کی نیت سے پہلے مفتی اور قاضی کی نیت کو جاننا ضروری ہوگیا، کیونکہ قوت فیصلہ ان کے قلم میں ہے اور نیت بھی وہ جو آج سے صدیوں پہلے کے ماحول میں کی گئی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان ساری دقتوں کو دیکھا، دین کی مصالح کو بھی ملاحظہ

رمایا اور ”کتاب الشروط“ میں دو باب ذکر فرمائے:

① باب الشروط في المهر عند عقدة النكاح، وقال عمر: ”إن مقاطع الحقوق عند الشروط ولها ما اشترطت الخ“

(بخاری: ١/ ٣٢٦)

② باب ما يجوز من الاشتراط والثنيا في الإقرار والشروط التي يتعارفها الناس بينهم الخ (١/ ٣٥٢)

تیسرا باب کتاب النکاح میں ذکر فرمایا: ”باب الشروط في النكاح“

ان ابواب میں محدثانہ انداز سے ان تمام دقتوں کا جائزہ لیا، جو اس راہ میں رباب تقلید و جمود نے پیدا کر دی تھیں، اس میں شروط کی اہمیت کا اس انداز سے جائزہ لیا کہ کتاب و سنت اور مقاصد نکاح کے منافی نہ ہوں، تو ان شرائط کی پابندی ضروری ہوگی۔ پہلی شرط کے لیے حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اصلی قرار دیا،[1] دوسری کے لئے اثر عمر رضی اللہ عنہ کو اصلی قرار دیا اور ”کتاب النکاح“ اور ”کتاب الشروط“ دونوں میں اس کا ذکر فرمایا،[2] جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ حضرت میں نے اس شرط پر نکاح کیا تھا کہ میں اپنی بیوی کو س کے گھر سے باہر نہیں لے جاؤں گا، اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ فلاں سرزمین میں چلا جاؤں اور میں سفر کے لیے پوری تیاری کر چکا ہوں، لیکن میری بیوی نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ” لها ما

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الشروط، باب ما يجوز من الاشتراط والثنيا في الإقرار......، رقم الحديث (٢٥٨٥)

[2] صحيح البخاري: كتاب النكاح، باب الشروط في النكاح، قبل الحديث (٤٨٥٦) و كتاب الشروط، باب الشروط في المهر عند عقدة النكاح، قبل الحديث (٢٥٧٢)

اشترطت" اسے اپنی شرط پر قائم رہنے کا حق ہے، اس شخص نے کہا مرد تو اس صورت میں مر گئے، عورت جب چاہے گی (اس شرط کے مطابق) مرد کو طلاق دے دے گی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "المومنؤن علی شروطھم "مومن اپنی شروط کے پابند ہیں، ان کے حقوق کا آخری فیصلہ ان شروط ہی کی روشنی میں ہوگا۔ [1]

طلاق:

طلاق کے الفاظ اور مطلّق کی نیت کے متعلق ہمارے معاشرے میں جو گڑ بڑ پائی جاتی ہے، اس کی بہت حد تک ذمہ داری فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ پر ہے، شرح وقایہ اور ہدایہ کے طالب علم جانتے ہیں کہ ان کتابوں میں طلاق وعتق کے مباحث کس قدر دقیق اور دقت انگیز ہیں، امام رحمہ اللہ نے یہاں بالکل طبعی فطری راہ کی طرف راہنمائی فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

" باب إذا قال فارقتكِ أو سرّحتكِ أو الخلية أو البرية أو ما عني به الطلاق فهو علي نيته" .الخ [2]

یعنی الفاظ طلاق مطلّق اور اس وقت کے محاورات ملحوظ ہوں گے، اس کا علماء خراسان اور فقہاء ماوراء النہر کے محاورات سے فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح حرام کے لفظ سے حضرات موالک تین طلاقیں مراد لیتے تھے، [3] امام بخاری رحمہ اللہ نے حسن بصری کا اثر ذکر فرمایا:

---

[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں مقامات پر یہ اثر سند کے بغیر (تعلیقاً مجزوما به) ذکر کیا ہے، لیکن اسے امام سعید بن منصور (السنن: ۱/ ۱۸۱) امام ابن ابی شیبہ (المصنف: ۳/ ۴۹۹) اور امام بیہقی رحمہ اللہ (۷/ ۲۴۹) نے موصولاً بیان کیا ہے، جس کی سند صحیح ہے، نیز دیکھیں: فتح الباری (۹/۲۱۷) تغلیق التعلیق (۳/ ۴۲۸، ۴/ ۴۱۹)

[2] صحیح البخاری: کتاب الطلاق ، باب إذا قال فارقتك ...... (۹/۳۶۹، مع الفتح)

[3] المدونة الکبری (۲/۲۸۵، ۲۸۸) فتح الباري (۹/ ۳۷۲)

"قال الحسن: نیته" ❶

امام حسن فرماتے ہیں: مطلّق کی نیت کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

لفظ حرام طلاق اور قسم دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے، امام نے ایک بہت بڑی دقت معاشرہ سے اٹھا دی۔ اللهم اجعل جنة الفردوس مأواه!

استثناء:

استثناء کے متعلق بعض اہل علم کا خیال تھا کہ قلیل کو کثیر سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے، لیکن کثیر کا استثناء صحیح نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اس کے لیے نصوص سے استدلال فرمایا اور شروط کے مفہوم کی تعیین کے لیے "الذي يتعارفها الناس بينهم" ❷ فرما کر معاملہ کو حقیقت سے قریب تر کر دیا۔ اگر دنیا کو توفیق ملی کہ وہ اپنے قوانین کی تاسیس اور تشکیل اسلام کی روشنی میں کرے، تو امام بخاری اور محدثین کرام ان کے لیے بہترین راہنما ہوں گے۔

نفقات:

نفقات کے متعلق مفلس، متعنت اور مفقود الخبر کا معاملہ فقہ حنفی کے مطابق بہت ہی مشکل تھا، ائمہ احناف رحمہم اللہ ان تینوں صورتوں میں فسخ کی اجازت آسانی سے مرحمت نہیں فرماتے تھے، ان کے ارشادات کے مطابق عقد نکاح کی تقدیس کا خیال تو واقعی بدرجہا غایت تھا، لیکن عورت کی مظلومیت، اس کی اقدار زندگی اور غیر طبعی حالات کا اس میں کوئی حل نہ تھا۔ انگریزی عمل داری کے زمانے میں کاظمی بل کی تشکیل سے

---

❶ صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب من قال لا مرأته أنت علي حرام (٩/ ٣٧١، مع الفتح) امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اثر سند کے بغیر (تعلیقاً مجزوما به) ذکر کیا ہے، اسے امام عبدالرزاق (المصنف: ٦/ ٢-٤) اور امام بیہقی رحمہ اللہ (٧/ ٣٥١) نے موصولاً بیان کیا ہے، نیز دیکھیں: فتح الباري (٩/ ٣٧١) تغليق التعليق (٤/ ٤٣٨)

❷ صحيح البخاري: كتاب الشروط، باب ما يجوز من الأشراط (٥/ ٣٥٤، مع الفتح)

پہلے ان قوانین کا جو اثر پاک و ہند کے مسلمانوں پر پڑا، وہ حدیث محفل ہے، امام کے مسلک اور فتویٰ علی مذہب الغیر کی آڑ میں بعض مسلمانوں کی دادرسی ہوتی رہی، مگر بعض حضرات تو بدستور مسلک اہل حدیث سے ناراض رہے، مولانا تھانوی پر اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ رحمت فرمائے، انھوں نے "الحیلة الناجزة للحلیلة العاجزة" لکھ کر موالک، حنابلہ، شوافع کے فتووں سے عامۃ المسلمین اور علماء احناف دونوں کے لیے مخلصی کی راہ پیدا فرمائی، تو یہ سب حنفی مسلک کے خلاف تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے "باب حكم المفقود في أهله وماله" میں مفقود کو "لقطه" پر قیاس فرمایا ہے، ان کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس مسئلہ میں امام مالک سے بھی مظلوم کو زیادہ رعایت دینا چاہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دو اثر ذکر فرمائے ہیں:

① سعید بن مسیب کا اثر، اگر لڑائی کی صفوں میں خاوند مفقود ہو جائے، تو ایک سال انتظار کے بعد نکاح کرے۔ [1]

② حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک لونڈی خریدی، اس کا مالک مفقود الخبر ہو گیا، حضرت عبداللہ نے ایک سال کے انتظار کے بعد اس کی قیمت بتدریج فی سبیل اللہ خرچ کر دی، خیال یہ تھا اگر بائع آ گیا تو دے دوں گا، ورنہ اس کا اجر اس کو ملے گا۔ [2]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الطلاق، باب حكم المفقود في أهله وماله (٩/ ٤٣٠، مع الفتح) امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اثر سند کے بغیر (تعلیقاً مجزوما به) ذکر کیا ہے، اسے امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے موصولاً بیان کیا ہے، مصنف عبدالرزاق (٧/ ٨٩) نیز دیکھیں: فتح الباري (٩/ ٤٣٠) تغليق التعليق (٤/ ٤٦٩)

[2] صحیح بخاری کے محولہ بالا مقام پر یہ اثر بھی معلق (مجزوما به) مروی ہے، اسے امام سفیان بن عیینہ، ←

۞ قیدی کے متعلق امام زہری کا فتویٰ نقل فرمایا، اگر قیدی کا پتہ معلوم ہو، تو اس کی بیوی کو نکاح کی اجازت نہیں ہوگی، ورنہ ایک سال انتظار کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔[1] اس کے لئے یزید مولی منبعث کی مرفوع حدیث "لقطه" کے متعلق بیان فرمائی ہے، جس کا مطلب ظاہر ہے کہ امام بخاری مفقود کی منکوحہ کو ایک سال انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ آج کے حالات اس سے بھی زیادہ اس مظلوم کے ساتھ رعایت کا تقاضا کرتے ہیں، بنیاد قرآن کا ارشاد ہے:

﴿ ولا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا ﴾[2]

جہاں عورت کو ضرر محسوس ہو، اس کی مخلصی کے لیے بواسطہ قاضی کوئی نہ کوئی راہ تلاش ہونی چاہیے، کیونکہ عورت کو تکلیف دے کر بند رکھنا درست نہیں۔

مفلس اور متعنت:

مفلس اور متعنت کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث بیان فرمائی:

"تقول المرأة إما أن تطعمني وإما أن تطلقني "[3]

← سعید بن منصور، ابو القاسم طبرانی اور طحاوی رحمہم اللہ (شرح معاني الآثار: ٤/ ١٣٩) نے موصولاً بیان کیا ہے۔ فتح الباري (٩/ ٤٣٠) تغليق التعليق (٤/ ٤٦٩)

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٦/٤٤٨) نیز دیکھیں: فتح الباري (٩/ ٤٣١) تغليق التعليق (٤/ ٤٧٠)

[2] البقرة: ٢٣١

[3] صحيح البخاری: كتاب النفقات، باب وجوب النفقة على الأهل والعيال، رقم الحديث (٥٠٤٠) ولفظه:

" أفضل الصدقة ما ترك غنى، واليد العليا خير من اليد السفلى، وابدأ بمن تعول، تقول المرأة إما أن تطعمني، وإما أن تطلقني، ويقول العبد أطعمني واستعملني، ويقول الابن أطعمني إلى من تدعني؟ فقالوا: يا أبا هريرة! سمعت هذا من رسول الله ﷺ؟ قال: لا، هذا من كيس أبي هريرة " ←

غلام اور چھوٹی اولاد کے متعلق بھی ان کا یہی خیال ہے۔ مفلس اور متعنت دونوں کی بیویاں طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہیں، عدالت صحیح حالات کا جائزہ لینے کے بعد فسخ کر سکتی ہے۔

اگر خاوند کے پاس مال موجود ہے، لیکن وہ بخیل ہے، پورا خرچ نہیں دیتا، تو اس کی اجازت کے بغیر بھی اس کے مال سے خرچ کر سکتی ہے، ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی کو آنحضرت ﷺ نے اس کی اجازت دی۔ (۱/ ۸۰۸) [1]

امام بخاری رحمہ اللہ کی اس محدثانہ تحقیق کے بعد مفلس اور متعنت خاوند اور مفقود کے مسائل قریباً صاف ہوجاتے ہیں۔ للہ درہ ما أغزر وبلہ وما أوسع فقہہ!

قیاس:

قیاس کے متعلق فقہاءِ کوفہ اور علماء ظاہر دونوں ہی افراط و تفریط میں مبتلا تھے، اب محسوس ہوتا ہے قیاس میں بے اعتدالی نے امام داود ظاہری اور امام ابن حزم پیدا کر کے قیاس کی حجیت کے انکار نے اس کی حجیت میں بے اعتدالیاں پیدا کی ہیں، وہ بے اعتدالی کی صدائے بازگشت ہے۔ فقہاءِ احناف رحمہم اللہ نے قیاس کو اس بے اعتدالی سے استعمال فرمایا کہ اس پر پابندی لگانا اہل حق کے لیے ضروری ہوگیا، لیکن اہل ظاہر کی راہ بھی اتنی ہی غیر معتدل ہے، جس طرح فقہاء احناف کی، اس بے اعتدالی کی

← مذکورہ بالا مرفوع حدیث کے آخری الفاظ " وابدأ بمن تعول " ہیں، اس کے بعد والے الفاظ اور تفصیل و تفسیر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اپنی بیان کردہ ہے، مرفوع حدیث کا حصہ نہیں، جیسا کہ آخر میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے خود بھی صراحت کر دی ہے، نیز دیکھیں: سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ٣٨٣) فتح الباري (٩/ ٥٠٠)

[1] صحيح البخاري: كتاب النفقات، باب إذا لم ينفق الرجل فللمرأة أن تأخذ بغير علمه ما يكفيها وولدها بالمعروف، رقم الحديث (٥٠٤٩)

ایک دو مثالیں سن لیجئے، تا کہ ائمہ حدیث کی اعتدال پسندی کی قدر معلوم ہو سکے۔

علامہ برجندی مشہور قاضی خاں کے متعلق حضرت سید انور شاہ صاحب کی رائے ہے کہ:

" و أرفع درجة من صاحب الهداية " (فيض الباري: ١/ ١٨٦)

ان کا مقام صاحب ہدایہ سے بھی اونچا ہے۔

قاضی خان فرماتے ہیں:

" رجل قال لامرأته إن لم يكن فرجي أحسن من فرجك فأنتِ طالق، وقالت المرأة إن لم يكن فرجي أحسن من فرجك فجاريتي حرة، قال الشيخ الإمام أبوبكر محمد بن الفضل رحمه اللّٰه تعالىٰ إن كانا قائمين عند المقالة برّت المرأة؛ وحنث الزوج وإن كانا قاعدين بر الزوج وحنثت المرأة لأن فرجها حالة القيام أحسن من فرج الزوج ، والأمر على العكس حالة القعود "

(قاضي خان: ١/ ٤٢١، باب التعليق)

اہل علم ترجمہ پر غور فرمائیں! آخر ان قیاسات نے دین کی کونسی خدمت سر انجام دی؟ بلکہ دین مضحکہ ہو کر رہ گیا!

ایک اور مثال:

"رجل تزوج امرأة وطلقها من ساعة فجاء ت بولد على تمام ستة أشهر من وقت النكاح كان الولد ولده عندنا خلافا لزفر"

(قاضی خان: ١/ ٣١٥)

ایک اور مثال:

إذا رأى الرجل امرأة تزني فتزوجها جاز النكاح وللزوج أن يطأها من غير استبراء الخ (قاضی خان: ١/ ٣٠٩)

علماء کھینچ تان کر ان مسائل کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ جواز تو پیدا کر لیں گے، مگر ایک حقیقت پسند مزاج ان معاذیر سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح میں "الاعتصام بالکتاب والسنۃ" پہلے مستقل عنوان مقرر فرمایا اور تیس کے قریب ذیلی ابواب سے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔[1] مقصد یہ ہے کہ انسان اولاً واضح نصوص کا اتباع کرے اور مقاییس کی تلاش میں نہ پھرے اور اگر ضرورت محسوس ہو، تو پھر مقیس علیہ واضح اور معلوم ہونا چاہیے، یعنی علت حکم واضح اور ظاہر ہونا چاہیے:

" باب من شبه أصلاً معلوما بأصل مبين، وقد بين النبي ﷺ حكمهما ليفهم السائل " (۱۰۸۸/۲)

امام کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیاس میں اصل اور علت کو بیّن اور واضح ہونا چاہیے، محض ظن اور تخمین پر انحصار نہ کیا جائے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے، تو قیاس کی بہت سی بے اعتدالیوں سے بچا جا سکتا ہے، یہی ائمہ حدیث کا مذہب ہے، وہ قیاس کو حجت مانتے ہیں، لیکن اس کے استعمال میں بے اعتدالی نہیں فرماتے اور نصوص کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتے، نہ ہی علماء ظاہر کی طرح اس کی ضرورت اور حجیت سے انکار فرماتے ہیں۔

کتاب الرد علی الجھمیّۃ:

آخری مندرجہ عنوان کے تحت قریباً ساٹھ ذیلی ابواب[2] میں علماء کلام کی

---

[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے " کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ " میں اٹھائیس ابواب ذکر کیے ہیں۔

[2] صحیح بخاری کے بعض رواۃ نے آخری عنوان " کتاب التوحید " ہی پر اکتفا کیا ہے اور بعض رواۃ نے " الرد علی الجھمیۃ وغیرھم " کے الفاظ کا اضافہ بھی نقل کیا ہے، دیکھیں: فتح الباری (۱۳/ ۳۴٤) امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب میں اٹھاون (۵۸) ابواب ذکر کیے ہیں۔

متکلمانہ مباحث کو محدثانہ سادگی سے ذکر فرمایا، توحید، شفاعت، استواء علی العرش، رؤیت باری، سمع، بصر وغیرہ صفات کا تذکرہ فرما کر ائمہ سنت کا مذہب واضح فرمایا، جس سے نئی اور پرانی بدعات سے ذہن صاف ہو جاتا ہے۔ مضمون خلاف امید لمبا ہو چکا ہے، ورنہ اس کی تفصیل بھی دلچسپ تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مسلک حق کی حمایت اور اس کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے اور بدعت سے بچنے کی توفیق دے۔

ضرورت:

صحیح کے ابواب سے جہاں تک امام کے مذہب کو سمجھا جا سکتا ہے، ضرورت ہے کہ شروح بخاری کی اعانت سے اسے مرتب کیا جائے، ائمہ اربعہ کے ساتھ اتفاق اور اختلاف کو الگ کیا جائے اور تفردات بھی ہوں تو انھیں بھی نمایاں کر دیا جائے۔ تھوڑی سی محنت سے توقع ہے ایک مفید تالیف مرتب ہو جائے، فتح الباری، عمدة القاری، قسطلانی اور کرمانی سے ایسا مجموعہ مرتب ہوسکتا ہے۔

خبر واحد:

ائمہ کلام اور فقہاء نے گفتگو کا جو انداز خبر واحد کے متعلق اختیار فرمایا تھا، اس کی تفصیل علم کلام کی کتابوں میں موجود ہے، ان سے متاثر ہو کر علماء اصول نے بھی اصول فقہ میں اسے مستقل بحث کی حیثیت دے دی۔ کچھ شک نہیں کہ اخبار کے مراتب میں تفاوت ہے، ہر خبر ایک پایہ کی نہیں، متواتر جسے قرآن کا ہم پایہ سمجھا جاتا ہے، اس کی حجیت میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ سمنیہ اور براہمہ متواتر کو بھی حجت نہیں سمجھتے۔ (کشف الأسرار[1])

حالانکہ دنیا کا پورا نظام خبروں پر چل رہا ہے، متکلمین اور فلاسفہ سے متاثر ہو کر

---

[1] کشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي (٢/ ٥٢٤) إرشاد الفحول (١/ ١٣٠)

علماء اصول نے بھی اسے خطرناک مبحث کی صورت دے دی، خبر واحد ان کی نظر میں کوئی ہیبت ناک چیز ہے، اصول بزدوی اور اس کی شرح "کشف الأسرار" ملاحظہ فرمایئے، [1] خبر واحد اور اس کی حجیت اور اس پر اعتراضات میں کئی اجزا لکھ دیے گئے ہیں، إرشاد الفحول کے مؤلف نے بھی ان مباحث کا کافی حصہ لکھا ہے۔ [2]

متکلمین کی بحث تو سمجھ میں آتی ہے، وہ فلاسفہ سے متاثر ہیں اور انھیں احادیثِ صفات کے انکار سے پہلے کسی نہ کسی آڑ کی ضرورت تھی، مگر فقہاء حنفیہ اور ائمہ اصول کو معلوم نہیں کیا ہوا، وہ بھی خبر واحد سے بے حد گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ فصلِ خصومات کا سارا انحصار اخبار آحاد پر ہے اور محکمہ قضا میں ساری قوتِ فیصلہ شہادت پر ہے۔ یہ ظن اصطلاحی تھا، عوام نے اور خصوصاً منکرین سنت نے اسے عرفی معنی میں لیا، بلکہ اس سے بھی کمتر، یعنی وہم کے مرادف سمجھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس مسامحت نے احادیث کے تمام تر ذخیرہ کو ظنی اور وہمی کہہ دیا اور سنت کے خلاف ان جہلاءِ دہر نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔

خبر واحد:

ہر خبر بلحاظ خبر صدق اور کذب کی متحمل ہے، اس میں تمام اخبار مساوی ہیں، تواتر، شہرت اور وحدت یہ خبر کے اوصاف اور عوارض ہیں، اسی طرح کذب، اشتباہ، وضع یہ بھی خبر کے اوصاف وعوارض ہیں، ہر خبر کے ساتھ ان اوصاف، عوارض یا قرائن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ان قرائن کی وجہ سے خبر کے مراتب میں تفاوت ہوگا۔ کذب، اشتباہ، وضع یہ رد کے قرائن ہیں اور کبھی اس میں توقف کی ضرورت ہوتی

[1] أصول البزدوي (ص: ١٥٢) كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي لعبد العزيز البخاري (٢/ ٥٣٨)

[2] إرشاد الفحول (١/ ١٣٣)

ہے، اس کے علاوہ ہر خبر مقبول ہے، صحیح، حسن خبر واحد ہی کی اقسام ہیں۔

پھر خبر کے رد و قبول کا تعلق رواۃ کے اعداد و شمار ہی سے نہیں، بلکہ مخبر کے اوصاف اور خصائص کا بھی اس پر اثر ہوتا ہے، کون نہیں جانتا کہ ہزار بشر بن غیاث مریسی ایک امام احمد سے ٹکر نہیں لے سکتا اور مثلاً اگر حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ ایک خبر دے دیں، دس کروڑ پرویز، اسلم جیراج پوری اور عمادی عددی اکثریت سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے ائمہ رجال نے اوصافِ رجال کا تذکرہ کتب رجال میں بسط سے فرمایا ہے۔ خبر واحد میں اگر ظنیت کا کوئی واہمہ ہے، تو وہ من حیث العدد ہے، اوصاف رجال کے لحاظ سے اگر خبر واحد کے رواۃ میں ایسے مستند رواۃ آ جائیں، جو اپنے وقت میں صدق و ثقاہت میں مستند سمجھے گئے ہوں، تو یہ عددی ظنیت وہیں ختم ہو جائے گی، اصطلاحی ظن ہو یا عرفی، عرف جہلاء میں استعمال کر کے منکرین حدیث نے ایک کہرام مچا دیا، اس کہرام سے آج مستند علمی حلقے بھی متاثر ہیں، بعض دینی تحریکات کے بانی اصحاب فکر بھی اس قدر بہکی ہوئی باتیں کرتے ہیں، جو ان کے مقام سے کہیں فروتر ہیں، شرم آتی ہے کہ یہ لوگ کس سادگی سے شیاطین اعتزال کی گرفت میں آ گئے! ائمہ حدیث کی آسانیت کو ارباب اعتزال کے پاس رہن رکھ رہے ہیں: ﴿ وھم یحسبون أنھم یحسنون صنعا ﴾ [1]

مصنفین کے اصول:

ساری مصیبت غالباً اس سے پیدا ہوئی کہ اصول فقہ کے مصنفین اور واضعین میں ارباب اعتزال کو بہت حد تک دخل ہے، علامہ کاتب چلپی ۱۰۶۷ھ علامہ علاؤ

[1] الکھف: ۱۰۴

الدین حنفی سے نقل فرماتے ہیں:

" اعلم أن أصول الفقه فرع لعلم أصول الدين فكان من الضرورة أن يقع التصنيف فيه على اعتقاد مصنف الكتاب، وأكثر التصانيف في أصول الفقه لأهل الاعتزال المخالفين لنا في الأصول، ولأهل الحديث المخالفين لنا في الفروع، ولا اعتماد على تصانيفهم " الخ

(كشف الظنون عن الكتب والفنون ١/ ٨٩، بحث أصول الفقه، أبجد العلوم: ٢/ ٣٢٥)

فرماتے ہیں: اصول فقہ علم کلام کی فرع ہے اور ہر تصنیف اپنے مصنف کے اعتقاد کی مظہر ہوتی ہے، اصول فقہ میں زیادہ تر تصانیف معتزلہ اور اہل حدیث کی ہیں، اول الذکر اصول میں ہمارے مخالف ہیں اور دوسرے فروع میں، ان کی تصانیف پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ [1]

اس کے بعد حنفی علماء اصول کی تصانیف کا ذکر فرمایا کہ بعض علماء دقائق اصول سے آشنا نہ تھے اور نہ ہی معقولات کو صحیح طور پر سمجھتے تھے، اس لئے ہمارے اصول کی کتابوں میں آمیزش ہوگئی اور علامہ علاؤ الدین کا یہ ارشاد صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اصول

[1] نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ " أبجد العلوم " میں اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اہل حدیث اور ان کی تصانیف پر عدم اعتماد ایسی بات ہے، جس میں انتہائی تعصب کی آمیزش ہے، جو تقلیدی بطن سے نمودار ہوئی ہے۔ کیونکہ اگر اہل حدیث کی کتب پر اعتماد نہیں کیا جائے گا، جو دین میں ایک نمونہ اور قدوہ اور اہل فقہ اور مقلدین سے کئی گنا زیادہ کتاب وسنت کی نصوص کا علم اور معرفت رکھنے والے ہیں، تو کون سی جماعت اعتماد واعتناء کے لائق ہے؟، اس حنفی متعصب کی یہ بات انتہائی سنگین غلطی ہے، جو صرف اس شخص سے صادر ہوسکتی ہے جس کو علم وانصاف چھو کر بھی نہ گزرا ہو، اس قول پر کوئی علمی دلیل نہیں! "

نہ اعتزال کی آمیزش سے محفوظ نہیں۔ فقط راوی اور خبر واحد کی ظنیت کا مسئلہ اعتزال
کی راہ سے علماءِ اصول میں آ گیا ہوگا۔

امام بخاری رحمہ اللہ معتزلہ کی ان نوازشوں سے بے خبر نہ تھے، جو ان لوگوں نے
سلام اور ائمہ اسلام پر کی تھیں، مامون، معتصم اور واثق باللہ کی عنایتیں ابھی حدیث
محفل تھیں، خبر واحد کے متعلق ان کے نظریات سے ائمہ اسلام نا آشنا نہ تھے اور ائمہ
حدیث اصول فقہ میں بعض دوسرے فقہاء کی طرح خامکار بھی نہ تھے، اس لئے انھوں
نے "الجامع الصحیح" کے آخر میں " کتاب أخبار الآحاد" کا اضافہ فرمایا اور
پہلے ذیلی باب میں حضرات معتزلہ کی لغزش کو بے نقاب فرمایا کہ خبر واحد اگر مخبر صادق
کی طرف سے ہو تو وہ جانبر اور حجت ہوگی، اس میں قرآن مجید سے بھی استدلال
فرمایا:

﴿ فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا فى الدين ﴾ ❶

فرمایا: "ویسمی الرجل طائفة" ❷ ادنیٰ اطلاق کے لحاظ سے "طائفه" ایک
آدمی پر بھی بولا جاتا ہے اور عام مفہوم کے لحاظ سے "طائفه" کا لفظ تواتر سے کم پر بھی
بولا جائے گا۔

---

❶ التوبة: ۱۲۲

❷ صحيح البخاری: كتاب أخبار الآحاد، باب ما جاء في إجازه خبر الواحد الصدوق في الأذان والصلاة والصوم والفرائض والأحكام وقول الله تعالىٰ ﴿ فلو لا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون ﴾ ويسمىٰ الرجل طائفة لقوله تعالىٰ ﴿ وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا ﴾ فلو اقتتل رجلان دخلا في معنى الآية، وقوله تعالىٰ: ﴿ إن جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا ﴾ وكيف بعث النبی ﷺ أمراءه واحداً بعد واحد فإن سها منهم رد إلى السنة، (۱۳/ ۲۳۳، مع الفتح)

ایسے لوگ علم دیانت یا اصول و فروع کے متعلق جو بھی فرمادیں گے، وہ خبر واحد ہوگا، جسے قرآن نے قابل قبول فرمایا ہے۔

﴿ إن جاءكم فاسق بنبأ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة ...... ﴾ [1] میں دوسرے پہلو کی وضاحت فرمائی کہ فاسق کی خبر میں تبیّن کی ضرورت ہے، اگر قرائن مل جائیں، تو اس کی بھی تصدیق کی جائے گی۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ خبر واحد کی ظنیت بمعنی عدم احتجاج اس وقت تک ہے، جب مخبر فاسق ہو اور تبیّن نہ کیا گیا ہو، مومن ثقہ اور صادق کی خبر میں کوئی اشتباہ اور ظن کی گنجائش نہیں، اس لئے مسلسل ایسی احادیث بیان فرمائی ہیں، جن میں خبر واحد پر اعتماد کیا گیا ہے، یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ مخبر ثقہ ہے، صادق ہے، اس کی بات بلا تبیّن قبول کی گئی۔

تحویل قبلہ کے وقت ایک آدمی کی اطلاع پر پوری جماعت رو بقبلہ ہوگئی، [2] آنحضرت ﷺ کے خطوط اور فرامین مختلف ممالک کی طرف خبر واحد کے طور پر ہی بھیجے گئے، [3] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا، [4] حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بطور جاسوس بھیجا، [5] وفود عرب کو حکم کیا کہ وہ اپنے وطن جا کر اسلام کی اشاعت کریں، [6] ان کی تعداد حد تواتر کو

---

[1] الحجرات: ٦

[2] صحيح البخاري (رقم الحديث: ٦٨٢٤، ٦٨٢٥)

[3] صحيح البخاري (رقم الحديث: ٦٨٣٦)

[4] صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب ما جاء في دعاء النبي ﷺ أمته إلى توحيد الله تبارك وتعالىٰ، رقم الحديث (٦٩٣٧)

[5] صحيح البخارى، كتاب أخبار الآحاد، باب بعث النبى ﷺ الزبير طليعة واحدة، رقم الحديث (٦٨٣٣)

[6] صحيح البخارى، (رقم الحديث: ٦٨١٩، ٦٨٣٨)

نہیں پہنچی تھی، ابو عبیدہ بن جراح کو بطور امین بھیجا اور وہ اکیلے تھے۔ [1]

اس کے علاوہ قرآن میں خبر واحد ثقہ کی حجیت پر واضح دلائل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک آدمی کی اطلاع پر کہ فرعون اور اس کے عمائد تمہارے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں، مصر سے ہجرت کے بعد یمن چلے گئے اور یمن پہنچ کر ایک لڑکی کی اطلاع پر اس کے گھر چلے گئے۔ [2]

ان دلائل سے وہ سارا تار و پود بکھر جاتا ہے، جو معتزلہ نے خبر واحد کے متعلق پھیلا رکھا تھا اور وہ تمام قلعے مسمار ہو جاتے ہیں، جو کتب اصول میں اخبار آحاد کی حجیت کی راہ میں تعمیر کیے گئے اور بعض لیڈر نما اہل علم ان سے متاثر ہو کر عوام کے لیے مصیبت بن رہے ہیں!

کتاب اخبار الآحاد اور اس کے ذیلی ابواب پر نظر رکھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اہل حدیث اور ائمہ سنت کے دماغ اس ہنگامہ سے بالکل صاف ہیں، جو ائمہ اعتزال نے متکلمین اور ائمہ اصول کی معرفت بپا کر رکھا ہے، وہ خبر پر رواۃ اور ان کی صفات کے لحاظ سے غور فرماتے ہیں اور رد و قبول کے علاوہ رواۃ کی صفات میں اس اصول پر غور کے بعد وہ سب ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں جو اخبار آحاد کے متعلق بپا کیے گئے۔

---

[1] صحيح البخاري (رقم الحديث: ٦٨٢٧، ٦٨٢٨)

[2] القصص (٢٠، ٢١، ٢٢، ٢٣، ٢٤، ٢٥)

حدیث شریف کا مقام حجیت

یہ مضمون ماہنامہ ''صحیفہ اہلحدیث'' کراچی (مئی ۱۹۴۹) کی متعدد اقساط میں ''حضرت محبوب رب العالمین کی حدیث شریف کا مقام حجیت، مولانا مودودی صاحب کے مضمون ''مسلک اعتدال'' پر ایک مخلصانہ نظر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، ''صحیفہ اہلحدیث'' کے فاضل مدیر مولانا عبدالجلیل دہلوی رحمہ اللہ اس مضمون کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل بات یہ ہے کہ مولانا مودودی نے ''مسلک اعتدال'' پر ایک مضمون لکھا تھا، اس میں حدیث شریف کے مسلک اعتدال سے اعتزال واقع ہوا، قلم سے کچھ ایسے الفاظ سرزد ہوئے، جس سے حدیث نبوی اور اس کے حاملین کے وقار پر ٹھیس لگی، مولانا محمد اسماعیل صاحب شکر اللہ سعیہ نے حدیث شریف اور اس کے حاملین کرام کی حمایت و ہمدردی میں مندرجہ ذیل مضمون لکھا، جس میں مولانا صاحب نے بدلائل واثقہ ثابت کیا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں منزل من اللہ ہیں، ماننے، امر و نہی کرنے ، حجت پکڑنے میں دونوں یکساں ہیں، نیز قرآن مجید محفوظ ہے اور حدیث نبوی کی بھی حفاظت کی گئی ہے۔''

(صحیفہ اہلحدیث، مئی ۱۹۴۹)

حدیث شریف کا مقام حجیت

واضح رہے کہ قرآن و حدیث منزل من اللہ ہیں اور حجیت میں دونوں یکساں ہیں، ایک حاکم کے دو حکموں میں تفاوت نہیں ہو سکتا، ارشاد خداوندی ہے:

﴿ إن الذين يكفرون بالله ورسله ويريدون أن يفرقوا بين الله ورسله ويقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون أن يتخذوا بين ذلك سبيلا ۝ أولٓئك هم الكافرون حقا وأعتدنا للكافرين عذابا مهينا ۝ والذين اٰمنوا بالله ورسله ولم يفرقوا بين أحد منهم أولٓئك سوف يؤتيهم أُجورهم وكان الله غفورًا رحيما ۝﴾

(سورة النساء: ١٥٠ تا ١٥٢)

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض احکام مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ درمیانی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ یقیناً کافر ہیں اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان میں تفریق نہیں کرتے، ان کو اجر ملے گا اور اللہ کی بخشش اور رحمت ان کے شامل حال رہے گی۔''

ہمارے اہل قرآن دوستوں کا مسلک بھی تقریباً اس کی ایک صورت ہے، ایک کو حجت ماننا دوسرے کی حجیت سے انکار کرنا یہ تفریق ہے، جس پر قرآن نے سرزنش فرمائی ہے۔

حدیث: ((أوتیت القرآن و مثله معه)) ❶ کا مقصد بھی یہی ہے اور یہی اصول اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

شیخ عبدالعزیز بن احمد البخاری رحمہ اللہ (۴۲۸ھ) نے شرح اصول بزدوی میں فرمایا ہے:

" لأن قوله علیه السلام حجة مثل الکتاب " (کشف الأسرار: ۶۷۹) ❷

جہاں تک حجیت حدیث کا تعلق ہے، ائمہ سنت میں کوئی اختلاف نہیں۔

روایت و اسناد حدیث:

قرآن و حدیث کے ہم تک پہنچنے میں فرق ہے، قرآن عزیز جس طرح نازل ہوتا گیا، ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھتے اور یاد کرتے رہے، پھر یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، ہزاروں لوگ ایک دوسرے سے پڑھتے رہے، اسلامی ممالک میں جس قدر وسعت ہوئی، قرآن کی اشاعت بھی اسی قدر وسیع پیمانہ پر ہوتی رہی، فتوحات کے لحاظ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی سال مشہور ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے متعدد نسخے خاص رسم الخط سے نقل

---

❶ مسند أحمد (۴/ ۱۳۰) رقم الحدیث (۱۷۲۱۳) یہ حدیث زیادہ تر بایں الفاظ " أوتیت الکتاب " مروی ہے، دیکھیں: سنن أبي داود، کتاب السنة، باب في لزوم السنة، رقم الحدیث (۴۶۰۴) سنن الدار قطني (۴/ ۲۸۷) صحیح ابن حبان (۱/ ۱۸۹) سنن البیهقي (۹/ ۳۳۲) المعجم الکبیر (۲۰/ ۲۸۳) اس حدیث کو امام ابن حبان، امام بیہقی (مفتاح الجنة، للسیوطی: ۱۲) امام شوکانی (إرشاد الفحول: ۱/۹۶) اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

❷ کشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي لعبد العزیز البخاري (۲/ ۵۲۰)

کرائے اور ہر صوبہ و کمشنری میں ایک ایک نسخہ بھیج دیا، [1] تا کہ عجمی ممالک تصحیح الفاظ و مخارج کے لیے اس اصل کی طرف رجوع کریں۔ اس نسخہ کی خصوصیت یہ تھی کہ قرأت سبعہ متواترہ اس کے رسم الخط میں جمع کر دی گئی تھی، اس نسخہ کی نقل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نسخہ، جو ان کی زندگی میں لکھا گیا تھا، وہ بطور اصل استعمال ہوا [2] اور احتیاطاً حفاظ قرآن اور انفرادی دستاویز بھی زیر نظر رکھ لی گئیں، حفاظ کی ایک جماعت نے اس کی پوری نگرانی کی۔ [3] والتفصیل في الملل والنحل لابن حزم۔ [4]

جہاں نقل میں یہ احتیاط برتی گئی، وہاں حفاظ کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی تھی اور قدرتی طور پر قرآن کے الفاظ منضبط ہو گئے، مفہوم قرآن کے ساتھ اس کے الفاظ حفاظ نے یاد کیے اور صحیفوں میں خطی طور پر محفوظ کر دیے گئے۔

یہ تواتر لفظی قرآن عزیز کی خصوصیت ہے، جو کسی دوسری آسمانی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

کتابتِ حدیث:

ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لکھنے سے روک دیا، تا کہ عامۃ المسلمین اسے قرآن کے ساتھ خلط نہ کریں، جب قرآن کے ضبط و حفظ کے متعلق اطمینان ہو گیا، تو حدیث لکھنے کی اجازت ہو گئی۔ (جامع ابن عبدالبر) [5]

---

1. صحيح البخاري: كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، رقم الحديث (٤٧٠٢)
2. مصدر سابق، رقم الحديث (٤٧٠١، ٤٧٠٢)
3. مصدر سابق
4. الفصل في الملل والأهواء والنحل لابن حزم (٢/ ٦٥)
5. جامع بيان العلم وفضله لابن عبد البر (١/ ١٢٩، ١٤١)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے کئی یادداشتیں لکھیں❶، بعض یادداشتیں آنحضرت ﷺ نے خود منضبط فرمائیں، سلاطین کے ساتھ جو خط وکتابت ہوئی، اسے ائمہ حدیث نے ان نوشتوں سے نقل فرمایا، جو آج کل کتب حدیث کی زینت ہیں۔ بعض معاہدات کی نصوص کا تذکرہ ابو عبید قاسم بن سلاّم رحمہ اللہ نے "الأموال" میں فرمایا ہے، علامہ سہیلی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کا ذخیرہ محفوظ کیا ہے۔❷

"صادقہ" نام سے ایک صحیفہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس تھا، جو ان کی اولاد کے پاس دیر تک موجود رہا،❸ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ محفوظ ذخیرہ کافی حد تک امام

---

❶ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

❷ الأموال لأبي عبيد (ص: ٢٨، ٢٤٤) الروض الأنف للسهيلي (٢/ ٣٤٥، ٤/ ٤٨، ٣٠٠، ٣١٥، ٣٦٧، ٣٧٠)

علاوہ ازیں بعض علماء نے رسول اللہ ﷺ کے مکاتیب و رسائل اور معاہدات کو مستقل تصانیف میں جمع کیا ہے:

① المصباح المضيء في كتاب النبي الأمي ورسله إلىٰ ملوك الأرض من عربي وعجمي لأبي عبدالله محمد بن علي بن أحمد بن حديدة الأنصاري، المتوفى سنة: ٧٨٣هـ (طبعة دار الندوة الجديدة، بيروت لبنان، ١٤٠٦هـ

② مجموعة الوثائق السياسية في العهد النبوي والخلافة الراشدة للدكتور محمد حميد الله الحيدر آبادي، طبعة مكتبة الثقافة القاهرة.

③ إعلام السائلين عن كتب سيد المرسلين.

❸ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث لکھنا ثابت ہے، بلکہ وہ جو چیز بھی رسول اللہ ﷺ سے سنتے، اسے لکھ لیا کرتے تھے، دیکھیں: صحيح البخاري: كتاب العلم، باب كتابة العلم، رقم الحديث (١١٣) سنن أبي داود: كتاب العلم، باب في كتاب العلم، رقم الحديث (٣٦٤٦) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: دوام حدیث (١/ ١٤٢)

مالک رحمہ اللہ نے ”مؤطا“ میں نقل فرما دیا، مؤطا سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے اپنی صحیح میں منتقل فرما دیا۔

”صادقہ“ مسلسل لکھی ہوئی احادیث کا ذخیرہ ہے، جسے مقتدر اور ثقات صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی اور کتابت کا شرف حاصل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی اس قسم کی تحریری یاد داشتوں کا ایک انبار تھا، جس کی طرف آخر عمر میں بوقت ضرورت رجوع فرمایا کرتے تھے اور بعض احادیث کی توثیق کے لئے ان صحف محفوظہ پر اعتماد فرمایا کرتے تھے۔ [1]

یہ سلسلہ کتاب اس قدر عام ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال اور فتاویٰ بھی بعض لوگوں نے لکھنے شروع کر دیے، [2] مگر ان میں وہ احتیاط نہ تھی، جو احادیث کے متعلق

← حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما اس صحیفے کی انتہائی حفاظت کیا کرتے تھے، اسے ایک بڑے صندوق میں مقفل کر کے رکھتے اور ضرورت پڑھنے پر طلب کر کے اس سے احادیث بیان کیا کرتے تھے، بعد ازاں یہ صحیفہ ان کے خاندان میں محفوظ رہا، جسے عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عاص بیان کیا کرتے تھے۔

دیکھیں: مسند أحمد (٢/ ١٧٦) فتاویٰ ابن تیمیة (١٨/ ٨) تعلیق العلامة أحمد شاکر علی سنن الترمذي (٢/ ١٤١)

[1] سنن الدارمي (١/ ١٣٨) شرح معاني الآثار (٤/ ٣٢٠) جامع بیان العلم (١/ ٢٨١)، نیز دیکھیں: تاریخ بغداد (١٤/ ١٨١) فتح الباري (١/ ٢٠٧) دوام حدیث (١/ ١٥٩)

[2] صالح بن کیسان رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

”میں اور ابن شہاب زہری علم حاصل کیا کرتے تھے، پھر ہم نے احادیث و سنن کو لکھنے کا تہیہ کیا، تو جو بھی ہم نبی ﷺ کی طرف سے احادیث سنتے اسے لکھ لیتے، پھر ابن شہاب نے کہا کہ آؤ! اصحاب رسول ﷺ کے اقوال و افعال بھی لکھیں، تو میں نے کہا: نہیں، یہ سنت نہیں ہے، اس پر ابن شہاب نے کہا کہ وہ سنت ہی ہے، پھر انھوں نے لکھا اور میں نے نہ لکھا، پس وہ کامیاب رہے اور میں نے ضائع کر دیا۔“ مصنف عبدالرزاق (١١/ ٢٥٨) جامع بیان العلم (١/ ١٥٥) تقیید العلم (ص: ١٠٦) ←

فرمائی جاتی تھی۔

مقدمہ صحیح مسلم میں مرقوم ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتوے کا ایک ذخیرہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کا کافی حصہ کاٹ دیا اور فرمایا:

"ما قضى بها علي إلا أن يكون قد ضل" ❶

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے نہیں ہیں اور اگر ہوں تو وہ غلط ہیں۔

یہ فتاویٰ حجت بھی نہیں تھے اور محفوظ بھی نہ تھے، لیکن حدیث کی نقل و وضاحت کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم میں تشدد و احتیاط کافی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمارے اہل قرآن کی محفلوں میں ان کا تذکرہ بحیثیت منکر حدیث آتا ہے، یہ تو غلط ہے، البتہ بلحاظ نقاد حدیث یا امام جرح و تعدیل یہ تذکرہ بالکل درست ہے، بعض وقت یہ تشدد اس قدر زیادہ ہوجاتا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے برملا فرمایا:

"لا تكن عذابا على أصحاب محمد ﷺ" ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تثبت کیا ہے۔ ❸

⟵ اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے اقوال و افعال کی کتابت و تدوین بھی عہد مبکر ہی میں شروع ہوگئی تھی، چنانچہ صحابہ کرام کے اقوال و آثار کا بیشتر ذخیرہ ائمہ حدیث مالک بن انس، عبدالرزاق، سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، بیہقی، ابن عبدالبر اور ابن حزم وغیرہم نے اپنی کتب میں جمع کر دیا ہے، جو آج امت کے پاس محفوظ و موجود ہے، وللہ الحمد!

❶ مقدمہ صحیح مسلم (۱/ ۱۲)

❷ تم اصحاب رسول کے لیے باعث تکلیف مت بنو!

❸ صحیح مسلم: كتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحديث (٢١٥٤) یہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ نیز دیکھیں: فتح الباري (۱۱/ ۳۰) دوام حدیث (۱/ ۱۷۸)

مقام غور یہ ہے کہ بے ضرورت چیزوں کی حفاظت کون کرتا ہے؟ اگر حدیث حجت نہ تھی، تو اس کے لیے یہ احتیاط کیوں تھی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خود اہل زبان تھے، مقاصد کلام کو خوب سمجھتے تھے اور حدیث "من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار" ❶ بھی پیش نظر تھی، اس لئے حفظ الفاظ کی پابندی اور روایت بالمعنی میں پوری احتیاط سے کام لیا گیا۔ ﴿أولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة وأولئك هم المهتدون﴾ ❷

دوم:

بلحاظِ نقل و روایت حدیث کا مقام قرآن کے بعد ہے، ائمہ اسلام نے بلحاظ ثبوت اسے ثانوی حیثیت دی، کتب اصول فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ عوام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ حدیث کی حجیت اور ماننا یہ بھی قرآن سے دوسرے مرتبہ پر ہے، حالانکہ قرآن کی صراحت کے مطابق حدیث بلحاظ وحی قرآن کی طرح خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی۔ اس کے بعض حصے قرآن کی عملی تفسیر کے طور پر ہیں، بعض قرآن سے زائد، نماز، روزہ، حج، زکوۃ کے تفصیلی احکام اسی زیادت کی قسم کے ہیں، ان احکام کے اثبات میں حدیث کی حیثیت مستقل ہے۔ ❸

---

❶ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ، رقم الحديث (١١٠) صحيح مسلم، في المقدمة (١/ ١٠) و كتاب الزهد والرقائق، باب التثبت في الحديث و حكم كتابة العلم، رقم الحديث (٣٠٠٤)

❷ البقرة: ١٥٧

❸ یعنی قرآن و حدیث دونوں کا منبع و مرکز چونکہ وحی الٰہی ہے، اس لیے دونوں اطاعت میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ان عملی تفصیلات کو قرآن سے برآمد کرنے کے لیے جو تکلفات کیے گئے ہیں،

"اہل علم کا اتفاق ہے کہ سنت مطہرہ شرعی احکام سازی میں مستقل حیثیت رکھتی ہے اور وہ تحلیل وتحریم میں قرآن کی طرح ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "ألا إني أوتيت القرآن ومثله معه" یعنی مجھے قرآن اور اس جیسی ایک اور چیز سنت دی گئی ہے، جسے قرآن نے بیان نہیں کیا۔"

مزید لکھتے ہیں:

"حاصل کلام یہ ہے کہ سنت مطہرہ کی حجیت اور شرعی احکام سازی میں استقلال ایک دینی ضرورت ہے، جس کا صرف وہی شخص انکار کرسکتا ہے، جس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔" (إرشاد الفحول: ۱/ ۹۶)

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنت دو اعتبار سے قرآن کی مثل ہے:

① دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے (وحی) ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وما ينطق عن الهوىٰ ۝ إن هو إلا وحي يوحىٰ﴾

② اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے دونوں وجوب اطاعت میں برابر ہیں: ﴿من يطع الرسول فقد أطاع الله ومن تولىٰ فما أرسلناك عليهم حفيظا﴾ اور ﴿يآ أيها الذين آمنوا أطيعوا الله وأطيعوا الرسول وأولي الأمر منكم فإن تنازعتم في شيء فردوه إلى الله والرسول إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر ذلك خير وأحسن تأويلا﴾ اور دونوں صرف اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ مصحف میں قرآن کے علاوہ کچھ نہیں لکھا جاتا اور اس کے ساتھ اکٹھا ملا کر کسی اور چیز کی تلاوت نہیں کی جاتی اور قوت اعجاز میں۔ الإحكام في أصول الأحكام (٤/ ٥٠٦)

مزید برآں قرآن مجید اور سنت کے باہمی تعلق کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سنن نبویہ کی تین اقسام ہیں:

① جو چیز اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل کی، بعینہ وہی چیز رسول اللہ ﷺ نے بھی بیان کر دی۔

② اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کسی چیز کو مجمل طور پر ذکر کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی مراد و مفہوم کو وضاحت اور تفصیل وتفسیر کے ساتھ بیان کر دیا۔

③ رسول اللہ ﷺ نے ایسے احکام جاری کیے، جو قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ (الرسالة: ٩٠) نیز دیکھیں: جامع بيان العلم وفضله لابن عبدالبر (٢/ ٣٦٦)

علمی طور پر ان کی کوئی قیمت نہیں، اہل علم تو خیر ان سے کیا متاثر ہوں گے، جہلاء کے لیے بھی ان میں کوئی تسکین نہیں۔ اہل قرآن کی مختلف پارٹیوں کی انکشافی مساعی نے نماز کا جو آپریشن کیا ہے، وہ اس گزارش پر شاہد عدل ہے اور پھر وہ بھی کتاب اللہ پر زیادت ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولوی عبداللہ، مولوی رمضان کی ترمیم و اصلاح شدہ نمازیں بھی قرآن پر زیادت ہیں اور بخاری کی نماز بھی زیادت ہی ہے، تینوں میں سے کسے قبول کرنا ہے اور کسے رد کرنا ہے؟ یہ حضرات اہل قرآن کی صوابدید پر ہے۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کا قول:

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ المتوفی ۶۴۳ھ فرماتے ہیں:

" إن أمثال المتواتر على التفسير المتقدم يعز وجوده إلا أن يدّعىٰ ذلك في حديث من كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار "

(نزهة النظر: ۱۱، و مقدمہ ابن صلاح: ۱۳۵) [1]

یعنی متواتر کا وجود بہت کم ہے، یہ دعویٰ صرف حدیث " من كذب علي " الخ کے متعلق کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کی جلالت قدر کی بنا پر ان کے اس ارشاد سے بے حد مغالطہ ہوا، لوگوں نے سمجھا کہ شاید متواتر کا وجود ہی دنیا میں ناپید ہے، حالانکہ متواتر میں جہاں کثرت رواۃ ضروری ہے، وہاں صفاتِ رواۃ پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے، متواتر میں شرط یہ ہے کہ اس کے رواۃ کا جھوٹ پر جمع ہونا ناممکن ہے۔

---

[1] مقدمة ابن الصلاح (ص: ۱۵۵) نزهة النظر لابن حجر (ص: ٤٧) ابن الصلاح رحمہ اللہ کا قول نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " وما ادعاه من العزة ممنوع " یعنی انھوں نے متواتر حدیث کی قلت و ندرت کا جو دعویٰ کیا ہے، درست نہیں۔

یہ عدد کی کثرت سے بھی ہو سکتا ہے اور رواۃ کی رفعت شان سے بھی، بعض وقت ہم ایک آدمی کی شہادت کو ایک جماعت کی شہادت پر ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ اس ایک میں صفاتِ صدق و ثقاہت اس قدر موجود و باقی ہیں، جو ایک جماعت میں نہیں، یہ عُرف اور عقل کے مسلّمات سے ہے، اس اصول کی بنا پر اگر احادیث پر غور کریں، جس کے توسط سے یہ احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان کی جلالت قدر اور صدق و محنت پر نظر رکھیں، تو احادیث میں ایک بڑا ذخیرہ متواتر کا موجود ملے گا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”نزهة النظر“ [1] میں اور طاہر بن صالح الجزائری نے ”توجيه النظر“ [2] میں یہ نظریہ اختصار اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:

”وقد وقع هنا من الإبهام والإيهام في العبارات ما يضر بالمبتدئ، فإنه ربما توهم منها أنه ليس في السنة متواتر مع أن ما تواتر منها سواء كان من جهة اللفظ أو من جهة المعنى كثير يعسر إحصاؤه غير أن الأئمة المتعرضين لضبط السنة لم يتعرضوا له، لأنه ليس من مباحثهم“ [3] (توجيه النظر: ٤٨)

”متواتر کے متعلق علماء کی عبارات میں کچھ ابہام اور وہم سا ہوتا ہے، خطرہ ہے کہ مبتدی اس غلطی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ سنت میں کوئی متواتر ہے ہی نہیں، حالانکہ سنت میں متواتر باللفظ اور متواتر بالمعنی کی کثرت ہے، جسے شمار کرنا مشکل ہے، ائمہ حدیث نے اس طرف توجہ نہیں فرمائی، کیونکہ یہ ان کے مباحث سے نہیں ہے۔“

---

[1] مصدر سابق، نیز دیکھیں: فتح الباري (١/ ٢٠٣)

[2] توجيه النظر إلىٰ أصول الأثر (١/ ١٣٣)

[3] توجيه النظر إلىٰ أصول الأثر (١/ ١٣٦)

اسی طرح متواتر بالتعامل یا متواتر سکوتی بھی بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں، بلکہ اصول عبادات، اصول معاملات اور اصول اخلاق میں جو احادیث وارد ہیں، سب متواتر بالتعامل ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ بڑے سمجھدار اہل قرآن نے عبادات متواترہ کو علی خلاف التعامل خواہ مخواہ قرآن سے کشید کرنے کی کوشش کی اور ایسے ایسے اکتشافات فرمائے ہیں کہ رہتی دنیا تک اہل دانست ان پر تعجب کریں گے۔ شکر ہے کہ معاملات اور اخلاق کی طرف ان کی نگاہیں نہیں اٹھیں، ورنہ عجائبات کے کئی عوالم پیدا ہو جاتے۔ اصول حدیث اور اصول فقہ کے مبتدی بھی تواتر کی ان اقسام کو جانتے ہیں اور عقل سلیم ان حقائق کی شاہد ہے، گو اس کے متعلق علمی اصطلاحات میں اہل دانش گفتگو نہ کر سکے۔

مولانا سید اسماعیل شہید رحمہ اللہ دہلوی نے اپنے رسالہ ''اصول فقہ'' میں فرمایا:

"والمتواترة (من السنة) إما متواتر بالتعامل كأكثر أصول العبادات والمعاملات والأخلاق أو متواترة بالرواية، أما بالمعنى فقط وهي كثيرة أو باللفظ أيضا وهي قليلة جدا"

''یعنی سنت یا متواتر بالتعامل ہوگی، تمام اصول عبادات، معاملات اور اخلاق متواتر بالتعامل ہیں، یا صرف متواتر بالمعنی یا متواتر باللفظ والمعنی اور یہ فی الواقع کم ہے۔''[1]

صاحب ''مسلم الثبوت'' نے حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کے متذکرہ قول کا ذکر کر کے اس کی توجیہ ان الفاظ میں کی ہے:

" قد يقال مراده التواتر لفظا وإلا فحديث المسح على الخفين متواتر

[1] أصول الفقه (ص: ١٧)

رواه سبعون صحابيا، وقيل: حديث أنزل القرآن على سبعة أحرف متواتر رواه عشرون من الأصحاب، وقال ابن الجوزي: تتبعت الأحاديث المتواترة فبلغت جملة الخ " (مسلّم الثبوت:۲/ ۷۸) ❶

ابن صلاح کی مراد تواتر لفظی ہے، ورنہ مسح علی الخفین کی روایت متواتر ہے اور سات قرأت کی روایت بھی متواتر ہے، ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے متواتر احادیث کی تلاش کی، تو مجھے خاصہ ایک مجموعہ دستیاب ہو گیا۔

حافظ سیوطی کی کتاب " الأزهار المتناثرة في الأحاديث المتواترة " اہل علم کے ہاتھوں میں موجود ہے، جس میں بیسیوں روایتوں کے متعلق تواتر کا دعویٰ کیا گیا ہے، حتی کہ رفع الیدین فی الرکوع اور رفع سبابہ کی روایات کو بھی انھوں نے متواتر شمار کیا ہے۔ یہ کتاب " الفوائد المتكاثره " کی تلخیص ہے، حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے اس میں وہ روایات جمع کی ہیں، جو کم از کم دس صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، میرے پاس اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کی جلالت شان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اگر ان کے ارشاد کو ان کی منشا کے خلاف نہ اچھالا جاتا، تو تواتر کے مفہوم اور اقسام کے بسط کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

تواتر کی قطعیت:

تواتر کی قطعیت کو ہمارے حضرات منکرین حدیث نے اصول موضوعہ کی طرح مان لیا ہے، حالانکہ یہ بھی دنیا کے متفق علیہ مسائل سے نہیں، بلکہ اس میں نظار کو اختلاف ہے، چنانچہ صاحب مسلّم الثبوت فرماتے ہیں:

❶ مسلّم الثبوت مع فواتح الرحموت (۲/ ۱۲۰)

"الجمهور على أن ذلك العلم ضروري بالعادة ومال الغزالي إلى أنه من قبيل قضايا قياساتها معها، وهو قريب، وقال الكعبي وأبو الحسين والإمام أنه نظري، وتوقف المرتضىٰ والآمدي"

(مسلّم الثبوت: ۲/ ۸۱)❶

"جمہور کے نزدیک متواتر کا افادہ علم کی ضرورت عادی ہے، غزالی اسے "قیاساتها معها" کی قسم سے تصور کرتے ہیں، کعبی اور ابوالحسین وغیرہ متواتر سے حاصل شدہ علم کو نظری سمجھتے ہیں اور آمدی اس کے افادہ علم ہی میں متوقف ہیں۔"

روضہ لابن قدامہ حنبلی، امام الحرمین اور ابوالخطاب کو احباب شافعی نے بھی اسی زمرہ میں شمار کیا ہے۔ وكذا ذكره في حصول المأمول!

براہمہ متواتر کو بھی ظنی سمجھتے ہیں، ملاحظہ ہو: "کشف الأسرار"۔❷

پھر یہ بحث بھی متواتر کے الفاظ اور ان کے ہم تک پہنچنے کے متعلق ہے، رہا دلالت علی المفہوم کا مسئلہ تو اس میں کتاب اللہ، سنت متواترہ اور اخبار آحاد سب ظنی ہیں۔ تفسیر قرآن میں اہل علم کے اختلاف اور شروح حدیث میں شرّاح حدیث کی مختلف توجیہات اس ظنیت کی دلیل ہیں، پھر معلوم نہیں الفاظ کے تواتر یا ان کی ظنیت سے احادیث پر حملہ آور ہونے سے کیا فائدہ؟

بہر حال اس راہ کی منازل سے منزل ظن کے سوا کوئی چارہ نہیں، الفاظ اگر

---

❶ مسلّم الثبوت مع فواتح الرحموت (۲/ ۱۱٤) نیز دیکھیں: المعتمد في أصول الفقه لأبي الحسين البصري (۲/ ۸٦) المستصفىٰ للغزالي (ص: ۱۰۷) الإحكام للآمدي (۲/ ۲۷) إرشاد الفحول (۱/ ۱۲۸)

❷ كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي (۲/ ٥۲٤) الإحكام للآمدي (۲/ ۲٦) إرشاد الفحول (۱/ ۱۲۸)

یقین سے پہنچیں گے، تو مقاصد پر دلالت ضرور ظنی ہوگی۔

ظن کیا ہے؟

① فقہ میں ظن کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، ظن بمعنی یقین بھی استعمال ہوا ہے:

﴿ وإنا ظننا أن لن نعجز الله في الأرض ولن نعجزه هربا ﴾ [1]

(سورۃ الجن)

''ہمیں یقین ہے کہ ہم خدا کو زمین میں عاجز اور بھاگنے میں کمزور نہیں کر سکتے۔''

② احتمال راجح پر بھی ظن کا لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿ وظن أنه الفراق ﴾ [2] (سورۃ القیامۃ)

اور اسے جدائی کا ظن غالب ہو جاتا ہے۔

③ اور شک اور توہم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے:

﴿ وذا النون إذ ذهب مغاضبا فظن أن لن نقدر عليه ﴾ [3] (سورۃ الأنبیاء)

ذاالنون جب قوم سے ناراض ہو کر نکلے، تو ان کو خیال تھا کہ ہم انھیں کسی مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔

④ ﴿ إن الظن لا يغني من الحق شيئا ﴾ [4] یہاں ظن شک کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے علاوہ بھی لفظ ظن بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے، قرآن عزیز کا طالب علم تھوڑی سی توجہ سے ان مواقع اور قرائن کو پا سکتا ہے، جہاں یہ لفظ مختلف

❶ الجن: ١٢

❷ القیامۃ: ٢٨

❸ الأنبیاء: ٨٧

❹ یونس: ٣٦

معانی میں استعمال کیا گیا ہے، راغب نے ''مفردات'' میں ظن کے متعلق ایک قاعدہ ذکر فرمایا ہے۔[1]

اس لئے حدیث کے متعلق اگر ائمہ نے کہیں لفظ ظن استعمال کیا ہے، تو نہ اس سے گھبرانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی خوشی کا مقام ہے، اگر ائمہ کی نظر میں حدیث کی ظنیت شک وتہمت کے معنی میں ہوتی، تو وہ یقیناً اس کی حجیت سے انکار کر دیتے، حالانکہ امت قاطبتاً حدیث کو حجت سمجھتی ہے اور معلوم ہے کہ شکوک واوہام اہل نظر کی نگاہ میں کبھی بھی حجیت کا مقام نہیں پا سکتے۔

اہل قرآن کو بھی اس لفظ کے استعمال کی اسی وقت جرأت ہوئی ، جب انھوں نے حدیث کی حجیت سے انکار کا فیصلہ کیا، دراصل یہ فیصلہ دلائل کی بنا پر نہیں کیا گیا، بلکہ کسی ضرورت کی بنا پر فیصلہ کرنے کے بعد دلائل کی تلاش کی ضرورت کا احساس ہوا۔

”وذلك دأب أهل البدعة فإنهم يقضون ثم يستدلون “

”اہل بدعت کا یہی طریق ہے کہ وہ فیصلہ کے بعد دلائل کی تلاش کرتے ہیں۔“

حدیث کی ظنیت کا مفہوم:

اہل حدیث جب حدیث کو ظنی کہتے ہیں، تو وہ ظن کو عرفی معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس لئے وہ ظن کو واجب العمل سمجھتے ہیں، اسی طرح ائمہ اصول نے بھی تصریح فرمائی ہے:

” وهذا يوجب العمل ...... وقال بعض أهل الحديث يوجب علم اليقين لما ذكرنا أنه أوجب العمل، ولا عمل من غير علم (أصول بزدوی:۲/ ۶۹۰، ۶۹۱)

---

[1] المفردات (۲/ ۵٤)

"خبر واحد موجب عمل ہے اور بعض اہلحدیث کے نزدیک خبر واحد سے علم اور عمل دونوں واجب ہوتے ہیں۔"[1]

متاخرین کی تصانیف میں اصول فنی اور اصطلاحی سا ہو کر رہ گیا، اسے عملی زندگی پر منطبق کرنے کے لیے کافی وقت نظر کی ضرورت ہے، جن لوگوں نے اصول فقہ کو عمل کے نقطہ نظر سے لکھا ہے اور انھوں نے اصطلاحات کے استعمال میں منطقی طریق فکر سے زیادہ عرف اور استعمال کو پیش نظر رکھا ہے، ان میں حافظ عز الدین عبدالسلام ۶۶۰ھ کی کتاب " **قواعد الأحكام في مصالح الأنام** " خاص طور پر قابل توجہ ہے، آپ فرماتے ہیں:

"فصل في بيان جلب مصالح الدارين ودرء مفاسدهما على الظنون، الاعتماد في جلب معظم مصالح الدارين ودرء مفاسدهما على ما يظهر في الظنون، وللدارين مصالح إذا فاتت فسد أمرهما، ومفاسد إذا تحققت هلك أهلهما، وتحصيل معظم هذه المصالح بتعاطي أسبابها مظنون غير مقطوع به، فإن عمّال الآخرة لا يقطعون بحسن الخاتمة، وإنما يعملون بناءاً علىٰ حسن الظنون، وهم مع ذلك يخافون أن لا يقبل منهم ما يعملون وقد جاء التنزيل بذلك في قوله ﴿**وِالذين يؤتون ما أتوا وقلوبهم وجلة أنهم إلىٰ ربهم راجعون**﴾، فكذلك أهل الدنيا إنما يتصرفون بناءاً علىٰ حسن الظنون وإنما اعتمد عليها؛ لأن الغالب صدقها عند قيام أسبابها، فإن التجار يسافرون على ظن أنهم يستعملون بما به يرتفقون والأكّارون يحرثون ويزرعون بناءاً على أنهم مستغلون، والجمالون،

---

[1] أصول البزدوي (ص: ١٥٤) كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي (٢/ ٥٣٩)

والبغالون يتصدرون للكراء لعلهم يستأجرون، والملوك يجندون الأجناد، ويحصنون البلاد بناءاً على أنهم بذلك ينتصرون، وكذلك يأخذ الأجناد الحذر والأسلحة على ظن أنهم يغلبون، ويسلمون، والشفعاء يشفعون على ظن أنهم يشفعون، والعلماء يشتغلون بالعلوم على ظن أنهم ينجحون، ويتميزون، وكذلك الناظرون في الأدلة والمجتهدون في تعرف الأحكام يعتمدون في الأكثر على ظن أنهم يظفرون بما يطلبون، والمرضىٰ يتداوون لعلهم يشفعون ويبردون ومعظم هذه الظنون صادق موافق غير مخالف ولا كاذب، فلا يجوز تعطيل هذه المصالح الغالبة الوقوع خوفا من ندور وكذب الظنون ولا يفعل ذلك إلا الجاهلون "

"دونوں جہاں کے مصالح اور مفاسد کی بنیاد ظن پر ہے، دنیا اور آخرت کے مصالح اور مفاسد کی بنیاد بظاہر ظن پر ہے، اگر یہ مصالح فوت ہوجائیں یا مفاسد موجود ہوجائیں، تو دونوں جہاں میں تباہی تک نوبت پہنچ جائے گی، ان کے مصالح کی تحصیل بواسطہ اسباب ظنی ہے، قطعی نہیں، آخرت کے لئے کام کرنے والے حسن خاتمہ پر یقین اور وثوق نہیں رکھتے، تمام اعمال خیر حسن ظن ہی کی بنا پر کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ شاید اعمال قبول نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ" مومن خدا تعالیٰ کے دیے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں، کیونکہ ان کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔" یہی حال اہل دنیا کا ہے، ان کو اسبابِ دنیا کی سچائی پر اعتماد ہے۔

تاجر اسی ظن پر اپنا سرمایہ صرف کرتا ہے کہ وہ صحت وسلامتی کے ساتھ اس سے فائدہ حاصل کرے گا اور پیشہ ور اس ظن پر گھر سے نکلتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا پھل پائے گا، کسان صرف امید پر ہی غلہ کے انبار سپرد خاک کر دیتا ہے، خچر،

گھوڑوں والے کرایہ ہی کے خیال سے نکلتے ہیں کہ انھیں اجرت ملے گی، بادشاہ شہروں کی فصیلیں بناتے ہیں، لشکر بندی کرتے ہیں، اس خیال سے کہ ان کو ان اسباب سے مدد ملے گی اور خود لشکر بھی مسلح ہوتے ہیں کہ وہ سلامت رہیں گے اور غالب ہوں گے۔ سفارشیں اس امید پر کی جاتی ہیں کہ وہ منظور ہوں گی، اہل علم بھی اپنی عمر کامیابی کی ہی امید پر صرف کرتے ہیں، اسی طرح مناظر اور مجتہد دلائل کی چھان پھٹک کرتے ہیں، انھیں ظن ہے کہ وہ اپنی طلب میں کامیاب ہوں گے، بیمار صحت کے خیال سے علاج کرتے ہیں اور عموماً یہ ظن سب سچے نکلتے ہیں، اس لئے ان مصالح کو اس خیال سے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کبھی یہ خیال ظن اور امید بن کر غلط نکلتے ہیں، ان ظنون سے بے پروائی صرف جاہل ہی کر سکتے ہیں۔'' (قواعد الأحکام: ۳)

جب ظن و تخمین انسان کی زندگی پر اس طرح محیط ہو، تو پھر اس سے کیونکر بھاگا جا سکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبہ کی بنیاد ظن پر ہے، بادشاہوں سے لے کر عامۃ الناس تک ظن کے قبضہ میں ہیں، انبیاء سے لے کر عامۃ المسلمین تک ظن کی رعیت ہیں۔

پھر اگر اس معنی سے حدیث بھی ظن ہے، تو اسے قبول کر لینے سے کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے؟ سارے معاملات ظن کی حجیت پر مبنی ہیں، اگر کسی نے حدیث رسول ﷺ کو ظنی ہونے کے باوجود حجت مان لیا تو کون سا جرم کیا؟

یقین ہے کہاں؟

زندگی کے فراز و نشیب پر غور کرو اور ٹھہر کر سوچو کہ یقین ہے کہاں؟ گنتی کے چند واقعات ہیں جن کو بمشکل یقینی کہا جا سکتا ہے، ورنہ پوری دنیا ظنیات سے آباد ہے۔

''دنیا بامید قائم''

یہ محاورہ حقیقت حال کے لحاظ سے کتنا صحیح ہے۔ پھر حدیث کی ظنیت پر

پہرے بٹھائے جا رہے ہیں، اس فنِ شریف کی ظنیت کی کیوں منادی کی جا رہی ہے؟ اس کا داعی صرف بغض سنت کا داعیہ ہی تو نہیں؟

علماءِ سنت کی انصاف پسندی ہے کہ انھوں نے اسناد کی مشکلات پر نظر رکھتے ہوئے احوال رجال میں امکانی شبہات کی بنا پر اس فن کی ظنیت کا کھلا اقرار کیا اور سنت کو کتاب اللہ کے بعد دوسرے مرتبہ پر رکھا، ورنہ ظن کی اس پہنائی پر نظر رکھتے ہوئے بلاشبہ اس کی ضرورت کتاب اللہ اور بدیہات سے کم نہیں اور اس ظن کا اعتماد ان چکڑالوی پسند یقینیات سے کہیں زیادہ ہے، جن کے وثوق پر ناز کیا جاتا ہے۔

یقین اور اس کے اسباب و دواعی کیا ہیں؟

حواس ظاہرہ کے محسوسات کو عموماً یقین سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن آپ نے کبھی تجربتاً دیکھا کہ ان محسوسات کے ادراکات میں کہاں تک غلطی کو دخل ہے؟ آنکھیں سورج اور چاند ستاروں کے حجم کے متعلق جو اندازہ کرتی ہیں، وہ حقیقت واقعیہ سے کس قدر مستبعد ہے؟ کان جو کچھ سنتے ہیں، اس میں غلطی کو کہاں تک دخل ہے؟ ذوق حس پر جب اندورنی عناصر کے مخالفانہ حملہ سے مرض کی کیفیت طاری ہو، تو میٹھے کا کڑوا ہونا اور سخت کا نرم محسوس ہونا یا اس کے بالعکس سرے سے حس کا ناپید ہونا، اس یقین کے حلیہ کو کس قدر بگاڑ دیتا ہے؟ جب یقین کے اسباب کا یہ حال ہے، تو جو یقین ان سے پیدا ہوگا، وہ عام حالات میں کہاں تک قابل فخر ہے؟

علم حدیث جس میں خدائی حفاظت کے ساتھ انسانی مساعی کا جہاں تک اعتماد کیا جا سکتا تھا، اس کی پوری کوشش کی گئی، اس کے باوجود اسے ظن کا مقام دیا گیا اور اسے ظن سمجھ کر حجت تصور کیا گیا، انصاف و دیانت کی کتنی بڑی زندہ مثال ہے اور مقام حدیث کے تعین میں کس قدر صداقت سے کام لیا گیا ہے؟

﴿فما لهم عن التذكرة معرضين﴾ (المدثر: ٤٩)

حدیث علمائے امت کی نظر میں

اس مضمون میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے قرآن و حدیث اور تاریخی شواہد کے ساتھ صحابہ کرام اور دیگر علمائے امت کے نزدیک حدیث نبوی کا مقام و مرتبہ بیان فرمایا ہے، اسی ضمن میں انھوں نے بعض ان آثار کا تذکرہ بھی کیا ہے، جو ظلماً و زوراً حدیث نبوی کے استخفاف کے پیش نظر بعض صحابہ کرام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، بعد ازاں انھوں نے نقلی و عقلی دلائل اور واقعاتی شواہد کے ذریعہ ان آثار کی حقیقت تشت از بام کی ہے، مزید برآں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ان سطور کے آخر میں ان علوم و فنون کا بھی ذکر فرمایا ہے، جو علماءِ امت نے خدمتِ حدیث اور سنت کی حفاظت کے لیے استعمال کیے اور کس طرح انھوں نے بیسیوں علوم ایجاد کیے، لاکھوں تصانیف سے امت کو مالا مال کیا اور ایسے آثار باقیہ چھوڑے، جن پر رہتی دنیا ناز کرے گی۔

یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۱۴ جون ۱۹۵۰) میں شائع ہوا۔

حدیث علمائے امت کی نظر میں

قرآن عزیز کے بعد جو فن امت کی نظر میں سب سے زیادہ عزیز تھا، وہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات ہی ہو سکتے ہیں۔ صحابہ میں دو قسم کے لوگ پائے جاتے تھے:

اول: وہ لوگ جن کا قیام مسجد کے سامنے صفہ میں تھا، یہ لوگ عموماً دنیوی کاروبار اور بقدر ضرورت مشقت کرتے تھے اور زیادہ وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں صرف کر کے علم سیکھتے اور حدیث وقرآن حفظ کرتے تھے۔

دوم: وہ لوگ جو دنیوی کاروبار بھی کرتے اور علمی خدمت میں بھی مشغول رہتے، یہ لوگ فرصت کے اوقات مسجد میں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں گزارتے تھے۔ کبھی اشتراک سے باریاں مقرر کرتے، ایک ساتھی اپنی باری سے کاروبار کرتا، دوسرا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا، جو کچھ وہ آنحضرت ﷺ سے سیکھتا، دوسرے ساتھی کو اس سے آگاہ کر دیتا۔ (بخاری ملتقطاً) [1]

غرض حفظ حدیث ایک مقدس مشغلہ تھا، جس کے لیے ہر دل میں آرزو تھی، اور ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے، کیونکہ شریعت کا روایتاً تمام تر انحصار آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی پر ہے۔ [2] اگر آنحضرت ﷺ کی صداقت، حسن خلق اور شمائل

---

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب التناوب في العلم، رقم الحديث (٨٩)

[2] اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حفظ حدیث کی ترغیب وتلقین کی ہوئی تھی، چنانچہ امام ابو داود رحمہ اللہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ایسے بندے کے چہرے کو تروتازہ رکھے، جس نے ہم سے کوئی حدیث سنی، پھر اس کو ←

حسنہ کو نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو بھی اگر محل تنقید تصور کر لیا جائے، تو پوری شریعت اور سارا دین اوہام و تصورات کا مجموعہ بن کر رہ جائے گا۔ العیاذ باللہ!

اس لیے عقلاً آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دونوں قسمیں جنھیں آنحضرت ﷺ نے اللہ کی طرف منسوب فرمایا، یعنی وحیِ متلو (قرآن) جس کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں، یا غیر متلو جس کا مفہوم خدا تعالیٰ کی طرف سے ہونا یقینی ہے، اس کی حجیت عقلاً ضروری ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ ہے کہ ان کی بنیاد ہوائے نفس پر نہیں:

﴿وما ينطق عن الهوىٰ ۞ إن هو إلا وحي يوحىٰ﴾ [1]

پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ جو کچھ فرماتے ہیں، خدا کی وحی سے فرماتے ہیں۔

نفسانی خواہشات کے لیے وہاں تک گزر کی کوئی گنجائش نہیں، صحابہ کا عمل جس کا تذکرہ ابتدائی سطور میں مختصراً آیا ہے، اس کا شاہد ہے، تمام تنازعات میں آنحضرت ﷺ کے فیصلوں کی حیثیت آخری حکم کی رہی۔

← حفظ کیا، یہاں تک کہ اس کو آگے پہنچا دیا۔ (حدیث نمبر: ٣٦٦٠)

اسی بناء پر صحابہ کرام اور تابعین عظام اپنے تلامذہ کو حفظ حدیث کی تعلیم و ترغیب دیا کرتے تھے، جس کی تفصیل کتب رجال میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہے، امام اسماعیل بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہمیں حفظ کرنی چاہیے، کیونکہ وہ بھی قرآن کے مرتبے میں ہے!" (ذم الکلام و أهله: ٢/ ٦٩، السنة للمروزي: ٣٢) مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي (١/ ٢٣١)

[1] النجم: ٤

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تمام صحابہ کی طرح حدیث کو حجت سمجھتے تھے، خصومات میں حدیث پر اعتماد فرماتے، جدّہ کے حصہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اپنی رائے سے رجوع اور حدیث پر اعتماد مشہور واقعہ ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک ماہ بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا، وہ قابل غور ہے:

"یا أیھا الناس! ولوددت أن ھذا کفانیه غیري ولئن أخذتموني بسنة نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم ما أطیقھا إن کان لمعصوما من الشیطان وإن کان لینزل علیه الوحي من السماء"[2] (مسند أحمد: ۱/ ۱٤)

---

[1] جس میں ذکر ہے کہ ایک دادی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا حق وراثت طلب کرنے کے لیے آئی، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیرا کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی حصہ نہیں، تم واپس چلی جاؤ، تا آنکہ میں لوگوں سے دریافت کرلوں، بعد ازاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام سے پوچھا، تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو وراثت سے چھٹا حصہ دیا تھا، جس پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بھی گواہی دی، چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حدیث سن کر دادی کو حصہ دے دیا۔ (المؤطا: ۲/ ۵۱۳، سنن أبي داود: ۲/ ۱۳٦ (حدیث: ۲۸۹٤) سنن الترمذي (حدیث: ۱۰۰)

لیکن اس واقعہ کے راوی قبیصہ بن ذویب اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، جس کی بنا پر یہ سند ضعیف ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فمنقطعة لا تصح" (الإحکام: ۲/ ۲۰۸)

تفصیل کے لیے دیکھیں: تھذیب التھذیب (۸/ ۳۱۱) إرواء الغلیل (٦/ ۱۲٤)

لیکن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل بالحدیث ایک مسلّمہ حقیقت ہے، جس کے بے شمار دلائل میں سے سقیفہ بنی ساعدہ اور وراثت نبوی کی عدم تقسیم والا واقعہ شاہد عدل ہے، دیکھیں: صحیح البخاري (۲۹۲٦) فتح الباري (۷/ ۳۱)

[2] مسند أحمد (۱/ ۱۳) رقم الحدیث (۸۰)

حضرات! اس خلافت کے بوجھ کو کوئی اور اٹھاتا تو مجھے پسند تھا، اگر تم میرا آنحضرت ﷺ کی سنت کے مطابق مواخذہ کرو، تو میرے لئے مشکل ہے، آنحضرت ﷺ شیطان سے محفوظ تھے اور آپ پر وحی نازل ہوتی تھی۔

یہ اثر ان تمام مزخرفات کا جواب ہے، جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف انکار حدیث کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔ اس میں سنت کی حجیت کا ذکر ہے، آنحضرت ﷺ کی عصمت کا اقرار ہے اور سنت کے وحی ہونے کا کھلا اعتراف ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بحوالہ تذکرۃ الحفاظ ایک اثر عموماً اہل قرآن کی تحریروں میں بڑے فخر سے ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت نے آخری عمر میں پانصد احادیث کا ایک مجموعہ جلا دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ شاید اس میں کوئی ایسی چیز ہو، جس کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف غلط ہو۔ یہ اثر کئی وجوہ سے غلط اور بے اصل ہے:

① اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی احادیث کی تعداد پانصد ذکر کی گئی ہے، حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کل احادیث ایک سو بیالیس ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کثرت طرق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1]

(تلقيح فهوم أهل الأثر لابن الجوزي : ١٨٥)

② اثر کی اسناد تمام تر مظلم ہے، کتب رجال میں اس کے رواۃ کا ذکر قریباً ناپید ہے۔[2]

③ ذہبی نے اسے بحوالہ حاکم نقل کیا ہے، "حاکم" سے مراد علی الاطلاق مستدرک

---

[1] دیکھیں: خلاصة تذهيب تهذيب الكمال للخزرجي (ص: ٢٠٦) تلقيح فهوم أهل الأثر في عيون التاريخ والسير لابن الجوزي (ص: ٢٦٤)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: دوام حدیث (١/ ٧٢)

ہوتی ہے، مستدرک کے مطبوعہ نسخہ میں یہ اثر نہیں ہے۔

④ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس خطرہ کا اظہار فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ غلط نسبت سے بچنا چاہتے ہیں، یہ تثبت فی الحدیث ہے، اسے انکار تصور کرنا تصور کی غلطی ہے۔ ❶

⑤ اس اثر سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تدوین وتصنیف حدیث کا رواج تھا۔ منکرین حدیث کے لیے اس اثر سے استدلال " فرّ من المطر وقرّ تحت المیزاب " ❷ کا مصداق ہو جائے گا۔

⑥ اور ہمیں یہ اثر قطعی مضر نہیں، کیونکہ ہم آج بھی غلط اور جھوٹی حدیثوں کو جلا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جب قرآن کے مشتبہ نسخے جلائے جا سکتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے زیادہ کیا کیا؟

اس کی اسناد کے متعلق کسی دوسری فرصت میں ان شاء اللہ عرض کیا جائے گا۔ ❸

---

❶ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ مجموعہ جلا دیا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ آپ نے اسے کیوں جلا دیا ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ڈرتا ہوں کہ مجھے موت آ جائے اور اس صحیفے میں ایسے شخص سے احادیث مروی ہوں، جسے میں تو امانت دار سمجھتا ہوں لیکن حدیث ایسی نہ ہو، جیسی اس شخص نے مجھے بیان کی ہے، تو کہیں میں نے اس کو بعینہ ویسا ہی نقل کر دیا ہو اور اگر کوئی حدیث باقی رہ گئی، جو مجھے نہ مل سکی، تو لوگ کہیں گے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہوتا، تو ابوبکر پر مخفی نہ رہتا۔ میں نے تم کو احادیث بیان کر دی ہیں اور شاید میں اس کا حرف بحرف تتبع نہیں کر سکا۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۵، کنز العمال، برقم: ۲۹۴۶۰)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول الفاظ سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان احادیث کی صحت کے بارے مکمل اطمینان نہیں تھا، نہ کہ وہ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔

❷ بارش سے بھاگا اور نالے کے نیچے ٹھہر گیا۔

❸ امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

۷ کسی غلط یا مشتبہ چیز کے جلانے سے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ اصل حقیقت اور اس کا صحیح حصہ بھی قابل ترک ہے؟!

۸ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حجیت حدیث کے منکر تھے، تو پھر ایک سو بیالیس احادیث انھوں نے کیوں روایت فرمائیں؟

حسبنا کتاب اللہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ:

معترضین حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض ارشادات پر بہت ناز ہے، اسے الٹ پھیر کر اپنے رسائل اور جرائد میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ حضرات تثبت فی الحدیث اور انکار حدیث میں فرق نہیں سمجھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث کو حجت سمجھتے تھے، اس لئے اس میں تثبت ضروری سمجھتے تھے۔ بعض وقت کبار صحابہ سے شہادت طلب فرماتے، ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ جب سلامِ اجازت کے بعد واپس چلے گئے تو چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تین دفعہ سلام کہنے کے بعد گھر والے اجازت نہ دیں، تو واپس چلے جانا چاہیے، ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اسی حکم کے مطابق واپس چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تثبت کے طور پر شہادت طلب کی، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو قبول فرمایا اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو کوئی سرزنش نہیں فرمائی۔[1] یہ تثبت ہے جو حجیت حدیث کو مستلزم ہے، لیکن ہمارے

← اس سند سے یہ اثر سخت غریب ہے اور (اس کا راوی) علی بن صالح کا کوئی پتہ نہیں (یعنی مجہول ہے) (کنز العمال، برقم: ۲۹۴۶۰) علی بن صالح کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی "مستور" قرار دیا ہے۔(تقریب التھذیب: ۳۰۲)

[1] صحیح البخاري: کتاب البیوع، باب الخروج في التجارۃ، رقم الحدیث (۱۹۵۶) صحیح مسلم: کتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحدیث (۲۱۵۴) چنانچہ جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے عمر! تم اصحاب رسول کے لئے باعث تکلیف مت بنو، تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "سبحان اللہ! میں نے تو صرف ایک چیز سنی تو پسند کیا کہ اس کے بارے مزید اطمینان حاصل کرلوں!"

عقلمندوں نے خوش ہونا شروع کر دیا کہ حضرت عمر حدیث کی حجیت کے منکر تھے!

إذا كان الطبائع طبائع سوء

فلا أدب يفيد ولا أديب ❶

اسی طرح ایک اثر امام شعبی رحمہ اللہ قرظہ بن کعب انصاری سے ذکر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے ساتھ مقام صرار تک تشریف لائے، وضو کیا اور فرمایا کہ تم ایسی قوم کے پاس جاؤ گے، جن کی زبانیں قرآن کے ساتھ حرکت کرتی ہوں گی، تم ان کو احادیث کے ساتھ نہ روکنا۔

دوسری روایت ابو حصین عثمان بن عاصم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو عراق روانہ فرمایا تو ارشاد ہوا:

"جردو القرآن، وأقلو الرواية عن رسول الله ﷺ وأنا شريككم"

یہ دونوں روایتیں مقطوع ہیں۔ شعبی کا قرظہ سے لقاء نہیں، قرظہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں انتقال فرمایا، مغیرہ بن شعبہ ۵۰ھ میں فوت ہوئے، جبکہ شعبی بالکل بچے تھے۔ اسی طرح عثمان بن عاصم ابو حصین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے، اس لئے یہ نقل ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درست نہیں۔ ❷

❶ جب مزاج خراب ہوں تو نہ کوئی ادب فائدہ بخش رہتا ہے، نہ کوئی ادیب ہی!

❷ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر تین طرق سے مروی ہے:

① عبدالرزاق عن معمر عن عاصم بن أبي النجود أن عمر بن الخطاب ...... (مصنف عبدالرزاق: ١١/ ٣٢٤) اس سند میں عاصم بن أبي النجود اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، کیونکہ عاصم خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان پیدا ہوئے۔ (سير أعلام النبلاء: ٥/ ٢٥٦)

② أبو كريب قال حدثنا أبوبكر بن عياش قال سمعت أبا حصين قال كان عمر رضی اللہ عنہ...... (تاريخ الطبري: ٢/ ٥٦٧) اس کی سند میں بھی ابو حصین عثمان بن عاصم اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صحابہ کرام سے ان کی روایت میں انقطاع ہے۔ (تهذيب التهذيب: ٧/ ١١٦) ←

اس مفہوم کے جس قدر آثار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، سب روایتاً

← ③ الشعبي عن قرظة بن كعب قال بعثنا عمر رضی اللہ عنہ...... ، (ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨) سنن الدارمي (١/ ٩٧) المستدرك (١/ ١٨٣) المعجم الأوسط (٢/ ٢٧٩) طبقات ابن سعد (٦/ ٧) العلل ومعرفة الرجال (١/ ٢٥٨) المحدث الفاصل (ص:٥٥٣) جامع بيان العلم (٢/ ٩٩٨)

امام شعبی رحمہ اللہ سے اس اثر کو ان کے مندرجہ ذیل شاگردوں نے بیان کیا ہے: ١۔بيان بن بشر، ٢۔ داود بن أبي هند، ٣۔مجاهد بن سعيد، ٤۔أشعث بن سوار ، ٥۔ سعد بن إبراهيم، ٨۔إسماعيل بن أبي خالد، ٩۔ أبو حصين، ١٠۔ أبو البلاد يحيىٰ بن سليمان ۔ (العلل للدار قطني: ٢/ ٢٠٦ اور مذکورہ بالا مصادر ومراجع) قرظہ بن کعب کی وفات کے بارے میں دو اقوال ہیں:

① وہ خلافت علی رضی اللہ عنہ کے دوران کوفہ میں فوت ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، یہ ابو حاتم رازی، ابن سعد، ابن حبان، ابن عبدالبر اور ابن اثیر رحمہم اللہ کا قول ہے۔

(الجرح والتعديل: ٧/ ١٤٤، طبقات ابن سعد: ٦/ ١٧، الثقات: ٣/ ٣٤٧، مشاهير علماء الأمصار كلاهما لابن حبان: ٤٨، الاستيعاب: ٤٠٥، أسد الغابة: ٩١٠)

② وہ خلافت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی امارت کے دوران پچاس ہجری کے قریب فوت ہوئے، اس کی دلیل یہ ہے کہ قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ نے جب وفات پائی، تو ان پر نوحہ کیا گیا، جس سے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے منبر پر چڑھ کر لوگوں کو روکا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اس وقت کوفہ کے امیر تھے۔ دیکھیں: صحيح مسلم، برقم (٩٣٣) سنن الترمذي ، برقم (١٠٠٠)

ان دونوں اقوال میں سے خواہ کوئی بھی راجح ہو، اس کا قرظہ رضی اللہ عنہ سے امام شعبی رحمہ اللہ کے سماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ امام شعبی رحمہ اللہ اکیس (٢١) ہجری یا خلافت عمر رضی اللہ عنہ کے چھٹے سال پیدا ہوئے اور ایک سو چار (١٠٤ھ) ہجری کو فوت پیدا ہوئے۔ (تاريخ خليفه بن خياط: ١٤٩، طبقات خليفه: ١٥٧، سير أعلام النبلاء: ٤/ ٢٩٥، تهذيب الكمال: ١٤/ ٢٨)

پہلے قول کے پیش نظر قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت امام شعبی رحمہ اللہ کی عمر کم وبیش دس سال ظاہر ہوتی ہے اور دوسرا قول تسلیم کرنے کی صورت میں پچیس سال سے زیادہ ثابت ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ائمہ محدثین رحمہم اللہ نے قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں امام شعبی کا تذکرہ اور روایت ←

اور درایتاً غلط اور باطل ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قریباً پانصد احادیث مروی ہیں، [1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار مکثرین صحابہ میں ہے، چند صحابہ ہیں جن کی روایات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہیں۔ [2]

← کی صراحت کی ہے:

① امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "روی عنه عامر بن سعد والشعبي" (الجرح والتعديل: ٧/ ١٤٤)

② امام ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حديثه عند الشعبي" (الثقات: ٣/ ٣٤٨)

اسی طرح امام ابو الحجاج المزي اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس اثر کی سند کو امام حاکم، حافظ ابن حجر (فتح الباري: ١٣/ ٢٤٤) اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

لیکن اس اثر سے یہ مراد لینا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث نبوی کو شرعی حجت تسلیم نہیں کرتے تھے، قطعاً باطل ہے، حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"دشمنان سنت اور جہلاء نے اس اثر کو حدیث سے بیزاری کی دلیل بنا لیا ہے۔" پھر انھوں نے ایسے آثار نقل کیے ہیں، جو دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث نبوی کو شرعی حجت اور دینی ماخذ تسلیم کرتے تھے۔ (جامع بيان العلم: ٢/ ١٠٠٤)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دو اسباب کی بناء پر لوگوں کو کثرتِ تحدیث سے منع کرتے تھے:

① اس خوف سے کہ لوگ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے معانی و تفسیر میں غور کرنے سے احتراز کریں گے۔

② کہیں لوگ ایسی احادیث بیان کرنا شروع کر دیں، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمائی ہوں، چونکہ لوگ لکھتے نہیں تھے، اس لئے نسیان کا خطرہ تھا۔ (فتح الباري: ١٣/ ٢٤٤)

[1] حافظ ابن ملقن اور علامہ صفی الدین خزرجی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی تعداد پانچ سو انتالیس (۵۳۹) ذکر کی ہے۔

خلاصة تذهيب تهذيب الكمال (ص: ٢٨٢) الإعلام بفوائد عمدة الأحكام (١/ ١٤٢)،

نیز دیکھیں: تلقيح فهوم أهل الأثر لابن الجوزي (ص: ٢٦٤)

[2] یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کثرت سے احادیث مروی ہیں، اصطلاحاً "مکثرین صحابہ" ان صحابہ کرام کو کہا جاتا ہے، جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے اور وہ سات صحابہ کرام ہیں: ←

(الإحکام لابن حزم: ١٤٠)[1]

البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہود و نصاریٰ کے قصص اور پہلی امت کی کہانیوں اور افسانوں سے روکا کرتے تھے، اس پر بعض صحابہ کو بھی آپ نے ٹوکا۔[2] ایسے تمام آثار جن میں احادیث کی روایت سے روکنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ بشرط صحت اسی مفہوم پر محمول کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

عبداللہ بن الأشج فرماتے ہیں:

" إن عمر بن الخطاب قال: "سيأتي قوم يجادلونكم بشبهات القرآن فخذوهم بالسنن، فإن أصحاب السنة أعلم بكتاب الله عزوجل " (الإحکام: ٢/ ١٤)[3]

← ① أبو هريرة رضی اللہ عنہ ٥٣٧٤ احادیث۔

② عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہ: ٢٦٣٠ احادیث۔

③ أنس بن مالك رضی اللہ عنہ: ٢٢٨٦ احادیث۔

④ عائشه صدیقه رضی اللہ عنہا: ٢٢١٠ احادیث۔

⑤ عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہما ١٦٦٠ احادیث۔

⑥ جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہما ١٥٤٠ احادیث۔

⑦ أبو سعيد خدری رضی اللہ عنہ: ١١٧٠ احادیث۔

(تلقيح فهوم أهل الأثر: ٢٦٣، شذرات الذهب: ١/ ٦٣، فتح المغيث: ٣/ ١١٧)

[1] الإحکام لابن حزم (٢/ ٢٥٥)

[2] الإحکام لابن حزم (٢/ ٢٥٧)

[3] سنن الدارمي (١/ ٦٢) جامع بيان العلم (٢/ ١٨٦) الإحکام لابن حزم (٢/ ٢٥٧)
اس کی سند میں بکیر بن عبداللہ بن الأشج اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، بعض روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی کا نام " عمر بن الأشج " آتا ہے، ←

تم ایسی قوموں سے ملو گے، جو تم سے قرآن کے متشابہات میں بحث کریں گے، ان کی سنت سے گرفت کرو، کیونکہ اصحاب سنت کتاب اللہ کو بہتر جانتے ہیں۔

جو شخص قرآن عزیز کے شبہات کا حل ہی حدیث اور سنت سے سمجھتا ہے، اس کی طرف انکار حدیث کی نسبت سینہ زوری ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ احادیث میں تثبت چاہتے تھے، اسے بعض کم سواد حضرات نے انکار سمجھ کر خوش ہونا شروع کر دیا۔ وبينهما مفاوز تنقطع فيها الأعناق! ❶

وكم من عائب قولا صحيحا وآفته من الفهم السقيم ❷

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس تشدد سے، جو تثبتِ حدیث کے سلسلہ میں فرمایا، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے بعد رجوع فرمایا، ❸ کوئی ایک بھی روایت ایسی ثابت نہیں کی جا سکتی ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجیت حدیث سے انکار فرمایا ہو۔

← (سنن الدارمي: ١/ ٦٢، شرح أصول اعتقاد أهل السنة: ٢/ ١٢٣)

امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”**عمر بن عبدالله بن الأشج**: روى عن عمر رضى الله عنه مرسل، قال: سيكون أقوام يجادلونك بشبهات القرآن“ (الجرح والتعديل: ٦/ ١١٨)

عمر بن عبداللہ بن الأشج اور بکیر بن عبداللہ بن الأشج دونوں بھائی ہیں (الثقات لابن حبان: ٧/ ١٧٢)

أبو الأشبال الزهيري (محقق جامع بيان العلم) نے ان دونوں طرق کی بنا پر اس اثر کو ”لا بأس به“ کہا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مذکورہ بالا اثر مروی ہے۔ (أصول السنة للالكائي: ٢/ ١٢٤)

❶ ان دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جسے طے کرتے کرتے سواریوں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں!

❷ اور کتنے ہی درست بات میں عیب جوئی کرنے والے ہوتے ہیں، ان کی اصل مصیبت کمزور سمجھ ہے!

❸ الإحكام لابن حزم (٢/ ٢٥٨) نیز دیکھیں: صحيح مسلم: كتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحديث (٢١٥٤)

حسبنا کتاب اللہ [1] فرمانے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احادیث کو حجت مانا، ان سے استدلال فرمایا، فصل خصومات کے وقت ان پر اعتماد فرمایا، طاعون زدہ زمین میں جانے کے متعلق جب مہاجرین و انصار کے مشوروں سے بھی اطمینان نہ ہوا، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حدیث بیان کرنے سے طبیعت صاف ہوگئی۔[2] اس قسم کے بیسیوں واقعات دفاتر سنت میں موجود ہیں، طالب حق ان کی طرف رجوع کرے۔

فن حدیث:

حدیث سے مراد دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور افعال ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہادات کی حیثیت یہی ارشادات اور افعال ہی کی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور تقریر بھی حجت ہے۔ غرض احادیث کا تعلق دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے، لیکن فنی طور پر حدیث کا لفظ صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتووں پر بھی بولا جانے لگا، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی علی الاطلاق حجت نہیں ہے۔

اسی طرح جب ایک ہی حدیث مختلف طرق سے بیان کی گئی، تو ہر طریق کو حدیث ہی کہا گیا اور یہی سبب ہے کہ حدیث کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی جامع صحیح کو چھ لاکھ حدیث سے انتخاب فرمایا،[3] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے متعلق معلوم ہے کہ انھیں کئی لاکھ حدیث ضبط تھی، ان کی مسند میں قریباً

---

[1] صحيح البخاري: كتاب المرضىٰ، باب قول المريض: قوموا عني، رقم الحديث (٥٣٤٥)، صحيح مسلم: كتاب الوصية، باب ترك الوصية لمن ليس له شيء يوصي فيه، رقم الحديث (١٦٣٧)

[2] صحيح البخاري: كتاب الطب، باب ما يذكر في الطاعون، رقم الحديث (٥٣٩٧) صحيح مسلم: كتاب السلام، باب الطاعون والطيرة والكهانة ونحوها، رقم الحديث (٢٢١٩)

[3] هدي الساري (ص: ٧، ٤٨٩)

پچاس ہزار حدیث موجود ہے، [1] یہ تعداد طرقِ حدیث اور موقوفات کے ملانے ہی سے بنتی ہے، ورنہ حدیث نبوی کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں۔

شبہ:

ایک سطحی نظر سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی عمر کا جو حصہ تعلیم و تعلم سے متعلق ہے، وہ قریباً ۲۳ سال ہے، اس مدت میں کوئی شخص اتنے لاکھ باتیں کیونکر کر سکتا ہے؟ حضرات روافض اور ہمارے نقاد اہل قرآن حضرات پر بھی یہی ذہنی کیفیت طاری ہے، اس لیے ان حضرات کی طرف سے بھی ایسے شبہات ظاہر فرمائے گئے۔ حالانکہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، مختلف طرق اور آثار کے ملنے کی وجہ سے یہ عدد لاکھوں تک پہنچ گیا۔

قال ابن الجوزي في صيد الخاطر: "جرى بيني وبين أحد أصحاب الحديث كلام في قول الإمام أحمد: صح من الحديث عن رسول الله ﷺ سبع مائة ألف حديث، فقلت له إنما يعني به الطرق فقال: لا، بل المتون، فقلت: هذا بعيد التصور!" (ص: ٢٠١، [2] أيضا: توجيه النظر ص: ٤)

بعض محدثین نے کہا کہ امام احمد کے قول سے مراد کہ "آنحضرت ﷺ سے سات لاکھ حدیث منقول ہے" متون حدیث مراد ہیں، میں نے کہا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس سے مراد طرق حدیث ہیں۔

تدوین حدیث:

صحابہ چونکہ اصحاب واقعہ تھے، حدیث کی اکثر واردات کا تعلق ان سے ہے،

---

[1] دیکھیں: خصائص المسند لأبي موسىٰ المديني (ص: ١٥)

[2] صيد الخاطر (ص:٢٤٣)

قول، فعل اور تقریر کے اصل مہبط وہی ہیں اور معلوم ہے کہ آپ بیتی چیزیں کم بھولتی ہیں، اس لئے ان کی توجہ کتابت حدیث کی طرف نہ تھی، صحابہ کے زمانہ میں تدوین حدیث بطور فن اور بصورت مشغلہ نہ تھی، لیکن آنحضرت ﷺ کے ارشادات لکھنے کا رواج ضرور تھا، بلکہ بعض حضرات کی درخواست پر آنحضرت ﷺ نے بعض احادیث خود لکھوا کر وہ یاد داشت ان کو دے دی۔ [1] آنحضرت ﷺ کے خطوط، معاہدات آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھوائے گئے، جن کی خاصی تعداد ابن هشام، روض الأنف، الأموال لأبي عبيد، الخراج للقاضي أبي يوسف میں موجود ہے۔ [2] اسی طرح زکوۃ وغیرہ کے احکام خود آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ضبط کئے گئے، تاہم صحابہ نے باقاعدہ تدوین کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن فصل خصومات میں حدیث کو قرآن ہی کی طرح سمجھا جاتا تھا، صحابہ کے سرمایہ میں " صادقه " (صحیفہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ) کے علاوہ بعض اور نوشتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو: الكفايه للخطيب (ص: ٢٦٣ و ٢٧٥)

"عن عكرمة أن ابن عباس كان بحرا، فلما عمِي أتاه ناس من أهل الطائف، ومعهم علم من علمه، أو كتب من كتبه فجعلوا يستقرؤنه، وجعل يقدم، ويؤخر فلما رأى ذلك قال: إني تلهت من مصيبتي هذه فمن كان عنده علم من علمي وكتب من كتبي فليقرأ علي فإن إقراري له كقرأتي عليه فقرؤا عليه"

(الكفاية للخطيب: ٢٦٣)

---

[1] جس طرح فتح مکہ کے موقع پر ابو شاہ یمنی رضی اللہ عنہ کی درخواست پر خطبہ لکھوا کر ان کو دے دیا۔ دیکھیں:
صحيح البخاري: كتاب اللقطة، باب كيف تعرف لقطة أهل مكة، رقم الحديث (٢٣٠٢)
صحيح مسلم: كتاب الحج، باب تحريم مكة وصيدها، رقم الحديث (١٣٥٥)

[2] السيرة لابن هشام (٢/ ٥٤٢، ٦٠٠)

عکرمہ فرماتے ہیں: ابن عباس علم کے سمندر تھے، وہ آنکھوں سے معذور ہوگئے، تو طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس آئے، ان کے پاس حضرت ابن عباس کی کچھ کتابیں اور علم کا ذخیرہ تھا۔ انھوں نے حضرت ابن عباس سے پڑھنا شروع کیا، تو ابن عباس تقدیم و تاخیر کرنے لگے، یہ دیکھ کر حضرت ابن عباس نے فرمایا: میں نابینگی کی وجہ سے حیران ہوگیا ہوں، جن حضرات کے پاس میری کتابیں ہیں، وہ مجھ پر پڑھ دیں، میری تصدیق کافی ہے، اس کے بعد میری قرأت کی ضرورت نہیں۔ (یاد رہے کہ سلف میں یہ رواج تھا کہ استاد شاگرد پر پڑھے۔)

اس اثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تصانیف تھیں۔

"قال بشير بن نهيك: كنت أكتب بعض ما أسمع من حديث أبي هريرة فلما أردت فراقه أتيته بالكتب فقرأتها عليه فقلت: هذا سمعته منك؟ قال: نعم،" [1] (الكفاية: ٢٧٥)

بشیر بن نہیک فرماتے ہیں: میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنا کرتا تھا، میں نے جب واپسی کا ارادہ کیا، تو میں نے ان پر وہ کتابیں پڑھیں اور عرض کیا: میں نے یہ کتابیں آپ سے پڑھی ہیں، تو انھوں نے کہا: ٹھیک ہے!

جس سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس حدیث کی کتابیں تھیں۔ [2]

تابعین کے زمانہ میں آپ بیتی والے بزرگ جب ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے، تو تدوین حدیث کی ضرورت ہوئی۔ دل غافل ہوسکتا ہے، حافظہ غلطی کر سکتا ہے، اس لئے قلم کی گرفت علم کی حفاظت کا ایک بہترین ذریعہ ہے، چنانچہ ائمہ

---

[1] سنن الدارمي (١/ ١٣٨) مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٣١٤) تقييد العلم (ص: ١٠١)

[2] بشیر بن نہیک رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ " كنت آخذ الكتب من أبي هريرة فأكتبها " میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کتابیں لے کر لکھا کرتا تھا۔ (شرح معاني الآثار: ٤/ ٣٢٠)

نے اس طرف توجہ دی، جو کچھ صحابہ سے سنا تھا، اسے ضبط تحریر میں لے آئے۔ سب سے پہلی تصنیف عبدالملک بن جریج نے کی، اسی طرح امام مالک کی مؤطا مدینہ سے شائع ہوئی، بصرہ میں ربیع بن صبیح نے ایک کتاب تالیف فرمائی، دیگر محدثین کی توجہ اس طرف ہوئی۔ ❶ امام ابن شہاب زہری نے علم کے سمندر بہا دیئے، ہزاروں تشنگان علم کو سیراب فرمایا، ❷ عمر بن عبدالعزیز ایسے متقی خلفاء ان ائمہ کی سرپرستی فرماتے رہے، ❸ اس لئے یہ دور تدوین جاری رہا۔ امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داود، امام نسائی، امام ترمذی رحمہم اللہ نے علم کے خزانے علم کی منڈیوں میں انڈیل دیئے۔

ان کتابوں کا تنوع ائمہ حدیث کی افتادِ طبیعت کا پتہ دیتا ہے، کہیں جرح و تعدیل کی طرف توجہ ہے، کہیں مذاہب فقہاء کا تذکرہ ہے، کہیں تطبیق احادیث پر زور ہے، کہیں فقہ الحدیث، تبویب مضامین سے حق خدمت ادا فرمایا گیا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر یہ علم شرعاً حجت نہیں، بلکہ عام تاریخ سے اس کا مقام بلند نہیں، تو پوری امت کا رخ اس طرف کیوں پھر گیا؟ کئی صدیاں اس کے حفظ و ضبط میں بسر ہوگئیں۔ تاریخی ذخائر اور ان کی خدمت کی راہیں اہل علم سے مخفی نہیں، بیسیوں نئے علم اس کی خدمت کے لیے ایجاد فرمائے۔

خدمت حدیث کے دیگر طریقے:

یہاں تک حفظ و ضبط کا تذکرہ تھا، جو مختصراً عرض کر دیا گیا، امت نے اس فن

---

❶ الجرح والتعديل (١/ ١٨٤) الجامع للخطيب (٢/ ٤٢٤) سير أعلام النبلاء (٧/ ١١١) هدي الساري (ص: ٦)

❷ جیسا کہ امام زہری رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں: "والله ما نشر أحد العلم نشري ولا صبر عليه صبري" المعرفة والتاريخ للفسوي (١/ ٦٢٣) تاريخ دمشق (٥٥/ ٣٤٢) نیز دیکھیں: جامع بيان العلم (١/ ٢٨٨)

❸ صحيح البخاري (١/ ٢٥٦، مع الفتح) سنن الدارمي (١/ ٤٣١) جامع بيان العلم (١/ ٢٨٨)

کی خدمت اور بھی کئی طریقوں سے کی ہے۔ علامہ زمخشری نے لغت حدیث میں "الفائق" لکھی، حافظ ابن الاثیر جزری نے "نهاية" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لغت حدیث میں لکھی، جو مصر سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ ہمارے ہندوستان کے مایہ ناز عالم اور محدث شیخ محمد طاہر پٹنوی نے "مجمع بحار الأنوار" لکھی، جس میں نہایہ اور اس سے پہلی کتابوں کو نظر میں رکھا اور مزید اضافہ فرمایا، اور اس آخری دور میں مولانا وقار الملک نواب وحید الزمان مغفور نے "وحید اللغات" کے نام سے کئی جلدوں میں مبسوط لغت حدیث لکھی۔

علم تلفیق الحدیث:

احادیث کے مفہوم میں جہاں بظاہر منافات کا شبہ ہوتا تھا، اسے دور کرنے کے لیے اس علم کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ عام خاص، مطلق اور مقید میں امتیاز سمجھا جائے یا تعداد واقعات پر محمول کیا جائے، تاکہ تطبیق ہو سکے۔ ❶

علم الضعفاء والمتروکین:

روایت حدیث کے سلسلہ میں کچھ ایسے لوگ بھی آئے، جن کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا، ائمہ حدیث نے ان کا تذکرہ مستقل تصانیف میں فرما دیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں "كتاب الضعفاء" لکھی، امام نسائی کی "كتاب الضعفاء" اس باب کی مشہور کتاب ہے۔ امام حسن بن محمد صنعانی، حافظ ابو الفرج عبدالرحمان بن الجوزی ۵۹۷ھ کی مساعی اس باب میں معلوم ہیں۔ حافظ ذہبی نے ابن جوزی کی کتاب کا اختصار فرما دیا اور اس پر ذیل لکھا، ایک ذیل حافظ مغلطائی ۷۶۲ھ نے لکھا، اس کے علاوہ محدثین کی خدمات اس مسئلہ میں واضح ہیں۔ ❷

---

❶ دیکھیں: کشف الظنون (۱/ ٤٨٠) أبجد العلوم (۲/ ۲۰۲)

❷ کشف الظنون (۲/ ۱۰۸۷) أبجد العلوم (۲/ ۲۵۲)

علم الجرح و التعدیل:

اس علم میں جرح و تعدیل کے لحاظ سے رواۃ کے مراتب کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور الفاظ جرح و تعدیل کی خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ اس سے اہل علم کے مقام اور مرتبہ کا علم ہو۔ سب سے پہلے اس باب میں شعبہ بن الحجاج نے گفتگو فرمائی، پھر یحییٰ بن سعید قطان نے، اس کے بعد ان کے تلامذہ یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل اور عمرو بن علی فلاس نے اسے وسعت دی۔ پھر ان کے تلامذہ حافظ ابو زرعہ، ابو حاتم، بخاری، مسلم، نسائی، ابن خزیمہ اور امام ترمذی وغیرہم نے اس علم کی خدمت کی۔ امام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابی حاتم (م ۳۲۷ھ) نے اس موضوع پر مبسوط کتاب لکھی اور حافظ ابو الحسن احمد بن عبداللہ العجلی کی کتاب اس مسئلہ میں نقش اول ہے۔ ابن عدی کی کامل اور حافظ ذہبی کی میزان الاعتدال اس فن کی بہترین کتابیں تصور کی گئی ہیں، حافظ ابن حجر کی "لسان المیزان" انھی کی ہم پایہ ہے۔ [1]

علم الرجال:

یہ علم تاریخ ہی کی ایک قسم ہے، جس میں رواۃ حدیث کے اوصاف اور ان کی پیدائش اور موت کا ذکر ہے، تاریخ ابن جریر طبری، تاریخ کامل، تاریخ نیسابور للحاکم، تاریخ بغداد للخطیب مع ذیل للسمعانی، المنتظم لابن الجوزی، الروضتین لأبی شامه، تاریخ الإسلام للذهبی، البدایة والنهایة لابن کثیر، تهذیب التهذیب ابن حجر اور تذهیب التهذیب للذهبي ایسی بیسیوں مؤلفات اس فن کی مستندات میں شمار ہوتی ہیں۔ اس فن کی حفاظت اور خدمت کے لیے حفاظ حدیث نے ہزاروں اہل علم کے حالات کو محفوظ کر دیا۔ [2] رحمهم الله!

---

[1] کشف الظنون (۱/ ۵۸۲) أبجد العلوم (۲/ ۲۱۱)

[2] کشف الظنون (۱/ ۸۱) أبجد العلوم (۲/ ۶۱)

علم الروایة:

اس فن میں سند حدیث کے اتصال و انقطاع اور اس کے متعلقہ احوال سے اصولی بحث کی جاتی ہے، تاکہ احادیث کے الفاظ اور ان کی صحتِ نسبت کے متعلق صحیح علم ہو سکے۔ [1] اسے عرف عام میں ''اصول حدیث'' کہا جاتا ہے۔ یہ علم ارکان دین سے ہے اور فن حدیث کے متعلق اسے بے حد اہمیت حاصل ہے۔ مقدمه ابن الصلاح، تدريب الراوي للسيوطى، فتح المغيث للسخاوي، الفيه عراقى، الفيه سيوطى، معرفة علوم الحديث للحاكم، الكفاية للخطيب، شرح نخبة الفكر، اختصار علوم الحديث للحافظ ابن كثير، اس فن کی بہترین کتابیں شمار کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں کتابیں ائمہ فن نے اس موضوع پر لکھیں، تاکہ مستند، صحیح اور مختلق [بناوٹی] احادیث کی تمیز کے لیے قانون اور آئین کا کام دیں۔

علم الدراية:

اس فن میں درایت کی اقسام، شروط اور ان کے مفہوم کی توضیح کی جاتی ہے۔ یہ فن حدیث کے لئے تفسیر کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں تمام علوم ادبیہ صرف، نحو، معانی، بیان اور اصول کی روشنی میں احادیث کے معانی کی وضاحت کی جاتی ہے، شروح احادیث اسی علم کی فرع ہیں۔ [2]

علم المطاعن:

اس فن میں ان اعتراضات اور مطاعن کا جواب دیا گیا ہے، جو بدعتی فرقوں کی طرف سے احادیث پر وارد کئے جاتے ہیں، اسلام کے ابتدائی دور میں ایسی حرکات

---

[1] أبجد العلوم (٢/ ٢١٩)

[2] مصدر سابق

قرامطہ اور روافض کی طرف سے ہوتی رہیں۔ اہل علم نے اس باب میں اپنا فرض ادا کیا، مشكل الأحاديث للطحاوي اور تأويل مختلف الأحاديث في الرد على أعداء أهل الحديث لابن قتيبة الدينوری اس فن کی مغتنمات سے ہیں۔ [1] ان کے علاوہ سینکڑوں کتابیں امت نے اس موضوع پر لکھیں، شروح حدیث میں بہت حد تک اس فرض کو ادا فرمایا گیا، فتح الباری، شرح النواوی للمسلم، عون المعبود، نيل الأوطار للشوكاني سے بھی یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

علم الفقه:

کتاب اللہ اور سنت سے اشارتاً یا عبارتاً جو مسائل استنباط کیے جائیں، اسی کا نام فقہ ہے۔ [2] قرآن عزیز اور حدیث کی حجیت میں تو امت نے کبھی شبہ نہیں کیا، لیکن فقہ کی راہیں مختلف رہیں، بعض لوگوں نے بعض مخصوص ائمہ کے طریق فکر کو پسند کیا اور معلوم ہے کہ طریق فکر ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہے، ان لوگوں نے اسی ماحول کو ہر زمانہ میں محیط کرنے کی کوشش کی اور اسی طریق فکر کو تمام پر لازم کرنا ضروری سمجھا۔ حنفی شافعی، مالکی، حنبلی اسی مخصوص نظریہ کی پیداوار ہیں، ان بزرگوں کے مقلدین نے ضروری سمجھا کہ کتاب وسنت کو اسی ماحول میں سمجھا جائے، جس ماحول میں ان ائمہ رحمہم اللہ نے سمجھا، اس لیے ان بزرگوں نے کچھ اصل وضع فرمائی، یہی اس خاص مذہب کی فقہ قرار پائی۔ اس تخصیص کا جو اثر انقلاب اور تبدیلیِ احوال پر ہو سکتا تھا، وہ ان ائمہ کے اختلافات اور فقہ کی جزئیات کے مختلف احکام سے ظاہر ہے۔

ائمہ حدیث چونکہ ان افکار اور شخصی آراء کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے تھے، اس لیے وہ فہم حدیث میں ان بزرگوں کے افکار و آراء اور ان کے پیش آمدہ ماحول کے

[1] اسی طرح ''اختلاف الحديث'' للإمام الشافعي رحمہ اللہ بھی اس نوع میں داخل ہے۔

[2] أبجد العلوم (٢/ ٤٠٠)

پابند نہ تھے، بلکہ وہ احادیث کو اسی ماحول میں اور اسی طریق فکر سے سمجھنے کی کوشش فرماتے تھے، جس ماحول میں آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقاء کرام نے کہا یا سنا۔ اس لئے اس طریق کا نام "فقه الحديث" رکھا گیا، اسی سے اصول فقہ کی وضع اور تصنیف کا سہرا اہل سنت سے علماء اہل حدیث ہی پر ہے۔

" قال الإمام علاؤ الدين الحنفي في ميزان الأصول:

اعلم أن أصول الفقه فرع لعلم أصول الدين فكان من الضرورة أن يقع التصنيف فيه على اعتقاد مضنف الكتاب وأكثر التصانيف في أصول الفقه لأهل الاعتزال المخالفين لنا في الأصول و لأهل الحديث المخالفين لنا في الفروع " (أبجد العلوم: ٢/ ٣٢٥)

علامہ علاؤ الدین حنفی فرماتے ہیں کہ اصول فقہ علم کلام کی فرع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر تصنیف مصنف کے اعتقاد اور خیالات ہی کی ترجمان ہوگی، اور اصول فقہ کی اکثر تصانیف معتزلہ کی ہیں، جو اصول میں ہمارے مخالف ہیں یا اہل حدیث کی ہیں، جو فروع میں ہمارے مخالف ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اصول فقہ کی ضرورت سب سے پہلے ائمہ حدیث یا اہل حدیث کو محسوس ہوئی، اس لیے فقہ الحدیث فن حدیث کے لیے لازمی ہوئی۔ جس طرح فن روایت سے الفاظِ حدیث کی نسبت کی صحت میں فائدہ ہوا، ٹھیک اسی طرح اس علم حدیث نے فقہ الحدیث میں بہت مدد دی اور یہ علماء اہل حدیث کا خاص فن ہے۔ صحیح بخاری اور دیگر کتب صحاح پر نظر رکھنے والے اس فن کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہیں کہ محدثین کس قدر فقیہ تھے۔

ان فنون کے علاوہ علم الناسخ والمنسوخ، رموز الحدیث ، غریب الحدیث، طبقات المحدثین ،اصول فقہ وغیرہ فرعی علوم صرف خدمت حدیث کے

لیے ایجاد کیے گئے اور امت کے کروڑوں اہل علم صدیوں تک ان علوم کی ایجاد اور توسیع میں مشغول رہے، ان بزرگوں کی تصانیف لاکھوں تک پہنچتی ہیں، ان کا امت پر بے حد احسان ہے۔

حجیت حدیث:

یہ خدمات آفاقی دلائل کی حیثیت سے پتہ دیتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک اس فن شریف کی کیا حیثیت تھی؟ اسے حجت سمجھا جاتا تھا یا نہیں؟ تو اتر و تعامل کی حجیت کا اعتراف کرنے والے اس عملی تواتر کا جواب دیں گے، جو پوری امت نے صدیوں تک اختیار فرمایا۔ بحث وجدل سے کسی شخص کو چپ کرانا تو یقیناً مشکل ہے، لیکن عقل کے ساتھ تھوڑی بہت دیانت موجود ہو، تو اس کے قبول میں کوئی چارہ نہیں کہ امت نے حدیث کو حجت سمجھا، اس نے اس کے الفاظ اور مفہوم کی حفاظت کے لیے اپنی عمریں صرف کر دیں، بیسیوں علوم ایجاد کیے، لاکھوں تصانیف سے امت کو مالا مال کیا اور ایسے آثار باقیہ چھوڑے جن پر رہتی دنیا ناز کرے گی۔

آج کے جہلستان میں چند آبرو باختہ متفرنج اور ان کے ذیول وضمائم اگر اس فن کی تقدیس وحجیت کا انکار کریں، تو پوری دنیا کا تعامل ان کے خلاف صف آرا ہوگا۔

جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور مدیر فاران کراچی

حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مولانا مودودی کے مضمون ''مسلک اعتدال'' اور اس کی تائید و تصویب میں مولانا امین احسن اصلاحی کے لکھے گئے ایک مضمون پر تعاقب کیا، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۴ مارچ ۱۹۵۶ء) کی متعدد اقساط میں شائع ہوا اور بعد ازاں ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' کے عنوان سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کی تصدیر و اہتمام کے ساتھ مکتبہ سلفیہ لاہور سے طبع ہوا۔

یہ رسالہ جہاں اپنوں کی نگاہ میں بنظر استحسان دیکھا گیا، وہاں جماعت اسلامی کے رسائل و جرائد میں اس پر نقد و تبصرہ بھی کیا گیا، چنانچہ جنوری ۱۹۵۷ کے ''فاران'' کراچی میں مولانا ماہر القادری نے بھی اپنا حق وفاداری نبھاتے ہوئے مذکورہ بالا رسالہ کا تنقیدی جائزہ لیا۔

جس کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ماہنامہ ''رحیق'' (فروری ۱۹۵۷ء) میں مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا، جس میں انھوں نے ماہر صاحب کے اشکالات و اعتراضات کا جائزہ لیا اور زیر بحث موضوع کے کئی پہلوؤں کو قرآن و حدیث کے دلائل اور ائمہ لغت و اصول کے اقوال و آراء سے مبرہن کیا۔

جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث اور مدیر فاران کراچی

جنوری ۱۹۵۷ء کے ''فاران'' میں مولانا ماہر القادری نے رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' پر ایک تنقیدی شذرہ لکھا ہے۔ آپ نے کتاب کے بعض اجزاء کو پسند فرمایا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں اور بعض حصوں پر تنقید فرمائی، جس کا انھیں حق تھا۔ کسی تنقیدی کتاب کے متعلق اگر اپنے ہم خیال پسندیدگی کا اظہار کریں اور مخالفین اس سے خلش محسوس کریں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ اس معنی سے یہ کوشش بحمداللہ خاصی کامیاب ہے۔ ماہر صاحب کی تنقید کے بعض حصے غلط فہمی پر مبنی ہیں، چونکہ اس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لیے زیر قلم گزارشات کی ضرورت محسوس ہوئی۔

﴿إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله﴾ [1]

قادیانی عقیدت مندی:

میں نے عرض کیا تھا کہ

''جماعت اسلامی میں بعض حضرات مولانا مودودی سے اسی طرح عقیدہ رکھتے ہیں، جیسے قادیانی حضرات آج سے چند سال قبل مرزا محمود سے رکھتے تھے۔'' (مختصراً) [2]

ظاہر ہے کہ اس کا مقصد نہ عقائد میں تشابہ ہے اور نہ ان مزخرفات میں جو

---

1. ھود: ۸۸
2. جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث (ص: ۸)

قادیانی امت کی خصوصیت ہے، بلکہ اس سے مطلب اس مفرط عقیدت کی نشان دہی ہے، جو جماعتوں کے عوام کو اپنی قیادت سے ہوتی ہے اور مجھے اصرار ہے کہ جماعت اسلامی اس لیڈر پرستانہ عقیدت سے مستثنیٰ نہیں۔

کوئی خوش ہو یا ناراض حقیقت یہی ہے کہ جماعت کے عوام کی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے اور جماعتیں اسی طرح فرقہ بن جاتی ہیں۔کوئی مانے یا نہ مانے اس امر کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عموماً ان حضرات کی نظر میں حق و باطل کا معیار مولانا کا اندازِ فکر ہے۔ وہ کتاب و سنت سے زیادہ اپنے لٹریچر اور اپنی قیادت کی طرف دعوت دیتے ہیں، وہ دوسرے اہل علم کی تحقیر و تذلیل سے قطعی پرہیز نہیں کرتے ،لیکن مولانا پر معمولی تنقید بھی گوارا نہیں کرتے ،سوچنا تو بڑی بات ہے، نیک دلی سے تنقید کرنے والوں پر کیچڑ اچھالتے اور بدزبانی کرتے ہیں اور یہ سب قادیانی خصائص ہیں۔

خود ماہر صاحب نے مجھ پر جس گھٹیا انداز سے حرف گیری کی اور جس قدر ہلکی زبان اور خفیف لب و لہجہ اختیار کیا ہے، یہ میری تائید ہے۔ ایسے پڑھے لکھے حضرات کی زبان جب بے احتیاط ہو جائے ،تو عوام سے شکوہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے حضرات کو'' فالتو'' شرافت کون دے؟ میں مکرر عرض کروں گا کہ " المسلم مرآۃ المسلم "[1] کی روشنی میں میری گزارش پر غور کیا جائے۔ مریض اگر معالج کے ساتھ

---

[1] ''مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے آئینہ ہے۔'' مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔

حافظ عبدالرؤف المناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فيه يحيىٰ بن عبدالله قال الذهبي: قال أحمد: غير ثقة " (فيض القدير : ٦/ ٢٧١) علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:" ضعيف جدا " (ضعيف الجامع، برقم: ٥٩٣٣)

لیکن " المؤمن مرآة المؤمن " کے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے، دیکھیں: سنن أبي ←

بدزبانی کرے، تو اس سے مرض کو فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ کے عوام میں اندھی عقیدت اور جمود، قوتِ فکر کی جگہ لے رہا ہے!

"مُثلہ" یا بدحواسی؟

مولانا ماہر کی تنقید کا سارا زور اس مقام پر ہے کہ میں نے **تفہیمات** (۱/۲۳۵) کی عبارت کو مُثلہ کر دیا، اس میں قطع و برید کی ہے۔ [1] مولانا یہاں بہت تیز ہوگئے، اشہب قلم ترقی پسند ادیبوں کے انداز استحقار سے بھی زیادہ پست ہوگیا ہے۔

مجھے اس اصول سے اتفاق ہے کہ کسی حوالہ میں قطع و برید اور دوسرے کے مقاصد کی تخریب واقعی علمی خیانت ہے اور دیانت داری کے منافی، أعاذنا اللّٰہ من ذلك!

لیکن میں افسوس سے عرض کروں گا کہ یہاں اس کی حیثیت ایک بدحواسی سے زیادہ نہیں، اگر غصہ اور انتقام قوت فکر کو معطل نہ کر دیتا، تو مولانا ایسے ذہین آدمی کے لیے حقیقت کو پالینا چنداں مشکل نہ تھا۔

معلوم ہے کہ تعارفی مقالات میں اساسی مباحث نہیں آ سکتے، مولانا مودودی لکھنے میں اطناب کے عادی ہیں، معمولی مباحث کو ان کا قلم بلاضرورت پھیلا دیتا ہے، جس کا آپ کے ہاں کے فہمیدہ حضرات کو بھی اعتراف ہے۔

مولانا نے اہل قرآن کے تیسرے گروہ کی ترجمانی قریباً سات سطروں میں کی ہے۔ میں نے اس کا اختصار ایک فقرہ میں کیا ہے، یعنی "تیسرا گروہ حیثیت رسالت

← داود، برقم (٤٩١٨) اس کی سند کو حافظ عراقی، ضیاء المقدسی، ابن حجر اور البانی رحمہم اللہ نے "حسن" قرار دیا ہے۔

(المغني: ٢/ ١٣٧، الأحاديث المختارة: ٢/ ٤٧٢، بلوغ المرام، برقم (١٣٤١) السلسلة الصحيحة: ٢/ ٥٩٦)

[1] فاران، جنوری ۱۹۵۷ (ص: ٤٧)

اور حیثیت شخصی میں فرق کرتا ہے''۔ پورا فقرہ مولانا کی عبارت میں کہیں نہیں، اس کے بعد مولانا کی عبارت کا اقتباس لفظ ''میں سمجھتا ہوں'' سے شروع ہوتا ہے، اس میں ایک لفظ بھی کم نہیں کیا گیا۔ ❶

کاتب صاحب نے یہ بدحواسی کی کہ میرا مختصر فقرہ مولانا کے اقتباس کے ساتھ ملا کر لکھ دیا۔ مولانا ماہر صاحب جوشِ انتقام میں بے تاب ہوگئے، سوچے بغیر اس کا نام ''مُثلہ'' اور ایک علمی خیانت رکھ کر میری طرف منسوب فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل کو بھی سلیقے سے استعمال کی توفیق نہیں مل سکی، ''فالتو'' تو خیر تھی ہی نہیں!

ایک دور افتادہ گنہگار پر اس طرح نظرِ عنایت اور فتووں میں یہ طغیانی ''صلحاء'' کراچی سے اس کی امید نہ تھی۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ ایک مسلمان جانتے ہوئے ایسی تہمت نہیں تراش سکتا، لیکن جو لوگ دنیا میں اسلامی معاشرہ بپا کرنے کے مدعی ہوں، وہ بھی جوشِ انتقام میں اس قدر بے بس ہو جائیں، تو ہم ایسے سیاہ کار اس کے سوا کیا عرض کر سکتے ہیں:

توبہ فرمایاں چرا خود توبے کمتر میکنند ❷

میرے مقصد کو نہ اس اختصار سے کوئی فائدہ ہے، نہ پوری عبارت سے نقصان، میں تیسرے گروہ کو اس عقیدہ کے ہوتے بھی گمراہ سمجھتا ہوں۔ مولانا مودودی

---

❶ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مولانا مودودی کی عبارت یوں نقل کی ہے:

تیسرا گروہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق کرتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ چودھری (غلام احمد پرویز ایڈیٹر طلوع اسلام) صاحب اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور میں ابتداء ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان کا مسلک حق سے بہت زیادہ قریب ہے، اگرچہ تھوڑی سی غلطی اس میں ضرور ہے، لیکن الحمدللہ کہ وہ گمراہی کی حد تک نہیں پہنچتی۔ (تفہیمات: حصہ اول، طبع چہارم، ص: ۲۳۵۔ ۲۳۶)

❷ توبہ کی فرمائش کرنے والے خود کیوں کم ہی توبہ کرتے ہیں؟

اسے گمراہی کی حد سے ورے تھوڑی سی غلطی سمجھتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں آج کا پرویز اور ۳۵ء کا پرویز دونوں گمراہ ہیں، بلکہ ۳۵ء کا پرویز کسی قدر بیوقوف اور کم فہم! بشرطیکہ وہ مولانا کی اس ترجمانی کو قبول کرے، جس کی مجھے امید نہیں۔

اگر یہ شہادت مل جائے کہ پرویز صاحب ۳۵ء میں منکر حدیث نہیں تھے، تو میری معلومات میں اضافہ ہوگا۔ کیا پرویز صاحب یہ اقرار کریں گے کہ میں اب منکر حدیث ہوں؟ پہلے میں گمراہ نہیں تھا، اب گمراہ ہو چکا ہوں؟ اگر آپ یہ اقرار کرا دیں، تو آپ کا ملت پر احسان ہوگا۔ میری دانست میں حافظ اسلم اور پرویز صاحب میں عقیدہ کا کوئی فرق نہیں۔ منافقین کی ایک جماعت ہے، جو عوام کو خراب کرنے کے لیے الفاظ کی ہیرا پھیری کرتی رہتی ہے، اہل نفاق کے متعلق احتیاط ہی برتنی چاہیے۔

چور دروازے:

میں نے انکار حدیث کے تدریجی ارتقاء اور اس کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ایسے لوگوں کا ذکر بھی کیا ہے، جو حدیث کی حجیت کے منکر تو نہیں، مگر ان کی منطق نوازی سے انکار کی راہیں ضرور کھلتی اور انکار کے لیے حیلے اور بہانے پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس میں ایسے اکابر کا بھی ذکر کیا ہے، جن کی علمی اور بعض ملّی خدمات کا خود مجھے اعتراف ہے، مگر میں دیانتاً ان کو تشکیک اور چور دروازوں کی ایجاد کا ملزم سمجھتا ہوں۔

کتاب کے صفحہ (۱۰۰) سے آخر تک میں نے ان حضرات کی ''نصوص'' اور عبارات سے واضح کیا ہے کہ میں ان اکابر کو کیوں ملزم سمجھتا ہوں؟ میں نے اس میں اجمال اور اہمال دونوں سے کام نہیں لیا اور شکر ہے کہ ان کی ''بزرگی'' اس صاف گوئی میں حائل نہیں ہو سکی۔ ماہر القادری صاحب کا فرض تھا کہ میرے شبہات پر بحث کرتے اور میری غلطی کو واضح فرماتے، مولانا شبلی [1]، مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی

[1] میں نے ندوی حضرات کو بھی باستثناء مولانا سید سلیمان صاحب رحمہ اللہ ان مشککین میں شمار کیا ←

کے طریقہء تنقید واصول تنقید کی صحت کو ثابت فرماتے، مگر مولانا نے میرے دلائل کے حصہ کو بالکل کاٹ کر الگ کر دیا۔ اگر ایسا غلطی سے ہوا ہے اور مولانا کتاب کا آخری حصہ نہیں پڑھ سکے، تو اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔ اگر دانستہ ایسا کیا گیا ہے، تو یہ علمی خیانت ہے، "مُثلہ" کرنے کا جو الزام مجھ پر لگایا گیا تھا، اس کا ارتکاب خود فرمایا:

کیا کسی سے گلہ کرے کوئی !

مولانا نے یہی نہیں کیا، بلکہ بحث کا رخ ہی دوسری طرف پھیر دیا اور یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی کہ گویا محدثین کے طریق تنقید سے بھی چور دروازے کھل سکتے ہیں اور استحقار اور استخفاف کا الزام دیا جا سکتا ہے۔[1] آخر میں فرمایا:

"نقد احادیث تو مسلمانوں کا بہت بڑا علمی اور دینی کارنامہ ہے، اس کو چھپا دینا خود فن حدیث کے ساتھ نا انصافی ہے۔"[2]

مولانا ماہر القادری کا یہ فرمانا کہ

"فن حدیث پر محدثانہ طریق تنقید کو اہل حدیث ہی چھپانا چاہتے ہیں۔"[3]

دیانت اور شرافت سے کتنی بڑی بے انصافی ہے؟ إنالله وإنا إليه راجعون!

← تھا۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کی زبانی معلوم ہوا کہ محترم مولانا ابو الحسن علی میاں کو اس کا شکوہ ہے کہ سب ہی ندویوں کو کیوں تشکیک کا ملزم گردانا گیا؟ حالانکہ ہم لوگ تو عام اہل سنت کی طرح حدیث کو صاف طور پر حجت مانتے ہیں۔ میں مولانا علی میاں سے بصمیم قلب معافی چاہتا ہوں اور یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے حضرات کے متعلق میرا یہی خیال ہے، جو آپ فرماتے ہیں، لیکن لکھتے وقت وہ ندوی حضرات میرے سامنے تھے، جو حدیث میں مولانا شبلی کی طرح تشکیک کے مریض ہیں اور وقتاً فوقتاً تصانیف و مقالات میں اس کی اشاعت کرتے رہتے ہیں۔

[1] فاران، جنوری ۱۹۵۷ء، (ص: ۴۷)

[2] فاران (ص: ۴۸)

[3] فاران (ص: ۴۹)

ہمیں تو شکایت ہی یہ ہے کہ آج کل کے متورین نئے تنقیدی نظریات سے متاثر ہو کر محدثین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا چاہتے اور انھیں ناتمام سمجھتے ہیں اور لاعلمی کی وجہ سے چور دروازے کھولتے اور سنت میں تشکیک پیدا کرتے ہیں۔ افسوس ہے مولانا اصلاحی کی ''مزعومہ سنت'' اور مولانا مودودی اور مولانا شبلی مرحوم کی ''مخترعہ درایت'' سے شکوک کے سوا حدیث کی کوئی خدمت ممکن نہیں ہو سکی، یہ بحث کے نئے زاویے ملت کے لیے بھی مصیبت ہیں اور ان حضرات کے لیے بھی!

''ذکر'' کا عموم:

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ قرآن کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، حدیث کی حفاظت بھی اسی کے ذمہ ہے اور آیت: ﴿إنا نحن نزلنا الذكر ......﴾ [1] میں ان دونوں کی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ [2]

مولانا ماہر القادری صاحب کا خیال ہے کہ ذکر میں یہ عموم درست نہیں، ابن حزم کی ذاتی رائے ہے۔ [3]

یہ بحث علمی ہے، مولانا کو اختلاف کا حق ہے۔ اگر سنجیدگی سے سوچا جائے، تو حافظ ابن حزم کی رائے معقول اور وزنی معلوم ہوتی ہے بوجوہ:

① ظاہر ہے کہ جب حدیث بھی دین ہے اور قرآن عزیز بھی دین ہے، پھر اگر قرآن عزیز کی حفاظت کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے لے لی اور حدیث حفاظت سے خارج رہی، تو گویا ایک حصہ کو محفوظ کر دیا گیا اور دوسرا حصہ بالکل ''غیر محفوظ'' رہا،

---

[1] الحجر: ٩

[2] الإحكام لابن حزم (١/ ٩٥)

[3] فاران (ص: ٤٨)

یعنی کچھ دین محفوظ ہوگیا، کچھ غیر محفوظ! اہل قرآن کہہ دیں گے یہ حدیث تو دین ہی نہیں، ورنہ اس کی حفاظت کے لیے ضمانت دی جاتی۔ کتابت حدیث کے متعلق بھی ان کے شبہ کی یہی نوعیت ہے۔

② لغت عرب کے علاوہ قرآن مجید کا خود بھی اپنا لغت ہے، جس میں "ذکر" کا لفظ متعدد معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

﴿إن الذكرى تنفع المؤمنين﴾ [1] (۵۱/ ۵۵) کثرت ذکر۔

﴿الذكر الحكيم﴾ [2] (۳/ ۵۸) قرآن عزیز۔

﴿فاسألوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾ [3] (۲۱/۷) کتب سابقہ۔

﴿قد أنزل الله إليكم ذِكراً ۝ رسولا ...﴾ [4] (۶۵/۱۰) آنحضرت بوصف رسالت۔

﴿وإنه لذكرلك ولقومك﴾ [5] (۴۳/ ۴۴) شرف و برتری۔

﴿ولقد اٰتينا موسىٰ وهارون الفرقان وضياء وذكراً﴾ [6] (۲۱/۴۸) وحی، نبوت، تورات وغیرہ۔

﴿ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر﴾ [7] (۲۱ / ۱۰۵) تورات۔

---

❶ الذاريات: ۵۵

❷ آل عمران: ۵۸

❸ الأنبياء: ۷

❹ الطلاق: ۱۰

❺ الزخرف: ۴۴

❻ الأنبياء: ۴۸

❼ الأنبياء: ۱۰۵

﴿ یا بنی إسرائیل اذکروا نعمتی ﴾[1] (۲/ ۴۰) ضد نسیان۔

③ حدیث خمسہ رضعات[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث پر قرآن یا کتاب اللہ کا لفظ بھی استعمال فرما لیتے تھے۔

④ ذکر جب رسول پر بولا جائے، تو رسالت کے تمام لوازم اور خصائص اس میں شامل ہوں گے، اس لئے حدیث بھی اس میں شامل ہوگی۔

⑤ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ منفرد نہیں، صواعق مرسلہ میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ان حضرات کے دلائل کا ذکر فرمایا ہے، جو حدیث کو مفید علم سمجھتے ہیں، اس میں ضمناً آیت: ﴿إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون ﴾ کا ذکر فرمایا ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے:

"قالوا: فعلم أن کلام رسول الله ﷺ في الدین کله وحي من عند الله، و کل وحي من عند الله فهو ذکر أنزله الله...... الخ"

(صواعق مرسلہ: ۳/ ۳۷۱، ۳۷۲)

یعنی دین سب وحی ہے اور ہر وحی ذکر منزل من اللہ ہے۔

یہ حوالہ کافی لمبا اور بہت مفید ہے، میں نے اختصار کے لیے اسے " مُثلہ " (بقول ماہر صاحب) کر دیا ہے، صواعق ملاحظہ فرما لیں!

حافظ ابن قیم نے فرمایا ہے کہ علی بن مدینی اور تمام اہل علم جو احادیث کو مفید علم سمجھتے ہیں، وہ ابن حزم کے ہم زبان ہیں، اور حدیث کو " ذکر " میں شامل سمجھتے ہیں۔ ے خانہ سنت میں سرشاروں کی کمی نہیں۔

---

[1] البقرہ: ۲

[2] صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب التحریم بخمس رضعات، رقم الحدیث (۱۴۵۲) نیز دیکھیں: صحیح البخاري، برقم (۲۰۴۹، ۶۴۴۲) صحیح مسلم، برقم (۱۶۹۷، ۱۶۹۱)

”جنید و شبلی و عطار شد مست“

① ”عن الأوزاعي عن حسان بن عطية قال كان جبريل عليه السلام ينزل على النبي ﷺ بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن ويعلمهم إياها كما يعلمه القرآن “(الرد الوافر ،ص:۳، موافقات شاطبي : ٤/٢٦) ❶

یعنی جبریل علیہ السلام سنت بھی قرآن کی طرح نازل فرماتے اور آنحضرت ﷺ کو قرآن کی طرح اس کی تعلیم دیتے۔

② حدیث: ”أوتيت القرآن ومثله معه“ ❷ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جہاں تک سنت کے انتساب اور استناد کا تعلق ہے، وہ قرآن ہی کی طرح ہے، دونوں کا منبع ایک ہی ہے، لیکن حفاظت کے طریقے دونوں جگہ مختلف ہیں، قرآن جس طرح متواتر ہے، سنت اس طرح متواتر نہیں، اس حیثیت سے سنت کا مرتبہ واقعی قرآن کے بعد ہے، البتہ قرآن کی توضیح اور تفسیر میں سنت کا مقام سب سے پہلا ہے۔

اس لیے ماہر صاحب کا یہ ارشاد بالکل درست ہے کہ

”جہاں تک قرآن کی حرف بحرف محفوظیت اور اس کے لا ریب فیه ہونے کا تعلق ہے، احادیث کو ٹھیک اس درجہ میں رکھنا ناپسندیدہ غلو ہے“۔ ❸

اگر کوئی ایسا خیال کرے اور بحمداللہ اہل حدیث اس خیال کے نہیں، تو اسے سختی سے روک دینا چاہیے۔ اسی طرح جو لوگ احادیث کی صحت کو اپنی ”آزاد عقل“ کے

---

❶ سنن الدارمي (١/ ١٥٣) السنة للمروزی (ص: ٣٣) الكفاية للخطيب البغدادي (ص: ١٢)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس اثر کی سند کو صحیح کہا ہے۔ فتح الباري (١٣/ ٢٩١)

❷ اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ دیکھیں:

❸ فاران (ص:٤٨)

معیار پر رکھنا چاہتے ہیں، ان سے بھی ادباً عرض کیجئے کہ رسول کی ''مزاج شناسی'' کا یہ انداز درست نہیں۔ ایاز قدر خویش بشناس ![1]

قصہ غرانیق:

حدیث غرانیق کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ محدثین کے نزدیک یہ ساقط الاعتبار ہے اور جن الفاظ سے محدثین نے اسے قابل استناد سمجھا ہے، اس میں کوئی خلش نہیں۔[2]

ماہر صاحب فرماتے ہیں: ''یہ عجیب تضاد ہے''!

کیا عرض کیا جائے۔

جو چاہے آپ کا '' علم '' کرشمہ ساز کرے !

میری تو پھر بھی یہی مؤدبانہ گزارش ہے کہ حدیث غرانیق مختلف طرق اور الفاظ سے مروی ہے، جن طرق میں غرانیق کا صراحتاً ذکر ہے، اس کے تمام طرق مرسل ہیں، ایک مرسل طریق کے متعلق سیوطی فرماتے ہیں:

''مرسل صحیح الإسناد'' (روح المعاني، ص: ۱۷٦، پاره ۱۷)[3]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''ابن جبیر کے سوا تمام طریق ضعیف اور منقطع ہیں، بزار کا طریق متصل اور صحیح ہے، کثرت طرق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ قصہ کی کچھ اصل ہے''۔[4] (روح المعاني، ص: ۱۷۸، ملخصاً)

---

1. ایاز اپنی قدر پہچان!
2. جو صرف اس قدر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ نجم میں سجدہ کیا، تو آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس نے بھی سجدہ کیا۔ صحيح البخاري، برقم (۱۰۲۱)
3. الدر المنثور للسيوطي (٦/ ٦٦) روح المعاني (۱۷/ ۱۷٦)
4. فتح الباري (۸/ ۳۵٤) روح المعاني (۱۷/ ۱۷۸)

در منثور میں طرق کا استقصا کیا گیا ہے، آلوسی نے اس پر مبسوط بحث کی ہے، صاحب فتح البیان ان تمام طرق پر غیر مطمئن ہیں۔ [1]

صحیح بخاری میں ابن عباس اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے دو اثر منقول ہیں، ان میں غرانیق کا ذکر اشارتاً ہے، صراحتاً نہیں، اس میں کوئی خلش نہیں۔

(صحیح بخاري: ۲/ ۷۲۱) [2]

فن سے تھوڑی بہت ممارست کی وجہ سے جو تاثرات تھے، عرض کر دیئے گئے، اسے آپ کے ہاں اگر تضاد فرمایا جاتا ہے، تو شوق سے فرمائیے۔ مشکل یہی ہے کہ آپ کے ہاں احادیث پر تنقید چھاتی کے زور سے ہوتی ہے، ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔ حدیث کا احترام اور ائمہ اسلام کی محنت پر اعتماد اس ''تضاد'' کا موجب ہے اور رہے گا۔ إن شاء اللّٰہ!

میں آپ کو اس جرأت میں معذور سمجھتا ہوں، آپ کے ہاں وہ اسباب و دواعی غالباً ناپید ہیں جو اس سینہ زوری سے روک سکیں یا جن سے اس فن کی عظمت

← حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا کلام فتح الباری میں بایں الفاظ لکھا ہوا ہے: " وكلها سوى طريق سعيد بن جبير إما ضعيف وإما منقطع لكن كثرة الطرق تدل على أن للقصة أصلا " (فتح الباري: ۸/ ۳۵٤)

[1] الدر المنثور (٦/٦٥) روح المعاني (۱۷/ ۱۷٦) فتح البیان (۹/ ٦۷)

کسی بھی صحیح اور متصل سند سے یہ قصہ ثابت نہیں ہے، چند مرسل اسانید سے یہ واقعہ مروی ہے اور مرسل روایت ائمہ محدثین کے نزدیک از قسم مردود اور نا قابل احتجاج ہے، علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے متعلقہ تمام مرویات کو اپنے رسالہ "نصب المجانيق في نسف قصة الغرانيق " میں جمع کیا ہے، جس میں اس واقعہ پر سنداً اور متناً بحث کی ہے اور اس کے عدم ثبوت اور نا قابل احتجاج ہونے کے بڑے ٹھوس اور تفصیلی دلائل ذکر کیے ہیں، جزاه الله خير الجزاء! مزید برآں اس قصہ کو امام ابن خزیمہ، بیہقی، ابن العربی، قاضی عیاض، فخر الدین الرازي، قرطبی، کرمانی، عینی، شوکانی، آلوسی وغیرہم نے بے اصل اور من گھڑت قرار دیا ہے، تفصیل کے لیے مذکورہ بالا رسالہ ملاحظہ کریں۔

[2] صحیح البخاری: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الحج (۸/ ٤۳۸، مع الفتح)

قائم ہو سکتی ہے۔

معتزلہ سے تاثر:

میں نے عرض کیا تھا کہ حنابلہ اور اہل حدیث، معتزلہ سے متاثر نہیں، باقی ائمہ کے بعض اُتباع ان سے متاثر ہو گئے۔ ❶

مولانا ماہر القادری متاثرین کی وکالت فرماتے ہیں کہ

''اپنی ''تعمق فی الدین'' کی کمزوری اور دینی مسائل میں دقتِ نظر کی کوتاہی کو چھپانے کے لیے پھبتی چست کی گئی ہے''۔ ❷

اچھا ہوا آپ نے دل کی بھڑاس نکال لی، حالانکہ یہ پھبتی نہیں بلکہ حقیقت اور واقع ہے۔ کیا زمخشری، قاضی عیسیٰ بن ابان اور بشر مریسی حنفی نہیں ہیں؟ لیکن ان میں بعض اعتزال کے پیشوا ہیں۔ اپنے وقت میں حضرات معتزلہ نے اہل حدیث کو حشویہ، مجبرہ، غثاء اور غثر ایسے ناموں سے نوازا ہے۔ ❸ اس کا وہی مطلب ہے جو آپ نے معتزلہ کی وکالت اور حمایت میں فرمایا۔ اس وقت کے اہل حدیث امام حافظ ابن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ متوفی ۲۷۶ھ (امام اسحاق بن راہویہ کے شاگرد) فرماتے ہیں:

'' قال كل فريق منهم لأهل الحديث مثل الذي قالته القدرية والأسماء لا تقع غير مواقعها، ولا تلزم إلا أهلها، ويستحيل أن تكون الصياقلة هم الأساكفة، والنجار هو الحداد ''

(تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ: ۹۷)

---

❶ جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث (ص: ۹۰)

❷ فاران (۴۹)

❸ دیکھیں: تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ (ص: ۸۰)

قدریہ کی طرح سارے بدعتی فرقوں نے اہل حدیث کا کوئی نہ کوئی نام رکھا ہے۔

ماہر صاحب! ڈینگیں مارنے کی ہمیں بحمداللہ عادت نہیں، اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ تاہم جب تک امام احمد، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن دقیق العید، ابن رجب، ابن قدامہ مقدسی، عزبن عبدالسلام رحمہم اللہ ایسے لوگوں کا ذکر تاریخ کے صفحات میں موجود ہے، آپ ایسے متنورین کی یہ پھبتیاں برمحل نہیں ہوں گی۔ دنیا میں وقت نظر کا کوئی دور بتایئے، جس کی امامت اہل حدیث نے نہ کی ہو۔ اعتزال، تجہم، رفض اور خروج کو شکست کہاں سے ہوئی؟ ﴿جند ما هنالك مهزوم من الأحزاب﴾ [1]

آج جس حریت فکر پر آپ حضرات کو ناز ہے، اس کی صحیح حدود اہل حدیث ہی کو معلوم ہیں۔

قادیانی یا تصوف آمیز شاعری:

فقہاء اسلام کی تعریف میں مولانا مودودی نے جو غیر علمی اور جذباتی انداز اختیار فرمایا ہے، میں نے اسے قادیانی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

ماہر صاحب فرماتے ہیں:

''تصوف آمیز شاعری'' مناسب طنز ہے۔ [2]

مجھے یہ ترمیم منظور، لیکن تصوف کا شاعرانہ دور تو ساری بدعات کا منبع ہے، یہ تو ''فر من المطر و قام تحت الميزاب'' [3] کی مثال ہے، یہ صحیح ہے کہ قادیانیت بہت بڑی شناعت ہے۔

امت کی معصومیت:

---

1. سورہ ص: ۱۱
2. فاران (ص: ۴۹)
3. بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا!

اجماع اور تلقی بالقبول کے سلسلہ میں میں نے بحیثیت مجموعی امت کی معصومیت کا ذکر کیا تھا۔ مولانا ماہر القادری فرماتے ہیں کہ

"اہل حدیث کو ایسے علم کلام کا استعمال نہیں کرنا چاہیے"۔ ❶

اس علمی مسکنت کا کیا علاج کیا جائے؟ کاش! مولانا جماعت اسلامی کے علماء کی طرف اس مسئلہ میں بھی رجوع فرماتے۔ اجماع کی حجیت اور اس کی تعبیر میں بے شک اختلاف ہے، لیکن جو لوگ اجماع کو حجت مانتے ہیں، ان کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ امت بحیثیت مجموعی معصوم ہے، یہ مسئلہ احادیث التزامِ جماعت ❷ اور "لا تجتمع أمتي علی ضلالة" ❸ وغیرہ سے استنباط فرمایا گیا ہے۔

کشف الأسرار شرح أصول بزدوی میں ہے:

"فدل علی أنه أراد ما لا تعصم عنه الآحاد من سهو و خطأ وكذب ويعصم عنه الأمة تنزيلا لجميع الأمة منزلة النبي في

---

❶ فاران (ص: ٤٩)

❷ یعنی جن احادیث میں اجتماعی زندگی گزارنے کی تلقین اور تفرق و تحزب سے ممانعت کی گئی ہے اور مسلمان حکمران کی موجودگی میں اس سے جنگ و جدل اور راہ شذوذ و نفور اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري، برقم (٢٤١١) صحیح مسلم، برقم (١٨٨٧) سنن أبي داود، برقم (٤٧٥٨) سنن الترمذي، برقم (٢١٦٥) سنن النسائي، برقم (٨٤٧)

❸ مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت نہیں ہے، لیکن اسی معنی میں دیگر الفاظ کے ساتھ یہ حدیث ثابت ہے، امام ابن حزم رحمہ اللہ مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: " وهذا وإن لم يصح لفظه ولا سنده فمعناه صحيح بالخبرين المذكورين آنفا " (الإحكام لابن حزم: ٤/ ٥٢٧) نیز دیکھیں: التلخيص الحبير (٣/ ١٤١) کشف الخفاء، برقم (٢٩٩٩) السلسلة الصحيحة (٣/ ٣١٩) بعض اہل علم نے اس حدیث کو متواتر احادیث میں شمار کیا ہے، دیکھیں: نظم المتناثر من الحديث المتواتر للكتاني (ص: ١٦١)

العصمة عن الخطأ في الدين"[1] (۳/ ۹۷۹)

یعنی آحاد امت بھول، خطا اور کذب سے معصوم نہیں، لیکن امت اجتماعی طور پر آنحضرت ﷺ کی طرح معصوم ہے۔

اسی طرح (۳/ ۹۷۸) میں ہے، نیز روضة الناظر لابن قدامة المقدسي (۱ / ۳٤۲) میں ہے:

" أن النبي ﷺ عظم شأن هذه الأمة وبين عصمتها عن الخطأ "

(أيضا: ۱/ ۳٤۷، ۱/ ۳٦٤، وإرشاد الفحول: ۷٦)[2]

آنحضرت ﷺ نے امت کی عظمت اور اس کی خطا سے عصمت کا ذکر فرمایا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" فإن العصمة تثبت بالنسبة الإجماعية كما أن خبر التواتر يجوز الخطأ والكذب على واحد واحد من المخبرين بمفرده ولا يجوز على المجموع، والأمة معصومة عن الخطأ في روايتها ورأيها ورؤياها الخ " (صواعق مرسله: ۳/ ۳۷٤)[3]

یعنی افراد خطا اور کذب سے محفوظ نہیں، لیکن اجماعی نسبت کے لیے عصمت ثابت ہے، امت روایت، رائے اور خوابوں میں معصوم ہے۔

یہ صواعق میں بحوالہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مرقوم ہے۔

آج کے مفکر علما سے موسیٰ جار اللہ مرحوم بہت بلند پایہ عالم ہیں۔ اس پاداش میں انھیں روس سے ہجرت کرنا پڑی، فرماتے ہیں:

---

[1] كشف الأسرار (۳/ ۳۸۲)

[2] المستصفىٰ للغزالي (ص: ۱۳۹) روضة الناظر بجنة المناظر لابن قدامه (ص: ۱۳٤) إرشاد الفحول (۱/ ۲۰٦)

[3] نیز دیکھیں: إعلام الموقعين (۱/ ۸٤)

”والأمة في عقيدتي معصومة عصمة نبيها وهذه في اليوم دعواي“[1]

(كتاب السنة : ١١٤)

الوشیعه میں انھوں نے اُسے زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

جزو پر کل کا حکم نہیں ہوتا:

میں نے علماء اصول کے تتبع میں اجماع کے لیے عصمت لکھا تھا۔ اس پر ماہر صاحب نے نبوت کا معارضہ کھڑا کر دیا، حالانکہ علما اور صلحا پر بحیثیت مجموعی ”نبوت“ کا معارضہ مضحکہ خیز ہے، آپ کے منہ سے یہ نہیں سجتا!

حضرت! کسی مجموعہ کے بعض اجزاء کا کسی جگہ پایا جانا اور بات ہے اور کسی جزو پر پورے کل کا مطلقاً حکم جہل عظیم ہے۔ دیکھیے نبوت کے بعض اجزاء (بشریت، صداقت، رویائے صادقہ وغیرہ) دوسری جگہ پائے جا سکتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر نبوت کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس معارضہ پر مقرر غور فرمایئے، بڑا ہی مضحکہ خیز ہے۔

اور ہاں!

دستور میں سنت کے لیے جو کچھ ہوا، میں اس کا مدو جزر جانتا ہوں، جن حضرات نے جو کوشش کی، معلوم ہے۔ جماعت اسلامی کی مساعی بھی مخفی نہیں، جو کسی نے کیا ہے، اس کا اجر اسے اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔ اہل حدیث نے بھی اس سلسلے میں جو حصہ لیا ہے، اس کے اشتہار کی ہمیں ضرورت نہیں، کیونکہ یہاں ”دستور“ کا بزنس کبھی نہیں کیا گیا۔ هذا والسلام!

---

[1] اور امت میرے عقیدے میں اپنے نبی کی طرح معصوم ہے، آج یہی میرا دعویٰ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذبات ثلاثہ

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں صحیح بخاری کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کذبات ثلاثہ والی حدیث کا اپنی دانست میں مخالف قرآن ہونے کی بنا پر انکار کیا، تو ایک سائل نے حضرت سلفی رحمہ اللہ سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا، جس کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے قرآنی دلائل اور عقلی ولغوی شواہد کے ذریعہ اس حدیث کا مبنی برحق ہونا ثابت فرمایا اور اس کا انکار قلتِ نظر اور استدلال کی سطحیت کا نتیجہ قرار دیا۔

جب حضرت سلفی رحمہ اللہ کا یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا، تو جماعت اسلامی کے تنظیمی جرائد میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا، جس میں زیر بحث حدیث، مسلک اہلحدیث اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کے علم وفضل کو رد وقدح کا نشانہ بنایا گیا، چنانچہ ان احوال میں زیر بحث حدیث کے دفاع، مسلک اہلحدیث کے محامد و محاسن کو اجاگر کرنے اور حضرت سلفی رحمہ اللہ کی حمایت میں جماعت اسلامی ہی کے ایک سابق رکن اور نامور محقق عالم دین قاضی مقبول احمد صاحب ایم۔ اے نے قلم اٹھایا اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۸، ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء، جلد: ۱۹، شمارہ: ۱۹، ۲۰) کی دو اقساط میں متعلقہ مباحث پر بھرپور روشنی ڈالی اور کئی نئے پہلو اجاگر کیے۔ چنانچہ اسی افادیت کے پیش نظر حضرت سلفی رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا مضمون کے حواشی میں یہ مضمون بھی درج کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کذبات ثلاثہ

سوال:

کیا فرماتے ہیں علماء دین متین:

کیا بخاری شریف کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے؟ نیز بخاری شریف کی وہ حدیث جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ کا تذکرہ ہے، صحیح ہے یا ضعیف؟ یہ حدیث قرآن مجید کی آیت ﴿إنه كان صديقا نبيا﴾ [1] سے متعارض ہے؟ اگر حدیث صحیح ہے، تو یہ تعارض کیسے دور ہوسکتا ہے؟ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن جلد سوم میں اسی حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ ایک پیغمبر کو جھوٹا ثابت کرنے کی بجائے بخاری کے راویوں کو جھوٹا کہنا آسان ہے بینوا توجروا۔

الجواب و باللہ التوفیق:

حدیث "لم یکذب إبراھیم" [2] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصف صدیقیت کی

---

[1] مریم: ٤١

[2] صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب قول الله تعالىٰ ﴿واتخذ الله إبراهيم خليلا﴾ رقم الحديث (٣١٧٩) صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب من فضائل إبراهيم الخليل عليه السلام رقم الحديث (٢٣٧١) امام بخاری رحمہ اللہ سے پیشتر اور بعد میں آنے والے کئی دیگر محدثین نے بھی اس حدیث کو اپنی کتب میں ذکر کیا ہے، ان کی طبائع سلیمہ کو یہ حدیث کبھی نہیں کھٹکی اور نہ انھوں نے اس حدیث سے کبھی کوئی خلش محسوس کی۔ مثلاً دیکھیں: مسند أحمد (١/٢٨١، ٢٩٥، ٢/٤٠٣، ٤٣٥، ٣/ ٢٤٤، مسند الطيالسي (ص: ٣٥٣) سنن الترمذی، برقم (٢٤٣٤، ٢١٤٨ سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٢٩٨) مسند أبي يعلى (٤/ ٢١٣، ٥/ ٣٩٦، ١٠/ ٤٢٦) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٣٠٧) الإيمان لابن منده (٢/ ٨٣٧) التوحيد لابن خزيمه (٢/ ٥٩٥) المعجم الأوسط ←

مؤید ہے۔ اصل مغالطہ اس سے ہوا کہ عرف عام میں جھوٹ اور کذب کو ہم معنی سمجھ لیا گیا، اسی طرح صدق اور سچ کو مرادف سمجھ لیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں ان دونوں لفظوں کے معنی ہماری زبان سے وسیع ہیں۔

کذب کا معنی:

① کذب کے معنی ترغیب دلانا بھی مستعمل ہے، " كذبته نفسه" کے معنی ہیں: اس کے دل نے اسے ترغیب دلائی۔

② "کذب "وجوب کے معنی میں آتا ہے:

"قال الجوهري : كذب قد يكون بمعنى وجب وقال الفراء كذب عليك أي وجب عليك " (نهایه ابن أثير : ٤/ ١٢)[1]

"جوہری اور فراء کہتے ہیں: "کذب "معنی "وجب "پر ہے۔"

③ "کذب " لزم کے معنی میں آیا ہے، "كذب عليكم الحج والعمرة "تم پر حج اور عمرہ لازم ہوگیا ہے۔[2]

④ غلطی خطا کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے، حدیث میں ہے: "كذب أبو محمد"[3] ابو محمد نے غلطی کی۔ ابو محمد صحابی ہیں، ان کا نام مسعود بن زید ہے، ذوالرمہ شاعر نے کہا: " ما في سمعه كذب" اس کے سماع میں غلطی نہیں۔[4]

اسی طرح " خطأ " بھی کئی معنی میں مستعمل ہوا ہے، ابن اثیر فرماتے ہیں:

"كما أن الكذب ضد الصدق وإن افترقا من حيث النية والقصد لأن الكاذب يعلم أن ما يقوله كذب والمخطئ لايعلم "

(نهایه ابن أثير: ٤/ ١٣)[5]

← (١/ ٢٩١) سنن البيهقي (٧/ ٣٦٦) تعظيم قدر الصلاة للمروزي (١/ ٢٢٨)

❶ النهاية في غريب الأثر لابن الأثير (٤/ ٢٨٢)

❷ مصدر سابق

❸ أبو داود، برقم (٤٢٥)

❹ النهاية (٤/ ٢٨٢)

❺ مصدر سابق

⑤ اجتہادی غلطی پر بھی "کذب" کا لفظ بولا جاتا ہے، صحیح بخاری میں نوف بقالی کے متعلق ابن عباس نے فرمایا: " كذب عدو الله "[1] نوف نے غلطی کی۔ نوف تابعی ہیں، ظاہر ہے کہ ہر کذب جھوٹ نہیں، جس طرح ہر سچ صدق نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا،[2] باقی لغت کی کتابوں میں اس قسم کی تفصیل موجود ہے۔[3]

اس تفصیل کے بعد ظاہر ہے کہ جس کذب سے قرآن عزیز نے منع فرمایا ہے، اس میں دو شرطیں ہیں، اول یہ ہے کہ وہ واقع کے خلاف ہو، دوسرا یہ کہ متکلم کا ارادہ ہو کہ وہ مخاطب کو حقیقت سے آگاہ نہ ہونے دے، اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی کم ہو، تو کذب کا اطلاق صحیح اور حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا، قرآن عزیز نے منافقین کے تذکرہ میں فرمایا:

﴿ إذا جاء ك المنافقون قالوا نشهد إنك لرسول الله والله يعلم إنك لرسوله والله يشهد إن المنافقين لكاذبون ﴾[4] (منافقون)

"منافق کہتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو، اللہ گواہ ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔"

یہاں منافقین کی صحیح بات کی بھی تصدیق نہیں فرمائی، اس لیے کہ یہ ان کے ضمیر کی آواز نہیں، بلکہ ضمیر کی آواز اس کے خلاف ہے۔ صدق اور کذب میں جس

---

❶ صحيح البخاري: كتاب العلم، باب ما يستحب للعالم إذا سئل أي الناس أعلم فيكل العلم إلى الله، رقم الحديث (١٢٢) صحيح مسلم: كتاب الفضائل، باب من فضائل الخضر عليه السلام، رقم الحديث (٢٣٨٠)

❷ مفردات القرآن (٢/ ٢٨٨)

❸ لسان العرب (١/ ٧٠٨) الفائق للزمخشري (٣/ ٢٥٠) القاموس المحيط (ص: ١٦٦) تاج العروس (١/ ٨٩٧)

❹ المنافقون: ١

طرح واقع یا محکی عنہ کو دخل ہے، اسی طرح ارادے کو بھی دخل ہے۔ صدق اور کذب کے معنی سمجھ لینے کے بعد ایک تیسری چیز بھی ذہن میں آجانی چاہیے۔ جب متکلم خبر واقع اور مخبر عنہ کے مطابق دے، لیکن اس واقع اور حقیقت کو مخاطب سے مخفی رکھنا چاہے، تو اسے تعریض یا توریہ کہتے ہیں، یہ حقیقت میں سچ ہوتا ہے، لیکن ایک لحاظ سے اسے جھوٹ کہا جا سکتا ہے، راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والتعریض کلام له وجهان من صدق و کذب أو ظاهر وباطن قال ﴿فيما عرضتم به من خطبة النساء﴾ "(ص ۱۰۲)[1]

"تعریض ایسی گفتگو ہوتی ہے، جس کے ہر دو پہلو ہوتے ہیں، من وجه صدق ہے اور من وجه کذب، جیسے ﴿ فيما عرضتم به من خطبة النساء﴾[2] سے واضح ہے۔"

ثلاث کذبات:

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان تین واقعات پر غور فرمائیں، یہ صدق ہیں یا کذب یا تعریض؟ اور یہ احادیث قرآن سے متعارض ہیں یا قرآن کے موافق؟ ان تین واقعات میں سے دو تو قرآن عزیز میں موجود ہیں اور ایک حدیث میں، مودودی صاحب اور مولانا آزاد ایسے حضرات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خیر اندیش پہلے قرآن کی قرآن سے تطبیق اور تعارض رفع فرمائیں، تیسرے واقعہ کی تطبیق ہم گزارش کر دیں گے، ان شاء اللہ۔ بخاری کی صحت پر آنچ آئے گی، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت پر دھبہ آئے گا، نہ رواۃ حدیث اور ائمہ سنت کو جھوٹا کہنے کی مجرمانہ کوشش کی ضرورت محسوس ہوگی۔ آپ حضرات کیا تطبیق دیتے ہیں اور قرآن کو تعارض سے کس طرح بچاتے ہیں؟ اس کے لیے ہم گوش بر آواز ہیں۔ ہماری گزارش سن لیں:

---

[1] مفردات القرآن (۲/ ۸۵)

[2] البقرة: ۲۳۵

ا۔ بت شکنی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم کو بت پوجتے دیکھا، تو فرمایا:

﴿ما هذه التماثيل التي أنتم لها عاكفون﴾ ❶

ان ٹھاکروں کی مورتیوں کے ساتھ تم نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟

پھر پوری صراحت سے حلفی اعلان فرمایا:

﴿تالله لأكيدن أصنامكم بعد أن تولوا مدبرين﴾ ❷

تمہاری غیر حاضری میں یقیناً تمہارے ان ٹھاکروں کا تیا پانچہ کر کے رہوں گا۔

غور فرمائیے! اس اعلان اور حلفی بیان کے بعد جھوٹ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قوم اپنے مشاغل کے لیے چلی گئی، ان کی غیر موجودگی میں پورے اطمینان سے بڑے ٹھاکر کے سوا باقی ٹھاکروں کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا، واپسی پر جب بت خانہ ویران پایا تو کہرام مچ گیا، بڑے حزن و ملال سے قوم کے چودھریوں نے کہا:

﴿ من فعل هذا بآلهتنا إنه لمن الظالمين ﴾ ❸

کسی بڑے ظالم نے ہمارے ٹھاکروں کا یہ برا حال کر دیا ہے۔

بات ڈھکی چھپی نہ تھی، حلفی اعلان ان کے کانوں میں تھا، فوراً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملزم قرار دیا گیا:

﴿ سمعنا فتى يذكرهم يقال له إبراهيم ﴾ ❹

---

❶ الأنبياء: ٥٢

❷ الأنبياء: ٥٧

❸ الأنبياء: ٥٩

❹ الأنبياء: ٦٠

ایک ابراہیم نامی نوجوان کو ہم نے سنا تھا، وہ ان کو برا بھلا کہتا تھا۔

اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلانے کا فیصلہ ہوا:

﴿ فأتوا به على أعين الناس لعلهم يشهدون ﴾ ❶

اسے کھلی عدالت میں پیش کر کے اس کے خلاف شہادت قائم کرو۔

اس قدر کھلے اور پیش افتادہ واقعات میں نہ جھوٹ کی گنجائش ہے نہ انکار کی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی بے وقوفی کو نمایاں کرنے کے لیے جواب میں تعریض کی صورت اختیار کی، کھلا اقرار نہیں کیا، اس لیے کہ واقعہ تو معلوم ہی تھا، فرمایا:

﴿ بل فعله كبيرهم هذا فاسألوهم إن كانوا ينطقون ﴾ ❷

امام رازی نے "فعله" پر وقف کر کے تقدیر عبارت اس طرح فرمائی ہے:

"بل فعله من فعله" ❸ جس نے کیا تم انھی سے دریافت کرو، بہتر ہے یہی بتا دیں۔ زبان کے لحاظ سے حقیقت کے اظہار میں ایک گونہ اغماض کے وقتی مقاصد اور تبلیغی لحاظ سے یہی مناسب ہے کہ ان کا جدامجد یہی بڑا ٹھاکر ہی اس ہنگامے کا موجب ہے، اس لیے ان مقتولوں کے نزعی بیان لو اور اس بڑے ٹھاکر سے پوچھو، جس کے سامنے یہ ہنگامہ ہوا، سارا زور ﴿ فاسألوهم إن كانوا ينطقون ﴾ پر ہے، جس کے نتیجہ میں مجرمانہ ندامت کے ساتھ ان لوگوں نے سرِ عدالت اقرار کیا:

﴿ ثم نكسوا على رؤوسهم لقد علمت ما هؤلاء ينطقون ﴾ ❹

" سر نیچا کیے ندامت سے اقرار کیا، تم جانتے ہو یہ (بیچارے) بول تو نہیں سکتے۔"

---

❶ الأنبياء: ٦١

❷ الأنبياء: ٦٣

❸ تفسير الرازي (٢٢/ ١٥٧)

❹ الأنبياء: ٦٥

اصل مقصد یہ تھا کہ ان کی زبان سے ان کے دھرم کی کمزوری ظاہر ہو جائے، ورنہ دونوں فریق جانتے تھے کہ جسے بولنے کی ہمت نہیں، ساتھیوں کو بچانے کی قدرت نہیں، اسے توڑنے کی قدرت کہاں سے ہوگی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس حکیمانہ تعریضی اقرار کے بعد عدالتِ وقت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آخری سزا سنا دی:

﴿ حرقوه وانصروا آلهتكم إن كنتم فاعلين ﴾ [1]

(بات تو صاف ظاہر ہے) ''پھر بھی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے، تو اس نوجوان کو جلا ڈالو۔''

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی علالت:

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ وہ لوگ کسی تہوار یا کسی اجتماعی کام کے لیے جانا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے ہمراہ چلیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اپنے حلفی بیان کے مطابق بتوں کو توڑنے کا پروگرام موجود تھا، ستاروں پر نگاہ ڈال کر فرمایا: ﴿ إني سقيم ﴾ [2] ''میری طبیعت خراب ہے۔'' بیمار یقیناً تھے، لیکن نہ اس قدر کہ تھوڑی دور تک بھی چل نہ سکیں، قوم نے اس تعریض سے یہی سمجھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہیں۔ بیمار نے ان کے جانے کے بعد پورے بت خانہ کو تل پٹ کر کے رکھ دیا۔ ﴿سقيم﴾ کے اظہار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اجمال سے کام لیا، نہ قوم نے تفصیل پوچھی نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی ضرورت سمجھی۔ یہ ابہام اور تعریض تھی، جو بالکل سچائی اور حقیقت پر مبنی تھی، مگر قوم نے اسے واقعی اہم بیماری سمجھا، انھیں حق ہے کہ اس من وجہ صداقت کو کذب سے تعبیر کریں۔ اس لیے تعریض اور توریہ کو من وجہ ''کذب'' کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] الأنبياء: ٦٨

[2] الصافات: ٨٩

سائل کے سوال کی روشنی میں دیکھا جائے، تو ان واقعات میں خود قرآن عزیز میں تعارض ہے، ایک ایسا مریض جو قوم کی نظروں سے ذرا اوجھل ہوتے ہی پورے بت خانے کا صفایا کر سکتا ہے، سینکڑوں مصنوعی خداؤں کو چند گھڑیوں میں پیوند خاک کر سکتا ہے، اس کی بیماری کی کمیت اور کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں، یہ تعریض ہی کے پیمانہ سے ناپی جا سکتی ہے، جس کا اندازہ دوست اور دشمن اپنے نقطہ نظر سے لگا سکیں۔

۳۔ بیوی یا بہن:

صحیح بخاری میں یہ حدیث قریباً پانچ مقامات پر مذکور ہے، [1] کہیں پورا متن، کہیں مختصر، کہیں تعلیقاً، کہیں مرفوعاً باسند، "كتاب الأنبياء" میں مفصلاً موجود ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"لم يكذب إبراهيم إلا ثلاث كذبات، ثنتين منهن في ذات الله قوله ﴿إني سقيم﴾ وقوله ﴿بل فعله كبيرهم هذا﴾"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عمر میں تین دفعہ بظاہر غلط بیانی کی، دو مقام پر تو ذات حق کی عظمت کا تحفظ مطلوب ہے، تیسرا مقام بھی گو حدود اللہ کی حفاظت ہی سے متعلق ہے، لیکن اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی ذات کا بھی دخل ہے، کیونکہ یہ بیوی کی عصمت کا معاملہ ہے، چنانچہ بعض روایات میں " كلهن في الله " (فتح الباری: ۲۳۲) مرقوم ہے، [2] یعنی یہ تینوں مقام ذات حق کی عظمت اور برتری قائم کرنے کے سلسلہ میں تھے۔ اسی متن میں تیسرے واقعہ کی تفصیل خود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہے، ایک ظالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت سارہ کے متعلق دریافت

---

[1] صحيح البخاري، برقم (٢١٠٤، ٢٤٩٢، ٣١٧٩، ٤٧٩٦، ٦٥٥٠)

[2] مسند أبي يعلى (١٠/ ٤٢٦) فتح الباري (٦/ ٣٩٢) عمدة القاري (١٥/ ٢٤٩)

کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا یہ میری بہن ہے:

" فأتى سارة فقال: يا سارة ليس على وجه الأرض مؤمن غيري وغيرك، وإن هذا سألني فأخبرته أنك أختي فلا تكذبيني الخ "[1]

(صحیح بخاری: ۱/ ۴۷۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں نے ظالم کے پاس تمھیں اپنی بہن کہا ہے، تم میری تکذیب نہ کرنا، کیونکہ دین کے لحاظ سے تم میری بہن ہو اور اس سرزمین میں تمہارے سوا کسی سے میرا یہ دینی رشتہ نہیں ہے۔

اس تعریض کی حقیقت حضرت سارہ سے خود ظاہر فرما دی کہ اس سے دینی اخوت مراد ہے، گو ظالم اس سے بظاہر نسبی اخوت سمجھے گا، اس تعریض سے یہی مغالطہ مقصود ہے، تاکہ عصمت بھی محفوظ رہے اور شر بھی نہ پہنچ سکے۔

ایسے حالات میں عصمت کی حفاظت، حدود اللہ کے احترام اور مشرکانہ درباروں کی بربادی کے لیے اگر واضح جھوٹ بھی بولا جائے، تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعریض کی راہ اختیار فرمائی، جو درحقیقت صحیح ہے اور اس کی سچائی معلوم، حافظ ابن حجر نے فرمایا:

" وإلا فالكذب المحض في مثل تلك المقامات يجوز، وقد يجب لتحمل أخف الضررين دفعا لأعظمهما "[2]

(فتح الباری، طبع ہند: ۳/ ۲۳۲)

اسی مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ کے سامنے حقیقت کھول دی، ظالم کو مغالطہ میں رکھا، تعریض کا یہی مطلب ہے۔ ان طویل معروضات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ قطعاً نہیں بولا، البتہ ایسی گفتگو ضرورت فرمائی، جس سے مخالف اور دین کے دشمنوں کو دھوکہ لگ سکے اور یہ کچھ جرم نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، برقم (۳۱۷۹)

[2] فتح الباري (٦/ ۳۹۲)

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((الحرب خدعة)) [1] (رواه مسلم عن جابر وأبي هريرة: ٢/ ٨٣)

"لڑائی میں دھوکہ درست ہے۔"

آنحضرت ﷺ جب جنگ کے لیے سفر فرماتے، تو توریہ کرتے، یعنی اصل مقام کا نام نہ لیتے، بلکہ تذکرہ تعریض اور توریہ کے طور پر فرماتے:

"ما سافر رسول الله إلا ورّىٰ" [2] أو كما قال۔

تعبیر کے لیے کذب کیوں؟

اس وضاحت کے بعد کہ ابراہیم علیہ السلام سے کذب کا ظہور نہیں ہوا، اسے کذب سے تعبیر کیوں کیا گیا؟ یہ تذکرہ حدیث شریف میں دو مقام پر آیا ہے، شفاعت کی حدیث میں، جب لوگ قیامت کے دن شفاعت کے لیے انبیاء علیہم السلام کے پاس پھرتے پھراتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام معذرت کے طور پر فرمائیں گے:

"إني قد كذبت ثلاث كذبات فذكر" [3]

(الترمذي عن أبي هريرة وقال: حسن صحيح: ٤/ ٢٩٧)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تین کذبات کا ذکر فرما کر شفاعت سے انکار فرما دیں گے۔

دوسرے مقام پر آنحضرت ﷺ نے ان کذبات کا ذکر فرمایا، یہ حدیث بخاری

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الجهاد والسير، باب الحرب خدعة، رقم الحديث (٢٨٦٤) صحيح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب جواز الخداع في الحرب، رقم الحديث (١٧٣٩)

[2] صحيح البخاري: كتاب المغازي، باب حديث كعب بن مالك، رقم الحديث (٤١٥٦) صحيح مسلم: كتاب التوبة، باب حديث كعب بن مالك وصاحبيه، رقم الحديث (٢٧٦٩) ولفظه: "ولم يكن رسول الله ﷺ يريد غزوة إلا ورّى بغيرها"

[3] سنن الترمذي: أبواب التفسير، باب من سورة الأنبياء، رقم الحديث (٣١٦٦)

نے صحیح میں متعدد مقامات پر ذکر کی ہے:

”لم یکذب إبراهیم إلا ثلاث کذبات “ [1] (کتاب الأنبیاء، صحیح بخاری)

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ یہ تعریض ہے، جسے من وجہ کذب کہا جا سکتا ہے، تو متکلم کو اختیار ہے جس عنوان سے چاہے تعبیر کرے۔

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ شفاعت سے گریز فرما رہے ہیں، انھیں وہی عنوان اختیار کرنا چاہیے، جو اس مقصد کے لیے مفید ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس قسم کی تعریض بھی عمر میں تین ہی دفعہ فرمائی، اس تعریضی کذب کے مواقع زیادہ نہیں، یہ بھی من وجہ صدق ہے، حقیقت میں مقام توحید کی طرف ایک مجاہدانہ قدم ہے اور عصمت کے لیے ذریعہ، اس لیے ﴿إنه کان صدیقا نبیا﴾ [2] کی تائید ہے، تعارض ہے ہی نہیں، حضرت نے صراحتاً فرمایا تو بھی سچ تھا اور تعریضاً فرمایا تو بھی سچ تھا۔ ﴿صدیقا﴾ کا معنی یہی ہے کہ:

”لم یکذب قط أو لم یکذب إلا قلیلا “ [3]

(لسان العرب، راغب، المحیط، قاموس، أقرب الموارد وغیر ذلك من أسفار اللغة)

اب اس کی تائید اور وضاحت میں حافظ ابن قیم رحمہ اللہ حسن اور قبح عقلی اور شرعی کی بحث میں اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان تعریضات کو کذب سے کیوں تعبیر فرمایا؟ کہتے ہیں:

---

1. صحیح البخاري: کتاب الأنبیاء، باب قول اللّٰه تعالیٰ ﴿ واتخذ اللّٰه إبراهیم خلیلا﴾ رقم الحدیث (۳۱۷۹)
2. مریم: ٤١
3. مفردات القرآن (۱/ ۵۷۳) التعاریف للمناوي (ص: ٤٥١) تاج العروس (٢٦/ ١٣)

"فإن قيل: كيف سماها إبراهيم كذبات، وهي تورية، وتعريض صحيح؟ قيل لا يلزمنا جواب هذا السؤال إذ الغرض إبطال استدلالكم وقد حصل، فالجواب تبرع منا وتكميل للفائدة ولم أجد في هذ المقام للناس جوابا شافيا يسكن القلب إليه، وهذا السؤال لا يختص به طائفة معينة، بل هو وارد عليكم بعينه وقد فتح الله الكريم بالجواب عنه فنقول الكلام له نسبتان نسبة إلى المتكلم وقصده وإرادته، ونسبة إلى السامع، وإفهام المتكلم إياه مضمونه فإذا أخبر المتكلم بخبر مطابق للواقع وقصد إفهام المخاطب فهو صدق من الجهتين، وإن قصد خلاف الواقع وقصد مع ذلك إفهام المخاطب خلاف ما قصد بل معنى ثالثا لا هو الواقع ولا هو المراد فهو كذب من الجهتين بالنسبتين معا، وإن قصد معنى مطابقا صحيحا وقصد مع ذلك التعمية على المخاطب وإفهامه خلاف ما قصده فهو صدق بالنسبة إلى قصده كذب بالنسبة إلى إفهامه ومن هذا الباب التورية والمعاريض، وبهذا أطلق عليها إبراهيم الخليل عليه السلام الكذب مع أنه الصادق في خبره ولم يخبر إلاصدقا، فتأمل هذا الموضع الذي أشكل على الناس، وقد ظهر بهذا أن الكذب لا يكون قط إلا قبيحا وأن الذى يحسن ويجب إنما هو التورية هي صدق، وقد يطلق عليه الكذب بالنسبة إلى الإفهام لا إلى العناية" [1] (مفتاح السعادة: ٢/ ٣٩)

"اگر کہا جائے جب یہ تعریض تھی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کذب کیوں کہا؟ ہم کہتے ہیں اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں، ہمارا ذمہ صرف اس قدر

---

[1] مفتاح دار السعادة (٢/ ٣٦)

تھا کہ تمہارے استدلال کا ابطال ہو جائے، وہ ہو چکا، اب جواب تبرعاً اور تکمیل فائدہ کے لیے پیش خدمت ہے، یہ مقام مشکل ہے، لوگوں نے اس مقام پر جو کچھ کہا، اس سے تسکین نہیں ہوتی اور یہ سوال کسی خاص گروہ سے نہیں بلکہ ہمارے مخالفین پر وارد ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو انکشاف فرمایا ہے، وہ حاضر ہے:

ہر کلام کی دو نسبتیں ہوتی ہیں: ایک متکلم کے قصد اور ارادہ سے اور ایک سامع اور متکلم کو اسے سمجھانے سے متعلق ہے، جب متکلم ایسی خبر دے جو واقع کے مطابق ہو اور مخاطب کو وہ یہ واقع سمجھانا چاہے، یہ دونوں لحاظ سے صدق ہوگا، اور اگر خلاف واقع خبر دے اور مخاطب کو خلاف واقع کچھ تیسرا معنی بتانا چاہے، جو فی الحقیقت واقع نہیں، تو یہ دونوں لحاظ سے جھوٹ ہے، اگر متکلم صحیح بات حسب واقع بیان کرے، لیکن مخاطب کو اس سے ناآشنا رکھنا چاہے، تاکہ وہ متکلم کے مقصد کو نہ سمجھ سکے، تو وہ متکلم کے قصد کے لحاظ سے صدق ہے اور اس کے افہام کے لحاظ سے کذب ہے، اسے ہی تعریض اور توریہ کہا جاتا ہے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کذب سے تعبیر فرمایا، حالانکہ بات صحیح ہے اور واقع کے مطابق ہے، اس سے ظاہر ہے کہ کذب بہر حال قبیح ہے، اس کی مستحسن صورت تعریض اور توریہ ہے، جو حقیقت کے لحاظ سے صدق ہے، گو افہام کے لحاظ سے اسے کذب کہا جا سکتا ہے۔"

شیخ الاسلام رحمہ اللہ "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" میں فرماتے ہیں:

"والخبر تارة يكون مطابقا لمخبره كالصدق المعلوم أنه صدق وتارة لا يكون مطابقا لمخبره كالكذب المعلوم أنه كذب......

وقد تكون المطابقة في عناية المتكلم، وقد يكون في إفهام المخاطب إذا كان اللفظ مطابقا لما عناه المتكلم ولم يطابق

إفهام المخاطب فهذا أيضا قد يسمىٰ كذبا، وقد لا يسمى، ومنه المعاريض ولكن يباح للحاجة "❶ (ملخصاً: ٤/ ٢٨٨)

شیخ الاسلام نے کسی قدر اختصار سے وہی فرمایا، جس کی تفصیل "مفتاح السعادة" کے حوالہ میں ہو چکی ہے۔

"وفي المعاريض مندوحة عن الكذب"❷

تعریضات جھوٹ سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

زندگی کی مشکلات پر غور کر لیا جائے، تو ہر انسان پر ایسے مواقع آتے ہیں، جن میں صاف بات کی بجائے تعریض ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، دنیائے صداقت کو قائم رکھنے کے لیے اور جھوٹ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ تعریضات کی راہ کھلی رہے، جسے سائل نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وصف صدیقیت سے متعارض سمجھ کر

❶ الجواب الصحيح (٦/ ٤٥٢)

❷ یہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ دیکھیں: الأدب المفرد (ص: ٢٩٧) مصنف ابن أبي شيبه (٥/ ٢٨٢) سنن البيهقي (١٠/ ١٩٩) یہ الفاظ مرفوعاً بھی مروی ہیں، لیکن اس کی سند ضعیف ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا هو الصحيح موقوفا " (شعب الإيمان: ٤/ ٢٠٣، سنن البيهقي: ١٠/ ١٩٩) اسی طرح مرفوع روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

" تفرد برفعه داود بن الزبرقان وروي من وجه آخر ضعيف عن علي رضى الله عنه مرفوعاً "

(سنن البيهقي: ١٠/ ١٩٩)

امام ابن عدی رحمہ اللہ داود بن الزبرقان کے ترجمہ میں یہ مرفوع روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" وهذا يرفعه عن سعيد بن أبي عروبة داود بن الزبرقان وغيره أوقفه " (الكامل: ٣/ ٩٦)

نیز " داود بن الزبرقان " کے متعلق فرماتے ہیں:

" ولداود بن الزبرقان حديث كثير غير ما ذكرته وعامة ما يرويه عن كل من روى عنه مما لا يتابعه أحد عليه وهو في جملة الضعفاء الذي يكتب حديثهم " نیز دیکھیں: كشف الخفاء، برقم (٧١٢) السلسلة الضعيفة (٣/ ٢١٢) برقم (١٠٩٤)

صدیقیت کی راہ میں ضیق پیدا کر دی ہے، جس قانون میں لچک نہ ہو، وہ یقیناً ٹوٹ کر رہتا ہے، آنحضرت ﷺ کے سفر ہجرت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: آپ کے رفیق کون ہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "رجل يهديني السبيل" [1] یہ بزرگ میری راہنمائی فرماتے ہیں، کس قدر تعریض ہے؟ جو فرمایا، وہ بالکل سچ تھا، مگر خطرات کا بھی سدّ باب ہو گیا۔

تعریضات ہر زبان کے ادبیات عالیہ میں موجود ہیں، جس زبان میں تعریضات نہیں، وہ زبان نامکمل ہے اور لطافت سے خالی!

مولانا مودودی:

مجھے مولانا مودودی سے تعجب نہیں، وہ جب بھی علم کی ان متعارف راہوں سے گزرے، انھوں نے ٹھوکر کھائی، متعہ کا مسئلہ، مسلک اعتدال، حیات مسیح، دجال وغیرہ میں ان کی جدت نوازیاں کامیاب ثابت نہیں ہوئیں، ان کے رہوار قلم کی جولانیوں کا میدان دوسرا ہے، تعجب مولانا آزاد اور امام رازی سے ہے۔ یہ جواب "راوی کو جھوٹا کہنا نبی کو جھوٹا کہنے سے بہتر ہے۔" بے حد سطحی ہے، نبی کو جھوٹا کہنا تو کفر ہے، بخاری کو صحیح ماننے والے نبی کو جھوٹا کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بخاری کا تمامتر انحصار نبوت کی صداقت اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی صداقت پر ہے، مولانا مودودی کے راہوار قلم کی جولانیوں کا میدان بالکل دوسرا ہے، جب بھی وہ اپنا میدان چھوڑ کر تفسیر اور فقہ الحدیث کے مرغزاروں کا رخ فرماتے ہیں، ان کا قلم ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتا ہے، مولانا سے گزارش ہے وہ ان راہوں سے اگر کترا کر گزر جائیں، تو نہ ان کے مقام کی رفعتوں میں فرق آئے اور نہ ان کے ادب و احترام کو نئے پیمانوں سے ناپنا پڑے۔

---

[1] صحيح البخاري: كتاب فضائل الصحابة، باب هجرة النبي ﷺ وأصحابه إلى المدينة، رقم الحديث (٣٦٩٩)

رہے مولانا آزاد تو کیا اس صراحت کی ضرورت ہے کہ کسی شخصیت کے محاسن کی تحسین کی جاسکتی ہے، لیکن مساوی اور غلطیوں کی تقلید کبھی قابل رشک نہیں ہوسکتی!

استدلال کی سطحیت:

حدیث اور اصول حدیث بحمداللہ ایک زندہ اور متحرک فن ہے، منکرین حدیث پون صدی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے، بلکہ علمی حلقوں میں مضحکہ بن کر رہ گئے ہیں۔ حدیث پر اعتراض کرنے میں تنقید کے اصول نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، محدثین مبہم جرح کو قبول نہیں فرماتے، یعنی کسی راوی کو مجمل طور پر ضعیف کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ضعف کا تذکرہ صراحتاً اور تفصیلاً ہونا چاہیے۔[1] آپ حضرات اپنے کردار پر غور فرمائیں، آپ نہ راوی کا نام لیتے ہیں، نہ جرح کی تفصیل فرماتے ہیں، یہ فن کے لحاظ سے جرح کی کونسی قسم ہے؟ نہ راوی کا پتہ، نہ جرح کا علم، جیتی جاگتی حدیث موضوعات کے مردہ خانہ میں بھیج کر آپ مطمئن ہو گئے کہ اب کوئی پوچھنے والا نہیں، ہزار احترام کے باوجود جہالت اور جسارت ناقابل برداشت ہے، حدیث کو جھوٹا کہنا اتنا آسان نہیں جتنا جناب نے سمجھا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے قریباً چھ مقامات پر ذکر فرمایا ہے،[2] آپ کے اس مبہم نشانے کا ہدف ہر راوی ہو سکے گا، جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچے گی، بات ایک حدیث کی نہیں، اس کا اثر ان تمام احادیث پر پڑے گا، جو مختلف ابواب علم میں ان ائمہ سے مروی ہیں۔ آپ بھی اپنے جرم کی نوعیت پر غور فرمائیں، آپ نے کونسا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: الكفاية (ص: ١٠٨) مقدمة ابن الصلاح (ص: ٦١) فتح المغيث (٣/ ٣٦١) تدريب الراوي (١/ ٣٠٨) الرفع والتكميل (ص: ٧٩)

[2] اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

مناظرانہ کمال ظاہر فرمایا؟ ﴿تحسبونه هينا وهو عند الله عظيم﴾ [1]

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہیں مرغ قبلہ نما آشیانے میں

سائل کو غور فرمانا چاہیے کذب کے معنی متعین ہو جانے کے بعد یہ حدیث ﴿إنه كان صديقا نبيا﴾ [2] کی مؤید ہے یا معارض؟ [3]

---

[1] النور: ١٥

[2] مریم: ٤١

[3] مؤلف رحمہ اللہ کا یہ مضمون جب ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا، تو جماعت اسلامی کے تنظیمی جرائد میں اس پر ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور مولانا مودودی کی مدافعت میں کئی تحریرات سامنے آئیں، جس میں زیر بحث حدیث اور مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ پر کئی اعتراضات کیے گئے، جن کے جواب اور دفاع میں جماعت اسلامی ہی کے ایک سابق رکن اور نامور محقق عالم دین قاضی مقبول احمد صاحب ایم۔اے نے قلم اٹھایا اور مذکورہ بالا حدیث اور مؤلف رحمہ اللہ پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا، جس میں جہاں انھوں نے مذکورہ اعتراضات و اتہامات کی حقیقت تشت ازبام کی، وہیں زیر نظر حدیث کے سلسلے میں مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جزاہ اللہ خیراً، چنانچہ اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس مضمون کو بھی ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''حدیث ''ثلاث کذبات'' اور مولانا مودودی''

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے ۲۰ اکتوبر کے شمارہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، یہ مضمون ایک سوال کا جواب ہے، جس میں سائل نے دریافت کیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ''کذبات ثلاثہ'' کی روایت قرآن کی آیت ﴿إنه كان صديقاً نبياً﴾ [مریم: ٤١] کے خلاف ہے؟ اور کیا اس روایت کی کوئی معقول اور قابل قبول توجیہ کی جا سکتی ہے؟ سائل نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ مولانا مودودی اس روایت کے منکر ہیں اور موصوف اسے غلط اور اسرائیلی ←

....

کہاوت قرار دیتے ہیں۔ سوال چونکہ بہت اہم تھا، ایک طرف صحیح حدیث کی حیثیت خطرہ میں تھی اور دوسری طرف ایک جلیل القدر پیغمبر کی عصمت کا معاملہ تھا، لہٰذا مولانا موصوف نے اس سوال کا جواب پورے غور و فکر اور تحقیق و تفحص کے بعد تحریر فرمایا۔

دوران بحث آپ نے مولانا مودودی کی غلطی کی نشاندہی فرمائی اور مشورہ دیا کہ موصوف کو ان دقیق مباحث سے کترا کر گذر جانا چاہیے، کیونکہ تفسیر اور فقہ الحدیث ان کا اصل میدان نہیں ہیں۔ مولانا محترم کا یہ ارشاد جماعت اسلامی کے بعض نازک طبع رفقاء پر گراں گزرا اور انھوں نے، جیسا کہ شخصیت پرستی کا اصول ہے، آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ کر مولانا مودودی کی حمایت اور زیر بحث حدیث کی تغلیط شروع کر دی۔

چنانچہ ۵ نومبر کے ''ایشیا'' میں محمد صدیق صاحب خوش نویس نے ''مکتوب مفتوح'' لکھ کر مولانا محمد اسماعیل صاحب کو مخاطب کیا ہے، یہ صاحب اگرچہ مسلکاً اہلحدیث ہیں، لیکن آج کل اقامت دین کا شغل رکھتے ہیں، خوش نویس صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک حصہ کا تعلق مولانا محمد اسماعیل صاحب کے اس مشورہ سے ہے، جو موصوف نے مولانا مودودی کو دیا ہے اور دوسرے کا تعلق حدیث زیر بحث سے ہے۔

ہم ذیل میں خوش نویس صاحب کے دونوں حصوں کے متعلق کچھ عرض کریں گے، امید ہے کہ آپ اپنے رفقاء سمیت ہماری گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ وباللہ التوفیق!

مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مذکورہ مشورے پر تبصرہ کرتے ہوئے خوش نویس صاحب لکھتے ہیں:

''آپ نے یہ تحریر فرما کر مولانا مودودی سے انصاف نہیں کیا کہ:

''مولانا مودودی جب کبھی تفسیر و فقہ الحدیث کے مرغزار کا رخ کرتے ہیں، تو ان کا قلم ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتا ہے، ان کا میدان دوسرا ہے۔'' مفسرین، محدثین اور فقہاء کے سر پر سینگ آج

....

➜ تک نہیں دیکھے گئے۔ ع

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

(ھفت روزہ ایشیا: ۵، نومبر ٦٧ء، ص: ۱۰)

خوش نویس صاحب کا اس مشورہ پر موئے آتش دیدہ کی طرح بل کھانا نامناسب اور بے جا ہے، کیونکہ اس کی بنیاد سالہا سال کے تجربے اور مولانا مودودی کی تحریرات ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اگرچہ اس سلسلہ میں متعہ، مسلک اعتدال، حیات مسیح اور دجال کی مثالیں پیش فرما دی تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خوش نویس صاحب کی اپنے رفقاء سمیت ان سے تسلی نہیں ہوئی۔ اس سلسلہ میں ہم مزید چند شواہد پیش کرتے ہیں، جن سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ مولانا مودودی واقعتاً تفسیر و فقہ الحدیث کے راستوں سے کما حقہ آگاہ نہیں ہیں اور بلاشبہ موصوف کا راہوار جب بھی اس مرغزار کا رخ کرتا ہے، تو ٹھوکریں کھانے لگتا ہے۔

❶ مولانا مودودی کا تفسیر کے میدان میں شاہکار ''تفہیم القرآن'' ہے، موصوف اس میں آیت ﴿فإن کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترك﴾ [النساء: ۱۱] (اگر میت کی اولاد میں صرف دو سے زائد لڑکیاں ہوں، تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا) کے تحت لکھتے ہیں:

''دو سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں، تو خواہ دو لڑکیاں ہو یا دو سے زائد، بہر حال اس کے کل ترکہ کا ۲/۳ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا اور باقی ایک ۱/۳ دوسرے وارثوں کو، اس سے یہ حکم آپ سے آپ نکل آتا ہے کہ اگر میت کا صرف ایک بیٹا ہو، تو وہ ۲/۳ کا حق دار ہوگا اور کئی بیٹے ہوں تو ۲/۳ میں شریک ہوں گے۔'' (تفہیم القرآن: ۱/ ۳۲٦ طبع اول)

خط کشیدہ عبارت غور سے پڑھیے، اس مقام پر مولانا محترم کا لڑکے کو لڑکیوں پر قیاس کرنا قطعی طور پر غلط اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ یہ بات تو درس نظامی کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے ➜

....

کہ لڑکا دوسرے وارثوں کی عدم موجودگی میں کل مال کا وارث ہوتا ہے اور اگر دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی سب مال اسے ملتا ہے۔ غور فرمایئے علم وراثت کا یہ معمولی سا مسئلہ بیان کرنے میں مولانا مودودی نے کیسی ٹھوکر کھائی ہے؟!

سورہ احزاب آیت نمبر ۳۶ کے تحت لکھتے ہیں:

''ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور مقاتل بن حیان کہتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی، جب نبی کریم ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لیے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا پیغام دیا تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نا منظور کر دیا تھا، اس طرح کا اظہار نارضا مندی آپ کے بھائی عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔''

(تفہیم القرآن، طبع أول)

اس مقام پر بھی موصوف ٹھوکر کھا گئے ہیں، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اس واقعہ سے بہت پہلے جنگ احد میں شہادت پا چکے تھے، سیرت ابن ہشام (۴/ ۹۸) میں ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جحش دونوں کو ایک قبر میں دفن کیا گیا تھا۔

آیت: ﴿ فمن تعجل في يومين فلا إثم عليه ومن تأخر فلا إثم عليه ﴾ [البقرة: ٢٠٣] کا ترجمہ یوں کیا ہے:

'' پھر جو کوئی دو دن پہلے واپس ہو گیا، تو کوئی حرج نہیں اور جو کسی نے دو دن زیادہ صرف کر دیے، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس کے بعد حاشیہ میں تشریح یوں کی ہے:

''ایام تشریق میں منیٰ سے مکے کی طرف واپس، خواہ دو دن پہلے ہو یا دو دن بعد، دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔'' (تفہیم القرآن)

مولانا کا راہوار فکر یہاں بھی ٹھوکر کھا گیا ہے، آیت کریمہ کا مطلب وہ نہیں جو موصوف نے بیان کیا ہے، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بارہ ذوالحجہ کو لوٹ آئے، تو بھی کوئی حرج نہیں اور اگر ایک دن تاخیر کر کے ۱۳ کو پلٹ آئے، تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ نا معلوم مولانا نے دو دن پہلے اور دو

....

⬅ دن بعد کا مطلب کس بنیاد پر اخذ کیا ہے؟

۴ آیت: ﴿وسخرنا مع داود الجبال يسبحن والطير﴾ [الأنبياء: ۷۹] کی تشریح بایں الفاظ کی ہے:

''ان ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت داوٗد علیہ السلام جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے، تو ان کی سریلی آواز سے پہاڑ گونج اٹھتے تھے اور پرندے ٹھہر جاتے تھے اور سماں بندھ جاتا تھا۔'' (تفهيم القرآن، طبع أول)

حضرت داود علیہ السلام کے معجزے کا جس طرح اس تشریح میں عقل اور تاویل نے حلیہ بگاڑا ہے، اس پر گرفت کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:

''تسخیر جبال کا یہ معنیٰ کرنا کہ حضرت داوٗد علیہ السلام جب پہاڑوں میں تسبیح میں مشغول ہوتے تھے، تو پہاڑ ان کی آواز سے گونجنے لگتے تھے، قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے۔''

(تفسير ماجدى سورة أنبياء، آيت نمبر ۷۹)

۵ سورہ فاتحہ کی آیت: ﴿الرحمن الرحيم﴾ کی تشریح میں موصوف لکھتے ہیں:

" رحمان " کے بعد لفظ " رحیم " بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم ''سخی'' کے بعد ''داتا'' ''گورے'' کے بعد ''چٹا'' اور لمبے کے بعد ''تڑنگا'' بولتے ہیں۔''

گویا جیسے یہ بعد میں آنے والے الفاظ لغو، بے معنی اور مہمل ہیں، اسی طرح " رحمان " کے بعد " رحیم " بھی ایک مہمل اور بے معنی لفظ کا اضافہ ہے۔ ع

جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی!

۶ "صلوۃ وسطیٰ" کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''بعض احادیث سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔''

یہ '' جا سکتا ہے'' میں جو بے یقینی کارفرما ہے، وہ فہم حدیث میں کوتاہ دستی کا ثبوت ہے، جن احادیث کی طرف موصوف نے اشارہ کیا ہے، ان سے ''اخذ کیا جا سکتا ہے'' نہیں، بلکہ وہ اس بارہ ⬅

میں نص قطعی ہیں کہ صلوۃ وسطی سے مراد عصر کی نماز ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

نبی کریم ﷺ نے جنگ احزاب کے موقع پر فرمایا:

" ملأ الله قبورهم و بيوتهم ناراً كما شغلونا عن الصلوة الوسطىٰ حتى غابت الشمس " [بخاري: ٦٠٣٣]

مسلم [حدیث:٦٢٧] کے الفاظ یہ ہیں: "عن الصلوة الوسطىٰ صلوة العصر"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم صلوۃ وسطی فجر کی نماز سمجھا کرتے تھے۔

"فقال رسول الله ﷺ: هي صلوة العصر" (مسند أحمد: ١/ ١٢٢)

ان واضح، دوٹوک اور قطعی احادیث کے بعد یہ کہنا کہ ''اخذ کیا جا سکتا ہے،'' جس قدر عامیانہ بات ہے، اس کا اندازہ صرف اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔

⑦ فقہ الحدیث کے میدان میں مولانا مودودی کا شہکار '' خطبات '' ہے، یہ کتاب ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو نماز روزہ، حج اور زکوۃ کے مسائل پر آپ نے فرمائیں، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے متعدد زبانوں میں شائع کیا جا چکا ہے، مولانا محترم حج کے مسائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' اس جگہ'' (منیٰ میں، م۔ا) قربانی کی جاتی ہے، تاکہ راہ خدا میں خون بہانے کی نیت اور عزم کا اظہار عمل سے ہوجائے، پھر وہاں سے کعبہ کا رخ کیا جاتا ہے، جیسے سپاہی اپنی ڈیوٹی ادا کر کے ہیڈ کوارٹر کی طرف سرخرو واپس آرہا ہے، طواف اور دو رکعتوں سے فارغ ہو کر احرام کھل جاتا ہے، جو کچھ حرام تھا، وہ پھر حلال ہوجاتا ہے۔'' (حقیقت حج)

مولانا محترم کو غلط فہمی ہوئی ہے، احرام طواف اور دو رکعتوں سے بہت پہلے منیٰ میں ہی کھل جاتا ہے اور ماسوائے بیوی کے سب کچھ حلال ہوجاتا ہے، طواف کے بعد یہ ممانعت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

....

➜ ۸ مولانا مودودی غالباً دنیا کے پہلے فقیہ ہیں، جنھوں نے ''حقیقت صلوۃ'' (مطبوعہ مکتبہ جماعت اسلامی حیدرآباد دکن) میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ

''نمازی جب کھڑا ہوتا ہے، تو تکبیر تحریمہ سے پہلے ہی " إني وجهت وجهي الخ " دعا کرتا ہے، پھر تکبیر کہتا ہے اور اس کے بعد " سبحانك اللهم " پڑھتا ہے۔''

ورنہ آج تک علماء یہی بیان کرتے آئے ہیں کہ یہ دعا تکبیر تحریمہ سے پہلے نہیں بلکہ بعد میں پڑھی جاتی ہے۔[دیکھیں: أبو داود (۷٦۰)]

۹ مولانا مودودی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تین طلاقیں مغلظ ہیں اور ان کے بعد رجوع کا حق باقی نہیں رہتا، علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کے خلاف رائے دی ہے، وہ اسے طلاق رجعی قرار دیتے ہیں، حالانکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، جس میں بیک وقت تین طلاقوں کو رجعی قرار دیا گیا ہو۔''

(ہفت روزہ ایشیا، ۵ نومبر ۱۹٦۷، ص: ۹)

قطع نظر اس بات کے کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علاوہ متقدمین میں سے کون کون اسے رجعی قرار دیتے ہیں اور اس بات سے بھی قطع نظر کرتے ہوئے کہ حق ابن تیمیہ کے ساتھ ہے کہ ائمہ اربعہ کے ساتھ۔ کیا مولانا مودودی کا یہ ارشاد درست ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء کے زمانہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی؟ تو اس میں فقہاء الحدیث کا کیا قصور؟ انھیں تو مسند احمد میں یہ روایت ملتی ہے:

''عن ركانة أنه طلق امرأته ثلاثا في مجلس واحد فحزن عليها حزنا شديدا، فسأله النبي صلی اللہ علیہ وسلم كيف طلقتها فقال ثلاثة في مجلس واحد فقال له تلك واحدة فارجعها.''

[۲٦۵/۱]

حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں، پھر بہت پریشان ہوئے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت فرمانے پر انھوں نے کہا کہ میں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں ➜

دی ہیں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایک ہی واقعہ ہوئی ہے، رجوع کر لو۔

گزرتے ہوئے قاضی شوکانی کی رائے بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

"الحدیث نص فی محل النزاع" (نیل الأوطار: ٦/ ١٩٨)

"یہ حدیث محل نزاع میں فیصلہ کن ہے۔"

کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، جس میں تین طلاقوں کو رجعی قرار دیا گیا ہو؟

إن كنت لا تدري فتلك مصيبة وإن كنت تدري فالمصيبة أعظم (1)

ہم نے یہ مثالیں بادل نخواستہ پیش کی ہیں، اگر خوش نویس صاحب نے پھر اصرار کیا، تو انشاء اللہ تفقہ کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کی عربی دانی کی چند مثالیں بھی پیش کر دی جائیں گی۔

حدیث "کذبات ثلاثہ" کا مطلب:

حدیث مذکورہ پر بحث سے قبل یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول: ﴿بل فعله كبيرهم هذا﴾ [الأنبياء: ٦٣] کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے متعلق علماء کے دو قول ہیں، علماء امت اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کا یہ ارشاد حقیقتاً درست ہونے کے باوجود ظاہری شکل میں خلاف واقع ہے، چنانچہ زیر بحث حدیث کا انکار کرنے والوں میں امام رازی سرفہرست ہیں، لیکن آپ نے بھی دبی زبان سے اس کا خلاف ہونا تسلیم کیا ہے۔

اسی طرح مولانا مودودی نے بھی تصریح کی ہے کہ آپ کا یہ قول خلاف واقع تھا، جب اس قول کا خلاف واقع ہونا ایک مسلمہ امر ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خلاف واقع قول کا کیا نام رکھا جائے؟

تعریض یا کذب!

بعض علما نے اسے مقام نبوت کے پیش نظر تعریض سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے "حسنات الأبرار سیئات المقربین" کے تحت اسے "کذب" سے موسوم کیا ہے، جن علما نے "تعریض" کہا

(1) اگر تو نہیں جانتا تو یہ ایک مصیبت ہے اور اگر جانتا ہے، پھر تو یہ بہت بڑی مصیبت ہے!

....

ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام شرائع میں حتی کہ محمدی شریعت میں بھی، جو کہ ہر اعتبار سے کامل اور مکمل ہے، تعریض کی قولاً وفعلاً اجازت ہے، چنانچہ مسند احمد میں روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ایک شخص نے اپنے پڑوسیوں کی ایذا رسانیوں کی شکایت کی، آپ نے اسے مشورہ دیا کہ تمام اسباب گھر سے نکال کر گلی میں رکھ دو، جو کوئی سبب دریافت کرے، اسے کہو کہ اپنے فلاں پڑوسی کی بداخلاقی سے تنگ آ کر جا رہا ہوں، سائل نے ایسا ہی کیا، چنانچہ لوگوں نے اس پڑوسی کو طعن وتشنیع کی اور اپنے سابقہ رویہ میں اصلاح کا وعدہ لیا اور پھر اس صحابی نے سامان واپس مکان میں رکھ لیا، ظاہر ہے کہ اس صحابی کا یہ کہنا کہ میں یہ مکان چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگرچہ بظاہر صحیح تھا، لیکن حقیقت میں اس کا ارادہ ایسا کرنے کا نہ تھا اور اس نے یہ فعل نبی ﷺ کے مشورہ پر کیا، کیا نبی ﷺ نے اسے جھوٹ بولنے کی ترغیب دی تھی؟ اگر ایسا نہیں تو پھر اسے تعریض کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

نبی ﷺ نے چند افراد سے دریافت کیا کہ: "من أنتم" (آپ کون ہیں؟) انھوں نے جواب دیا "من ماء" (پانی سے) کیا ان حضرات کا یہ جواب جھوٹ تھا؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ بھی تعریض ہی ہے۔ اسی طرح جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی معیت میں سفر ہجرت پر روانہ ہوئے، تو راستہ میں جب کوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سوال کرتا کہ آپ کے ساتھ یہ رفیق کون ہے؟ تو آپ فرماتے یہ میرے رہبر ہیں، لوگ اسے دنیاوی رستہ دکھانے والا سمجھتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آخرت کے رہبر مراد لیتے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سوال کرنے والوں کو حق پہنچتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کاذب کہیں؟ اگر ایسا نہیں تو یقیناً یہ بھی آپ کی تعریض ہی تھی۔

عبداللہ بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم جب تک میں بصرہ کو جلا نہ ڈالوں گا اور وہاں کے رہنے والوں کو مصر نہ دھکیل دوں گا، اپنے سر کو صابن سے صاف نہیں کروں گا، حضرت عبداللہ بن سلمہ یہ سن کر بہت پریشان ہوئے، ابومسعود بدری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا کہہ سنایا، ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم علی رضی اللہ عنہ نہ بصرہ کو نذر آتش کرے گا، نہ وہاں

کے لوگوں کو مصر پہنچائے گا، کیونکہ اس کے سر پر بال ہی نہیں، جو اسے صابن سے دھونے کی نوبت آئے، لہٰذا یہ محض دھمکی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ "لا أغسل رأسي" جھوٹ ہے؟ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو معنی مراد لیا، وہ اور تھا اور جو دوسروں کو تاثر دیا، وہ کچھ اور تھا؟ لہٰذا یہ بھی تعریض ہی ہے، یہ سب مثالیں تعریضِ قول کی ہیں، تعریضِ فعل کی مثال نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جو شخص نماز با جماعت میں ''حدث'' کا مرتکب ہو، اسے چاہیے کہ ناک پکڑ کر دوبارہ وضو کرنے چلا جائے، بعض حدث انتہائی معمولی قسم کے ہوتے ہیں اور اگر پیشاب کے قطرہ سے ہو، تو ایسی صورت میں ناک پکڑنا کیا خلاف واقع نہیں؟ کیونکہ معمولی حدث کی بو نہیں ہوتی، اسی طرح پیشاب کے قطرہ سے بھی بو نہیں آتی، کیا اس حدیث کی روشنی میں نمازی کا ناک پکڑنا غلط نہیں؟ نفس الامر میں اگرچہ اس فعل کی ضرورت نہیں، لیکن دوسروں کو بتانا مقصود ہے، لہٰذا یہ تعریضِ فعل ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ارشاد فرمایا ہے۔ قصہ کوتاہ یہ ہوا کہ سنت سے تعریض ثابت ہے اور اس کی مثالوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں، بالکل اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسی بات کی جو فی الحقیقت اگرچہ درست تھی، مگر بظاہر خلاف واقع تھی، لہٰذا اس ﴿بل فعله كبيرهم هذا﴾ کو تعریض ہی کہنا چاہیے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس فعل کو ''تعریض'' کہا جا سکتا تھا، تو اسے ''کذب'' سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان اس سے بہت ارفع و بلند تھی کہ آپ مصلحتاً بھی ایسی بات کرتے جو اگرچہ درست تھی، مگر بظاہر خلاف واقع تھی، یہ بات اگرچہ بذات خود معمولی ہے، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہ نسبت بہت بڑی ہے، لہٰذا اسے "حسنات الأبرار سيئات المقربين" کے تحت کذب کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی تائید حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ اجازت دی تھی کہ اپنے ''اہل'' کو کشتی میں سوار کر لیں، آپ نے سمجھا کہ ''اہل'' میں بیٹا بھی شامل ہے، اس لئے اس کو بھی کشتی پر بٹھانے کی اجازت طلب کی،

←حضرت نوح علیہ السلام نے لفظ "اہل" کی تعبیر میں غلطی کی تھی اور اگرچہ یہ معمولی نوعیت کی تھی، کیونکہ بیٹا اہل میں یقیناً شامل ہوتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی اس تعبیر کو ناروا فعل اور جہالت قرار دیا۔ ﴿إنه عمل غير صالح ...... أن تكون من الجاهلين﴾ [هود: ۴۶]

جس طرح اس آیت کریمہ میں حضرت نوح کی لغزش کو "جہالت" کہا گیا ہے، اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی "تعریض" کو "کذب" کہہ دیا ہے، اب اگر قرآن کی تصریح کے مطابق "جاہل" کہنے سے حضرت نوح علیہ السلام کا "جاہل" ہونا ثابت نہیں ہوتا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے "کذب" کا لفظ استعمال فرمانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کاذب کیسے بن گئے؟

ان گزارشات سے معلوم ہوا کہ کذب کو تعریض پر محمول کرنا ایک بالکل صحیح اور معقول توجیہ ہے اور اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی زد نہیں پڑتی اور اس معنی کی رو سے کذبات ثلاثہ والی روایت ﴿إنه كان صديقاً نبياً﴾ کے خلاف نہیں ہے۔

دوسرا قول:

بعض علماء کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد فی الحقیقت "کذب" ہے، چنانچہ امام بغوی نے تعریض کی توجیہ کرنے کی بجائے حدیث زیر بحث کی بنیاد پر کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ ارشاد تھا ہی کذب اور اس سے قرآن کی آیت کی مخالفت نہیں ہوتی، کیونکہ کسی شریعت میں بھی "کذب" ہر حال اور ہر مقام پر مذموم نہیں ہوتا، چنانچہ شریعت محمدی بھی، جو کہ اخلاق جمیلہ کی سب سے بڑی داعی اور کذب کی سب سے بڑی مخالف ہے، اس نے بھی بعض حالات کو مستثنیٰ رکھ کر وہاں "کذب" کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، چنانچہ ایسے مقامات پر کذب درحقیقت صدق ہی کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے کذب محض سابقہ نام کی بدولت کہا جاتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھیے، خنزیر کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، لیکن بعض حالات میں اسے کھانے کی اجازت دی ہے، اب کیا جو شخص اس اجازت کے وقت خنزیر کھاتا ہے، اسے حرام خور کہا جا سکتا ہے؟ ←

ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اکڑ کر چلنے کی مذمت کی ہے، لیکن ساتھ ہی دوران جنگ میں ایسا کرنے کی اجازت دی ہے۔ اب جو شخص دشمن کے مقابلہ میں اکڑ کر چلے گا، کیا اسے اللہ کے حکم کا نافرمان کہا جائے گا؟ بالکل اسی طرح اگرچہ کذب حرام ہے، لیکن جن مقامات پر اللہ نے اس کی اجازت دی ہے، وہاں وہ درحقیقت صدق ہی ہے اور ایسے شخص کو کسی صورت کاذب نہیں کہا جا سکتا۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ نبی ﷺ نے کن مقامات پر کذب کی اجازت دی ہے؟

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

" لم أسمع النبي ﷺ يرخص في شيء من الكذب مما يقول الناس إلا في الحرب والإصلاح بين الناس وحديث الرجل امرأته وحديث المرأة زوجها." (مسلم)

''میں نے حضور کو جھوٹ بولنے کی رخصت دیتے ہوئے ماسوائے تین مقامات کے کبھی نہیں سنا، لڑائی میں، اصلاح بین الناس اور خاوند بیوی کا باہم جھوٹ بولنا۔''

اس حدیث سے تین مقامات پر کذب کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جنگ، اصلاح بین الناس، میاں بیوی کا باہم ایسا کرنا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ حالت جنگ میں تھے یا حالت صلح میں؟ یہ بات سمجھنے کے لیے عقل کی کوئی بڑی مقدار درکار نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ یقیناً حالت جنگ میں تھے اور ایسی حالت میں آپ کا یہ جھوٹ بولنا بالکل جائز تھا اور اللہ کی اجازت سے ایسا ہوا تھا اور اس کا ثواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اتنا ہی ہوا جتنا عام زندگی میں سچ بولنے کا، کیونکہ وہاں بھی اطاعت تھی اور یہاں بھی اطاعت ﴿ فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا ﴾ اس کی تائید حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ہوتی ہے، آپ اپنے بھائیوں سے '' حالت جنگ '' میں تھے۔ وہاں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو کذب استعمال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ قرآن مجید میں ←

ارشاد ہے: ﴿جعل السقاية في رحل أخيه﴾

''آپ (حضرت یوسف علیہ السلام) نے پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا۔''

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ خود حضرت یوسف علیہ السلام نے یا آپ کے حکم سے پیالہ بنیامین کے سامان میں رکھ دیا گیا، اس کے بعد قرآن کہتا ہے:

﴿أذن مؤذن أيتها العير إنكم لسارقون﴾

''پکارنے والے نے پکارا: اے قافلے والو! تم چور ہو۔''

کیا خود پیالہ رکھ کر دوسرے کو چور کہنا کذب نہیں؟ ایسا کرنا یقیناً ''کذب'' کی تعریف میں آتا ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی تھی کہ ایسی حالت میں کذب کہنا جائز ہے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیا اور اب اس بنا پر آپ کو کاذب نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح کذبات ثلاثہ والی حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہر سہ مقامات پر اللہ کی اجازت سے ایسا کیا، لہٰذا آپ کا یہ فعل ﴿إنه كان صديقاً نبياً﴾ کے مخالف نہیں ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ بخاری کی کذبات ثلاثہ والی حدیث کسی طور بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت پر ''داغ'' نہیں اور نہ ہی قرآن کے مخالف ہے، لہٰذا حدیث جس طرح سند کے اعتبار سے صحیح ہے، اس طرح متن کے اعتبار سے بھی معقول اور صحیح ہے اور روایت اور درایت کسی اعتبار سے بھی اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ خوش نویس صاحب اور آپ کے معاونین کو چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کو مولانا مودودی کے وقار کا سوال نہ بنائیں، کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کا وقار بہرحال ان سے مقدم ہے۔

آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث حدیث کے سلسلہ میں خوش نویس صاحب نے جن شبہات کا اظہار کیا تھا، ان کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔

آپ لکھتے ہیں کہ ''اس حدیث میں لفظ کذب کو تعریض پر محمول کرنا عقل سلیم کے خلاف ہے، لہٰذا یہ یقیناً قرآن کے خلاف ہے۔''

....

➜ خوش نویس صاحب کا یہ ارشاد کئی وجوہ سے محل نظر ہے:

اولاً: بلا شبہ اسلام نے عقل سلیم کو بہت اہمیت دی ہے، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس شخص کو اس کا اجارہ دار سمجھا جائے؟ کیونکہ ہر شخص کے متعلق اس کے معتقدین کا خیال ہے کہ وہ عقل سلیم کا مالک ہے، اس طرح ہر زمانہ میں اس عقل سلیم ہی کی آڑ میں کتاب وسنت کا شکار کھیلا گیا ہے اور حدیث ہمیشہ سے اس کا تختہ مشق رہی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی، آپ کی بغیر باپ پیدائش، معراج جسمانی، عذاب قبر، پل صراط، حوض کوثر، جنت، دوزخ، ان سب عقائد کا انکار بھی تو عقل سلیم ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، جنات کو انسانوں سے علیحدہ مخلوق قرار دینا حماقت ہے، اس نظریہ کی بنیاد بھی تو عقل سلیم ہے، سرسید وغیرہ نے بھی تو عقل سلیم کے قلم سے معجزات پر خط تنسیخ کھینچا، پرویز صاحب بھی تو عقل سلیم کی لٹھ سے حدیث کا سر کچل دینا چاہتے ہیں، قدریہ، جہمیہ، مرجیہ اور معتزلہ کی ماں بھی تو عقل سلیم ہی ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو بیڑیاں اور درے بھی تو اس عقل نے ہی لگوائے، آخر دین میں وہ کونسا فتنہ ہے، جو ''عقل سلیم'' سے پیدا نہیں ہوا؟ بدعت کا سرچشمہ اور الحاد کا منبع بھی تو یہ عقل سلیم ہی ہے، آخر عقل سلیم سے کیا مراد ہے، مولانا مودودی کی عقل؟ رازی کی عقل؟ نامعلوم خوش نویس صاحب نے یہ نام کہاں سے سن رکھا ہے کہ بلا سوچے سمجھے استعمال فرماتے رہتے ہیں، اگر دوسروں کو تلقین کرنے کی بجائے خوش نویس صاحب ذرا اپنی عقل سلیم استعمال فرماتے، تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ عقل سلیم کتاب وسنت کی خادم ہے، نہ کہ ان کی حاکم، عقل سلیم دلیل میں دوسرا درجہ رکھتی ہے اور یہ خوش نویس صاحب ہی کی جہالت ہے کہ آپ اسے پہلا اور حدیث کو دوسرا درجہ دے رہے ہیں، خوش نویس صاحب کی یہ بات بذات خود عقل سلیم کے خلاف ہے، انھیں غور فرمانا چاہیے!

ثانیاً: جس زمانہ میں بخاری لکھی گئی تھی، اس وقت سے لے کر آج تک اسے سینکڑوں فقہاء محدثین نے پڑھا، ہزاروں اساتذہ نے پڑھائی، لاکھوں تلامذہ نے پڑھی، بیسیوں افراد نے روایت کی، امام بخاری رحمہ اللہ، مسلم رحمہ اللہ، نسائی رحمہ اللہ، ترمذی رحمہ اللہ، ابن ماجہ رحمہ اللہ، ابن تیمیہ رحمہ اللہ، ابن قیم رحمہ اللہ، ابن ➜

....

← حجر رحمہ اللہ، شوکانی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے بخاری میں یہ حدیث پڑھی، اسے صحیح سمجھا، یہ بزرگ عقل سلیم سے محروم تھے؟

اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو یہ خلق خدا عقل سلیم سے محروم تھی یا آپ ہی اس نعمت سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور دوسری بات کا امکان زیادہ ہے، کیونکہ یہ بات بھی تو عقل سلیم کے خلاف ہے کہ پوری خلق خدا کے مقابلہ پر دو تین افراد کو اس کا اجارہ دار سمجھا جائے۔

ثالثاً: امام بخاری رحمہ اللہ کے زمانہ تک اکثر فرقے جنم لے چکے تھے، بخاری رحمہ اللہ نے ان کے خلاف قلمی جہاد کیا، لیکن کسی کو یہ کیڑا نظر نہ آیا، جو آپ ہمیں دکھا رہے ہیں!

رابعاً: مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت کی تبلیغ میں کوتاہی ہوئی تھی، آپ کی اس تحریر پر ایک شخص نے اعتراض کیا کہ اس سے ایک نبی کی توہین کا پہلو نکلتا ہے، مولانا مودودی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انبیاء کی عزت کا خیال آپ کو ان کے بھیجنے والے خدا سے بھی بڑھ کر ہے؟ اگر یہ بات نہیں، تو جو مضمون اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے، اس کو موجب ہتک یا موہم ہتک قرار دینے کی اور کیا توجیہ آپ کر سکتے ہیں؟'' (رسائل و مسائل: ۲/ ۷٤)

اگر زیر بحث حدیث کے سلسلہ میں مولانا مودودی سے یہ سوال کر دیا جائے کہ:

کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت و عظمت کا خیال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہے؟ اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اقوال کو کذب قرار دیا ہے، تو آپ کی جبین پر شکنیں کیوں پڑ گئی ہیں؟

اسی طرح خوش نویس صاحب سے بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر یونس علیہ السلام کا فریضہ رسالت کی تبلیغ میں کوتاہی کرنا عقل سلیم کے منافی نہیں، تو آخر وہی عقل سلیم زیر بحث حدیث میں عقل سقیم کیوں بن جاتی ہے؟!

خامساً: حدیث کا رد کرنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ کی عقل سلیم نے سمجھ رکھا ہے، ←

....

← اگرچہ مذکورۃ الصدر بحث سے واضح ہو چکا ہے کہ یہ حدیث قرآن کے ظاہر و باطن کے کسی طور پر بھی مخالف نہیں، لیکن اگر آپ کی عقل ''سلیم'' کچھ تضاد محسوس کرتی ہے، تو کیا ان دونوں میں تطبیق کی تمام راہیں بند ہو چکی ہیں؟

اس حدیث کا انکار کرنے والوں میں امام رازی پیش پیش ہیں، لیکن انھیں بھی تسلیم ہے کہ اگر اس حدیث میں کذب سے تعریض مراد لی جائے، تو پھر اس کا قرآن سے کوئی تضاد نہیں رہ جاتا ہے، کیا امام رازی کی عقل سلیم صرف حدیث کے انکار کے بارہ میں قابل تقلید ہے یا اس تطبیق کے بارہ میں بھی؟ بہرحال خوش نویس صاحب کا یہ عقل سلیم کا بہانہ ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق ہے اور حدیث کسی صورت میں بھی عقل سلیم کے مخالف نہیں۔ وللہ الحمد!

۲۔ خوش نویس صاحب اپنے مکتوب مفتوح میں لکھتے ہیں:

''عموماً مسائل کے استنباط و تخریج میں سلف میں سے کسی نہ کسی امام، محدث یا فقیہ کی تائید انھیں (مولانا مودودی) حاصل ہوتی ہے۔''

خوش نویس صاحب کا یہ ارشاد موصوف کی خوش فہمی اور ابلہ فریبی کی علامت ہے، کیونکہ ''شاذ'' قول سے استدلال کرنا شہرت پسندی اور کج فکری کی علامت سمجھی جاتی ہے، اس کی زندہ مثال ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ہیں، ذبیحہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے خلاف ملک بھر میں ہنگامہ بپا ہے، حالانکہ امام شافعی کی تائید انھیں حاصل ہے، اگر کسی نہ کسی امام محدث یا فقیہ کی تائید حاصل ہونا صداقت کی دلیل ہے، تو ڈاکٹر فضل الرحمن کے خلاف یہ ہنگامہ آرائی کیوں؟ کیا یہ اصول صرف ڈاکٹر فضل الرحمن ہی کے لیے ہے یا مولانا مودودی کے لئے بھی؟

ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ غلطی سمجھتے ہیں، وہ ایک شاذ قول لے کر علماء امت کے مقابلہ پر آ گئے ہیں، حالانکہ اتباع ''شاذ'' کی نہیں بلکہ معمول بہ اور جمہور کی ہونی چاہیے، حافظ داری فرماتے ہیں:

'' إن الذی یرید الشذوذ عن الحق یتبع الشاذ من قول العلماء ویتعلق بزلاتھم ←

....

← والذي يؤم الحق في نفسه يتبع المشهور من قول جماعتهم وينقلب مع جمهورهم فهاتان آيتان بينتان يستدل بهما على اتباع الرجل وابتداعه"

(الرد على الجهمية: ٦٨)

''جو شخص حق سے روگردانی کرنی چاہتا ہے، وہ علماء کے اقوال میں سے شاذ قول اختیار کرتا ہے اور ان کی غلطی کو حجت بنا لیتا ہے اور جو شخص حق کا طلب گار ہوتا ہے، وہ قول مشہور اختیار کر لیتا ہے اور جمہور علماء کا ساتھ دیتا ہے، یہ وہ عظیم الشان اصول ہے، جس کی بنا پر مبتدع اور متبع شخص کو پہچانا جا سکتا ہے۔''

حافظ دارمی کے اس ارشاد سے خوش نویس صاحب کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ زیر بحث حدیث میں مولانا مودودی کا امام رازی کے شاذ قول کو قبول کرنا اور ان کی غلطی سے تمسک کرنا مولانا مودودی کے لیے کس قدر نقصان دہ ہے!

خوش نویس صاحب کے مکتوب مفتوح میں ہمیں جو قابل مواخذہ چیزیں نظر آئی ہیں، ان پر گزارشات پیش کر دی ہیں، امید ہے کہ آپ اپنے رفقاء سمیت ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے اور ان کو شخصیت پرستی کے سردخانہ میں نہیں ڈال دیں گے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اپنے مضمون میں ایک اہم سوال یہ بھی اٹھایا تھا کہ آخر یہ جرح وتنقید کا کونسا اصول ہے کہ کسی راوی کا نام لیے بغیر یوں ہی حدیث کا انکار کر دیا جائے؟ محدثین کوئی جرح مبہم قبول نہیں کرتے اور یہاں کسی راوی کا نام تک نہیں لیا جاتا، یہ دنیا میں جرح کی کونسی قسم ہے؟ اس طرح تو بیسیوں رواۃ نے یہ حدیث بیان کی ہے، وہ سب ساقط الاعتبار ٹھہریں گے، اس سوال کا جواب خوش نویس صاحب اور ان کے علمی سرپرستوں کے ذمہ ہے اور افسوس کہ موصوف نے مکتوب مفتوح میں اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

پروفیسر خالد بزمی صاحب سے

مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مضمون پر ان لوگوں کا برہم ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، جو ←

....

مولانا مودودی کے ''دربار'' سے وابستہ ہیں، لیکن نامعلوم ہفت روزہ چٹان کے کالم نویس پروفیسر خالد بزمی صاحب اس سے کیوں خفا نظر آتے ہیں؟ پروفیسر صاحب کا خیال ہے چونکہ مولانا مودودی کا بیشتر حصہ قرآن و حدیث کی تشریح و تبلیغ میں گزرا ہے، لہٰذا ان کے متعلق یہ کہنا کہ علم کی ان متعارف راہوں سے موصوف واقف نہیں، ''کم ظرفی'' ہے، ہم نے مولانا مودودی صاحب کے تفقہ کی جو مثالیں شروع میں پیش کی ہیں، ان سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا ارشاد سچا تھا، اس سے قطع نظر اگر مولانا مودودی کی عمر کا بیشتر حصہ قرآن و حدیث کی تبلیغ وتشریح میں گزرا ہے، تو مولانا محمد اسماعیل صاحب نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔

آپ کا علم بہت ٹھوس، فکر بہت عمیق اور معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہے، مولانا مودودی نے تو شاید بخاری شریف کو استیعاباً پڑھا ہے یا نہیں، لیکن مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اسے کئی سال درساً پڑھایا ہے اور موصوف کا قول اس بارہ میں مولانا مودودی کی نسبت زیادہ وزنی ہے۔

پروفیسر بزمی صاحب کو اس بات سے بھی بہت تکلیف ہوئی ہے کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اپنی کتاب ''تحریک آزادی فکر'' میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ اور مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو ''کم ظرف'' کہا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بزمی صاحب نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھا ہے، اگر دوسرا بھی ملاحظہ فرما لیتے، تو ایسا کہنے کی جسارت نہ فرماتے، یہ بزرگ اپنے علم و فضل کے باوجود اہل حدیث کے متعلق بہت متعصب اور تنگ ظرف واقع ہوئے ہیں اور یہ بات ان دونوں ہستیوں پر منحصر نہیں ہے، بلکہ ''اہلحدیث'' تمام حنفی علماء کی مشترکہ کمزوری ہے، جب بھی اس جماعت کا ذکر آتا ہے، تو ان حضرات کا دوران خون تیز ہوجاتا ہے اور ان کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک جاتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

① مولانا محمد حسن سنبھلی رحمہ اللہ اپنی وسیع الظرفی کا مظاہرہ یوں کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر تنقید کرنے والے (جن میں امام بخاری، دارقطنی، نسائی وغیرہ شامل ہیں) احمق، ذلیل، کتے، گدھے، مکھیاں

....

اور پھکڑ ہیں۔ (مقدمه مسند أبي حنيفه)

② مولانا حسین احمد مدنی اپنی وسیع المشربی کا اظہار یوں فرماتے ہیں کہ اہل حدیث خبیث اور ناپاک لوگ ہیں۔ (الشهاب الثاقب: ٥١)

③ مولانا مہاجر مکی فرماتے ہیں:

اہل حدیث دین کے ڈاکو ہیں۔ (شمائم إمداديه: ٢٨)

④ ایک اور کرم فرما نے اہل حدیث کا شمار عیسائیوں مرزائیوں، دہریہ اور نیچری لوگوں میں کیا ہے۔

(رساله القاسم: ١/ شماره: ٥)

⑤ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اہل حدیث لوگ جاہل، گمراہ، ناواقف اور خود رائے ہیں۔ (سبيل الرشاد: ١٠، ٥)

⑥ مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن حجر نے حنفیہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور میں نے ان کے ساتھ نرم سلوک کر کے حنفیہ کی ''نمک حرامی'' کی ہے۔ (مقدمه أنوار البارى)

کیا ان مرصع گالیوں کے بعد بھی کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ یہ حضرات اہل حدیث کے بارہ میں تنگ ظرف اور متعصب نہیں ہیں؟ اب اگر اسی حقیقت کی طرف مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اشارہ فرما دیا ہے، تو اس میں اس قدر تیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا بزمی صاحب کے خیال میں دن کو دن اور رات کو رات کہنا جرم ہے؟

امید ہے کہ حقیقت حال کی وضاحت کے بعد بزمی صاحب کا ذہن صاف ہو گیا ہو گا۔

عجمی سازش کا فسانہ

منکرین قرآن و حدیث کی طرف سے عموماً یہ شبہ پھیلایا جاتا ہے کہ عہد نبوی میں احادیث کی جمع و تدوین کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، احادیث کا موجودہ ذخیرہ عجمی سازش کی پیداوار ہے، جو انتقامی جذبے کے پیش نظر اعدائے دین کی جانب سے مسلمانوں میں رائج کیا گیا۔

حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون میں اسی فاسد نظریہ کی بیخ کنی فرمائی ہے اور تاریخی دلائل اور واقعاتی شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اس ناممکن الوقوع سازش کا تصور چند علم و عقل کے یتامیٰ کا پیدا کردہ ہے، حقیقت اور واقع میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا، بلکہ یہ حضرت خود ایک ''عجمی سازش'' کا شکار ہوئے ہیں!

یہ مضمون ہفت روزہ 'الاعتصام'' (۱۷ فروری ۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا۔

عجمی سازش کا فسانہ

سنت اور بدعت کا اختلاف بہت پرانا ہے، اہل بدعت کو ہر دور میں ائمہ حدیث سے ہمیشہ مخالفت رہی ہے، سنت اور بدعت کے درمیان کوئی ایسا مقام نہیں جہاں دونوں میں سمجھوتہ ہو سکے، اہل بدعت جس آزادی یا آوارگی سے اسلام کا آپریشن کرنا چاہتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ مزاحمت ائمہ حدیث نے کی۔ اعتزال و تجہم کی بدعات سے شروع ہو کر قادیانیت اور پرویزیت تک اہل بدعت کی حیثیت ﴿جند ما هنالك مهزوم من الأحزاب﴾ [1] کی رہی، صدیوں کی جنگ کے بعد بھی حدیث اور اس کے حامیوں میں اصول کی حد تک کوئی لچک ظاہر نہیں ہوئی، حالانکہ اہل بدعت نے اس لمبے سفر میں کئی پینترے بدلے۔

نیا ہتھیار:

منکرین سنت نے ایک نیا پینترا بدلا ہے، تاریخ کے چند صحیح واقعات سے غلط نتائج اخذ کر کے عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اسلامی فتوحات نے پہلی صدی کے آغاز میں اپنی مخالف طاقتوں کو مسل کر رکھ دیا تھا، نجد، شام، تہامہ، عراق وغیرہ ممالک کو سرنگوں کر دیا، ایران، روسی ترکستان اور فارس میں عجمی شہنشاہیت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، اسی طرح ہرقل اور اس کی معاون طاقتوں کو چند سالوں میں بے دست وپا کر دیا۔ ایسے حالات میں بعض سازشوں کا امکان ذہنی طور پر کچھ بعید نہیں، ایک عام ذہن جو اس وقت کی ذہنیت اور ماحول سے ناآشنا ہو اور آج کی ڈپلومیسی اس کے دماغ پر محیط ہو، آسانی سے اس نظریہ کو قبول کر سکتا ہے۔

[1] سورہ ص: ۱۱ (حقیر سا لشکر ہے لشکروں میں سے، جو اس جگہ شکست کھانے والا ہے۔)

تاریخ کا طالب علم:

تاریخ کا ایک طالب علم جس کا دماغ جذبات سے خالی ہو، وہ اسے آسانی سے قبول نہیں کرے گا، وہ سوچے گا کہ آیا یہ فتوحات عوام کی منشاء کے خلاف تھیں؟ مسلمانوں کے اس استیلاء کو زیادہ عربی اور عجمی رعایا نے ناپسند کیا یا مسلمان فاتحین عوام کی صوابدید اور دعوت پر وہاں گئے؟ فتح کے بعد عوام پر ظلم کیے یا عوام کو سہولت پہنچائی؟ اگر پہلی صورت ہے تو سازش کے امکانات ہو سکتے ہیں، اس امکان کو کسی حد تک قبول کرنا چاہیے، لیکن اگر صورت حال اس کے خلاف ہے، غیر مسلم رعایا اپنے آقاؤں سے تنگ آ چکی تھی، وہ شہنشاہیت کے ناروا بوجھ کو اپنی گردن سے اتار دینا چاہتی تھی، مسلمان ان کی دعوت یا ان کی منشا کے مطابق وہاں گئے، غیر مسلم رعایا نے نئے فاتحین کو خوش آمدید کہا، تو سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جن فارسی علماء نے اسلام قبول کیا، ان کی اکثریت عوام سے تھی، شاہی خاندان کے بہت کم لوگ اسلام لائے اور علمی مشغلہ تو ان میں اور بھی کم تھا۔ کون نہیں جانتا کہ فارس کا آخری فرمانبردار یزد جرد اپنی قوم کے ہاتھوں مارا گیا، جو قوم اپنے بادشاہ کو خود قتل کرتی ہے، تاکہ فاتح آسانی سے آگے بڑھ سکے، وہ اس کے خلاف سازش کیوں کرے گی اور پھر یہ دانشمندی عجمیوں ہی نے کیوں کی؟ عرب مفتوحین نے سازش کیوں نہ کی؟

حدیثوں کے بم:

اور پھر مفتوح قوموں نے انتقام کے لیے نہ تلواریں بنائیں نہ توپیں، بلکہ حدیثوں کے بم بنا کر فاتحین کی پسلیاں توڑ ڈالیں، اور یہ فاتحین حدیثوں کے مارے نڈھال ہو کر پوری عربی اور عجمی قلم رو پر قابض ہو گئے اور صدیوں حکومت کرتے رہے، اور ان مفتوحین نے تقسیم کار کے طور پر مساجد اور مدارس کا شعبہ سنبھال لیا، گویا بطور

انتقام فاتحین کی تعلیم ایسے اہم شعبہ کی ذمہ داریاں خود سنبھال لیں اور عرب بادشاہوں نے ان انتقام لینے والے عجمیوں کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ ﴿هل جزاء الإحسان إلا الإحسان﴾ [1] یہ ہے وہ اکتشاف جو پرویز اینڈ کمپنی نے آج کل کیا اور بعض سادہ لوح عوام کو دھوکا دیا۔ ﴿وسيعلم الذين ظلموا أى منقلب ينقلبون﴾ [2]

تجزیہ:

ہم نے اس تہمت کا اسی ماحول میں تجزیہ کیا ہے اور گزارشات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے:

① سازش ثابت کرنے کے لیے کس قسم کے ثبوت کی ضرورت ہے؟ جس میں یہ حضرات ناکام ہوئے ہیں۔

② فن حدیث اور دفاتر سنت کے اندر بھی کوئی ایسا مواد موجود ہے، جو سازش کا پتہ دے؟

③ عجمی سازش کا ہنگامہ بپا کرنے والے خود ہی کسی سازش کا شکار تو نہیں ہوئے؟

یہ پہلی کوشش ہے، امید ہے کہ اہل قلم اس نہج پر مزید لکھیں گے۔

عجمی سازش:

① حدیث کے متعلق آج کل ان لوگوں کو ایک انکشاف ہوا ہے، ان لوگوں کا خیال ہے کہ حدیث کی تدوین عجمیوں کی سازش سے ہوئی، یہ انکشاف دوسری تیسری صدی میں کسی کو نہ سوجھا، حالانکہ وہ زمانہ تدوین حدیث کے اوقات سے بہت قریب تھا۔ اگر اس قسم کی کوئی سازش اس فن میں کارفرما ہوتی، تو اہل حدیث کے

---

[1] الرحمن: ٦٠

[2] الشعراء: ٢٢٧

مخالف ضرور اسے نمایاں کرتے، فن حدیث اس وقت بدنام ہو جاتا، شیعہ، خوارج، معتزلہ، جہمیہ اور بعض دوسرے گروہ فوراً ان کو عریاں کر کے رکھ دیتے، یہ عجیب ہے کہ یہ سازش اپنے وقت پر نہ کھلی اور آج بارہ سو سال کے بعد اس کا الہام پرویز اینڈ کمپنی کو ہوا، جن کو فن حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں!

حدیث کی جمع و تدوین پہلی صدی سے قریباً تیسری صدی تک ہوئی، اسلام کے دشمنوں کی اس وقت کمی نہ تھی، مگر یہ سازش بالکل معلوم نہ ہو سکی، تاریخ اس تہمت سے یکسر خاموش ہے۔

ائمہ حدیث	ائمہ حدیث کے مدّ مقابل
۱۔ امام محمد بن مسلم الزہری ۱۲۴ھ	۱۔ المقنع الخراسانی ۱۶۲ھ
۲۔ عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی ۱۵۷ھ	۲۔ واصل بن عطا المعتزلی ۱۸۱ھ
۳۔ امام مالک بن انس الاصبحی ۱۷۹ھ	۳۔ امیر المومنین مامون بن ہارون الرشید ۲۱۸ھ
۴۔ عبداللہ بن مبارک ۱۸۲ھ	۴۔ ابراہیم بن سیار ابو اسحاق النظام ۲۲۱ھ
۵۔ امام محمد بن ادریس شافعی ۲۰۴ھ	۵۔ امیر المومنین معتصم بن ہارون ۲۲۷ھ
۶۔ یحییٰ بن معین المحدث ۲۳۳ھ	۶۔ بشر بن غیاث المریسی ۲۱۸ھ
۷۔ امام علی بن مدینی ۲۳۴ھ	۷۔ امیر المومنین واثق بن معتصم ۲۳۲ھ
۸۔ احمد بن محمد بن حنبل ۲۴۱ھ	۸۔ محمد بن عبدالوہاب الجبائی ۳۰۳ھ
۹۔ محمد بن اسماعیل بخاری ۲۵۶ھ	۹۔ ابو ہاشم عبدالسلام الجبائی ۳۲۱ھ
۱۰۔ امام ترمذی ۲۷۵ھ	۱۰۔ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری ۵۲۸ھ
۱۱۔ امام احمد بن شعیب النسائی ۳۰۳ھ	

مذکورہ فہرست میں ائمہ حدیث اور ان کے مخالفین سے چند سر کردہ شخصیتوں

کے نام لکھے گئے ہیں۔ علامہ جار اللہ زمخشری کے علاوہ باقی سب حضرات چوتھی صدی کے آغاز تک اپنے اپنے طریق پر علمی خدمات انجام دیتے رہے، ائمہ حدیث جمع وتدوین میں مشغول رہے اور مختلف طریقوں سے فن کی خدمت انجام دیتے رہے، دوسرے اعتزال اور جہمیہ سے ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ زمخشری چھٹی صدی کے آدمی ہیں، لیکن علم وفضل کے لحاظ سے اختلاف کے باوجود اہل سنت اور معتزلہ دونوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان تمام حضرات نے حدیث کی مخالفت کی، اپنی عقلیات کے بالمقابل حدیث کو نظر انداز کیا، اس فن پر مختلف قسم کے اعتراضات کیے، مگر ان کی تصانیف میں اس عجمی سازش کا کہیں پتہ نہیں چلتا، جس کی نشاندہی تمنا عمادی اور ان کے رفقاء کر رہے ہیں۔

مخالفین حدیث کی صف میں تین جابر بادشاہ ہیں، جن کی حکومت اقصیٰ مغرب سے اقصیٰ مشرق تک پھیلی ہوئی تھی، انھوں نے مقدور بھر حدیث اور ائمہ حدیث کی مخالفت کی، اہل حدیث کو کوڑے لگائے، جیلوں میں ڈالا، زنجیروں میں جکڑا۔ اہل حدیث کی تاریخ کا یہ دور معصوم ائمہ حدیث کے خون سے رنگین ہے، امام احمد ایسے ائمہ حدیث ان کبراء کے مظالم کا تختۂ مشق رہے ہیں، کسی نے قید کیا، کسی نے کوڑے لگوائے، کسی نے حقارت سے نظر انداز کر دیا۔

امراء کا جبر و استبداد:

خود ائمہ حدیث کے متعدد اصحاب، حکومت کے جبر وتشدد کے مقابلہ سے عاجز ہو گئے، لیکن خدمت حدیث سے دستبردار نہیں ہوئے، اس حالت میں بھی جس قدر علوم حدیث کی خدمت کر سکتے تھے، سرانجام دیتے رہے اور حکومت کے تصادم سے

گریز کرتے رہے۔

لیکن ائمہ حدیث میں ایسے اصحاب عزیمت بھی تھے، جو بے خطر آتش نمرود میں کود گئے اور بے نیاز ہو کر ظالم اور مستبد حکومتوں سے ٹکرا گئے، قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے جھیلیں، جلادوں کے کوڑوں سے پیٹ کے چمڑے اڑ گئے، سولی پر نعشیں لٹکائی گئیں لیکن جادہ حق سے سر مو انحراف نہ کیا۔

أولئك أبائي فجئني بمثلهم

إذا جمعتنا يا جرير المجامع ❶

مامون، معتصم اور واثق کے پاس وسائل کی جو کثرت تھی، تحقیق و انکشاف کے جو اسباب و ذرائع موجود تھے، وہ بچارے علماء اہل حدیث کے پاس کہاں؟ مگر عجمی سازش کے انکشاف کا افسانہ کسی کے ذہن میں نہ آیا۔

مامون کا دربار:

مامون کے دربار میں اہل علم کی کمی نہ تھی، یونانی فلسفہ، ایرانی ادب اور ہندی طب کے ماہرین کی ایک بہت بڑی کھیپ بغداد میں موجود تھی، بغداد کی یونیورسٹیاں مسلم اور غیر مسلم اہل علم سے بھرپور تھیں، فارس کی سیاسی سازشوں سے یہ حکومت برسر اقتدار آئی تھی، اگر کوئی علمی سازش ہوتی، تو یہ مسلم اور غیر مسلم علماء جو اس حکومت کے وظیفہ خور تھے، خود اس راز کو طشت ازبام کر دیتے اور ائمہ حدیث کو دنیا کے سامنے رسوا کر دیتے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس کا کہیں تذکرہ تک نہیں۔

سازش کیسے؟

سازش ایک انتہائی جرم ہے اور اس کی سزا بھی حکومت کی طرف سے انتہائی سخت ہو سکتی ہے، اس لیے اس کے ثبوت کے لیے بھی قطعی اور حتمی دلائل کی ضرورت

❶ یہ ہیں میرے آباواجداد، اے جریر! کوئی ان جیسا محفل میں لا کر تو دکھا!

ہوتی ہے، محض ظن وتخمین سے ایسے جرائم ثابت نہیں کیے جا سکتے، آج سے چند سال پہلے اسمبلی ہال میں بم پھینکا گیا، اس کی پاداش میں کچھ آزادی پسند نوجوان گرفتار ہوئے، کئی سال تک مقدمہ چلتا رہا، حکومت کا لاکھوں روپیہ صرف ہوا، سلطانی گواہوں نے عینی شہادتیں دیں، تو کہیں جا کر سازش ثابت ہوئی، مجرموں کو سزا ملی۔ انگریز کی غیر مسلم حکومت میں ایک کیس ثابت کرنے کے لیے حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آئی، کیس غلط تھا یا صحیح، مگر جہاں تک آئین وضوابط کا تعلق تھا، اسے پورا کیا گیا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ پر سر سکندر کے قتل کی سازش کا کیس بنایا گیا، مہینوں کیس چلتا رہا، کیس غلط تھا یا صحیح، مگر ثابت نہ ہو سکا، شاہ صاحب باعزت بری کر دیے گئے۔

قرآنی سازش:

یہاں یہ حال ہے کہ ایک ایسی سازش کا سراغ لگایا گیا ہے، جس نے حسب بیانِ استغاثہ پورے اسلام کا نظام بدل کر رکھ دیا۔ مرکزی حکومت کا ایک خوبصورت خواب ایسا دفن ہوا کہ یہ مُردہ صدیوں تک نہ اٹھ سکا، احادیث کے بوجھ نے اسے ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں دے دیا۔

علم وحکمت کے ایوان پر ان سازشی علماء نے ایسا قبضہ کیا کہ صدیوں تک (حسب بیان استغاثہ) پوری امت کا پروگرام ہی بدل گیا اور کوئی نہ سمجھ سکا کہ یہ علم سازش کی پیداوار ہے۔ ان سازشی علماء نے اس فن کی تائید کے لیے سینکڑوں فنون ایجاد کیے، طالب علموں کی عمریں (حسب بیان استغاثہ) صدیوں سے ضائع ہو رہی ہیں، کروڑوں روپیہ اس علم کی تدوین واشاعت پر صرف ہوا، جس سے نظر وفکر کے

دھارے ہی بدل گئے، دینِ پرویز صدیوں نہ ابھر سکا۔

اتنی سنگین کانس پریسی (Conspiracy) [سازش] ثابت کرنے والوں نے صورت کیا اختیار کی، استغاثہ ہی دریا برد ہو رہا ہے، کون کون سے ائمہ حدیث کس کس عجمی بادشاہ سے کہاں کہاں ملے؟ اس استغاثہ کے گواہ کون تھے؟ شہادت عینی تھی یا تخمینی یا منطقی؟

اس کا جواب واقعات کی روشنی میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ یہ فسانہ ''طلوع اسلام'' کے دفتر میں بیٹھ کر چند آوارہ مزاج فرنگی نما یتیم العلم ساتھیوں نے گھڑا اور دو ایک کے سوا اس کا کوئی گواہ نہ مل سکا۔

استغاثہ دائر ہو چکا ہے، لیکن یہ تشخیص نہیں ہو سکا کہ مستغیث کہاں ہے؟ کون ہے؟ سازش کس کے سامنے ہوئی؟ کب ہوئی؟ اس کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟

لطف یہ کہ سازش تیسری صدی ہجری میں ہوئی، گواہ چودھویں صدی ہجری میں برآمد ہوئے اور استغاثہ کا منشا یہ ہے کہ اس سازش نے جن اختراعی علوم کی ایجاد کی ہے اور وضع و اختلاق سے جو فاسد نظریات پیدا کیے گئے ہیں، انھیں حدیث اور سنت کے بجائے اگر تاریخی حقائق لکھ لیا جائے، تو استغاثہ واپس لے لیا جائے گا اور مستغیث کو مجرموں سے کوئی شکوہ نہ ہوگا۔ ﴿ قاتلهم الله أنىٰ يؤفكون ﴾ [1]

غور طلب حقائق:

اگر یہ سازش کا فسانہ کچھ دیر کے لیے صحیح مان لیا جائے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ائمہ حدیث نے وہی کچھ کیا، جو عجمی امراء چاہتے تھے، فن حدیث کی ایجاد اور تخلیق سے ان عجمی امراء کا مقصد پورا ہو گیا، جو سیاسی شکست کے بعد انتقام کے طور پر اسلام اور مسلمانوں سے حاصل کرنا چاہتے تھے، تو انھوں نے ائمہ اسلام اور صنادید

---

[1] المنافقون: ٤

سنت کو جیلوں میں کیوں ڈالا؟ کوڑے کیوں لگائے؟

اس قدر سنگین سزائیں کیوں دیں؟ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، سفیان ثوری رحمہ اللہ، ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی داستانیں ابتداءِ تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں، ہارون کے دربار میں تو خیر کچھ عربیت موجود تھی، مامون کا دربار تو سراسر عجمیت نواز تھا، عجمی وزراء پوری شان سے دربار پر محیط تھے، معتصم اور واثق کے ایوانوں میں بھی عجمیت بطور قوت حاکم کارفرما تھی، پھر یہاں ائمہ حدیث پر قافیہ حیات کیوں تنگ کیا گیا؟

ائمہ حدیث کا مقاطعہ:

معلوم رہے کہ ائمہ حدیث شاہی درباروں سے متنفر تھے، مولانا تمنا عمادی کو شکوہ ہے کہ ائمہ حدیث نے شاہی درباروں کے مقاطعہ سے ذلیل لوگوں کے لیے میدان صاف کر دیا۔ گواہ کے بیان میں یہ بہت بڑا تضاد ہے، ایک طرف وہ ائمہ حدیث کو سازشی سمجھتا ہے، دوسری طرف درباروں سے ان کی علیحدگی اور مقاطعہ کو ناپسند کرتا ہے، ''حافظہ نباشد''[1] کی مثل صادق آ رہی ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ اگر عجمی سازش کے افسانہ میں کچھ بھی اصلیت ہے، تو نہ ہی ان عجمی درباروں کا ائمہ حدیث کو مقاطعہ کرنا چاہیے اور نہ ہی ان امراء و سلاطین کو ان علماء حدیث کے ساتھ یہ عناد رکھنا چاہیے، بلکہ بقول ''ادارہ طلوع اسلام'' ان دونوں کی سازش سے ہی تو یہ عجمی حکومت وجود میں آئی اور اسلام کا پورا نظام (مفروضہ) تلپٹ اور تباہ ہو کر رہ گیا اور عربی اندازِ حکومت قریباً ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

تاریخ کیسی ہے؟

[1] دروغ گورا حافظہ نباشد (جھوٹے آدمی کی یادداشت نہیں ہوتی!)

پھر آج کے منکرین حدیث مصر ہیں کہ فن حدیث کو صرف تاریخ سمجھ لیا جائے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس تاریخ کی تدوین میں سازش کارفرما ہو، مورخ غیر اسلامی نظریات کا شکار ہو، عجمی طاقتوں کا ممنون اور وظیفہ خور ہو، بلکہ اس تاریخ کی تدوین ہی عجمی آلہ کار کے طور پر کی گئی ہو؛ اس تاریخ پر کہاں تک اعتماد کیا جائے گا؟ دشمن کی تدوین کردہ تاریخ پر کوئی عقلمند کبھی اعتماد کرسکتا ہے؟ ﴿إنما أعظكم بواحدة أن تقوموا لله مثنىٰ وفرادىٰ ثم تتفكروا ما بصاحبكم من جنة﴾ [1]

امت کا موقف:

اس سازش کو جانتے ہوئے تیرہ صدیوں تک اگر امت نے اس فن کو مستند سمجھا، نظام حکومت کو اس کی روشنی میں مرتب کیا، اپنے مدارس کے نصاب ان علوم سے معمور کیے، تو پوری امت کو بے وقوف کہنا چاہیے یا بد دیانت، اگر ایسا نہیں، یقیناً نہیں، تو آپ کون ہیں کہ امت کی اس عظیم الشان خدمت کو عجمی سازش سے تعبیر کریں؟ شرم آنی چاہیے کہ دشمن جن کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، تم انھیں سازشی اور خائن سمجھتے ہو!

مجھے یقین ہے کہ منکرین حدیث کا یہ بے ادب اور بے شعور طائفہ ان اساطین علم کو بے وقوف بھی کہے گا اور بے دین بھی، لیکن ان کو تیار رہنا چاہیے کہ اس تقوّل [خود ساختہ بات] کے بعد آپ کی جگہ طلوع اسلام کا دفتر نہیں بریلی کا مینٹل ہسپتال ہونا چاہیے!!

قرآن اور لغت:

آپ حضرات کے نقطہ نظر سے دین کا سارا انحصار لغت عرب اور قرآن پر ہے، معاف فرمایئے گا، جب کوئی سازش اس قدر محیط ہو کہ شاہی دربار اور مدارس کے

[1] سورة سبأ: ٤٦

حجرے یکساں اس سے متاثر ہوں، وہاں نہ لغت محفوظ ہے نہ تواتر، ان حالات کے ہوتے ہوئے کسی کو خبر میں اصطلاحی تواتر کے انداز پیدا کرنا چنداں مشکل نہیں۔ آج کل اخبارات اور پراپیگنڈا سے حقائق کا جس طرح جھٹکا کیا جاتا ہے اور جھوٹ کو جس طرح حقائق کا رنگ دیا جاتا ہے، آپ حضرات اسے ہم سے زیادہ جانتے ہیں، خود اپنی تحریک ہی کو دیکھ لیجئے، اس میں دعایت اور پراپیگنڈا کے سوا کیا رکھا ہے؟ تحریک انکار حدیث پورے تخریبی پروگرام پر چل رہی ہے، جسے پراپیگنڈا کے زور سے تعمیری رنگ دیا جا رہا ہے۔

اس لئے کچھ شک نہیں کہ آپ جن احادیث کو متواتر سمجھ رہے ہیں، یہ بھی کہیں علم ونظر کا فریب ہی نہ ہو، آخر عجمیوں نے سازش سے کیا کیا نہ کرایا ہوگا؟ اس وہم خولیا کے ہوتے ہوئے جس سے آپ حضرات بری طرح متاثر ہیں، نہ متواتر حدیث قابل اعتبار ہوسکتی ہے، نہ مشہور، نہ خبر واحد!

یہ حادثہ کیسے ہوا؟

منکرین حدیث کے خیال کے مطابق اسلام کے ابتدائی دور میں حدیث حجت نہیں سمجھی جاتی تھی، جب اسلام عجمی سازش کا شکار ہوا، تو لوگ حدیث کو حجت سمجھنے لگے۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ اتنا بڑا حادثہ ہوا، نظر وفکر پر اتنا بڑا انقلاب آیا کہ سوچنے کی قدریں بدل گئیں، ارباب فکر ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے، قرآن ایک ایسی کامل کتاب کی جگہ ظنی احادیث نے لے لی اور یہ سب کانوں کان ہوگیا، کسی کو پتا ہی نہ چلا کہ اسلام پر کیا حادثہ گزر گیا؟ تاریخ کے دساتیر میں اتنے بڑے سانحہ کی نہ تاریخ معلوم ہے نہ وقت، نہ یہ معلوم ہے کہ اتنے بڑے انقلاب کے ہیرو کون لوگ تھے؟ اتنے بڑے جرم کو خاموشی سے کیونکر گوارا کرلیا گیا؟ إن هذا من أعاجيب الزمن ![1]

[1] بے شک یہ عجائب زمانہ سے ہے!

ائمہ حدیث کون تھے؟

عجمی سازش کے افسانہ پر اس لحاظ سے بھی سوچا جا سکتا ہے کہ ائمہ حدیث کا تعلق کن اوطان سے تھا؟ اس میں شک نہیں بخارا، نیشا پور، خراسان، قزوین وغیرہ مقامات فن حدیث کے بہت بڑے مراکز تھے، لیکن ان ممالک میں علوم دینیہ کی ترویج کے معنی سازش نہیں ہوسکتے، سوچنے کی چیز یہ ہے کہ آیا علم حدیث ان مراکز سے عرب میں پہنچا ہے، یا حجاز نے ان ریگستانوں کو علوم دین سے سرسبز اور شاداب کیا ہے؟ معلوم رہے علوم دینیہ کی سب سے پہلی درس گاہ حجاز ہے، یہیں سے علم کی سوتیں پھوٹیں اور پوری دنیا شاداب ہوگئی، امام مالک اور امام شافعی کے مدارس ہی سے ان تمام ممالک میں علم پہنچا، جب علوم دینیہ کا پہلا سرچشمہ حجاز ہے، تو عجمی سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر یہ علماء تمام فارسی یا عجمی ہی نہیں، ان میں خالص عرب بھی ہیں، اور بعض عجمی الاصل جو ہمیشہ کے لیے عرب میں اقامت پذیر ہوگئے، قاسم بن عبید بن سلام، امام شافعی خالص عرب ہیں، اگر عجمیت کی وجہ سے سازش کا افسانہ گھڑا جائے، تو تمام علوم عجمی سازش کا شکار ہوں گے، ابن خلدون نے لکھا ہے:

> " من الغريب الواقع أن حملة العلم فى الملة الإسلامية أكثرهم العجم لا من العلوم الشرعية ولا من العلوم العقلية إلا في القليل النادر " (مقدمه ابن خلدون: ٤٩٩)

> یہ عجیب واقعہ ہے کہ اسلام میں اکثر اہل علم عجمی الاصل ہیں، شرعی اور عقلی علوم کا یہی حال ہے، عرب بہت کم ہیں۔

ابن خلدون اس کے وجوہ اور علل پر اپنے ذوق کے مطابق بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "فكان صاحب صناعة النحو سيبويه والفارسي من بعده والزجاج

من بعدهما كلهم عجم في أنسابهم وإنما ربوا في اللسان العربي فاكتسبوا بالمربى ومخالطة العرب وصيروه قوانين و فنا لمن بعدهم، وكذا حملة الحديث الذين حفظوه على أهل الإسلام أكثرهم عجم أو مستعجمون باللغة والمربىٰ وكان علماء أصول الفقه كلهم عجما كما عرف وكذا حملة علم الكلام وكذا أكثر المفسرين ولم يقم بحفظ العلم وتدوينه إلا الأعاجم"

(مقدمہ ابن خلدون: ۵۰۰)

سیبویہ نحو کے ماہر تھے، ان کے بعد ابوعلی فارسی، ان کے بعد زجاج، یہ سب عجمی تھے، عرب میں تربیت کی وجہ سے انھیں کسی طور پر یہ زبان حاصل ہوگئی اور عربوں میں رہنے سہنے کی وجہ سے انھیں زبان کو قانون اور فنی صورت دینے کی توفیق ملی، اسی طرح علماء حدیث میں اکثر عجمی ہیں، انھوں نے علماء اسلام سے اسے سیکھا اور جیسا کہ معلوم ہے علماء اصول فقہ بھی سب عجمی ہیں، اسی طرح تمام علماء کلام اور ائمہ تفسیر بھی، علم کے حفظ و تدوین کی ذمہ داری عجمیوں نے لے لی۔

اگر کسی ملک میں علم کی خدمت اور اس کی تدوین سازش کی دلیل ہوسکتی ہے، تو یقین فرمایئے تمام اسلامی علوم سازش کا نتیجہ ہیں، نہ نحو محفوظ ہے، نہ فقہ، نہ علم کلام، نہ علم تفسیر، قرآن کے الفاظ کتنے ہی متواتر کیوں نہ ہوں، جب تعیین مراد میں عجمی سازش کو دخل ہوگیا، تو قرآن کا تواتر اور یقین بے مقصد ہوجائے گا۔ اب مولانا تمنا اور پرویز سوچ لیں کہ ان کے پاؤں سرزمین عجم میں ہیں یا عرب میں؟ وہ اپنی مفروضہ سازش سے تو نہیں بچ سکیں گے، ابن خلدون کا مقام اہل علم میں معلوم ہے، امید ہے حضرات منکرین حدیث اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ ''عجمی سازش'' کا واہمہ ایک جھوٹ ہے، جس سے ہر عقلمند کو پرہیز کرنا چاہیے۔

انقلاب کی نفسیات:

دنیا انقلابات کا دوسرا نام ہے، اس میں ذہنی اور سیاسی انقلابات ہوتے رہتے ہیں، ﴿ تلك الأيام نداولها بين الناس ﴾ [1] میں یہی حقیقت مستور ہے، لیکن انقلاب نظام کا مزہ نہیں کہ غیر شعوری طور پر گرنے لگیں، ہر انقلاب کا پس منظر ہوتا ہے، اس کے کچھ اسباب و دواعی ہوتے ہیں، عجمی سازش اگر واقعی کوئی حقیقت ہے، تو اس کے پس منظر اور اسباب و دواعی کا علم ضروری ہے، محض یہ کہہ دینا کہ عجمیوں نے فتح کے بعد اس کا انتقام احادیث کی وضع و تخلیق سے لیا، بے حد بے جوڑ چیز ہے، دلیل اور مدعیٰ میں کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے، جب کوئی قوم کسی پر غالب ہوتی ہے، تو اس کے اثرات دو طرح نمایاں ہوتے ہیں، اگر فاتح قوم کا اخلاق اچھا ہے، وہ مفتوح قوم سے اچھا برتاؤ کرے، تو مفتوح قومیں فاتح کی نقالی پر اتر آتی ہیں، ان کے علوم سیکھتی ہیں، ان کے رسم و رواج اپنے معاشرہ میں منتقل کرتی ہیں، ابن خلدون کا خیال ہے:

> "إن المغلوب مولع أبدا بالاقتداء بالغالب في شعاره وزيه ونحلته وسائر أحواله وعوائده" (مقدمه: ١٢٥)
>
> مغلوب غالب کی اقتداء کے لیے مشتاق ہوتا ہے، اس کی وضع، شعار، مذہب اور تمام حالات میں وہ غالب کا تتبع کرتا ہے۔

اور واقعات بتاتے ہیں کہ مفتوح قومیں فاتح کی نقالی کرتی ہیں، عجمی فتوحات اس قسم کی تھیں، مسلمانوں کا برتاؤ مفتوح قوموں سے برادرانہ تھا، ذمیوں سے ان کا سلوک بھائیوں کی طرح تھا، ان حالات میں انتقام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر فاتح کا تعلق مفتوح سے اچھا نہ ہو، فاتح ذلت آمیز انداز سے مفتوح کے ساتھ معاملہ کرے تو دانشمند اور اہل علم دل میں اس کے خلاف بغض رکھتے ہیں، سیاسی انتقام کے لئے

[1] سورة آل عمران: ١٤٠

وقت کا انتظار کرتے ہیں، لیکن عوام بہت جلد پیٹ کے دھندوں میں لگ جاتے ہیں، ان کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، کبھی کوئی نمایاں شورش ہو، تو عوام کے جذبات حکومت کے خلاف ہوتے ہیں، ورنہ عوام کو ضروریات زندگی میسر ہوتی رہیں، تو وہ کسی انتقام کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔

آپ ہندوستان ہی کے حالات کو دیکھیے، مغل حکومت کے اختتام کے بعد بغیر اہل توحید وسنت کے کوئی بھی انگریز کی مخالفت کو دیر تک سینے میں جگہ نہ دے سکا، یہ لوگ انگریز اور اس کی تہذیب کی مخالفت برسوں سینوں میں وبائے پھرے، ہند اور بیرون ہند میں اس کو شکست دینے کی تجویز کرتے ہیں، لیکن بزرگوں سے سر سید اور مرزا غلام احمد دونوں انگریز کی گود میں چلے گئے، سر سید کو اس معاملہ میں شاید مخلص کہا جا سکے، لیکن مرزا غلام احمد تو صرف انگریز کی غلامی کو اپنی نبوت کی بنیاد سمجھتے تھے، مجھے معلوم ہے کہ پرویز صاحب اور ان کے رفقاء کا تعلق ان ہی دونوں سلسلوں سے ہے، وہ تصورات کی آوارگی میں سر سید کی پیروی کرتے ہیں اور تاویل میں مرزا غلام احمد کے شاگرد ہیں، آپ ایسے لکھے پڑھے لوگ انتقام کی آگ کو سینوں میں زندہ نہ رکھ سکے، تو فارسیوں سے آپ کون سی عجمی سازش کی امید رکھ سکتے ہیں؟ اس جنون آمیز فسانہ کو جس قدر جلد ممکن ہو دماغ سے نکالیے، انقلاب کی نفسیات سے اس انقلاب کی قطعاً تائید نہیں ہوتی، پڑھے لکھے لوگوں کو کچھ تو معقول بات کہنی چاہیے!

عجمیوں کو کیا ملا؟

سوچنا یہ ہے کہ عجمیوں کا ملک گیا، ان کی سیاسی موت ہوئی، اب انتقام اس طرح لیا گیا کہ اسلامی علوم کی خدمت کا ان لوگوں نے ذمہ لے لیا، اسلام کی علمی خدمات میں رات دن ایک کر دیا، وطنی سیاسیات سے بالکل الگ ہو کر علوم کی تدوین

میں لکھو کھہا احادیث حفظ کیں، حفظ کی کمی، دیانت کے فقدان سے جو غلطیاں اس میں آ گئی تھیں، بلکہ ثقات سے جو اوہام سرزد ہوئے تھے، ان کی نشاندہی کی، ابن ابی حاتم کی علل اور الجرح والتعدیل، قاضی عیاض کی مشارق الأنوار پر ایک نظر ڈالیے اور فیصلہ فرمایئے کہ یہ سیاسی انتقام ہے یا خدمت دین کا خالص جذبہ؟ آپ حضرات کو شرم آنی چاہیے کہ جن لوگوں نے اس تن دہی اور خلوص سے اسلام کی خدمت فرمائی، آپ ان کو سازشی کہہ کر بدنام کر رہے ہیں، نمک حرامی کی حد ہو گئی۔ پھر ان سازشی حضرات نے، جیسے کہ ذکر ہوا، کبھی شاہی درباروں کا رخ نہ کیا، اگر کسی بادشاہ نے احتراماً کچھ دینے کی کوشش کی، تو اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، بادشاہ نے گھر بلایا، تو اَڑ گئے، بادشاہ نے علم حاصل کرنا چاہا، تو مساوات کے لیے مدرسہ کی چٹائیوں کی پیش کش فرمائی اور کسی تخصیص سے انکار کر دیا۔ یہ عجیب سازشی ہیں کہ سیاسی کامیابیوں کی تمام راہوں سے الگ ہو کر عرب بادشاہوں کو کھلا چھوڑ دیا کہ یہ تخت و تاج آپ کو مبارک ہو۔ اموی اور عباسی امراء کی تاریخ اور ائمہ حدیث کا طریق عمل آپ کے سامنے ہے، تاریخ کا طالب علم اس سے انکار نہیں کر سکتا، کیا سازشیں اس طرح کی جاتی ہیں؟ سوچیے عجمیوں کو اس محنت سے کیا ملا؟

سب سے بڑا سراغ:

عجمی سازش کے متعلق جو سراغ لگایا گیا ہے، وہ مہدی کی پیش گوئی کے متعلق چند روایات ہیں، جن سے بعض وقت اصحاب غرض نے فائدہ اٹھایا اور بعض سادہ لوح اہل علم کو اس سے غلطی لگی، تاریخ کے بعض ادوار میں ان روایات کا غلط استعمال کیا گیا، بعض اوقات صنعتِ وضع و تخلیق سے بھی کام لیا گیا، اسے کسی طرح بھی عجمی سازش کا نام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ جہاں تک وضع و تخلیق کا تعلق ہے، اس میں عرب

بھی شریک ہیں اور عجمی بھی! یہ فیصلہ کرنا قطعاً ناممکن ہے کہ یہ کام سازش سے ہوا یا عجمیوں کے مشورہ سے ہوا، حکومت نے کہہ کر کرایا یا محض خوشامد اور ٹوڈی پن سے کیا گیا، آپ اپنی تحریک ہی کو دیکھئے، آپ نظام اسلامی کے متعلق سنت کی مخالفت کر رہے ہیں، آپ کے جرائد اہل حق اور اصحاب سنت پر کیچڑ اور گندگی اچھال رہے ہیں، میری ذاتی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ محض آپ حضرات کی سادگی ہے یا صحافت ہے، آپ بے دین سیاسیین کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں، اس میں کوئی سازش نہیں، حالانکہ یہاں سازش کے امکانات کہیں زیادہ ہیں، ائمہ حدیث کے معاملہ میں سازش کا شائبہ تک نہیں ہے، بلکہ قرائن صریح اس کے خلاف ہیں، ائمہ حدیث کی روش اور سلاطین کے ان پر تشدد صریح اس مدعیٰ کے خلاف ہے۔

مہدی کی روایات:

مہدی کی روایات قابل حجت بھی ہیں اور موضوع بھی، [1] اسے مسئلہ کی طرح

[1] امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مہدی کے بارے میں وارد ہونے والی احادیث، جن پر میں واقف ہوا ہوں، پچاس احادیث ہیں، جو صحیح، حسن اور ضعیف منجبر ہیں، بلا شک وشبہ یہ متواتر احادیث ہیں، بلکہ کتب اصول کی روشنی میں تو اس سے کم تعداد والی روایات پر بھی متواتر کا اطلاق درست ہے، اور صحابہ کرام کے آثار بھی اس بارے میں بہت زیادہ ہیں، جو مہدی کی صراحت کرتے ہیں، وہ بھی حکماً مرفوع ہیں، کیونکہ ایسے مسائل میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ (التوضيح في تواتر ما جاء في المهدي المنتظر والدجال والمسيح للشوكاني نقلا عن عقيدة أهل السنة والأثر في المهدي المنتظر للشيخ عبدالمحسن العباد: ٨)

علاوہ ازیں حافظ ابو الحسن السجزي (٣٦٣ھ) امام محمد البرزنجي (١١٠٣ھ) السفاريني (١١٨٨ھ) نواب صدیق حسن خان (١٣٠٧ھ) اور محمد بن جعفر الكتاني (١٣٤٥ھ) نے احادیث مہدی کو متواتر قرار دیا ہے۔ (عقيدة أهل السنة الأثر في المهدي المنتظر للشيخ عبدالمحسن العباد: ٩)

یقیناً مہدی کے بارے میں ضعیف اور موضوع احادیث بھی مروی ہیں، لیکن یہ نفس مسئلہ کے لیے ←

سمجھنا چاہیے، آپ اصول محدثین کے مطابق ان پر جرح کر کے جو قابل رد ہیں، انھیں رد کر دیجیے، جو قابل قبول ہیں، انھیں مان لیجیے۔ یہ سازش کہاں کی ہوئی کہ عجمیوں نے سازش کر کے ایک سیاسی انقلاب برپا کیا اور حکومت پھر عباسیوں کو دے دی، جو خالص عرب تھے!

وضع و تخلیق:

حقیقت یہ ہے کہ احادیث کی وضع و تخلیق مختلف اسباب کی مرہون منت رہی، کبھی رقت قلب سے یہ عادت نمودار ہوئی، کبھی طمع دنیا سے، کبھی کسی بادشاہ کی خوشامد کے لیے یہ فعل سرزد ہوا، کبھی ہوائے نفس سے، یہ ایک مستقل موضوع ہے اور کافی مبسوط، جس کے لیے ایک مستقل صحبت کی ضرورت ہے۔[1] طالب علم کو اس باب میں " نزهة النظر، فتح المغيث للعراقي، فتح المغيث للسخاوی، توجيه النظر للجزائری، قواعد التحدیث، تدریب الراوی " وغیرہ کتب اصول حدیث کی طرف

← چنداں مضر نہیں، کیونکہ صحیح احادیث کی موجودگی میں ان سے استدلال کی قطعاً ضرورت نہیں اور علماء سلف نے اپنی کتب میں ان کا ضعیف اور موضوع ہونا بیان کر دیا ہے، جس کے بعد کسی طرح کا اشتباہ ممکن نہیں۔

﴿ليهلك من هلك عن بينة ويحيىٰ من حي عن بينة﴾

[1] احادیث میں وضع و تخلیق کا آغاز خلافت راشدہ کے بعد چالیس ہجری کے قریب ہوا، سب سے پہلے شیعہ نے شخصی فضائل میں احادیث وضع کیں، بعد ازاں مختلف فرق و طوائف نے اپنے اپنے دعاوی کی تائید و تصدیق میں اس عمل کو رواج دیا، جس کے اسباب مختلف رہے، بعض اسباب کا مؤلف رحمہ اللہ نے ذکر کر دیا ہے، اہل علم نے اس کے علاوہ بھی بعض اسباب وضع کا تذکرہ اپنی مؤلفات میں کیا ہے، جن میں سیاسی اختلافات، زنادقہ کی طرف سے اسلام پر طعنہ زنی، قصہ گوئی، نیکی کی ترغیب، فقہی اور کلامی اختلاف، مذہب، قبیلہ اور کسی امام کی عصبیت اور شہرت پسندی خصوصاً قابل ذکر ہیں، دیکھیں: المجروحين لابن حبان (١/ ٦٢) تدريب الراوي (١/ ٢٨٣) توضيح الأفكار (٢/ ٦٨)

توجہ کرنا چاہیے۔[1] "عجمی سازش" ایسی شر آمیز تہمت سے فن حدیث کی تاریخ یکسر خالی ہے۔

پھر وضع وتخلیق کا عمل احادیث کے مختلف ابواب میں جاری رہا ہے، جن کو سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں، موضوعات علی قاری رحمہ اللہ، الفوائد المجموعة للشوکانی رحمہ اللہ، تذکرة الموضوعات للشیخ محمد طاهر رحمہ اللہ ، بعض رسائل ابن تیمیہ رحمہ اللہ ، تمیز الطیّب من الخبیث فیما یدور علی ألسنة الناس من الحدیث [للشیخ عبدالرحمن بن علي الشیباني الأثري] وغیرہ کتب کی طرف رجوع فرمایئے،[2] ان کے ایک ایک باب دیکھئے، آپ یقین کریں گے کہ وہاں کوئی عجمی سازش ہے، نہ عربی سازش، نہ ایرانی سازش ہے، نہ چینی، وہ صرف جذبات کی

---

[1] شرح الألفیة للعراقي (ص: ۱۲۰) فتح المغیث (۱/ ۲۵۲) تدریب الراوي (۱/ ۲۷٤) نزهة النظر (ص: ۲۲۳) قواعد التحدیث (ص: ۱٤۷) توجیه النظر (۲/ ٥۷٤)

[2] موضوع احادیث کی باقاعدہ جمع وتدوین پانچویں ہجری کے آغاز میں عمل میں آئی، اس فن میں سب سے پہلی تصنیف أبو سعید محمد بن علي النقاش الحنبلي (۴۱۴ھ) کی کتاب "الموضوعات" کا ذکر ملتا ہے، دیکھیں: میزان الاعتدال (۱/ ۱۱۸) لسان المیزان (۱/ ۲۲۰)

بعد ازاں ہر دور میں موضوع احادیث کی جمع وتدوین علماء کرام کی توجہ کا مرکز رہی اور متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں، چنانچہ التذکرة في الأحادیث الموضوعات لمحمد بن طاهر المقدسی (٥۰۷) الأباطیل والمناکیر والصحاح والمشاهیر للجوزقاني (٥٤۳) الموضوعات من الأحادیث المرفوعات لابن الجوزي (٥۹۷) الموضوعات للصاغاني (٦٥۰) أحادیث القصاص لابن تیمیه (۷۲۸) الکشف الحثیث للحلبي (۸٤۱) اللآلي المصنوعه للسیوطي (۹۱۱) تنزیه الشریعة لابن عراق (۹٦۳) الأسرار المرفوعة لملا علی قاری (۱۰۱٤ھ) وغیرہا، اس فن کی امہات الکتب میں شمار کی جاتی ہیں۔

کرشمہ سازی ہے۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"میرے سامنے صالحین کی ایک جماعت ہے، جن کی پرہیز گاری پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن ان صوفی حضرات کی احادیث پر مجھے قطعاً اعتماد نہیں، وہ لوگوں کو نیک اعمال کی ترغیب کے لیے احادیث بناتے ہیں۔"[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے اہل علم کے سامنے جب ایک موضوع ذخیرہ پیش کیا گیا، تو انھوں نے اسے تلف کر دیا،[2] لیکن عجمی سازش کا نام تک نہیں لیا، بلکہ ظاہر ہے کہ حدیثیں بنانے کا کام اس دور سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، جب سے عجمی فسانہ کے مصنفوں نے اس کی ضرورت محسوس کی، مولانا عمادی اینڈ کمپنی نے تو یہ درد اور بھی دیر سے محسوس کیا۔

اس وقت تک گفتگو اس پہلو پر تھی کہ آیا عجمی سازش کے مدّعیوں نے اس افسانہ کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ایسا ثبوت مہیا کیا، جس سے یہ افسانہ ثابت ہو سکے

---

[1] امام مسلم رحمہ اللہ نے مقدمہ (ص: ۱۲) میں صالحین اور زہاد سے روایت کے بارے میں دو قول ذکر کیے ہیں:

① امام ابو الزناد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أدركت بالمدينة مائة كلهم مأمون ما يؤخذ عنهم الحديث، يقال: ليس من أهله "

② یحییٰ بن سعید قطان فرماتے ہیں:

" لم نر الصالحين في شيء أكذب منهم في الحديث "

نیز امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" والواضعون أقسام: أعظمهم ضررا قوم ينسبون إلى الزهد، وضعوه حسبة في زعمهم فقبلت موضوعاتهم ثقة بهم وجوزت الكرامية الوضع في الترغيب والترهيب (التقريب للنووي مع شرحه تدريب الراوي: ۱/ ۲۸۳)

[2] مقدمہ صحیح مسلم (ص: ۱۲)

اور آیا وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے، جو یہ دعویٰ ثابت کرنے کے لیے قانوناً لازم تھیں؟

فن حدیث مضامین کے لحاظ سے:

اب اس پہلو پر غور فرمایئے کہ فن حدیث میں اندورنی طور پر بھی کوئی ایسی شہادت یا قرینہ مل سکتا ہے، جس کی بنا پر اسے عجمی سازش کہا جا سکے؟ اگر یہ صورت بھی ثابت ہو سکے تو سوچا جا سکتا ہے کہ شاید اس دعویٰ میں کوئی جان ہو اور عجمی سازش کے مدّعیوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے۔

یہ پہلو جس قدر دلچسپ ہے، اسی قدر مبسوط بھی ہے، ضرورت ہے کہ دفاتر سنت کے ایک ایک باب پر اس نگاہ سے غور کیا جائے کہ شکست خوردہ عجمیوں کو ان تعلیمات سے کیا فائدہ ملا؟ اگر فی الواقع یہاں کوئی سازش موجود تھی، عجمی امراء نے سیاسی انتقام کے لیے ان علماء کو خریدا تھا، ان سے پوری ڈیڑھ صدی کام لیا، غالباً اس عرصہ میں ان علما کو کروڑوں روپیہ دیا ہوگا، ڈیڑھ دو سو سال کی محنت، لاکھوں آدمی کام کرنے والے، ان پر کروڑوں روپیہ خرچ ہونا بالکل قدرتی ہے۔

اس صحبت میں اس پہلو پر استقصاء سے بحث کرنا مشکل ہے، میں صرف ''الجامع الصحیح للإمام محمد بن إسماعیل بخاری رحمہ اللہ'' کو لیتا ہوں، اس میں شروع سے لے کر باب الرد علی الجهمیه تک امہات الأبواب قریباً ۸۴ ہیں:[1]

كتاب الإيمان، كتاب العلم، كتاب الوضوء، كتاب الحيض، كتاب الصلوة،

---

[1] علامہ طاہر الجزائری لکھتے ہیں:

'' بخاری میں کتب کی تعداد ایک سو کچھ ہے اور اس میں بعض نسخ کے اختلاف کے ساتھ ابواب کی تعداد تین ہزار چار سو پچاس ہے۔'' (توجيه النظر: ١/ ٢٣٤)

فؤاد عبدالباقی رحمہ اللہ کی ترقیم کے مطابق صحیح بخاری میں کتب کی تعداد ستانوے (۹۷) ہے۔ واللہ أعلم!

كتاب الأذان، كتاب الجمعه، كتاب التهجد، كتاب الجنائز، كتاب الزكاة، كتاب المناسك، كتاب الصوم، كتاب البيوع، كتاب المساقات، كتاب الشهادات، كتاب الوصايا، كتاب الجهاد، كتاب الأنبياء، كتاب المغازي، تفسير القرآن، فضائل القرآن، كتاب النكاح، كتاب الطلاق، كتاب الذبائح والصيد، كتاب الأضاحي، كتاب الطب، كتاب الأدب، كتاب الأيمان والنذور، كتاب الأحكام، كتاب التوحيد، وغیرہ موجود ہیں، ان کے درمیان چھوٹے چھوٹے ہزاروں ابواب ہیں، جن میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات ہیں۔

اسے جانے دیجئے کہ بخاری شرائط کے لحاظ سے کامیاب ہے یا ناکام، یہ حدیثیں قرآن کے مطابق ہیں یا مخالف، ان کے رجال پر آج کل بحث کہاں تک ممکن اور مناسب ہے، صرف اس نگاہ سے صرف اس چیز پر غور فرمایئے کہ عجمی امراء کو اس سارے ذخیرہ سے کیا ملا؟ وہ عجمی امراء کس قدر احمق تھے، روپیہ ان کا لگتا رہا اور کام اسلام کا ہوتا رہا، اس سازش سے نقصان عجمیوں کا ہوا یا اسلام کا؟ خاکم بدہن! فرض کیجئے کہ کسی محدث نے عجمیوں کو دو چار حدیثیں بنا بھی دی ہوں، تو اس میں خسارہ ائمہ حدیث کو ہوا یا ملوک کو؟ اور پھر ائمہ حدیث بلا کے ایماندار اور ذہین تھے کہ عجمی بادشاہوں سے کھا کر اپنے ایمان کا کام کرتے رہے، یہ سازش کیا ہوئی؟

پاسباں مل گئے، کعبے کو صنم خانے سے!

یہ تو بالکل اسی قسم کی سازش ہوئی کہ ترک چنگیز خاں سے شروع ہو کر مسلمانوں سے لڑتے رہے، لیکن ایسی سازش کی کہ پوری ترک قوم مسلمان ہو کر اسلام کی خادم ہوگئی، تمہیں معلوم ہے کہ جمع حدیث کا حکم عمر بن عبدالعزیز نے دیا[1]، کیا خلیفہ عمر بن عبدالعزیز عجمی تھے؟

---

[1] دیکھیں: صحيح البخاري (١/ ١٩٤ مع الفتح) سنن الدارمي (١/ ١٣٧)

صحیح بخاری شریف کے ان ابواب اور ان کے محتویات پر ایک غائر نظر ڈالیے، یہاں کوئی بھی حسب اطلاع ''ادارہ طلوع اسلام'' اگر سازش تھی تو عجمی بازی ہار گئے، اب تم لوگ بہت ہی عقلمند ہو کہ محدثین پر طعن کر کے جیتی ہوئی بازی ہار رہے ہو؟

سیدھی بات:

سیدھی بات یہ ہے کہ بعض احادیث تمہارے علم سے بالا ہیں، آپ انھیں سمجھ نہیں سکے، ان پر بحث کیجیے، کسی عالم سے پڑھا لیجیے، پھر بھی ذہن میں نہ آئیں، تو انکار کر دیجیے، لیکن امت کی سینکڑوں سال کی خدمات پر اپنی جہالت سے پانی نہ پھیریے، یہ بڑا قیمتی ذخیرہ ہے، اس کی صحیح قیمت جوہری ڈال سکتا ہے، تم وہ کام کرو جس کے تم اہل ہو، یہ ان کے لیے رہنے دو، جو اس کے اہل ہیں۔

ادباً گزارش:

مجھے اس تلخ نوائی پر معاف فرمایا جائے، الفاظ سخت ہیں، مگر دعویٰ یہی ہے، استعارہ یا نرمی حقیقت کو بدلنے کے مرادف ہیں، اس لیے اصلی لفظوں میں سن لیجیے، میری قطعی رائے ہے اور اس کی بناء تیس سال کا تجربہ ہے کہ تحریک انکار حجیت حدیث کے بانی بد نیت بھی ہیں اور بے دین بھی، یہ اسلام کے نام پر جو کچھ کہتے ہیں، جھوٹ ہے، یہ حضرات اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا چاہتے ہیں، معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ مناظرات اور افہام و تفہیم سے یہاں کوئی فائدہ نہیں، عوام میں یقیناً جہالت کی وجہ سے کچھ لوگ مخلص ہوں گے، لیکن اساطینِ دعوت یقیناً ایمان و دیانت کے دشمن ہیں، اور فرنگیت کے شکست خوردہ!

عجمی سازش کہاں ہے؟

ہماری تحقیق یہ ہے کہ عجمی سازش کا شکار تم لوگ ہو، مغل راج کی جگہ انگریز

راج علماءِ اسلام کو ناپسند تھا، ان لوگوں نے پوری عزیمت سے اس کی مخالفت کی، اس کا نتیجہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ حریت تھا، انگریز سمجھ گیا کہ علماء سخت جان ہیں، قوت سے نہیں دبیں گے، یہاں کامیابی کے لیے پھوٹ کا نسخہ مفید ہو سکے گا، اس لیے دو آدمی ان کی نظر میں آئے، مرحوم سرسید احمد خان علی گڑھی اور مرزا غلام احمد صاحب آں جہانی، سر سید شاید اس حد تک مخلص ہوں اور ان کا خیال دیانت داری پر مبنی ہو کہ انگریزی تہذیب کو قبول کر لینا ہی اس وقت مفید ہے، مرزا غلام احمد صاحب کے متعلق دیانت داری سے میری یہ رائے ہے کہ ان کو اسلام سے ہمدردی تھی نہ انگریز سے، وہ تاجر تھے، انھیں اسلام اور انگریز سے کاروباری انداز کی ہمدردی تھی، جس کو انھوں نے مدت العمر پوری خوبی سے نبایا۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی سادہ مزاج تھے، لیکن جاہ پسند، بڑائی کے خواہشمند، ان کے متعلق یہ رائے ان لوگوں کی ہے، جنھوں نے ان کو برسوں دیکھا، عام اہل توحید عموماً اہلحدیث خصوصاً انگریز کے سخت ترین دشمن تھے، مرزا صاحب نے سب سے پہلے اہلحدیث کو مخاطب کیا، بطور فریق ان کے مقاصد کو نقصان پہنچانے سے انگریز کی حمایت کی، اس کو فروغ ہوا اور قادیان کی دکان چمک گئی، تو عبداللہ نے اس روش پر حدیث کا انکار کیا اور اہل حدیث کو مد مقابل قرار دیا، تاکہ انگریز کی نظروں میں مقبول ہو سکے، انگریز کی ضرورت پہلے دو بزرگوں سے پوری ہو چکی تھی اور یہ مولوی عبداللہ صاحب بچارے چنداں عقلمند بھی نہ تھے، اس لئے یہ تو معلوم نہیں کہ ان کو کچھ ملا یا نہیں، لیکن حق کی مخالفت میں یہ بھی شامل ہو گئے۔

آپ کی موجودہ تحریک چار ارکان پر قائم ہے، ذہنی آوارگی، لا دینی، تاویل، انکارِ حدیث، آپ حضرات کا تصوری سلسلہ ان تین بزرگوں سے ملتا ہے، ذہنی آوارگی سرسید سے، تاویل مرزا غلام احمد صاحب سے اور انکارِ حدیث مولانا عبداللہ چکڑالوی

سے، لادینی سب میں مشترک ہے اور یہ تینوں انگریز کا شکار ہیں۔ انگریز اور اس کی سیاست کو جس آڑے وقت میں ان لوگوں نے بچایا ہے اور انگریز نے زندگی بھر جوان کی مدد کی ہے، وہ دنیا سے مخفی ہے نہ آپ سے، اگر انگریز مسلم اور عرب ہے، تو آپ عربی سازش کا شکار ہیں، اگر عجمی ہے تو آپ عجمی سازش کا شکار ہیں، واقعات اس کے شاہد ہیں۔ اگر آپ اس پر مزید شہادت چاہیں تو پیش ہوسکتی ہے، بلکہ آپ خود میرے دعویٰ کی شہادت ہیں: ﴿بل الإنسان علی نفسه بصیرة ولو ألقیٰ معاذیره﴾ ❶

---

❶ القیامة: ۱۵

عجمی سازش کا تجزیہ، واقعات کی روشنی میں

"طلوع اسلام" (جولائی ۱۹۵۷ء) کے شمارے میں مولوی ابراہیم صاحب ناگی امرتسری کا ایک سوال نما مضمون شائع ہوا، جس میں انھوں نے احادیث نبویہ کو عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیا اور سوال اٹھایا کہ آخر حدیث کی جمع و تدوین فارسی الاصل علماء ہی نے کیوں کی اور کتب صحاح کے مصنف عرب کیوں نہیں؟

چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے اس سوال کے جواب میں ماہنامہ "رحیق" (ستمبر ۱۹۵۷ء) میں مذکورہ بالا مضمون لکھا، جس میں انھوں نے مولوی ابراہیم ناگی کے اٹھائے ہوئے سوال کا اطمینان بخش جواب لکھا اور تاریخی دلائل کے ساتھ اس "سازش" کے تار و پود بکھیر دیے۔

عجمی سازش کا تجزیہ، واقعات کی روشنی میں

(منکرین حدیث کے ایک سوال کا جواب)

میری کتاب ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' پر ''طلوع اسلام'' نے جولائی ۱۹۵۷ء کے پرچے میں ''تعارفی'' نوٹ لکھا[1] اور وہ پرچہ مجھے بھی بھیج دیا، اس تقریب سے اتفاقاً ''طلوع اسلام'' کی زیارت کا موقع مل گیا۔

اپنی کتاب کے ''تعارف'' کے متعلق مجھے کچھ نہیں عرض کرنا ہے، کیونکہ تعارفی نوٹ سے ظاہر ہے کہ ''عریف'' محترم کو خود بھی معرفت حاصل نہیں ہو سکی، تو دوسروں کے تعارف کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ پھر یہ ''تعارف'' ایسی ذہنی کیفیت کا غماز ہے، جس کی بنیاد تقلیدی جمود اور گروہی عصبیت کے سوا کچھ نہیں، ان حالات میں صحیح تنقید یا تعارف کی امید ہو بھی کیسے سکتی ہے؟

ہاں اسی شمارے میں ہمارے دیرینہ محترم دوست مولوی ابراہیم صاحب ناگی امرتسری کا ایک سوال شائع ہوا ہے، جو ان کے خیال میں تاریخی ہو تو ہو، درحقیقت وہ کوئی تاریخی چیز نہیں، بلکہ وہی جدید مغالطہ ہے، جو منکرین حدیث کی اس قسم کو لگا ہے جو یورپ اور کعبہ کو بیک وقت پوجنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن ان کے ذہن کی پوری ساخت یورپین ہے، ان لوگوں کو علماء مغرب کی اکتشافیات پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے زیادہ یقین ہے، مگر اسلامی علوم سے یا بے خبر ہیں یا بدگمان! اس لیے ان کی کوشش ہے کہ اسلامی علوم کو مغربی اکتشافات کا بپتسمہ دیا جائے۔

مضمون نگار نے مسئولیت کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے اپنے طبعی

---

[1] طلوع اسلام (ص: ٦٥)

رجحانات بلکہ فیصلوں کو سوال کا رنگ دیا ہے، ورنہ دراصل وہ اسی فیصلہ کو دہرانا چاہتے ہیں، جس کی سازش غالباً کراچی "طلوع اسلام" کے دفتر میں ہوئی۔

واقع میں "عجمی سازش" کوئی حقیقت نہیں اور اس سلسلے کے سارے استدلال کی بنیاد چند سلبی اوہام پر ہے اور معلوم ہے کہ منفی قرائن سے کوئی ایجابی حقیقت ثابت نہیں کی جا سکتی اور عقل و دانش کی دنیا میں زلفوں کی زیبائش کا کام استرے اور بلیڈ سے نہیں لیا جاتا۔

مولوی صاحب کی پوری عمر عدالت کی کرسی پر بسر ہوئی ہے، ان کی زندگی کے قیمتی لمحات انگریزی قانون کی خدمت اور مغربی اندازِ فکر کی نذر ہوئے ہیں، اس لئے سوچنے کا وہی طریق محترم کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔

سوال:

سوال جو پیدا کیا گیا ہے، مختصراً صرف اتنا ہے کہ

"حدیث کی تدوین فارسی الاصل علماء نے کیوں کی اور کتب صحاح کے مصنف عرب کیوں نہیں؟"

طلوع اسلام کا ادارہ بے تکلف اس کا جواب عنایت فرما دیتا ہے کہ یہ عجمی سازش کا نتیجہ ہے۔ ہم جواب میں اختصار ہی سے ادباً گزارش کر دیتے ہیں کہ اس عجمی سازش کا سراغ بھی شکر ہے کہ عجمیوں ہی نے لگایا ہے اور بہت ممکن ہے کہ سراغ رسانی بھی کسی عجمی سازش ہی کا اثر ہو۔ ضرورت ہے کہ کچھ اور عجمی مکتشفین کی تلاش کی جائے، شائد اس سازش میں ہی کوئی سازش ہو!

نیا جال:

مگر اس مختصر سے سوال کو مولانا ابراہیم نے "طلوع اسلام" کے چھ صفحات پر

پھیلایا ہے۔[1] عرب کا جغرافیہ بیان فرماتے ہوئے ایک مفروضہ مرتب فرمایا کہ ایرانیوں کو عربوں سے عداوت تھی، جس کی بنا پر انھوں نے عربی علوم کی خدمت کا ذمہ لے لیا۔

تاریخی مغالطہ:

پھر اس عداوت پر فردوسی کے دو شعروں سے استدلال فرمایا، حالانکہ فردوسی کی شاعری کے سوا اس میں کوئی تاریخی حقیقت نہیں، فردوسی کا تصور ہی فارس کی فتوحات سے برسوں پہلے کا ہے۔ فارس کی فتوحات فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئیں، فردوسی کے اشعار کسریٰ کی زبان سے ہیں، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی گرامی نامہ کے تاثرات کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ پس موصوف کا یہ ارشاد کہ

> ''مفتوح ہونے کے بعد بھی عربوں سے اپنی قلبی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا، جو ہزار سال سے فضائے عالم میں گونج رہا ہے''۔

تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی خطوط صلح حدیبیہ کے بعد لکھے اور یہ اندازاً ۶، ۷ ھ کے قریب ہوں گے، اس وقت فارس کی فتح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انداز ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کسی بہت بڑے شکار کے لیے جال پھیلا رہے ہیں، مگر ''عنقا را بلند است آشیانہ''[2] یہ تجربہ شاید یہاں کامیاب نہ ہو!

جزیرۃ العرب:

موصوف کا یہ ارشاد ''اس خطہ ارض کا کوئی نام ہی نہ تھا۔'' بھی کوئی تاریخی حقیقت نہیں رکھتا، جناب نے خود اسے جزیرۃ العرب سے تعبیر فرمایا ہے، عرب اول

---

[1] طلوع اسلام (ص: ۷۴-۷۹، جولائی ۱۹۵۷)

[2] عنقا کا آشیانہ بلند ہے!

اپنے اشعار میں اس کے مختلف حصوں کے کئی نام ذکر کرتے ہیں، نجد، تہامہ، حجاز، عراق، عسیر، بحرین وغیرہ اسی جزیرہ کے مختلف حصوں کے نام ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ موصوف ایسے علم دوست کو اپنے اس ارشاد پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔﴿ واد غیر ذی زرع ﴾ [1] صرف بلد الحرام اور اس کے اطراف کو فرمایا گیا ہے، ورنہ عرب کے بعض حصے کافی زرخیز ہیں۔

محترم! پنشن مل چکی ہے، دنیا کے دھندے چھوڑیے، سنت کے مطابق حج فرمایئے، وادی فاطمہ، طائف، مدینہ منورہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ پورا ملک ﴿واد غیر ذی زرع ﴾ نہیں ہے، یہ حقائق کی تعبیر حقیقت کے خلاف فرمائی گئی ہے۔ عربوں کی تاجرانہ یورشوں پر غور فرمائیں، عرب تاجر شام، عراق اور ایران کے لیے سفر کرتے تھے، عرب کی منڈیوں کی فہرست الأغاني اور العمده وغیرہ میں پڑھیں۔ [2] عربوں کے تعلقات کم و بیش سب ملکوں سے تھے، جب فتوحات کا دور آیا، تو عربوں نے ان تمام جغرافیائی حدود کو عبور کر لیا اور چند سالوں میں ایران کی فتح مکمل ہوگئی۔

کیا عربوں نے آسانی سے قرآن کو قبول کر لیا؟

مولانا کا یہ ارشاد:

"قرآنا عربيا" کی تعلیم عربی بولنے والوں کو نئی معلوم نہ ہوئی اور ان ممالک میں اسلام بآسانی پھیل گیا"

بھی تاریخی حقائق کے خلاف ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے قریباً پچیس سال عرب ہی میں صرف ہوئے اور آپ ﷺ کے آخری عہد میں یمن میں

---

[1] إبراهيم: ٣٧

[2] الأغاني (٣/ ٢٠، ٤٨، ٨٤) العمدة (ص: ١٨٥)

فتنۂ ارتداد رونما ہوگیا اور مسیلمہ، اسود اور سجاح کو خاصی کامیابی بھی ہوگئی۔ علاوہ ازیں کیا یہ واقعہ نہیں کہ عرب کس طرح توحید سے گھبراتے تھے اور اس دعوت کو ﴿ إن هذا إلا اختلاق﴾ [1] سے تعبیر کرتے اور ﴿ إن هذا لشيء عجاب ﴾ [2] کہتے تھے؟

پھر بدر، حنین، خندق اور موتہ وغیرہ قریباً ۲۳ جنگیں اسی سلسلے میں لڑنی پڑیں۔

جب واقعات یہ ہیں، تو فرمایئے آسانی سے کس طرح قبول کیا ہے؟ سارے مصائب کا سرچشمہ تو عرب ہی تھے، سنت کی تاریخی حیثیت بھی اگر آپ لوگوں کو گوارا نہیں، تو یہ قرآن ہی کی شہادت ہے۔

ایران میں اسلام کی حیثیت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمادی الاولی ۱۳ھ میں خلافت کی ذمہ داری سنبھالی، [3] ۱۶ھ میں فتوحات کا رخ فارس کی طرف ہوا، اسی سال جلولاء کی جنگ میں یزدجرد کو شکست ہوئی اور وہ رے میں چلا گیا، [4] یہ سلسلہ قریباً ۲۳ھ میں ختم ہوا۔ ان جنگی مہمات میں اسلام کی اشاعت بھی ہوتی رہی اور فتوحات کا سیلاب بھی بڑھتا گیا، سعید روحیں اسلام سے متاثر ہوئیں، مگر ان فتوحات میں کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں چلتا، جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ایرانی عوام اسلامی حکومت کو ناپسند کرتے ہیں۔

شاہی خاندان اور ان کی وظیفہ خور فوجیں لڑتی رہیں، مگر ایرانی عوام میں ان فتوحات کے خلاف کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ اس بنا پر موصوف کے اس ارشاد:

”برعکس اس کے ایرانی ضمیر اسلام اور عربی تہذیب قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔“

---

[1] سورۃ ص: ۷

[2] سورۃ ص: ۵

[3] الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۳/ ۲۷۴)

[4] الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۵/ ۸۹) تاریخ الطبري (۲/ ۴۶۸)

کی تاریخی بنیاد تو کوئی نہیں ہے۔

اسلامی حکومت ایرانیوں کے لیے رحمت تھی:

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایرانی مسلمانوں سے کیسے ناخوش ہو سکتے تھے؟ جب کہ ایرانی حکومت نوشیرواں کے بعد انحطاط کی طرف جا رہی تھی اور اس کے نظام میں اضمحلال پیدا ہو چکا تھا، رعایا میں بے اطمینانی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہاں رعایا کے حقوق کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اس معاملہ میں مسلم و غیر مسلم میں بھی کوئی امتیاز نہیں تھا۔ جہاں تک حفظ حقوق اور عدل و انصاف کا تعلق ہے، اسلامی حکومت اس کی پوری طرح پابند تھی، یہی وجہ تھی کہ اسلامی عساکر نے جس طرف رخ کیا، عوام استقبال کے لیے حاضر تھے۔ ان حالات میں کسی عجمی سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عجمی سازش بازوں کی کوتاہی نظر:

''عجمی سازش'' کا ہوّا دکھانے والوں سے اسلامی تاریخ کے دو اہم مسئلے نظر انداز ہو گئے:

اول : اسلامی نظام حکومت میں عدل و انصاف اور رعیت نوازی کا جذبہ، حکومت کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو، رعیت کو آرام اور معاشی آسانیاں مہیا ہو جائیں، تو کسی سازش یا انقلاب کا خطرہ ہی باقی نہیں رہتا۔

دوم : اگر کسی ملک کی فتح اور ان کے نظام زندگی میں انقلاب سازشوں کا موجب ہو سکتا ہے، تو ''عربی سازش'' کا ہوّا بھی تیار ہو جانا چاہیے، کیونکہ جہاں تک پرانے مذہب کی تباہی، قومی رسوم اور عادات کی بربادی کا تعلق ہے، عربوں پر بھی اسلام نے رحم نہیں کیا ہے، بلکہ پوری تہذیب کو تباہ کر کے رکھ دیا، بت گرائے، بت

خانے تباہ کیے اور جاہلیت کی ایک ایک چیز کو ختم کر دیا، پوری زندگی کو جاہلی رسوم سے نکھار کر رکھ دیا۔ تعجب ہے کہ ''عربی سازش'' کے لیے ہمارے اہل قرآن مفکرین نے آج کل کیوں تجویز نہیں سوچی؟!

پھر وہی قصہ تدوین!

موصوف نے اپنے سوال کو ''مدلل'' کرنے کے لیے وہی پرانی بات تدوین حدیث کی دہرائی ہے، جس کے جواب میں معتدبہ ذخیرہ اہل سنت و حدیث نے جمع کر دیا ہے اور جس کو مُسکت سمجھ کر ہی منکرین حدیث نے یہ نئے نئے جال بچھانے شروع کیے ہیں۔ بہر کیف مولوی ابراہیم صاحب اس سے یہ ثابت فرمانا چاہتے ہیں کہ تدوین یا جمع حدیث کا وجود تیسری صدی سے پہلے نہ تھا، مگر یہاں بھی موصوف نے اپنا مقدمہ بے حد تشنہ رکھا اور ان ائمہ کی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو نظر انداز فرمایا ہے، جو ان کے خلاف جاتے ہیں، اگر ان زاویوں پر نظر رکھتے، تو ایسا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

ائمہ حدیث کے دور میں ایرانی:

فارسی حکومت تو ۲۳ھ تک پوری طرح کچل کر رکھ دی گئی تھی، آنحضرت ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی: '' إذا هلك كسرىٰ فلا كسرىٰ بعده ''[1] آج تک پوری شان سے اپنی صداقت کا اعلان کر رہا ہے۔ جیسے ہی محمد ﷺ کے غلاموں نے فارسی حکومت کو ختم کر دیا، اس کے بعد کوئی کسروی حکومت برسرِ اقتدار نہیں آ سکی۔ کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ اس پورے پونے دو سو سال میں ایرانی حکومت نے سر اٹھایا ہو؟ تیسری

[1] صحيح البخاري: كتاب الخمس، باب قول النبي ﷺ: " أحلت لكم الغنائم "، رقم الحديث (٢٩٥٢) صحيح مسلم: كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل ......، رقم الحديث (٢٩١٩)

صدی ہجری میں جسے تدوین حدیث کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، کیا فارس میں کوئی ایسی طاقت موجود تھی، جو اس ''عجمی سازش'' کی سرپرستی کر سکے؟ تاریخ کا ایک طالب علم اس کا جواب حتمی نفی میں دے گا۔

یہ پونے دوسو سال جب کہ خود عرب میں شیعہ سنّی کارزار شروع ہو چکا تھا، خوارج اور نواصب دنیا کے سامنے آ چکے تھے، آیا فارسیوں نے بھی کوئی سازش کی؟ پھر ایک ظنی مفروضہ کی بنا پر ائمہ حدیث کو بدنام کرنا، دانشمندی ہے نہ دیانت داری......!

ہم اس دوسو سال کے عرصہ میں فارس کے ساحل کو اس قدر پر سکون اور مطمئن پاتے ہیں، جس کی نظیر دنیا میں کم ملے گی۔ پھر کوئی پڑھا لکھا آدمی ''عجمی سازش'' کو کیوں مان لے؟ حقیقت یہ ہے کہ عجمی سازش کی سازش صرف ''طلوع اسلام'' کے دفتر میں ہے، واقعات میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

عباسی دور حکومت میں فارسی اثرات:

منکرین حدیث کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث سازی کی سازش عباسی حکومت میں ہوئی۔ مگر یہ معلوم ہے کہ عباسی حکومت کی تاسیس ابو العباس سفاح نے ۱۳۶ھ میں رکھی،[1] فارسی عناصر کا اقتدار برامکہ کے دور سے ہوا۔ تاریخ کے طالب علم کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابو العباس سفاح سے ہارون الرشید تک تقریباً چھ خلیفے ہوئے ہیں، اس وقت تک تو دربار میں فارسی اقتدار نہیں تھا، کیونکہ برامکہ کا اقتدار مامون کی خلافت میں ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جسے فارسی اقتدار کے

---

[1] ابو العباس السفاح ۱۰۵ھ کو پیدا ہوا، بعدازاں ستائیس سال کی عمر میں ۱۳۲ھ کو اس کی بیعت کی گئی اور ۱۳۶ھ کو بعمر ۳۳ سال اس نے وفات پائی۔

دیکھیں: تاریخ بغداد (۱۰/ ٤٦) تاریخ دمشق (۳۲/ ۲۷٦) سیر أعلام النبلاء (٦/ ۷۷)

شذرات الذهب (۱/ ۱۸۳)

عروج و زوال کا دور کہنا چاہیے، لیکن یہاں ''عجمی سازش'' کا نام تک ناپید ہے!

مامون سے پہلے عباسی حکومت کے کسی سربراہ کا نام لیجیے، جس نے اس سازش کی سرپرستی کی ہو، ان علماء کے نام لیجیے، جو اس سازش میں شریک ہوئے ہوں، جب تک مثبت طور پر آپ کا کیس درست نہ ہو، صرف اس قسم کے منفی سوالات کہ فارسیوں نے حدیث کی خدمت کیوں کی؟ عربوں نے کیوں نہ کی؟ ایسی چیزوں سے نہ کوئی دعویٰ ثابت ہوسکتا ہے اور نہ کوئی عدالت میں ان سلبی قرائن کی بنا پر ملزم کو سزا دی جا سکتی ہے۔ پھر یہ ثابت کیجیے کہ کسی صاحب علم و تحقیق نے اس سازش کی نشاندہی کی ہو، آیا کوئی تاریخی شہادت ایسی پیش ہوسکتی ہے؟ غالباً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

دراصل قصہ تو اتنا ہے کہ مامون رشید کو ہارون نے اپنی حکومت سے ایک تہائی حصہ دے دیا تھا، باقی دونوں بھائیوں کو بھی حسبِ حصہ ملک دے دیا، مگر خلافت اس کو دی، جو زبیدہ کے بطن سے تھا۔ بھائیوں کی بن نہ آئی، مامون کی جب ۱۹۸ھ میں بیعت ہوئی، [1] تو اس نے اپنی حمایت میں فضل بن سہل ایسے فارسی الاصل اور شیعی مدبّر کو وزارت کا منصب تفویض کیا۔ [2] پھر واقعہ یہ ہے کہ مامون کی خلافت میں تو ائمہ حدیث پر ایک مصیبت مسلط رہی، ان میں اکثر کھلے طور پر ظلم کا تختۂ مشق بنے۔ سوال یہ ہے کہ اس سازش کی سرپرستی کس نے کی؟ مامون نے یا فضل بن سہل نے؟ اور کس محدث و امام سے مل کر یہ سازش وجود میں آئی؟ اس کی شہادت تاریخ سے ہونی چاہیے، اوہام سے نہیں۔

اور یہاں بحمداللہ یہ حالت ہے کہ تاریخ بالکلیہ ساکت ہے، اس عہد کی تاریخ میں حدیث سازی کے متعلق کسی سازش کا ذکر آپ کو نہیں ملے گا۔

---

[1] تاریخ خليفة بن خياط (ص: ١٤٠)

[2] دیکھیں: تاريخ بغداد (١٢/ ٣٣٩)

بقول سائل سازش عباسی حکومت میں ہوئی، لیکن عباسی حکومت خلیفہ مستعصم باللہ (۶۵۶ھ) پر ختم ہوگئی، ابن علقمی رافضی کی نمک حرامی سے یہ حکومت صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی۔ اس کے بعد تاتاری برسر اقتدار آئے، تو عباسیوں کے منصب ترکوں کی طرف منتقل ہوئے اور ترکی اقتدار کو برطانوی حکومت نے باقی یورپین طاقتوں کے تعاون سے ختم کیا۔ اس صدیوں کی مسافت میں اس "فارسی سازش" کا پتہ یا شبہ "ادارہ طلوع اسلام" کی راہنمائی میں صرف مولانا ابراہیم صاحب ناگی کو کیوں ہوا؟ یہ مقطوع روایت ظنی نہیں جو کئی صدیاں عدم کی نذر رہی؟!

عجیب بات ہے کہ یہ اوہام حقیقت ثابتہ بن گئے اور حدیث بے چاری مشتبہ ہوگئی کہ اس کی تدوین پہلی صدی کی بجائے دوسری صدی میں کیوں ہوئی؟ "عجمی سازش" کا شاخسانہ جسے دوسری صدی میں ہونا چاہیے تھا، چودھویں صدی میں ہوا۔ یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فطری اقتضاء اور قدرتی توقع کے مطابق جو ہونا چاہیے تھا، وہ کیوں نہیں ہوا؟ جو نہیں ہونا چاہیے تھا، وہ کس طرح ہوگیا؟!

مشکلے دارم زدانش مند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر مے کنند [1]

مولانا نے بجا ارشاد فرمایا:

"آج تک بھی یہ حال ہے کہ عربی الفاظ ہماری زبان سے چن چن کر خارج کیے جارہے ہیں"۔

ادباً گزارش ہے کہ یہ مصطفیٰ کمال کی حماقت تھی کہ اس نے اسلامی وحدت کی پیامبر عربی زبان سے یہ ظلم روا رکھا اور رداءِ اسلام کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ لیکن اس قتل عام کا کیا علاج ہے کہ ہم نے پوری زبان سے عداوت بپا کر لی؟ نماز تک اردو میں

---

[1] دانش مند سے باز پرس کرنا مشکل ہے، توبہ کی فرمائش کرنے والا خود کیوں کم ہی توبہ کرتا ہے؟

شروع ہوگئی۔ مولانا ناگی صاحب مجھ سے اتفاق فرمائیں گے کہ یہ ساری شرارت ''عجمی سازش'' کی پیداوار ہے۔

عباسی حکومت کی بربادی عجمی سازش کا نتیجہ نہیں!

موصوف نے ایرانی آویزشوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے ابن علقمی اور نصیرالدین طوسی کی شر پسندانہ کارگزاریوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یقیناً یہ ایک دل گداز سانحہ ہے، اور یہ ایسا ہی ہیبت ناک منظر تھا، جس طرح ۱۹۴۷ء کا قتل عام ہماری نگاہوں نے دیکھا۔ لیکن اسے ''عجمی سازش'' یا فارسیوں کے سیاسی انتقام کا نتیجہ سمجھنا غلط ہے، یہ شیعہ سنّی اختلافات کا نتیجہ تھا۔ اس میں ایرانیوں کا کوئی قصور نہ تھا، حملہ آور ترک تھے، حکومت عباسیہ مظالم کا تختۂ مشق تھی اور یہی حکومت تھی، جسے منکرین حدیث عجمی سازش کے لیے بدنام کرتے ہیں۔ اگر منکرین حدیث کا یہ نظریہ درست ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ عجمیوں نے اپنی سازشوں سے اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کو برباد کر دیا۔ اس کے علاوہ نہ ابن علقمی ایرانی تھا، نہ طوسی! یہ دوسری بات ہے کہ ہر شیعہ کو ایرانی تصور کرلیا جائے، اگر یہ اصطلاح متعین کر لی جائے، تو شاید اہل قرآن حضرات پاکستان کی ساخت اور ملک کی تقسیم کو بھی عجمی سازش کہہ دیں!!

مولانا غور کریں گے تو میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ بغداد کی تباہی کو شیعی سازش تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اسے ایرانی یا فارسی سازش کہنا تاریخی لغزش ہوگی۔ اسی طرح قرامطہ کی تاریخ حسب ارشاد مولانا ''خون سے بھری ہوئی ہے''، لیکن عجمی شاہی خاندان اور ایران کے سابقہ حکمرانوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ یہ خلاف اسلام نظریات پیدا ہوتے رہے اور اسلام کی صحیح تعلیمات سے ٹکراتے رہے، یہ گاڑی صدیوں زمین کی سطح پر چلتی رہی، لیکن اسے عجمی سازش کہنا ایک مضحکہ خیز مغالطہ ہوگا۔

ہاں!

ایک دفعہ پھر ذہن نشین کر لیجیے تاریخ کی یہ بیّن شہادت کہ فارسی حکومت نے اپنی تباہی کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی ہنگامہ نہیں اٹھایا اور یزدجرد کے قتل کے بعد فارس کے حاکم خاندان میں یہ سکت ہی کب رہ گئی تھی کہ وہ کوئی سازش کر سکیں؟ باقی رہے عوام تو انھیں اسلام کے نظامِ عدل نے اس قدر مطمئن کر دیا تھا کہ اسلام کے آتے ہی وہ آرام کی نیند سو گئے، انھیں یہ ضرورت ہی نہ رہی کہ وہ سازش کریں۔

انمل بے جوڑ:

میں نے سوال کے ابتدائی اجزاء کی تنقید میں ناظرین کا بہت وقت لے لیا، اس لیے کہ سائل محترم نے اسے خواہ مخواہ ایک تاریخی حقیقت قرار دے کر اس پر زور قلم صرف فرمایا، حالانکہ جس طرح عرب جغرافیہ کا ذکر یہاں بالکل بے جوڑ ہے، اسی طرح حدیث کی تدوین میں عجمی سازش کی کڑی تاریخی لحاظ سے قطعاً بے جوڑ ہے اور تاریخ کی عظیم الشان غلطی یا بہت بڑا افتراء ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ روایت حدیث میں غلطیاں ہوئیں، مگر یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ ان کی نشاندہی بھی محقق محدثین ہی نے فرما دی اور احادیث کی تصحیح کے لیے کئی علوم وضع فرمائے، جن کی روشنی میں حدیث کی تنقید ایک علمی مشغلہ ہے لیکن اسے عجمی سازش کہنا بڑا ہی بدبودار جھوٹ ہے، ولا یفلح الکاذبون!

اصحاب صحاح کا تذکرہ:

مصنفین صحاح کا تذکرہ چھیڑ کر مولانا موصوف نے سوال کو بے ضرورت لمبا بھی کیا ہے اور الجھا بھی دیا ہے، لیکن میں سابقہ عمومی بحث کے بعد اب کسی تفصیلی

تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مولانا کا کیس بے حد کمزور ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا بہت سا حصہ عدل و انصاف کی سرپرستی میں گزرا ہے، وہ یقین کرے گا کہ اس بحث میں کوئی ایجابی چیز موجود نہیں۔ پھر تیرہ سو سال کا تسلسل اور تاریخ کا تواتر بھی اس تہمت کے خلاف ہے، کیونکہ جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا گیا ہے کہ ان تیرہ صدیوں میں ''عجمی سازش'' کا شبہ تک کسی کو نہیں گزرا۔

چند نکات:

میں ائمہ حدیث اور مصنفین صحاح کے متعلق صرف چند نکات عرض کرنا چاہتا ہوں:

① ان سب حضرات نے فن حدیث کی خدمت کا مشغلہ عموماً بچپن میں شروع کیا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ دس سال کی عمر میں حفظ و کتابت حدیث میں مشغول ہوگئے۔[1] معلوم ہے یہ عمر سازشوں کے لیے قطعاً غیر موزوں ہے۔ امام مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ کا بھی یہی حال ہے، ان کے تذکرے کتب رجال میں ملاحظہ فرمائیں۔ ناظرین کے ملال طبع کا خطرہ نہ ہوتا، تو میں اس دلچسپ حصہ کو بسط سے لکھتا، یہ تذکرہ ''عجمی سازش'' کے فسانہ کو قطعاً ختم کر دیتا ہے۔[2]

(ملاحظہ ہو: مقدمہ فتح الباری: ۲/ ۱۹۳ و مقدمہ تحفۃ الأحوذی وغیرہ)

② ان حضرات کا میل ملاپ پوری عمر علماء ہی سے رہا، عملی سیاسیات میں کبھی حصہ نہیں لیا، بلکہ عمر بھر شاہی درباروں سے بھاگتے رہے۔ جب ان کو سازش کے بغیر بھی حکومت مل سکتی تھی، تو سازش سے کیا فائدہ؟ ہارون رشید اور امام مالک، منصور اور امام ابوحنیفہ، امام احمد اور خلیفہ مامون کے تعلقات اس کے شاہد ہیں، امام بخاری اور

---

[1] هدي الساري (ص: ٤٧٨)

[2] هدي الساري (ص: ٤٧٩) مقدمة تحفة الأحوذي (ص: ٤٢٦)

خالد بن احمد ذہلی والیِ بخارئ میں مناقشہ اسی بنا پر ہوا کہ وہ درباری اعزاز کے لیے تیار نہ تھے، والیِ بخارئ کو یہ ناگوار محسوس ہوئے، تو اس نے انھیں شہر سے نکال دیا۔ جو شخص والی کی خواہش کے مطابق منصب نہیں لینا چاہتا، وہ اس کے لیے سازش کیوں کرے گا؟ (هدي الساري مقدمه فتح الباري: ۲/ ۲۰۵)

③ ائمہ سنت اور ائمہ حدیث کے اساتذہ اور تلامذہ کی فہرستیں رجال کی کتابوں میں ملاحظہ فرمائیں، ان میں تنقید بے شک ہے، وہ بڑی بے جگری سے ظلم بھی برداشت کرتے ہیں، لیکن ان کے مزاج میں کانسی پریسی (Conspiracy) نہیں۔ ایک واقعہ پوری تاریخ میں نہیں ملے گا، جس سے یہ محسوس ہو کہ ان بزرگوں نے کبھی کوئی سازش کی ہو۔

④ صحاح ستہ کے ایک ایک باب کو پڑھ جائیں، آپ احادیث کے مضامین پر تاریخی اعتراض کر سکتے ہیں، اخلاقی شبہات کر سکتے ہیں، مگر وہاں سیاسی سازشوں کے لیے کوئی مواد نہیں ملے گا، وہاں سب سے زیادہ یہی ملے گا:

"لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"[1]

یقیناً اسی تعلیم میں بغاوت کے جراثیم پائے جاتے ہیں، لیکن یہ بغاوت اسلامی تعلیمات کی جان ہے، ﴿أطيعوا الله وأطيعوا الرسول﴾[2] میں جابجا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سائل محترم نے امام بخاری رحمہ اللہ کو ایران کے اس حصہ کا متوطن قرار دیا

---

❶ المعجم الكبير للطبراني (۱۸/ ۱۷۰) اسی معنی میں دیگر الفاظ کے ساتھ یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (۱/ ۱۲۹) صحیح ابن حبان (۱۰/ ٤۳۰)، نیز دیکھیں: صحیح الجامع للألباني، برقم (۷۵۲۰)

❷ النساء: ۵۹

ہے، جہاں سنّی آباد تھے۔ سائل کے وہم کا اس میں یہی جواب موجود ہے، سازشی وہ ذہن تھا جس کی ترجمانی ابن علقمی اور طوسی کرتے تھے، سنّی ذہن نے کبھی سازش نہیں کی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے متعلق مولانا کا یہ فیصلہ کہ

''انھوں نے انتخاب کے بعد باقی احادیث کو رد کر دیا۔ انھیں (امام بخاری) یہ حق حاصل تھا کہ اپنے شخصی فیصلے کے مطابق لاکھوں حدیثوں کو رد کر دیں۔''

(طلوع اسلام: ٦ جولائی ٥٧ھ)

بڑی جرأت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنے ''شخصی فیصلے'' سے ایک حدیث کو بھی رد نہیں کیا، نہ ہی وہ اس کے مجاز ہیں، بلکہ اہل علم کے طے شدہ اصولوں کی روشنی میں یہ فیصلے کیے گئے، وہ اصول آج بھی موجود ہیں، جن کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت ہے اور آج بھی ان اصولوں کی روشنی میں کسی کو جرأت ہے، تو فن حدیث اس کے لیے تیار ہے ؎

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے!

لیکن ہر ناتراشیدہ ذہن کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ طے شدہ صحیح احادیث پر خط تنسیخ کھینچنا شروع کر دے، اس قتل عام کی اجازت ان شاء اللہ قیامت تک نہیں دی جائے گی۔ ﴿ولو كره المجرمون﴾ [1]

اور یہ حدیث پر کیا موقوف ہے، کسی فن میں بھی ہر آدمی کو محاکمہ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پھر صحیح بخاری کے رد یا قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، امام بخاری رحمہ اللہ نے بہت سی کتابیں لکھیں، صحیح بخاری کی احادیث کے انتخاب اور اندراج

---

[1] الأنفال: ٨

میں انھوں نے ذہن میں کچھ خاص شرائط رکھیں، ان شرائط کو نگاہ میں رکھ کر منتخب احادیث کو بخاری میں درج فرمایا اور جو احادیث ان شرائط کے مطابق نہیں تھیں، انھیں اس کتاب میں درج نہیں فرمایا۔ سائل محترم نے بڑی جرأت فرمائی، لیکن یہ خیال نہ رہا کہ انتخاب کا نام رد کر دینا نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کی چیز لے لی گئی۔ یہ کس مسخرے نے آپ کو کہا کہ باقی احادیث امام بخاری نے رد کر دیں؟ جزء القراءة، جزء رفع اليدين، الأدب المفرد ، تاريخ صغير، تاريخ كبير وغیرہ کتب [1] اسی غیر منتخب ذخیرہ سے ماخوذ ہیں۔ مولانا! یہ جرأت؟

پر تیرے عہد سے پہلے تو یہ دستور نہ تھا

مولانا! علمی مسائل میں علمی انداز سے گفتگو ہونی چاہیے، یہ عامیانہ انداز کسی دوسری محفل کے لیے بطور امانت رکھئے اور اپنے تمام رفقاء سے عرض فرمایئے کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو سے آپ کے وقار میں اضافہ نہیں ہوگا۔ انصاف سے خود ہی غور کیجیے کہ ''ادارہ ثقافت'' کے فضلاء، مسٹر غلام احمد پرویز اور ہمچو قسم کے حضرات کو ایسے مباحث میں دخل اندازی کا کوئی حق پہنچتا بھی ہے؟

آپ نے بارہا بازار سے کتابیں خریدی ہوں گی، آپ ضرورت کی کتابیں انتخاب فرما کر خریدتے ہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ باقی ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائیں۔ یہی ذخائر ہیں، جس سے مسلم، ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی رحمہم اللہ نے اپنی شرائط اور فہم کے مطابق انتخاب فرمایا۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ سائل محترم آئندہ قلم اٹھاتے وقت اپنی علمی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھیں گے۔

---

[1] التاريخ الأوسط، خلق أفعال العباد، كتاب الضعفاء، الجامع الكبير، المسند الكبير، التفسير الكبير ، كتاب الأشربة، كتاب الهبة، أسامي الصحابة، كتاب الوحدان، كتاب المبسوط، كتاب العلل، كتاب الكنى، كتاب الفوائد (هدى الساري: ٤٩٢)

تدوین حدیث اور تاریخی لغزش:

فن حدیث تدریجی ارتقاء سے ان مراحل تک پہنچا، جہاں وہ آج ہے۔ اس وقت ان مراحل کی تفصیل پیش نظر نہیں، صرف یہ گزارش کرنا مطلوب ہے کہ تدوین کا وقت کون سا ہے؟

تدوینِ حدیث کی باضابطہ بنیاد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ (م ۱۰۱ھ) نے رکھی، ان کے حکم سے ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ (م ۱۱۷ھ) نے بحیثیت گورنر اس کا انتظام فرمایا، جس کی تعمیل ابن شہاب زہری رحمہ اللہ (م ۱۲۵ھ) نے فرمائی۔ امام زہری رحمہ اللہ کے تتبع میں دوسرے ائمہ حدیث نے احادیث جمع کرنے کی طرف توجہ فرمائی اور تمام ذخائر جو صحابہ اور کبار تابعین نے مذکّرات کی صورت میں اپنے اپنے وقت میں جمع فرمائے تھے، انھیں اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کی صورت میں تدوین کرنا شروع کیا۔ [1]

سائل محترم کو افسوس ہے کہ کتب صحاح صحابہ یا تابعین کی سرپرستی میں کیوں نہیں لکھی گئیں؟ عباسیوں کی نیم عجمی حکومت میں سنت کے یہ ذخائر کیوں تصنیف ہوئے؟ مگر مجھے افسوس ہے کہ تاریخی طور پر اس ''افسوس'' کے لیے کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی، تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ ان چھ کتابوں (صحاح ستہ) میں جو احادیث لکھی گئی ہیں، وہ دراصل ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کی ''سازش'' سے لکھی گئیں اور یہ سب کچھ بنوامیہ کی خالص عربی حکومت میں ہوا، نیم عجمی حکومت میں ان احادیث پر فقہی ابواب کا اضافہ واقع ہوا، لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، وہ ذخیرہ بالکل وہی ہے، جس کی تاسیس بلکہ ایک حد تک تکمیل عربی حکومت میں ان عرب اساطین سنت کی سرپرستی میں ہوئی۔

[1] تہذیب: جلد ۱۲، تذکرہ ابوبکر بن حزم رحمہ اللہ، مصفی: جلد ۱، جامع بیان العلم وغیرہ (مولف) جامع بیان العلم (۱/ ۱۵۵) تہذیب التہذیب (۱۲/ ۴۰)

حسب اصطلاح سائل محترم، مصنفین صحاح نے اس ''عربی سازش'' میں معقول اور خوشنما اضافہ فرمایا اور اس کی تکمیل کی اور یہ کوئی جرم نہیں، نہ ہی اس پر کسی تأسف کی ضرورت ہونی چاہیے۔

نیم عجمی حکومت کے بعض ''کارنامے'':

نیم عجمی حکومت کے سربراہ کے بعض تاریخی کارنامے جو آج تاریخ کی زینت بنے ہوئے ہیں:

① مامون نے اپنے بھائی مؤتمن کو ولی عہدی سے معزول کر کے حضرت جعفر صادق کے پوتے علی رضا کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ [1] دیکھیے عجمیت زدہ خلیفہ نے ہاشمی عربوں کے لیے جگہ خالی کر دی!

② سیاہ لباس جو نیم عجمی حکومت کا شعار تھا، اسے بدل کر سبز لباس کر دیا۔ [2]

③ اعلان کر دیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر خیر نہ کیا جائے۔ [3]

انسانی ذہن بدکتے رہتے ہیں اور مطلق العنان بادشاہوں کے خیال میں جو کچھ آئے کر گزرتے ہیں، اس میں نہ کوئی سازش ہوتی ہے نہ کوئی مشورہ۔ ائمہ حدیث اسی لیے ان درباروں سے الگ تھلگ رہ کر اسلام کی خدمت میں مشغول رہے اور بوقت ضرورت حکومت کے اعمال پر مناسب تنقید کرتے رہے۔ مصنفین صحاح کی یہ خدمت بھی اسی نوعیت کی تھی، جو انھوں نے اس دور مفاسد میں انجام دی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

افسوس ہے کہ ہم نے اس پاک باز گروہ کی مساعی جمیلہ کا احسان مند ہونے کی بجائے

---

[1] تهذيب الكمال (٢١/ ١٤٩) البداية والنهاية (١٠/ ٢٤٧)

[2] البداية لابن كثير (١٠/ ٢٤٧) (مولف)

[3] تاريخ الخلفاء (ص: ٢١٣) (مولف)

ان کو سازشی کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیا ہے، وہم وخیال سے بحث کے لیے تو بہت کچھ بنایا جا سکتا ہے، لیکن حقائق سے اس وہم پرستی کی تائید نہیں ہو سکتی، مگر آپ لوگ ہیں کہ ان اوہام کا شکار ہیں۔﴿ إن بعض الظن إثم ﴾ [1]

عباسی حکومت کے مختلف دور:

عباسی حکومت کے عروج و زوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

1. ابو العباس سفاح سے ہارون رشید تک۔
2. مامون رشید سے متوکل تک۔
3. متوکل سے مستعصم تک۔

ہارون الرشید نے زبیدہ کی منشا کے مطابق امین کو اپنا جانشین بنایا، مگر مامون نے بہت جلد اس کی جگہ سنبھالی اور امین موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اس وقت تک عباسی درباروں میں عجمی عناصر کا کوئی علمی مقام نہیں، رعایا میں عجمی عناصر کا کوئی علمی مقام نہیں، رعایا میں عجمی عنصر خلیفہ ثانی سے آ رہا تھا، لیکن ان کو سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔

گزارش یہ ہے کہ پہلا دور یعنی ابو العباس سفاح سے ہارون تک، یہ خدمت حدیث کا دور ہے، یہ عباسی دربار کا عربی دور ہے۔ مامون سے واثق تک اگر عجمی دور کہا جائے، تو یہ ائمہ حدیث کے لیے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ بعض محدثین امام احمد کی طرح اسی ابتلاء کے میدان میں آ گئے اور بعض پچھلی صفوں میں چلے گئے۔ اس وقت ائمہ حدیث مصائب میں مبتلا تھے، سازش کہاں ہوئی؟ کس سے ہوئی؟ کیا یہ سازش ان دشمنوں سے ہوئی، جو ان حضرات کو دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے؟

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ان دوستوں سے جو اصابتِ فکر سلب کر لی گئی ہے، تو یہ انکار حدیث کی سزا ہے۔ سوچتے نہیں کہ متوکل سے مستعصم تک

---

[1] الحجرات: ۱۲

عباسی حکومت کا دور انحطاط ہے، حکومت کا اخلاق بگڑ چکا تھا، بے دینی کے رجحانات روز بروز ابھر رہے تھے، اس وقت کسی سازش کا کونسا امکان تھا؟ پھر متوکل نے مامون، مستعصم اور واثق کی بد اعتدالیوں کی تلافی کے لیے امام احمد رحمہ اللہ سے بظاہر مراسم پیدا کیے، مگر یہ مراسم محض سیاسی اور سطحی تھے، ان میں خدمت دین کا جذبہ نہیں تھا۔ اس لئے امام احمد رحمہ اللہ اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے، بلکہ سابقہ تنفر بدستور قائم رہا، چنانچہ وہ متوکل کے ہاں سے کھانا تک پسند نہیں فرماتے تھے۔[1]

ٹھوس دلیل کی ضرورت:

منکرین حدیث نے ایک تہمت کا دعویٰ کیا ہے، اس کے ثبوت میں وقت اور اشخاص کے تعین کے لیے قطعی شہادت ضروری ہے، ہوا میں پتھر مارنے سے دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ تہمت بھی ان لوگوں پر لگائی گئی ہے، جن کی صداقت آج کل کی ہزار در ہزار صداقتوں پر بھاری ہے۔

میں سائل محترم سے دریافت کرتا ہوں کہ ان بدگمانیوں کے باوجود جو آپ کو امیر المحد ثین امام بخاری پر ہیں، اگر آج امام بخاری کسی معاملہ پر شہادت دیں اور اس کے خلاف مسٹر غلام احمد پرویز یا خلیفہ عبدالحکیم شہادت دیں، آپ کا عدالتی ذہن کس کو ترجیح دے گا؟

میں یقین کرتا ہوں کہ اگر سائل محترم عباسی خلافت کے مختلف ادوار پر ایک تاریخ کے طالب علم کی طرح غور فرمائیں، تو آپ کو یقین ہوگا کہ بحمداللہ اس تہمت کے عام اجزاء واضح ہو چکے ہیں۔

وطنیت کا قانون:

سائل محترم نے امام بخاری کے تذکرہ میں فرمایا:

[1] سیر أعلام النبلاء (۱۱/ ۲۷۰)

"مختصراً امام بخاری دراصل ایرانی تھے"۔

یہ درست ہے کہ امام بخاری ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو بخارا میں پیدا ہوئے، والد کا انتقال ہوا، بڑے بھائی احمد اور امام صاحب والدہ کے ہمراہ حج کے لیے تشریف لے گئے، احمد اور والدہ واپس آ گئے، امام صاحب وہیں رہے، دس سال کی عمر میں حفظ حدیث کا مشغلہ اختیار فرمایا۔ ❶

سولہ سال کی عمر میں ابن مبارک اور وکیع کے علمی ذخائر ضبط کر لئے اور اصحاب الرائے کے نظریات میں بھی مہارت پیدا کر لی۔ اس اثنا میں بھی یمن، شام، مصر، اور جزیرہ کا دو دفعہ سفر کیا۔ قضایا الصحابہ اور تاریخ ایسی مفید کتابیں لکھیں، امام ابن راہویہ کے مشورہ سے الجامع الصحیح کی تسوید شروع فرمائی۔ ❷ غرض اس کے بعد بخارا کی سکونت اختیار نہیں فرمائی۔ یہی حال عموماً باقی حضرات اصحاب صحاح کا رہا، ساری عمر سیاحی اور بادیہ پیمائی میں گزری۔ عموماً ائمہ حدیث نے درس و تدریس کے لیے عرب میں ڈیرے ڈال دیئے، کوئی ایرانی ان کے پاس نہیں آیا، ذہن بدل گئے، طرز زندگی بدل گیا، ماحول بدل گیا، ماحول کے تقاضے بدل گئے، یہ جرم البتہ قائم رہا کہ پیدائش عجم میں ہوئی تھی۔

سائل محترم فرمائیں کیا "ایرانیت" کے لیے بے شعوری کا چند روزہ قیام کافی ہے؟ یا اس کے لیے کسی اور قانون کی ضرورت ہے؟ محدثین چار سال کا قیام وطن بدلنے کے لیے کافی سمجھتے ہیں، ❸ آپ قانون دان ہیں، فرمایئے وطنیت کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟ اگر وطنیت کے لیے پیدائش کافی ہے، تو یقین فرمایئے آج دنیا میں کوئی

---

❶ هدي الساري (۱/ ۱۹۲) طبعه منيريه۔ (مؤلف) هدي الساری (ص: ٤٧٧)

❷ هدي الساري (ص: ٤٧٨)

❸ تدريب الراوي (۲/ ۳۸٥)

عرب نہیں، موجودہ عرب دنیا میں اموی، عباسی، ہاشمی وغیرہ سب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، جن کی پیدائش مشہور قول کے مطابق فلسطین میں ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود نینوا میں پیدا ہوئے، اس کے بعد عرب کی رہائش اختیار فرمائی، محدثین جو ایران میں پیدا ہوئے، عموماً ان حضرات نے بالآخر رہائش عرب ممالک میں اختیار فرمائی، اب بخاری اور ائمہ حدیث رحمہم اللہ کو ایران بھیجنے کے لیے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو عرب بنانے کے لیے قانون بنایئے، اس کام کے لیے صرف قلم کی جنبش کافی نہ ہوگی۔

سائل محترم کے خیال کے مطابق تمام محدثین کو لاٹھی کے زور سے ایرانی بنایا گیا، تو کشمیر میں نہرو اور اس کے آباؤ اجداد کی وطنیت بھی صحیح ہوگی، کشمیر کا مسئلہ اور بھی لاینحل ہو جائے گا۔ خدا کے لیے عقل کے ناخن لیجئے اور یقین فرمایئے کہ ائمہ محدثین رحمہم اللہ اکثر عرب ہیں، ان میں بہت کم عجمی ہیں اور آپ کا تاریخی سوال قطعی بے محل ہے۔

موطا امام مالک کی مرفوع حدیثیں صحیح بخاری میں موجود ہیں:

اصل سوال کی طرف توجہ سے پہلے مناسب ہے کہ موطأ کے متعلق مولانا کا شبہ دور ہو جائے۔ موطأ چونکہ بقول سائل محترم ایک عرب امام کی تصنیف ہے، اس کی احادیث سائل محترم کے رفقا قبول فرمائیں، تو بخاری کے متعلق بہت سے شبہات دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ موطأ قریباً صحیح بخاری میں آ گیا ہے، کچھ آثار رہ جائیں گے، احادیث آ جائیں گی۔

موطأ صحاح ستہ میں داخل ہے:

یہ آپ کو کس نے کہا کہ موطا صحاح میں شامل نہیں؟ آج کل اہلحدیث مدارس میں موطأ ہی پڑھایا جا رہا ہے۔ نصاب میں اختلاف ہوتا ہے، اساتذہ اپنے اپنے

نقطۂ نگاہ سے بعض کتابوں کو شامل کر لیتے ہیں، بعض کتابوں کو نصاب سے نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ رائے کا اختلاف ہے، جو آج بھی موجود ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

نہ شامل کرنے والوں کا خیال ہے کہ **موطأ** حدیث سے زیادہ فقہ کی کتاب ہے، اس میں فقہ مالکی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور اس کے ساتھ صحابہ اور تابعین کے آثار ہیں، مرفوع احادیث پانچ چھ سو کے قریب ہوں گی، باقی مراسیل یا موقوفات اور اہل مدینہ کا عمل ہے۔ جسے امام مالک رحمہ اللہ آراء رجال سے زیادہ پسند فرماتے تھے، اس لئے انھوں نے **موطأ** کو صحاح میں نہیں شامل کیا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''چونکہ مالک در احکام فقہ کتاب مرتب ساخت و نام او موطأ نہاد''

امام مالک رحمہ اللہ نے فقہی احکام میں ایک کتاب مرتب کی اور اس کا نام ''مؤطا'' رکھا۔

مسوی میں فرماتے ہیں:

''إن علم الفقه أشرف العلوم و أوسعها و كتاب الموطأ أصح كتب الفقه وأشهرها وأقدمها وأجمعها'' ؎

سائل محترم جب سے حدیث اور محدثین سے ناراض ہوئے ہیں، انھوں نے بالاستیعاب کتب احادیث کا مطالعہ ترک کر دیا ہے، صرف قابل اعتراض حصے ان کی نظر میں رہ گئے، ورنہ خود فیصلہ دیتے کہ اس دلیل میں جان ہے؟ اس میں عربیت یا عجمیت کی بحث نہیں، بلکہ فن اور اس کی تدوین کے انداز کا اعتبار کیا گیا ہے۔ جو اہل علم اسے صحاح میں شامل سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ موطأ کے اکثر موقوفات اور

---

❶ مصفی (۱/۱)

❶ مسوی (۱/ ٦) یقیناً علم فقہ تمام علوم میں سب سے افضل اور وسیع علم ہے اور موطا فقہ کی تمام کتابوں سے زیادہ صحیح، مشہور، قدیم اور جامع کتاب ہے۔

مراسیل کو حاکم، بیہقی اور دوسرے ائمہ نے مرفوع اور موصول بیان فرما دیا ہے، اس لئے اسے صحاح میں شمار ہونا چاہیے۔ یہ ایک تعلیم اور تدوین کے لحاظ کا اختلاف ہے، اس کا یہ مطلب نہیں جو سائل محترم نے فرمایا کہ اسے اصحاب حدیث نے صحاح سے نکال دیا ہے۔ [1]

طبقات محدثین:

مکرم ناگی صاحب نے سوال کو پھیلاتے ہوئے نومبر ۵۰ھ کے ''طلوع اسلام'' سے محدثین کے طبقات کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ مضمون معلوم ہوتا ہے حجۃ اللہ سے نقل کیا گیا ہے، نقل در نقل کی وجہ سے محترم کے لیے لغزش کا موجب ہوگیا ہے۔

---

[1] کتب ستہ (جنھیں عموماً ''صحاح ستہ'' کہا جاتا ہے) میں پانچ کتب بخاری، مسلم، ابو داود، ترمذی، اور نسائی کے شمول پر اتفاق ہے لیکن چھٹی کتاب کونسی ہے؟ اہل علم کے درمیان یہ مختلف فیہ ہے، جس میں تین اقوال ہیں:

① سنن دارمي: حافظ علائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنن دارمی کو چھٹی کتاب رکھا جانا چاہیے، کیونکہ اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر احادیث بہت کم ہیں، اگرچہ اس میں مرسل اور موقوف روایات موجود ہیں، لیکن، پھر بھی یہ ابن ماجہ سے بہتر ہے۔

② موطا امام مالک: بعض اہل علم رزین سرقسطی اور ابن اثیر وغیرہ نے مؤطا کو چھٹی کتاب شمار کیا ہے۔

③ سنن ابن ماجه: سب سے پہلے حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر المقدسی نے ابن ماجہ کو کتب ستہ میں شمار کیا، انھوں نے اپنی کتاب " الأطراف " اور " شروط الأئمة الستة " میں بقیہ کتب کے ساتھ ابن ماجہ کا چھٹی کتاب کے طور پر اضافہ کیا۔

بعد ازاں حافظ عبدالغنی المقدسی نے بھی " الكمال في أسماء الرجال " میں ابن ماجہ کو چھٹی کتاب قرار دیا اور حافظ ذہبی، ابن حجر اور دیگر علماء نے اسے برقرار رکھا اسے بقیہ کتب پر حسن ترتیب، کتب خمسہ پر زوائد، مرفوع احادیث کی کثرت اور مرسل اور موقوف روایات کی قلت و ندرت کی بنا پر فوقیت حاصل ہوئی۔

دیکھیں: فتح المغيث (١/ ٨٧) توجيه النظر للجزائري (١/ ٣٧٢)

یہ دراصل کتب حدیث کے طبقات ہیں، محدثین کے طبقات نہیں۔ [1] اگر براہ راست حجۃ اللہ سے نقل کیا جاتا، تو غالباً یہ لغزش نہ ہوتی۔ اصل ناقل نے عمداً یہ غلطی کی ہے یا قلت فہم سے یہ لغزش سرزد ہوئی۔

ادارہ طلوع اسلام اور ان کے ہم خیال حضرت عجمی سازش سے اس قدر مرعوب ہیں کہ وہ ہر جگہ سازش ہی سازش دیکھتے ہیں۔ زکاوت حس کا یہ حال ہے کہ ایرانی ذہن پر سوار ہوگئے، کتب حدیث کے طبقات میں بھی انھیں ایرانی سازش ہی نظر آرہی ہے، حالانکہ یہ نصاب کا معاملہ ہے، اس میں کتاب کی جامعیت، حسن ترتیب، حسن تبویب، حسن سیاق، زبان اور اس کے علاوہ بیسیوں چیزیں ملحوظ رکھنا ہوتا ہے، لیکن سائل محترم کو ایرانیت نظر آرہی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سفیان ثوری، حماد بن سلمہ، اوزاعی، معمر وغیرہ کی تصنیفات محض تذکرے اور یاد داشتیں تھیں، جو پوری کی پوری صحاح میں آگئیں، ان میں ترتیب تھی نہ جامعیت اور نہ تبویب، مثلاً محمد بن اسحاق نے مغازی اور سیرت کے موضوع پر لکھا اور اس کا ضروری حصہ امام بخاری رحمہ اللہ نے مغازی میں لے لیا۔ باقی سیرت ابن ہشام آپ کے پاس موجود ہے، اگر آپ حضرات کو منظور ہے کہ اسے صحاح کا مقام دیا جائے، تو بسم اللہ! اہل قرآن کے مدارس میں اسے رکھ دیجیے، ان شاء اللہ آپ کو اسی سے صحاح کی افادی حیثیت معلوم ہو جائے گی۔

اف! کتنا ظلم ہے، کہا جاتا ہے:

”سنن کبریٰ بیہقی، مستدرک حاکم، سنن دار قطنی، سنن دارمی، ان کو کیوں ترک کیا گیا؟“

مگر آپ کے اصول کے مطابق یہ بھی ایرانی تھے، بیہق، سمرقند اور

---

[1] دیکھیں: حجة الله البالغة (ص: ۲۸۰)

بست سب عجمی شہر ہیں، ان کو صحاح میں شامل نہ کیا گیا، اعتراض کرتے وقت کچھ تو سوچنا چاہیے، قلم اگرچہ عقل مند نہیں مگر انسان تو عقل مند ہے!

حقیقت اتنی ہے کہ صحاح کے تعین میں تعلیمی محاسن اور نصاب کے تقاضے وغیرہ امور پیش نظر رہے، اس لیے نہ مسند امام احمد اس میں آ سکی، نہ مسند شافعی، نہ سنن کبریٰ آ سکی اور نہ مستدرک حاکم۔ اللہ تعالیٰ سائل محترم کو عجم خولیا اور ایران خولیا سے بچائے، اس مرض کا حملہ سب سے زیادہ قوت فکر پر ہوتا ہے۔ مگر یہ موضوع بسط کا متقاضی ہے، جس پر فرصت میں لکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ!

شیعوں کی صحاح:

سائل محترم نے چلتے چلتے شیعہ کی صحاح اربعہ کا تذکرہ کر دیا، حالانکہ مولانا کو خوب معلوم ہے یہ نظیر ان کے خلاف جاتی ہے۔ اگر یہاں عجمی سازش ہوتی، تو خود عجمیوں میں اختلاف نہ ہوتا۔ صحاح ستہ کی بجائے نصاب صحاح اربعہ مقرر ہوتا، کیونکہ عجمی تہذیب کی ترجمانی صحاح اربعہ میں بہت زیادہ ہے اور ان کے مسائل میں عجمیت کا عنصر غالب ہے۔

نیز مرفوع حدیث کا سرمایہ صحاح اربعہ میں کم ہے، وہ عموماً امام جعفر پر موقوف روایات ہیں۔ ضد سے ان کو صحاح کا ہم پایہ قرار دیا گیا، دونوں طرف کی کتابیں پڑھنے کے بعد طالب حق خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ صحاح اربعہ حدیث ہے یا نہیں؟ صورت جو بھی ہو، صحاح اربعہ کا وجود عجمی سازش کا واضح جواب ہے۔

فارس کی فضیلت کی احادیث:

سازش کے متعلق سائل محترم نے جو مبادی وضع فرمائے تھے، وہ تار تار ہو گئے اور ان کے متعلق اغلاط کی نشاندہی ہو چکی، اس کے بعد اصل سوال بے وزن ہو جاتا ہے۔

"یا أولي الأبصار" کے نام سے محترم ناگی صاحب نے جو اپیل شائع فرمائی، "أولي الأبصار" نے اپنا موقف واضح کردیا۔

آخر میں مولانا نے اہل فارس کی فضیلت میں واردشدہ احادیث پر گہرے رنج کا اظہار فرمایا ہے، حالانکہ احادیث میں یمن کی فضیلت آئی ہے، عراق کا تذکرہ آیا، نجد کے فضائل آئے، بعض اشخاص اور قبائل کے مناقب بھی آئے۔ ❶ اگر فارس کے حق میں سرور عالم ﷺ نے کوئی کلمہء خیر کہہ دیا، تو اس میں ناراضگی کی کون سی بات تھی؟ اور یہ حقیقت ہے کہ اہل فارس سے اللہ تعالیٰ نے دین کی بے حد خدمت لی ہے، واقعی "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" کا معاملہ ہوگیا۔ جزا هم الله عنا وعن المسلمين خير الجزاء وخير مايجزي عباده المخلصين!

مولانا نے ارشاد فرمایا ہے کہ سوال کا جواب جذباتی نہ ہو۔ محترم نے خیال فرمالیا ہوگا کہ سوال کا تو کوئی حصہ جذباتی نہیں، مگر میں نے تو اسے بہت حد تک جذباتی پایا۔ تاہم میں نے کوشش کی ہے کہ سائل محترم کے حکم کی حسب امکان تعمیل کر سکوں۔ ﴿وما أبرىء نفسيْ إن النفس لأمارة بالسوء...﴾ ❷

مثبت طریق سے:

میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایجابی اور مثبت طریق سے بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ سائل کے خیال میں چونکہ سوال تاریخی ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ جواب بھی کسی مسلمہ مورخ کی زبان سے ہو۔ سائل محترم اور ان کے رفقاء کے متعلق مجھے بد گمانی ہے کہ یہ حضرات جامد مقلد ہیں۔ ایک دوسرے سے جو سنتے ہیں، مکھی پر مکھی

❶ دیکھیں: صحیح البخاري، کتاب المناقب، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، سنن الترمذي، أبواب المناقب۔

❷ یوسف: ٥٣

مارتے چلے جاتے ہیں۔اس تقلید کا لازمی نتیجہ ہے کہ مخالف پر بے اعتمادی اور بدگمانی ہوجائے اور یہ انداز سارے منکرین حدیث میں مشترک ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ سوال کا جواب کسی مسلمہ مورخ کی زبان سے ہو، تاکہ بدگمانی کی گنجائش نہ رہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کا نظریہ:

اور وہ ہیں آٹھویں صدی کے علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ ،آپ نے اس مبحث پر سیر حاصل گفتگو فرمائی ہے، جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"فصل في أن حملة العلم أكثر هم العجم"

من الغريب الواقع أن حملة العلم في الملة الإسلامية أكثرهم العجم، وليس في العرب حملة علم لا في العلوم الشرعية، ولا في العلوم العقلية إلا القليل النادر، وإن كان منهم العربي في نسبه فهو عجمي في لغته، ومرباه ومشيخته مع أن الملة عربية وصاحب شريعتها عربي![1]

"یہ عجیب واقعہ ہے کہ اسلام میں علماء کی اکثریت عجمی الاصل ہے۔عقلی اور نقلی علوم میں عرب اہل علم نادر اور قلیل ہیں۔ اگر کوئی ان میں نسبی عرب ہے، تو وہ شیوخ اور تربیت کے لحاظ سے عجمی ہے، حالانکہ ملت اور صاحب ملت عربی ہیں۔"

ابن خلدون رحمہ اللہ عالم ہے اور فلسفہ تاریخ کا ماہر، وہ نہ اس حقیقت کا انکار کرتا ہے، نہ اس کی توجیہ میں کوئی ایسی بدگمانی پیدا کرتا ہے، جو اسے حقیقت سے دور لے جائے یا سلفِ امت پر بدگمانی پیدا کرے یا امت کی علمی خدمت کی ناشکری کرے۔ وہ حقائق کو حقائق کی سرزمین میں کھڑے ہوکر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے

[1] مقدمہ ابن خلدون (ص:٤٩٩)،وأیضاً:أبجدالعلوم (١٣٩-١٤٢)

اسباب عقلی سے بحث کرتا ہے، جس کا ملخص یہ ہے، فرماتے ہیں:

''اس کا سبب یہ ہے کہ ابتداءِ اسلام میں مسلمانوں میں نہ علم تھا نہ صنعت، ان میں اول سے آخر تک بدویت اور سادگی نمایاں تھی۔ شریعت کے اوامر ونواہی کو صاحب شریعت سے سن کر اسے یاد رکھتے تھے اور کتاب وسنت سے اس کے ماخذ کو جانتے تھے۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ اور صحابہ سے یہ سب کچھ سیکھا تھا، اس وقت عرب تالیف اور تدوین کے فن سے ناواقف تھے۔ نہ وہ اسکے لیے مجبور تھے اور نہ ہی انھوں نے اب تک اس کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ صحابہ اور تابعین کا زمانہ اسی طرح گذر گیا۔ ان ایام میں پڑھے لکھے لوگوں کو ''قاری'' کہتے تھے، یہ قاری قرآن اور سنت دونوں کو جانتے تھے۔ قاری کا لفظ ''اُمی'' کے مقابلہ پر بولا جاتا تھا اور سنت چونکہ قرآن مجید کی شرح اور تفسیر تھی، اس لیے قاری کا مطلب یہ تھا کہ قرآن اور سنت دونوں کو جانتا ہو۔

نقل کا زمانہ جس قدر دور ہوتا گیا، علوم تفسیر اور سنت کی تقیید تک کی ضرورت محسوس ہونے لگی، تاکہ یہ ضائع نہ ہوجائیں۔ اس کے لیے علم اسناد اور ناقلین کی جرح وتعدیل کی ضرورت ہوئی، تاکہ صحیح اور ضعیف میں امتیاز ہوسکے۔

اسی طرح نت نئے واقعات کے وقوع نے استخراج مسائل کی ضرورت کو پورا کیا، پھر زبان کی اصلاح کے لیے علوم عربیہ، نحو وغیرہ کی ضرورت کا احساس ہونے لگا، تو اس کے لیے علوم عربیہ کی تاسیس عمل میں آئی اور اصلاح عقائد کے متعلق علوم کلامیہ کی ایجاد کی گئی، اسی طرح اصول فقہ کے قواعد مرتب کیے گئے اور ان تمام علوم نے حرفت اور صنعت کی صورت اختیار کی اور اس کی تحصیل کے لیے تعلیم ومحنت کی ضرورت پیش آئی اور ہم بتا چکے ہیں کہ صنعت اور حرفت کا تعلق حضریت اور شہریت سے تھا اور عربوں کو طبعاً اس سے نفرت تھی اور عجمیوں میں حضریت کی وافر مقدار موجود تھی، وہ طبعاً حرفت اور صنعت

کے لیے سازگار تھے اور یہی حال موالی کا تھا۔نحو کے بانی سیبویہ،ابوعلی فارسی اور زجاج وغیرہ تھے،یہ سب عجمی تھے،لیکن عربی تربیت کی وجہ سے انھوں نے اسے ایک صنعت کی صورت دے دی‘‘۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وكذا حملة الحديث الذين حفظوه على أهل الاسلام أكثرهم عجم أومستعجمون باللغة والمربى، وكان علماء أصول الفقه كلهم عجما كما يعرف وكذا حملة علم الكلام وكذا أكثر المفسرين، ولم يقم بحفظ العلم وتدوينه إلا الأعاجم وظهر مصداق قولهﷺ :لو تعلق العلم بأكناف السماء لناله قوم من أهل فارس الخ [1]

یعنی ایسے ہی حدیث کے حامل بھی اکثر عجمی تھے،اسی طرح علماء اصول فقہ عجمی تھے،اسی طرح متکلمین اور ائمہ تفسیر،غرض علم کے حفظ وتدوین کا پورا کارخانہ عجمیوں کے سپرد ہو گیا اوراس طرح آنحضرت ﷺ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی:لو تعلق العلم بأكناف السماء لناله قوم من أهل فارس ! [2]

اور یہ اس حدیث کا مفہوم ہے، [3] جس سے محترم ناگی صاحب کو چڑ ہے!!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابتدا میں تو واقعی عربوں پر بدویت غالب تھی کہ وہ صنعت وحرفت سے متنفر تھے،لیکن اب تو وہ حضریت آچکی تھی۔ پس اس کے تقاضوں کا ظہور ضروری تھا،لیکن عرب پھر بھی نمایاں علمی خدمت نہ کر سکے؟

---

[1] مقدمه ابن خلدون (ص:٥٥٠)

[2] ان الفاظ کے ساتھ مجھے یہ حدیث نہیں ملی۔

[3] یعنی جس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمایا: اگر ایمان ثریا (اونچا ستارہ) پر بھی ہو،تو اس کی قوم (فارس) کے لوگ اس کو پالیں گے۔

صحيح البخاري، برقم (٤٦١٥) صحيح مسلم، برقم (٢٥٤٦)

اس سوال کے جواب میں ابن خلدون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جن عربوں نے اس حضریت کا زمانہ پایا اور وہ بدویت سے شہریت کی طرف آگئے، وہ آتے ہی حکومت اور ریاست میں مشغول ہوگئے اور دولت عباسیہ میں انھیں مجبوراً حکومت کی ذمہ داریوں کو اٹھانا پڑا، اور معلوم ہے کہ رؤساء اور دولت مند صنعت وحرفت سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے عرب اس وقت بھی کوئی اہم علمی کام سرانجام نہ دے سکے اور یہ کام علمائے دین عجم اور موالی کے سپرد رہا۔ مگر عرب ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، کیونکہ یہ ان کے علوم تھے اور ان کا اپنا دین تھا۔ عرب کے لیے ضروری تھا کہ وہ علم اور اہل علم کی قدر دانی کریں اور یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک کلی طور پر عرب حکومت سے محروم نہیں ہوگئے۔'' ❶

اہل قرآن حضرات سے دردمندانہ گذارش:

جو شبہ آپ کو آج پیدا ہوا، ٹھیک یہی سوال آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ کے ذہن میں کھٹکا، مگر ایک متدیّن اور دردمند انسان نے حقائق کو کس قدر نکھار کر رکھ دیا ہے۔ نہ کسی کی آبرو پر ہاتھ ڈالا، نہ اس کو امت کے اعمال کی تحقیر کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ قومی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی پاکباز آدمی پر سازش کی تہمت لگائی اور ایک عالم کی طرح سوال کی ذمہ داری سے فارغ ہوگئے ۔۔۔!!

آجکل:

یہی سوال آج آپ حضرات کے سامنے آیا، تو آپ نے اپنی پگڑی بھی اتار لی اور تیار ہوگئے کہ دوسروں کی پگڑیاں اتار پھینکیں ۔ امت کے بہترین انسانوں کو آپ نے سازشی قرار دیا اور جو چیز دنیا کی نظر میں ہمارے بزرگوں کے محاسن سے شمار ہوتی

---

❶ مقدمہ ابن خلدون (ص:٥٠٠)

تھی، اہل یورپ کی گہری سازش سے آپ نے اس کو ان کی برائیوں میں شمار کیا۔ اس جہل مرکب پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے!!

کوئی مجتہد صاحب نئی فقہ کی تشکیل کے لیے پریشان ہورہے ہیں، دوسرے صاحب اسلامی اصطلاحات کی خودساختہ تشریحات کر کے عامۃ المسلمین کو مغالطہ دے رہے ہیں، مگر خود ان مفسرین کا یہ حال ہے کہ علوم حدیث کے مبادی تک سے بے خبر اور اسلامی علوم سے ناآشنا ہیں، سارے اجتہاد کی بنیاد تک بندیوں پر رکھ لی گئی ہے۔

﴿وسيعلم الذين ظلموا أي منقلب ينقلبون﴾ [1]

---

[1] الشعراء: ٢٢٧

ایک سوال، دو جواب

یہ مضمون دراصل گزشتہ جواب ہی کا اختصار ہے، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۳ اگست ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا، بعض اضافی فوائد اور نتائج کے پیش نظر اسے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ایک سوال...... دو جواب

محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب ناگی نے جولائی ۷۵ء کے ''طلوع اسلام'' میں امہات ستہ کے متعلق ایک تاریخی سوال شائع فرمایا ہے، بعینہ یہ سوال تقریباً ۹۹ے ھ میں علامہ ابن خلدون کے ذہن میں کھٹکا۔ مولانا کے لیے محرک وہ فضا ہے، جو اہل قرآن حضرات نے احادیث نبویہ اور محدثین کے متعلق پیدا کی ہے۔

سوال یہ ہے:

صحاح ستہ کے مصنفین ائمہ حدیث فارسی الاصل عجمی ہیں، ان میں کوئی نسلاً عربی نہیں، مولانا دریافت فرماتے ہیں کہ عرب اس خدمت سے کیوں محروم ہوئے؟ عربی نبی ﷺ کے ارشادات کی تدوین کا شرف عجمیوں کو کیوں ملا؟ (مختصراً)

منکرین حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ اسلام کی تخریب کے لیے عجمیوں نے سازش کی اور احادیث بنا کر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر دیں، گویا مصنفین صحاح اسلام کے مخالف تھے، ان کے خیال میں فن حدیث کی تدوین سے اسلام کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور عجمی اس سازش میں صدیوں کامیاب رہے اور پونے گیارہ سو سال تک مسلمان اس سازش کو نہ سمجھ سکے، بلکہ اسے دین کی خدمت سمجھتے رہے۔

ابن خلدون اس سوال کا ان لفظوں میں تذکرہ فرماتے ہیں:

"ومن الغريب الواقع أن حملة العلم في الملة الإسلامية أكثرهم العجم لا من العلوم الشرعية ولا من العلوم العقلية إلا في القليل

النادر وإن كان منهم العربي في نسبه فهو عجمي في لغته ومرباه ومشيخته مع أن الملة عربية وصاحب شريعتها عربي"
(مقدمه ابن خلدون: ٤٩٩)

"یہ عجیب واقع ہے کہ اسلام میں شرعی اور عقلی علوم کے جاننے والے زیادہ تر عجمی ہیں، اگر شاذ و نادر ان میں نسباً کوئی عربی ہے، تو لغت، تربیت اور شیوخ کے لحاظ سے وہ بھی عجمی ہے، حالانکہ دین عربی ہے اور صاحب شریعت ﷺ بھی عرب ہیں۔"

ابن خلدون فرماتے ہیں کہ ملت اسلامیہ میں ابتداءً صنعت اور حرفت نہ تھی، اس وقت کی سادگی اور بدویت کا یہی تقاضا تھا، شرعی احکام اور اوامر ونواہی کو لوگ حفظ کرتے تھے اور کتاب و سنت سے اس کے ماخذ کو جانتے تھے، کیونکہ انھوں نے اسے آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام سے روبرو سنا اور سمجھا تھا، یہ لوگ عرب تھے، تعلیم، تصنیف و تالیف اور تدوین علوم سے یہ قطعی ناواقف تھے اور ان ظروف و احوال میں ان کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی، یہ حالت صحابہ اور تابعین کے زمانہ تک جاری رہی۔

نقل کا زمانہ:

جب نقل کا زمانہ دور ہوتا گیا، تو علوم کو مقید اور محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، یہ تقریباً ۱۹۳ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے انتقال کا زمانہ ہے، اس کے بعد تفاسیر کی تصنیف، دواوین سنت کی تدوین شروع ہوئی، تاکہ یہ منقول سرمایہ ضائع نہ ہوجائے، اس کے ساتھ اسانید کی پہچان، علم جرح و تعدیل کی بنیاد رکھی گئی، تاکہ اس منقول سرمایہ کی صحت اور سقم کو پرکھا جائے۔

جب نئے نئے واقعات رونما ہوئے، تو استخراج احکام اور ان کے لیے اصول اور قواعد کی تشکیل ضروری سمجھی گئی، تاکہ کتاب و سنت کے ساتھ ان فقہیات کا تعلق قائم

رہے، عجمی اختلاط کی وجہ سے زبان بگڑنے لگی، تو علم نحو ایجاد کیا گیا، فساد عقائد کی اصلاح کے لیے علم کلام کی تدوین ہوئی اور یہ علوم بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے رہے اور مزید علوم آلیہ کی ضرورت بڑھتی گئی، اس طرح ان علوم نے صنعت اور ملکہ کی صورت اختیار کر لی اور صرف سماع اور نقل کے بجائے یہ علوم فن اور صنعت قرار پائے اور معلوم ہے کہ یہ ساری چیزیں حضریت کے لوازم سے ہیں، بدویت اور سادگی ان تکلفات کی متحمل نہیں اور عربوں کا مزاج ان تکلفات سے طبعاً دور تھا۔

ان ایام میں حضریت موالی اور عجمیوں کے حصے میں آئی اور اس وقت کی شہریت رسوم اور عادات میں عجمیوں کی غلام اور دست نگر تھی اور صنعت و حرفت میں وہ انھی کے تابع تھے، فارسی حکومت ہی سے ان میں حضریت اور شہریت کی عادات راسخ تھیں، چنانچہ ائمہ نحو سیبویہ، ابو علی فارسی اور زجاج تمام کے تمام نسباً عجمی تھی، ان لوگوں نے عربی زبان عربوں سے سیکھی، لیکن اس کے قواعد اور ضوابط منضبط فرما کر اسے آنے والی قوموں کے لیے ایک فن بنا دیا۔

اسی طرح ائمہ حدیث کی اکثریت عجمی تھی یا مستعجم، ابن خلدون فرماتے ہیں:

"وكذا حملة الحديث الذين حفظوه على أهل الإسلام أكثرهم عجم أو مستعجمون باللغة والمربىٰ، وكان علماء أصول الفقه كلهم عجما كما يعرف، وكذا حملة علم الكلام، وكذا أكثر المفسرين ولم يقم بحفظ العلم وتدوينه إلا الأعاجم" (مقدمہ: ۵۰۰)

"ائمہ حدیث اکثر عجمی تھے، یا لغت اور رہائش کے لحاظ سے وہ عجمی تھے، علماء اصول فقہ کلہم عجمی تھے، ائمہ کلام کل عجمی تھے، اسی طرح اکثر ائمہ تفسیر عجمی تھے۔"

غرض علوم کے حفظ و تدوین میں عجمی حضرات کے سوا کوئی آگے نہیں آیا اور

آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی پوری طرح سچی ہوگئی کہ:

''اگر علم آسمان کے کناروں سے بھی متعلق ہو، تو اہل فارس اس پر قابض ہوجائیں گے۔'' ❶

اور حسب ارشاد مولانا تا گی علم کی دنیا میں عجمیت کا جال بچھ گیا، اس کے بعد فرماتے ہیں:

" أما العرب الذين أدركوا هذه الحضارة وسوقها وخرجو إليها من البداوة فشغلتهم الرياسة في الدولة العباسية وما دفعوا إليه من القيام بالعلم والنظر فيه فإنهم كانوا أهل الدولة وحاميتها وأولي سياستها مع ما يلحقهم من الأنفة عن انتحال العلم حينئذ بما صار من جملة الصنائع، والرؤساء أبدا يستنكفون عن الصنائع والمهن وما يجر إليها ودفعوا ذلك إلى من قام به من العجم والمولدين وما زالوا يرون لهم حق القيام به فإنه دينهم وعلومهم ولا يحتقرون حملتها كل الاحتقار...... الخ"

(مقدمه: ۵۰۰)

''عربوں سے جن لوگوں نے عباسی دور میں اس حضریت اور شہریت کو پایا اور بدویت کو چھوڑا، وہ آتے ہی ریاست کی ذمہ داریوں میں پھنس گئے، سیاسی مشاغل کی وجہ سے علم و دانش کا مشغلہ اختیار نہ فرما سکے، ویسے بھی رئیس اور سیاست دان صنعت و حرفت اور مشقت سے نفرت کرتے ہیں، البتہ عجمی اہل علم کی یہ لوگ عزت کرتے رہے، کیونکہ وہ علم دین کے حامل اور خادم تھے۔''

آخر میں فرمایا:

" فهذا الذي قررناه هو السبب في أن حملة الشريعة عامتهم من

---

❶ مجھے یہ حدیث نہیں مل سکی۔

العجم" (مقدمہ: ۵۰۱)

ہماری اس تقریری سے ظاہر ہے کہ حاملین شریعت عام طور پر عجمی تھے۔

اسی طرح عقلی علوم بھی زیادہ تر عجمیوں میں ہی رہے اور جب تک اہل عجم میں حضریت موجود رہی، وہ عقلی اور نقلی علوم کی خدمت کرتے رہے، جب عجمیوں میں بدویت آ گئی اور حضریت نے ان کو جواب دے دیا، ان سے بھی بالکل یہ علم جاتا رہا، اور علم ان شہروں میں چلا گیا جہاں حضریت پائی جاتی تھی جیسے مصر، یہ حضریت کے لحاظ سے آج کل دنیا کی جڑ ہے، ماوراء النہر میں تھوڑی بہت حضریت موجود ہے، اس انداز سے وہاں بھی علوم کی خدمت کا جذبہ موجود ہے، چنانچہ علامہ سعد الدین تفتازانی کے سوا ہمیں وہاں کسی محقق عالم کی اطلاع نہیں ملی۔ (مقدمہ ابن خلدون: ۴۹۹ تا ۵۰۲)

مولانا ناگی اور اہل قرآن حضرات سے:

دونوں جواب آپ کے سامنے ہیں، مقدمہ ابن خلدون کا میں نے آزاد ترجمہ کیا ہے، مناسب ہوگا آپ حضرات اصل کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیں، اسی سے علم اور جہل میں آپ توازن فرما سکیں گے، آپ محسوس فرمائیں گے کہ علم کی ذمہ داریاں کس قدر گراں ہیں، لاعلمی کتنی جلدی آوارگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

① ابن خلدون نے تاریخ سازی نہیں کی، بلکہ ثابت شدہ حوادث اور واقعات میں تطبیق دی ہے۔

② اس میں سلف کا اعزاز اور امت کے جذبات کا شکریہ آمیز اعتراف ہے۔

③ ملوک عرب کی طرف سے معذرت ہے اور قدرتی تقسیم کار کا اظہار۔

④ اس سے علوم خصوصاً علم حدیث کا تدریجی اور طبعی ارتقاء معلوم ہوتا ہے اور اہل علم کا خلوص۔

دوسرے جواب کے متعلق میرا احساس:

حضرات اہل قرآن کے جواب کے متعلق میرے احساسات یہ ہیں:

① اس میں کوئی علمی یا تاریخی نقطہ نہیں۔

② ایک سلبی واہمہ ہے، جسے قرینہ کہنا بھی مشکل ہے، البتہ شبہ کہا جا سکتا ہے۔

③ اس جواب کا انداز یہ ہے جیسے ایک شریر الطبع لیکن کمزور لڑکا اپنی آبرو سے بے نیاز ہو کر ساتھیوں کو چھیڑنا شروع کر دیتا ہے اور جب رفقاء کے حملوں کی مدافعت نہیں کر سکتا، تو شور، ہنگامے اور بدزبانی سے اس کسر کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے، شاید کوئی ناواقف اس کا ہمدرد بن جائے۔

علم اور عقل کی دنیا میں غالباً آپ کا کوئی غم گسار نہیں، حدیث پر آپ حضرات کے شبہات کی بنا قلت علم اور قلت مطالعہ پر ہے، ادارہ طلوع اسلام کے انداز فکر نے تحریک کو اور بھی عامیانہ اور علم و فکر کی حدود سے بہت دور ڈال دیا ہے، اب غوغا آرائی کے سوا علمی ذوق اور فکری پیاس کے لیے اس پورے ادارہ کے پاس کچھ نہیں۔

یہ گزارش جناب سے مخلصانہ مراسم کی بنا پر کی ہے، مجھے امید ہے کہ میرے اس اندازِ جسارت کو جناب میرے اخلاص پر مبنی سمجھیں گے۔

میرا خیال تھا کہ جناب عمر کا آخری حصہ قرآن اور سنت کی خدمت میں صرف فرماتے، شاید پہلی عمر کی لغزشوں کا کفارہ ہو جاتا، مگر افسوس ہے کہ آپ کے مطالعہ کا رخ بے حد غلط طرف پھر گیا اور آپ بڑے غلط ماحول میں گرفتار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے آپ کی مخلصی کا سامان پیدا کر دے اور آخر عمر میں آپ سے دین کی خدمت لے، آپ کا حشر قیامت میں اپنے اکابر کے ساتھ ہو، جو بحمد اللہ کتاب و سنت کے پابند تھے۔

امام محمد بن مسلم زہری قرشی اور تحریک انکار حدیث

ماہنامہ ”طلوع اسلام“ (ستمبر، ۱۹۵۰ء) میں تمنا عمادی کا ایک مضمون امام زہری رحمہ اللہ کے متعلق شائع ہوا، جو بعد ازاں ”امام زہری اور امام طبری، تصویر کا دوسرا رخ“ نامی کتاب کے ضمن میں کراچی سے طبع ہوا۔ اس مضمون میں تمنا عمادی نے امام زہری کے نسب، ان کی مدنیت اور جمع و تدوین حدیث کے بارے میں شکوک و شبہات ظاہر کیے۔

چنانچہ اس کے جواب میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا، جو الاعتصام (۸ دسمبر ۱۹۵۰ء) کی متعدد اقساط میں شائع ہوا۔

ماہنامہ ”صحیفہ اہلحدیث“ کراچی کے شمارہ ”حجیت حدیث نمبر“ (مارچ ۱۹۵۶) میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کی تائید میں ”امام زہری رحمہ اللہ کا شجرہ نسب“ کے عنوان سے مولانا عبداللہ لائل پوری رحمہ اللہ کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے کتب رجال اور انساب کی روشنی میں امام زہری کے نسب پر تمنا عمادی کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور امام زہری رحمہ اللہ کا قطعی طور پر عربی النسل اور مدنی ہونا ثابت کیا، موضوع سے تعلق اور افادیت کے پیش نظر اسے بھی متعلقہ مباحث کے حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔

امام محمد بن مسلم زہری قرشی اور تحریک انکار حدیث

حجیت حدیث کا کھلا انکار مولوی عبداللہ صاحب چکڑالوی نے کیا، اس سے پہلے صراحتاً انکار ملحدین اور زنادقہ سے بھی نہ ہو سکا۔ اسلام سے محبت اور قرآن سے شغف کے بعد آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا انکار ہے بھی ناممکن، اگر ایک غیر مسلم بھی اسلام کے مزاج اور ساخت پر غور کرے، تو اس کے لیے بھی دو ہی راہیں ہیں، یا تو پورے اسلام کا انکار کر دے اور یا پھر قرآن اور حدیث دونوں معاً قبول کرے، رد و قبول میں تفریق اسلام کے مزاج سے قطعاً مختلف چیز ہے۔

یہ تحریک اندرونی نقائص، بے عملی رفقاء، کارتقویٰ اور اخلاق سے تہی دامنی کی وجہ سے بہت جلد ناکام ہوگئی اور اس کا اجتماعی نظم چند سالوں میں درہم برہم ہو کر رہ گیا، اس خود ہی بربادی کا سبب تحریک کے مزاج کا عدم توازن ہے۔ میری دانست میں جماعت اہلحدیث کی مساعی کو اس میں بہت کم دخل ہے، جماعتی نظم کی اس پریشانی کے بعد ان کے بقیۃ السیف چور دروازوں سے گوریلا جنگ کی صورت اختیار کر رہے ہیں، تاکہ عساکر اسلام اور جنود سنت کو کچھ دیر تک پریشان اور سراسیمہ رکھ سکیں۔

ان گوریلا اور پریشان طاقتوں کی قیادت پرویز صاحب ''ادارہ طلوع اسلام'' کی معیت میں کر رہے ہیں۔ ہمارے محترم تمنا صاحب عمادی بھی ہاتھ بٹانے کے لیے ان گوریلا دستوں میں کبھی کبھی نمودار ہوجاتے ہیں۔ میری دانست میں مولانا عمادی انکار حدیث اور سنت کی عداوت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، لیکن وہ صراحتاً اس عقیدہ کے اعتراف سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ انگریزی ذہن جوان حضرات کا اصل

شکار ہے، ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ انگریزی معامل کے تعلیم یافتہ حضرات کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن مصیبت وہ ذہنیت ہے، جو ڈیڑھ سو سال میں انگریزی کارخانوں میں تیار ہوئی، انگریزی زبان اور انگریزی کلچر کے اس طریقہ معیشت نے زندگی کا قالب ایسا بنا دیا ہے، جس میں اسلامی پرزوں کا ڈھلنا کافی مشکل ہے اور یہی سادہ لوح دراصل ان شکاریوں کا تختہ مشق ہیں، انہی لوگوں کو پھانسنے کے لیے یہ منافقانہ روش اختیار کی گئی ہے اور یہ تمام جال ہم رنگ زمین بچھائے گئے ہیں۔

خداوند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

حال ہی میں ایک مضمون ''طلوع اسلام'' (شمارہ نمبر: ۹) میں تمنا صاحب کے نام سے امام زہری کے نام سے شائع ہوا ہے۔ تمنا صاحب کی اس دور اندیشی کا تو مجھے اعتراف ہے کہ اگر ان کے تیر زہری کو مجروح کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو یقیناً فن حدیث اور ائمہ سنت پر ایک کامیاب حملہ ہوگا۔

زہری کا مقام فن حدیث اور دواوین رجال میں وہی ہے، جو جالینوس کا یونانی طب میں، افلاطون کا یونانی فلسفہ میں۔ بلاشبہ امام زہری فن حدیث کی اساس ہیں، اکابر ائمہ حدیث کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، ان کے اساتذہ کو ان پر فخر ہے اور ان کے تلامذہ کو ان پر ناز!

لیکن مضمون پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے، کہ ''ادارہ طلوع اسلام'' بمع تمنا صاحب اپنے مقاصد میں پورے طور پر ناکام ہے اور ان کا مضمون بے ضرورت طول کے باوجود قطعی ناتمام اور تحقیق سے بمراحل دور ہے۔

﴿فقطع دابر القوم الذين ظلموا والحمد لله رب العالمين﴾ [1]

ان گزارشات سے مقصد تمنا صاحب کا جواب ہے اور نہ ہی ان مغالطات کی

---

[1] الأنعام: ٤٥

نشاندہی مقصود ہے، جن کی وجہ سے میرے جیسا آدمی ''مولانا'' تمنا کی دیانت اور ادارہ ''طلوع اسلام'' کے ارادوں کو مشتبہ سمجھنے پر مجبور ہے، مقصد ان اوہام کی وضاحت ہے، جن سے فن حدیث کو مظنون اور مشتبہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادارہ ''طلوع اسلام'' نے یہ مضمون ایک تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے اور تمنا صاحب سے خواہش ظاہر کی ہے کہ طلوع اسلام پر آئندہ بھی ایسی نوازشیں ہوتی رہیں گی۔

میرا خیال ہے کہ ادارہ ''طلوع اسلام'' کے ممبر غالباً فن رجال سے قطعی نابلد ہیں، بغض احادیث نے انھیں اس طولانی افسانہ کی اشاعت پر آمادہ کیا ہے، ورنہ مضمون میں نہ کوئی جاذبیت ہے اور نہ علمی اہمیت، اور نہ خود مضمون نگار رجال پر اسلوب گفتگو سے چنداں آشنا ہیں۔ مضمون میں خرص وتخمین کو دلائل کا مقام دیا گیا ہے، امکانات اور احتمالات کو حجت اور دلیل تصور کر لیا گیا ہے۔

مناسب ہے مضمون کے مغالطات اور اوہام کو ناظرین کے سامنے رکھ دیا جائے، اس کے بعد بالترتیب ان کے ازالہ کی کوشش کی جائے، واللہ ولي التوفيق۔

① امام زہری قرشی اور عرب نہیں ہیں، ان کی قرشیت اور قبیلہ زہرہ بن کلاب سے تعلق بذریعہ ولا، یعنی کسی قرشی نے ان کے کسی بزرگ کو آزاد کیا، اس لئے یہ بھی قرشی اور زہری کہلانے لگے۔

② موالی عموماً فارسی الاصل تھے، عربوں نے ان کی حکومت کو تاراج کیا، وہ انتقامی جذبات کے ماتحت احادیث کی وضع وتخلیق کا کام کرتے تھے، امام زہری پر بھی اس لئے یہ وہم کیا جا سکتا ہے۔

③ زہری مدنی نہ تھے، بلکہ یہ ایلہ کے باشندے تھے۔

④ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن حزم کو جمع احادیث کا حکم دیا، یزید بن عبدالملک نے ان کی شہادت کے بعد انھیں معزول کر دیا اور یہ کام یہیں ختم ہوگیا۔

⑤ کتابت و تدوین حدیث۔

⑥ امام زہری کی مراسیل اور ان کے شیوخ کا تذکرہ۔

ا۔ امام زہری کا سلسلہ نسب:

ائمہ حدیث، تاریخ اور انساب متفق ہیں کہ امام زہری قرشی ہیں اور ان کا تعلق قبیلہ زہرہ بن کلاب سے ہے۔ سمعانی کی کتاب انساب کے متعلق مشہور اور مسلّم ہے، عمادی صاحب نے لکھا ہے کہ ائمہ حدیث کے ساتھ ائمہ تاریخ اور ائمہ انساب اس شجرہ نسب میں متفق نہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ امام الانساب علامہ سمعانی ہی کے ارشاد سے اس الجھن کو دور کیا جائے، میرے پاس سمعانی کی کتاب نہیں تھی، اس لئے پنجاب لائبریری سے برادرم محترم مولانا عبدالقیوم صاحب ایم اے، پروفیسر گورنمنٹ کالج کی معرفت یہ حوالہ حاصل کیا گیا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں:

"الزهري بضم الزاء، وسكون الهاء، وكسر الراء ، هذه النسبة إلى زهرة بن كلاب بن مرة بن كعب بن لؤي وهو قريش والمشهور بها أبوبكر محمد بن مسلم بن عبيد الله بن شهاب بن زهرة القرشي المعروف بالزهري من تابعي المدينة،وكان من أحفظ أهل زمانه وأحسنهم سياقا لمتون الأخبار، وكان فقيها فاضلا، روى عنه الناس ومات ليلة الثلاثاء لسبع عشرة خلت من رمضان سنة أربع وعشرين ومائة في ناحية الشام"

كتاب الأنساب للسمعاني [1] (فوٹو غراف) (ص: ٢٨١)

---

[1] الأنساب للسمعاني (٣/ ١٨٠)

الزهري یہ زہرہ بن کلاب کی طرف نسبت ہے، ابوبکر محمد بن مسلم قرشی زہری اسی نسبت سے مشہور اور متعارف تھے، یہ اپنے وقت کے بہت بڑے حافظ حدیث تھے، متون حدیث کے بیان میں انھیں کامل مہارت تھی، بڑے فاضل تھے، محدث ہونے کے علاوہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے، ان سے بہت لوگوں نے روایت کی، ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ منگل کی رات کو اطراف شام میں انتقال ہوا۔

ائمہ تاریخ سے ابن خلکان کا مقام اہل علم سے پوشیدہ نہیں، ان کی تحقیق اور تصنیف کا مقام اس مدت سے واضح ہے، جو اس کتاب کے لکھنے پر صرف ہوئی، وہ بھی امام زہری کو قرشی اور زہری کے نسب سے یاد فرماتے ہیں:

"أبو بكر محمد بن مسلم بن عبيدالله بن عبدالله بن شهاب بن عبدالله بن الحارث بن زهرة القرشي الزهري أحد الفقهاء والمحدثين والأعلام التابعين بالمدينة" (ابن خلكان: ۱/ ٤٥١) [1]

ابوبکر محمد بن مسلم زہری قرشی ہیں، فقہاء اور محدثین میں یگانہ ہیں، آپ مدینہ منورہ کے اعلام تابعین سے تھے۔

عمرو بن دینار امام زہری کے علم و فضل کے قائل نہ تھے، جب امام زہری مکہ معظّمہ تشریف لائے، تو عمرو بن دینار ان کے حلقہ درس میں لائے گئے، تو دوسرے دن ان کے رفقاء نے امام زہری کے متعلق ان کی رائے دریافت کی، تو فرمایا:

"والله ما رأيت مثل هذا القرشي قط" (ابن خلكان: ۱/ ٤٥١) [2]

عمرو بن دینار معاصر ہیں اور کسی قدر مخالف بھی، وہ ان کی قرشیت کی کس طرح تصریح فرماتے ہیں، اس میں امام کے قرشی اور مدنی ہونے کی صراحت ہے۔

---

1. وفيات الأعيان لابن خلكان (٤/ ١٧٧)
2. مصدر سابق

امام ذہبی تذکرة الحفاظ (١/ ١٠٢) میں امام کا سلسلہ نسب ذکر فرماتے ہیں اور امام کے قرشی زہری اور مدنی ہونے کی تصریح فرماتے ہیں۔[1] یاد رہے کہ حافظ ذہبی محدث بھی ہیں اور مورخ بھی، علم رجال فن تاریخ کا ایک اہم شعبہ ہے اور امام ذہبی کا تاریخی مقام اہل علم سے مخفی نہیں، ان کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

امام نووی شارح مسلم کی وسعت نظر ارباب فکر میں معروف ہے، اسانید اور رجال میں ان کا مقام اقران و اماثل میں مسلّم ہے۔ امام زہری کے سلسلہ نسب میں علماء انساب کی تائید فرماتے ہیں اور "القرشي الزهري المدني" اور اس کے ساتھ ہی "سكن الشام و كان بأيلة" کا تذکرہ فرماتے ہیں،[2] اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

حضرت امام ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی (م ٧٧٤ھ) تفسیر، حدیث، رجال اور تاریخ میں ان کا مقام بلند ہے، ان کی کتاب "البداية والنهاية" اہم تاریخی مستندات سے ہے، آپ فرماتے ہیں:

"محمد بن مسلم بن عبيدالله بن عبدالله بن شهاب بن عبدالله بن الحارث بن زهرة بن كلاب بن مرة أبوبكر القرشي الزهري أحد الأعلام من أئمة الإسلام تابعي جليل" (البداية: ٩/ ٣٤٠)

وہی سلسلہ نسب ہے، جس پر ائمہ تاریخ، ائمہ رجال و حدیث تمام متفق ہیں، امام

---

[1] حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے الفاظ یوں ہیں:

" الزهري أعلم الحفاظ، أبوبكر محمد بن مسلم بن عبيدالله بن شهاب بن عبدالله بن الحارث بن زهرة بن كلاب القرشي الزهري المدني " (تذكرة الحفاظ: ١/ ١٠٨)

[2] دیکھیں: تهذيب الأسماء واللغات للنووي (١/ ١٠١)

زہری کو قرشی بھی کہتے ہیں اور ان کا تعلق بنوزہرہ سے بھی فرماتے ہیں۔ ایک بھی ایسا مستند حوالہ نہیں ملتا، جس میں امام کی زہریت اور قرشیت میں ادنیٰ شبہ بھی کیا گیا ہو۔ ❶

ان ائمہ فن کی ان تصریحات کے بعد عمادی صاحب کے اس ارشاد کی قیمت کہ

"یہ بخوبی ممکن ہے کہ بنی زہرہ کے موالی سے ہوں اور مولی بنی زہرہ ہونے کی وجہ سے زہری و قرشی کہے جانے لگے ہوں۔"

بالکل واضح ہے۔ ان نصوص اور تصریحات ائمہ کی موجودگی میں قریباً بارہ سو سال کے بعد یہ "اکتشاف" "بخوبی ممکن ہے"، اور "کہے جانے لگے ہوں" کی ٹرم سے تو ثابت نہیں ہو سکتی۔ تعجب ہے کہ جو لوگ حدیث ایسے یقینی اور مستند علم کو ظنی تصور کرتے ہوئے اس کی حجیت سے انکار کرتے ہیں، وہ ان اوہام اور مزخرفات اور ان ممکنات مزعومہ کو دلیل اور حجت کا مقام کس طرح دیتے ہیں؟!

فرماتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ شہاب نہ فقط خاندان قریش بلکہ ان کے اوپر کے شجروں میں بھی دیکھیے، تو کسی ایک فرد کا بھی یہ نام آپ کو نظر نہیں آئے گا۔"

سبحان اللہ! کس قدر قطعی اور عجیب استدلال ہے، کسی قبیلہ کے حقیقی ناموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سلسلہ میں بار بار آئیں؟ یہ دلیل ان ناموں پر بھی منطبق نہیں ہوگی جن کو تمنا صاحب واقعی قرشی سمجھتے ہیں، معد، عدنان، فہر، لوی کا قریش میں کہاں تک تکرار پایا گیا ہے؟

---

❶ امام زہری رحمہ اللہ کے سلسلہ نسب بارے مزید تفصیلات کے لیے دیکھیں:

تاریخ ابن أبي خیثمه (٢/ ٢٤٣) طبقات خلیفه (ص: ٢٦١) تاریخ خلیفه (ص: ٢١٨) طبقات ابن سعد (٢/٣٨٩) والقسم المنمم له (ص: ١٥٧) المعرفة والتاریخ (١/ ٦٢٠) حلیة الأولیاء (٣/ ٣٦٠) اللباب في تهذیب الأنساب (٢/ ٨٢)

ناموں کے تغیرات میں جو اسباب و دواعی کارفرما ہیں اور جن نفسیاتی محرکات کی وجہ سے خاندانوں کے ناموں پر انقلاب آتا ہے، ان پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ بزعم عمادی صاحب تمام خاندان عتقِ موالات کا شکار ہیں۔ چالیس سال میں دیہات اور شہروں میں ناموں کی ہیئت ہی بدل گئی ہے، نور دین، الہ بخش، محمد دین کی جگہ عبداللہ، عبدالعزیز اور محمود نے لے لی اور اب ان کی جگہ رشید اختر، شوکت حیات لے رہے ہیں۔ تمنا صاحب ایسے محقق اگر پیدا ہوتے رہے، تو تمام خاندانوں کو موالی اور حلفاء کی فہرست میں شامل فرمائیں گے!

زہری کے ہم عصر اور تمام ائمہ حدیث و لغت اور تاریخ کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت اگر ان وہمی دلائل کی بنا پر کی جائے، تو ایسے مکتشفین کا مقام علمی مجالس کی بجائے مینٹل ہسپتال میں ہونا چاہیے!!

انساب کی حیثیت:

ان تصریحات کے بعد مناسب ہوگا کہ اسلام میں نسب کی اہمیت پر غور کر لیا جائے۔ قرآن عزیز نے نجات کا مدار تقویٰ پر رکھا ہے، شعوب و قبائل کو صرف باہمی تعارف کا ذریعہ قرار دیا ہے، [1] وطنیت کی حیثیت بھی شرعاً ایسی ہی ہے، کوئی عرب ہو یا عجمی اس نسبت کی وجہ سے نہ قابل نفرت ہے اور نہ مستحق محبت، نہ سارے عرب متقی ہیں، نہ سارے فارسی وضع و تخلیق کے عادی، فارس میں بھی ایسے پاکباز لاکھوں تک پہنچتے ہیں، جن پر اسلام فخر کرتا ہے اور عرب میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ مل سکتے ہیں، جن کے اعمال سے مسلمان اور اسلام سرنگوں ہیں۔

علم الانساب تمام تر ظنی اور مشکوک ہے اور ہمیشہ مشکوک رہا ہے، پانچ فی صدی بھی ایسے آدمی نہیں، جو اپنے نسب سے پانچ دس پشت سے صحیح طور پر واقف

[1] دیکھیں: الحجرات: ۱۳

ہوں، ہمارے ملک میں بھی نسب کے متعلق بعض ایسی قوموں پر اعتماد کیا گیا ہے، جو قطعاً غیر مستند ہیں۔ علم رجال کی شرائط پر اگر ان لوگوں کی چھان پھٹک کی جائے، تو ان راویوں کی قیمت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

عرب میں خاندان کے بعض افراد اپنے خاندان کے نسب کو یاد رکھتے تھے، ان کا تمام تر ذخیرہ حفظ ہی تھا، ان اقوال کی صحت پر کوئی ظنی دلیل بھی ملنا مشکل ہے۔

اس وقت سمعانی کی " الأنساب " اور "سبیکة الذهب" دو ہی کتابیں انساب کے متعلق زیادہ مشہور ہیں، جو لوگ خبر واحد کی ظنیت سے گھبراتے ہیں، حدیث اور آنحضرت ﷺ کے اعمال پر انھیں یقین نہیں، وہ علم الانساب پر کیوں کر یقین کریں گے؟ اس علم کا مقام تو ظن سے بھی کہیں فروتر ہے!

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کی پہلی جلد کے ابتدائی صفحات میں انساب کی افادی حیثیت پر پُر مغز بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

> ''اقوام و امم میں نسب کا امتیاز بے حد کمزور ہے، مرور ایام کے ساتھ اس کے آثار بھی ناپید ہوتے جاتے ہیں، اس سے ایک ہی قوم اور قبیلہ کے نسب میں بے حد اختلاف ہوا، جس قدر وقت گزرتا گیا، اسی قدر اختلاف بڑھتا گیا، اور عام اہل عالم کی انساب کا بھی یہی حال ہے، جیسے یونان، فارس، بربر اور قحطان، جب انساب میں مختلف راہیں پیدا ہو جائیں اور ہر مدعی اپنے دعوے کے اثبات میں قرائن و احوال اور شواہد سے اپنے دعوے کو مبرہن کرے گا، زمان، مکان اور خصائص قبائل اور نشانات سے استدلال کرے گا اور شعوب و قبائل کے خصائص کو اپنی تائید میں پیش کرے گا۔''

اس کے بعد نسب اور اس کی بلندی کے متعلق مختلف ائمہ کے مذاہب کا تذکرہ فرمایا ہے، امام مالک سے پوچھا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام تک نسب کی صحت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ امام نے اسے ناپسند فرمایا اور فرمایا:

" من أين يعلم ذلك " اسے اس کی صحت کا علم کیونکر ہوگا؟

حضرت اسماعیل کی طرف نسبت کے متعلق بھی امام نے یہی فرمایا۔ تمام انبیا کے سلسلہ نسب کو حضرت امام نے مشکوک سمجھا۔ [1] ابن اسحاق، امام بخاری اور ابن جریر طبری نے انساب بعیدہ کے ذکر کو پسند کیا اور وراثت اور عصوبت میں اس کی افادی حیثیت کا ذکر فرمایا، اس ضمن میں بعض آثار کا بھی ذکر کیا، جن سے نفیاً یا اثباتاً استدلال کیا جا سکتا تھا اور معد بن عدنان سے اوپر کے سلسلہ میں شکوک کا اظہار فرمایا۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے دونوں اقوال کی علی الإطلاق صحت سے انکار کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ انساب بعیدہ تو شبہ سے خالی نہیں، قریبی آباء کا ضبط عرفاً اور شرعاً دونوں طرح مفید ہے، اس سے وراثت، رق اور عصوبت وغیرہ تعلقات میں مدد ملتی ہے۔

یہ تطبیق یا فیصلہ امام مالک کے اقوال میں بھی اشارتاً موجود ہے۔ تینوں مسالک پر نظر رکھنے کے بعد یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ علم الانساب کی تحقیقی حیثیت کیا ہے؟ ان انساب سے کسی شخص یا قبیلہ یا استلحاق کا فیصلہ کہاں تک قطعی اور یقینی ہوسکتا ہے؟

محترم! دلائل میں جان ہونی چاہیے، ورق سیاہ کرنے سے کیا فائدہ؟ اہل قرآن دوست عموماً اس فن سے کافی نابلد ہیں، وہ تو اس سے کم پر بھی خوش ہو سکتے ہیں، آپ اپنے بڑھاپے پر رحم کریں!

نسب کے تذکرہ میں بعض ناموں کی کمی یا زیادتی سے نسبت غلط نہیں ہوسکتی، امام شافعی کا قرشی ہونا اور امام زہری کا زہرہ بن کلاب سے تعلق تواتر سے ثابت ہے، اس کا ازالہ ان شبہات سے نہیں ہوسکتا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ متی اور لوقا میں مختلف ہے، بعض جگہ کچھ نام کم بعض میں کچھ زیادہ، اس سے مسیح کی اسرائیلیت مشتبہ

[1] تاریخ ابن خلدون (۱/ ۳)

نہیں ہوسکتی۔ آنحضرت ﷺ کے سلسلہ نسب میں معد بن عدنان سے آگے تفاوت ہے، لیکن اس سے آنحضرت ﷺ کی نسبت مشتبہ نہیں ہوگی۔ تمنا صاحب کے استدلال کا مفاد تو یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کو موالی تصور کر لیا جائے، العیاذ باللہ!

کیا موالی سب بد دیانت تھے؟

تمنا صاحب کے مضمون سے ذہن میں یہ اثر ہوتا ہے کہ موالی سب انتقامی جذبات سے بھرپور تھے، وہ دل سے اسلام کے خیر اندیش نہیں تھے، یہ خیال قطعی غلط اور بے معنی ہے۔ موالی میں بے حد مخلص اور اسلام کے سچے خادم موجود تھے، حضرت امام ابو حنیفہ فارسی تھے، امام بخاری بھی فارس کے رہنے والے تھے، اسی طرح اکثر ائمہ حدیث و فقہ فارسی الاصل اور موالی سے تھے، اگر عجمی اور موالی پر محض عجمی اور موالی ہونے کی وجہ سے وضع، تخلیق یا بے دینی کی تہمت لگائی جائے، تو تمام علوم غیر محفوظ ہوں گے۔

ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں ایک مستقل فصل اس موضوع پر لکھی ہے، فرماتے ہیں:

> ”یہ عجیب واقعہ ہے کہ دینی اور عقلی علوم کے ماہر اکثر عجمی ہیں، اگر کوئی نسبت کے لحاظ سے عرب ہے، تو بھی اسے زبان وغیرہ کے اعتبار سے کہیں نہ کہیں عجمیت کا پیوند لگا ہوا ہے، کیونکہ عرب سادگی کی وجہ سے حضری علوم کو نہیں جانتے تھے، دین آنحضرت ﷺ سے سن کر سیکھا، اس کے ماخذ کتاب وسنت سے ان کو معلوم تھے، تدوین علوم کا اس وقت نہ ان کو احساس ہوا اور نہ اس کی ضرورت سامنے آئی۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں عموماً یہی صورت رہی، جن لوگوں نے اس کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی، ان کو قاری کہا جاتا

تھا، اس کے معنی قرآن اور سنت کی معرفت کے تھے، کیونکہ اس وقت دین کی معرفت کے لیے یہی دونوں ماخذ تھے۔

ہارون رشید کے دور حکومت میں تفاسیر اور احادیث کی عام تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ زمانہ کے بُعد کی وجہ سے یہ علوم ضائع نہ ہو جائیں، اس لیے اسانید کی بھی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ صحیح اور ضعیف میں امتیاز کیا جائے اور زبان کی حفاظت کے لیے نحو کی باقاعدہ تدوین بھی عمل میں آئی۔ ایسے علوم کی ضرورت بھی محسوس کی گئی، جن سے استخراج مسائل کی صحت میں مدد لی جا سکے، اس لیے یہ علوم صنعت و حرفت کی صورت اختیار کر گئے۔ عرب چونکہ حکومت کی زمام ہاتھ میں لے چکے تھے، اس لئے وہ صنعت و حرفت کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اور یوں بھی صناعت شہریت اور حضریت کے لوازم سے ہے، بدوی زندگی میں نہ اس کا احساس ہوتا ہے نہ اس کی ضرورت، اس لیے عجمی اور موالی جو عموماً حضریت اور شہریت سے آشنا اور صنعت و حرفت کی قدر و قیمت کو سمجھتے تھے، وہی لوگ ان علوم کی خدمت کے لیے آمادہ ہوئے۔ البتہ عرب بادشاہ ان لوگوں کی عزت کرتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ یہ لوگ دین کے خادم ہیں۔ غرض تمام علوم کی تدوین کا سہرا عجم اور موالیین کے سر پر رہا، سیبویہ، ابو علی فارسی، زجاج نحو کے امام عجمی تھے۔ اسی طرح حفاظ حدیث بھی اکثر عجمی ہی تھے، فقہ، علم کلام، تفسیر، اصول فقہ، تمام علوم عجم ہی کے رہین احسان ہوئے۔"

ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"ودفعوا (أي العرب) ذلك إلى من قام به من العجم والمولدين وما زالوا يرون لهم حق القيام به فإنه دينهم وعلومهم"

عربوں نے تمام علوم عجم اور موالیین کے سپرد کر دیئے اور عرب ان لوگوں کے حق

کا پورا خیال رکھتے تھے، کیونکہ وہ ان کے علوم اور دین کے ساتھ وابستہ تھے۔

اگر عجم پر اس طرح بدگمانی کی جائے، تو عرب بھی اس سے محفوظ نہیں، وہ بھی ان لوگوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے اور ان پر اعتماد کرتے رہے۔

اور اگر معاف فرمایا جائے، تو ادباً گزارش کروں کہ آپ اور مولانا پرویز اور مولانا جیرا جپوری اور آپ کی پوری جماعت سب حضرات خالص عجمی ہیں۔ اگر تخریب دین کی بدگمانی عجمیت ہی پر موقوف ہے، تو آپ حضرات حدیث اور سنت کے خلاف جو کچھ فرما رہے ہیں، ان منافقین کے مشن کی تکمیل ہی تو نہیں؟ سنت کی ممانعت کے بعد قرآن پر جن دست درازیوں کے لئے راستہ ہموار کیا جا رہا ہے، وہ منافقین عجم ہی کی وراثت معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے نظریہ کا تقاضا ہے، ورنہ ہماری رائے تو صاف ہے۔

کالے اور گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کے اور ہی ڈھب ہیں

جس نظریہ سے قرآن اور سنت کی تعلیمات کی تخریب ہو، تواتر علمی اور اعتقادی کی مٹی پلید ہو، وہ نظریہ نفاق کی پیداوار ہے۔ اس کے قائل عرب میں رہیں یا عجم میں، کراچی میں یا لاہور میں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مزخرفات کا نام ”معارف القرآن“ رکھ دیا جائے، تو اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی!

امام زہری ۵۰ھ کے قریب پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

آج تیرہ سو ستر جا رہا ہے، اس بارہ سو سال کے عرصہ میں امام زہری کے ہم عصر، امام زہری کے دوست، امام زہری کے نقاد، امام زہری کے مداح، ائمہ جرح و تعدیل جو اصالتاً امام زہری کے حالات سے واقف تھے اور وہ لوگ جن کو زہری سے دیانتاً یا معاصرانہ چشمک تھی، سب موجود رہے اور جرح کے لیے ان کی زبانیں کھلی تھیں۔

---

[1] دیکھیں: الوافي بالوفيات (٥/ ١٨) وفيات الأعيان (٤/ ١٧٧)

چنانچہ امام زہری پر جرح ہوئی، زہری کی مراسیل پر ہاتھ صاف کیا گیا، انھیں "کالریح" کہہ کر ان کی کمزوری کو نمایاں کیا گیا، [1] لیکن زہری کے نسب پر جرح کا کسی کو حوصلہ نہ ہوا، ان کی عجمیت اور ولاء کا اکتشاف ائمہ فن نے نہ فرمایا۔ آج پورے بارہ سو سال کے بعد بڑھاپے اور ضعف بصارت کے ساتھ اس تراش اور خراش کی تکلیف آپ کو ہوئی، حالانکہ آپ صرف ناقل ہیں اور آپ کا پیشہ اور شاہکار صرف تشکیک ہے۔ وہ قُرب زمانہ کی وجہ سے اصالتاً امام زہری کو جانتے تھے اور ان کے مقام کو سمجھتے تھے۔

وکم من عائب قولا صحیحا
وآفته من الفهم السقیم

علماء انساب پر ایک نظر:

تمنا صاحب موالی اور شیعہ سے بہت گھبراتے ہیں، اس وجہ سے وہ علم حدیث کو ظنی تصور فرماتے ہیں، مناسب ہوگا علماء انساب پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے کہ یہ حضرات کس پایہ کے ہیں؟ شیخ صحار العبدی عثمانی تھے اور شرق بن القطامی کے متعلق لکھا ہے:

"وکان کذابا" (ابن ندیم : ۱۳۲)

عبداللہ بن عمرو بن الکواء : "کان نسابا وکان من الشیعة من أصحاب علي" (ابن ندیم: ۱۳۳)

عبداللہ بن عمرو انساب کے ماہر تھے، لیکن شیعہ تھے۔

مجاہد بن سعید محدثین کے نزدیک ضعیف تھے، عوانہ بن حکم علماء انساب سے ہیں، لیکن قرآن عزیز کی آیات اور اشعار میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ ابو اسحاق بن

---

[1] دیکھیں: جامع التحصیل (ص: ۳۷) تدریب الراوي (۱/ ۲۰۵)

ابراہیم کثیر الغلط تھے، ابو معشر نجیح المدنی موالی سے تھے، ابو مخنف لوط بن یحییٰ بن سعید بن مخنف انساب کے ماہر اور غالی شیعہ تھے۔ محمد بن سائب کلبی اور ان کے بیٹے ضعیف بھی ہیں اور مائل بہ تشیع بھی اور اس کے ساتھ علم الانساب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ❶

احادیث تو بعض شیعہ رواۃ کی وجہ سے ظنی ہو گئیں، زہری مفروضہ تشیع کی وجہ سے غیر مستند اور موالی کا آلہ کار، لیکن جن انساب پر اعتماد فرما کر یہ نقطہ نوازیاں کی جا رہی ہیں، ان کے رواۃ میں اکثر شیعہ اور موالی ہیں۔ تمنا صاحب اور ان کے احباب فرمائیں کہ ''یک بام و دو ہوا'' کا معاملہ کیوں ہو رہا ہے؟ شیعہ آپ کی تائید کریں تو سچے، حدیث کی روایت کریں تو شیعہ!!

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

۲۔ موالی کا انتقامی جذبہ:

۲۔ ''موالی نے انتقامی جذبہ کے تحت وضع و تخلیق احادیث کا کام شروع کیا۔''

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے فارسی حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا، ممکن ہے شاہی خاندان میں کچھ دیر انتقامی جذبات کو فروغ حاصل ہوا ہو، لیکن عوام اور علماء اس سے بہت کم متاثر ہوئے، کسریٰ کی حکومت شخصی تھی، وہ قومی اور عوامی نہ تھی، اس لئے عوام کے انتقامی تاثرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پھر وہ انصاف پسند حکومت بھی نہ تھی، جس کے ساتھ عوام کو کچھ زیادہ دل بستگی ہو، بلکہ عموماً عمال حکومت اور ارباب بست و کشاد مستبد اور ظالم تھے۔ اس لئے عوام کو حکومت کی بجائے فاتحین سے زیادہ الفت تھی۔ تاریخ میں یہ امر واضح ہے کہ جس فاتح سے عوام کو سہولت ملے اور اس کا برتاؤ ان کی آزادی میں بلاوجہ حائل نہ ہو، وہ

❶ لسان الميزان (٤/ ٤٩٢) الكشف الحثيث (ص: ٢٣٠)

دیر تک اس کے خلاف بغض و عداوت کی پرورش نہیں کر سکتے۔ بغاوت فطرت کی آواز نہیں لیکن آزادی انسانیت کا فطری حق ہے، اس لئے جو حکومت انسانیت کے اس حق پر دست درازی نہ کرے، انسانیت اس کے خلاف بغاوت کے غیر فطری جذبہ کا کبھی استعمال نہیں کرتی۔

مسلمان فاتحین کے ابتدائی دور میں انسانیت کے ساتھ انصاف کا جذبہ پوری قوت سے پایا جاتا تھا، وہ رعیت کے جائز حقوق کا پورا احترام کرتے تھے، اس لیے یہ خیال قطعی غلط اور بے دلیل ہے کہ عجمی عناصر نے حدیث سازی اور تخلیقِ روایات کے کارخانے انتقامی جذبات کی وجہ سے جاری کیئے اور اس جذبہ کے ماتحت موضوعات کا ایک ذخیرہ مہیا کر دیا گیا۔

مغل حکومت کا آخری دور اور انگریز کی فتوحات کے اسباب و نتائج کسی صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ مغل حکومت مسلمان تھی اور ہندوستان میں مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ انگریز غیر مسلم تھا، لیکن فتح کے بعد انگریز کی مخالفت کہاں تک زندہ رہ سکی؟ سر سید احمد صاحب ایسے دور اندیش آدمی انگریز کی غلامی کا وعظ کہنے لگے، کالج تعمیر کیا، انگریز کے لیے مشینیں تیار ہوئیں، پورے ملک میں ہوا کا رخ بدل گیا، دینی مدارس اور قومی مدارس میں جو نمایاں فرق پایا گیا، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پورے ملک نے انگریزی بود و باش کو اپنایا، حجامت کی تراش خراش تک انگریز بہادر کے اوضاع و اطوار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ صرف اس لئے کہ انگریز نے بظاہر کوئی دکھ نہیں دیا، بلکہ عوام کو ابتداء میں کچھ سہولتیں میسر آئیں، ملازمتیں ملیں، ریل موٹر ایسی مفید ایجادات نے ملک کی رائے پر اچھا اثر ڈالا۔

صرف ایک جماعت:

اس سارے دار الامن میں صرف اہل توحید کی ایک جماعت تھی، جو انگریز کے خلاف جذبہ پنہاں کی دیر تک پرورش کر سکی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک ناسور تھا، جو کافی دیر تک انگریزی حکومت کے جوڑوں سے رستا رہا اور یہ دیوانوں کی کمپنی انگریز اور اس کے نظام پر مطمئن نہ ہو سکی۔ عوام نے ان لوگوں کو وہابیت کی تہمت لگا کر انگریز کے سامنے اکیلا چھوڑ دیا۔ پھانسیوں اور عبور دریا شور کی سنگین سزاؤں سے ان لوگوں کو بھی اگر بلا وجہ اور بغض کی راہ سے دق نہ کیا جاتا، تو شاید یہ بھی انگریز کے فاتحانہ مظالم فراموش کر جاتے۔ علماء دیوبند جو توحید میں اشتراک کے علاوہ ابتدا سے اس دینی جنگ میں بھی اہل توحید اور اہل حدیث کے ساتھ دوش بدوش شریک رہے، بالآخر دینی تعلیم کے حصار میں محصور ہو گئے۔ بارہویں صدی کے آواخر اور تیرہویں کے آغاز میں صرف اہلحدیث ہی اس آگ کو سلگاتے رہے، باقی اکثریت انگریز کے متعلق مطمئن ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد جب انگریز نے فتح کی بدمستی سے نئے مظالم کا دروازہ کھولا، تو پھر سے ملک میں بغاوت، لاقانونی اور ہنگامے تیز ہو گئے۔

اس لیے میں تمنا صاحب کے اس خیال کو واقعات کے بالکل خلاف سمجھتا ہوں کہ عجمی انتقام اتنا دیرپا ثابت ہوا کہ انھوں نے اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم سیکھنے کے بعد بھی عداوت اور دشمنی کو قائم رکھا اور اسی جذبہ سے حدیثیں بنائیں۔

شیعہ، سنی، خوارج یہ مختلف نظریے تھے، اپنے ائمہ اور بزرگوں کی محبت میں یقیناً حدیثیں وضع کی گئیں، اس دینی مخالفت کے لیے ایک دوسرے کے خلاف حدیثیں بنائی گئیں، یہ اہل مذاہب کی کمزوری تھی، اس میں دیرینہ انتقام کا کوئی دخل نہ تھا۔

ہمارے دوستوں کی عادت:

ادارہ ''طلوع اسلام'' اور اس قسم کے حضرات کی عادت ہے کہ وہ مسئلہ یا نظریہ پہلے بناتے ہیں، پھر اس کے لیے دلائل کی تلاش میں نکلتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں دلیل سازی کے لیے پریشان ہونا پڑتا ہے، پھر بھی نتیجہ حسب منشا نہیں نکلتا، تو دلائل کو نچوڑ کر اپنا مطلب کشید کرنا شروع کر دیتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے مبادی اور نتائج دونوں غلط ہوتے ہیں۔ تقریر کے تسلسل سے عامی ذہن کو تھوڑی دیر ضرور غلطی میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے، لیکن دور اندیش نظریں اس تار و پود کی کمزوری کو ضرور بھانپ جاتی ہے۔ ان بزرگوں کی تقریریں اور مضامین بلا ضرورت لمبے ہونے کے علاوہ انتشارِ ذہن کا موجب ہوتے ہیں، لیکن دلائل کا ذخیرہ ان میں ناپید ہوتا ہے۔

تمنا صاحب کا پیش نظر مضمون اس کی زندہ دلیل ہے، مضمون کا کوئی موضوع نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے ذہن میں جو کچھ تھا، قلم نے اگل دیا ہے۔ مجھے خود اسی لئے آپ کے ارشادات لکھتے وقت پریشانی ہوتی ہے، توقع ہے مجھے آپ اس صاف گوئی میں معذور تصور فرمائیں گے۔ [1]

---

[1] ''صحیفہ اہلحدیث'' کراچی کے شمارہ ''حجیت حدیث نمبر'' بابت مارچ (۱۹۵۶ء) میں مولانا عبداللہ صاحب لائل پوری رحمہ اللہ کا ایک مضمون ''امام زہری رحمہ اللہ کا شجرہ نسب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے رجال اور انساب کی کتب کو مدنظر رکھتے ہوئے امام زہری رحمہ اللہ کے نسب پر عمادی شکوک و شبہات کا بھرپور جائزہ لیا تھا، مضمون کی موضوع سے مناسبت اور افادیت کی بنا پر اسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''امام زہری رحمہ اللہ کا شجرۂ نسب''

مولانا تمنا عمادی مقیم ڈھاکہ انکارِ حدیث کے متعلق دور کی کوڑی لانے کے عادی ہیں، ←

....

رسالہ ''طلوع اسلام'' کراچی میں آپ نے ایک مضمون ''زہری رحمہ اللہ'' پر لکھا ہے، جس میں زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ قبیلہ زہرہ سے نہیں ہیں، بلکہ موالی بنی زہرہ ہیں اور ان کو موالی بنا کر موردِ جرح گردانا ہے۔

''الاعتصام'' گوجرانوالہ میں مولانا اسماعیل صاحب نے اس کا جواب دیا ہے لیکن افسوس کہ انساب کی کتابوں کو بالکل پیش ہی نہیں کیا گیا، حالانکہ انساب میں کافی مواد موجود ہے۔

آج کی صحبت میں فقیر صرف امام زہری رحمہ اللہ کا بنی زہرہ سے ہونا ثابت کرے گا۔ إن شاء اللّٰہ، واللّٰہ الموفق۔

زہرہ کے آباء واجداد:

ذیل میں نقشہ دیا جاتا ہے، جس سے ''زہرۃ'' اور اس کے بھائی اور اس کے آباء واجداد کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے:

نقشہ میں ''کلاب'' کی اولاد نو (۹) فرد ظاہر کئے گئے ہیں۔

ا۔ ''قصی'' حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے جدّ اعلیٰ ہیں، حضور ﷺ کا نسب حسب ذیل ہے:

❶ ان کی کنیت ابوزہرہ تھی۔ منہ

....

نقشہ نمبر ۱ سے ثابت ہوتا ہے کہ "زہرہ" اور "قصی" دونوں بھائی ہیں اور وہ کلاب بن مرہ کی اولاد ہیں، جس طرح "قصی" آنحضرت ﷺ کے جدِ خامس ہیں، اسی طرح "زہرہ" حضور ﷺ کے ننھیال کی طرف سے جدِ رابع ہیں۔

زہرہ کی اولاد:

اب ہم "زہرہ" کی اولاد پر بحث کرتے ہیں۔

"زہرہ" کے دو بیٹے ہیں: ۱۔ حارث ۲۔ عبد مناف

"حارث" حضرت عبدالرحمٰن بن عوف صحابی رسول رضی اللہ عنہ کے جدِّ اعلیٰ ہیں اور "عبد مناف" حضرت سعد بن ابی وقاص صحابی رسول رضی اللہ عنہ و حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ و حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔

ان چاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجداد کا نقشہ ملاحظہ ہو:

....

- زہرہ
  - عبدمناف
    - وہب
      - مالک
        - ابووقاص
          - سعد رضی اللہ عنہ
          - عامر رضی اللہ عنہ
          - عمیر رضی اللہ عنہ
          - عقیا
      - نوفل
        - مخرمہ
          - مسور رضی اللہ عنہ
      - عبدیغوث
        - ارقم
          - عبداللہ رضی اللہ عنہ
  - حارث
    - عبد
      - عوف
        - عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ
    - عبداللہ
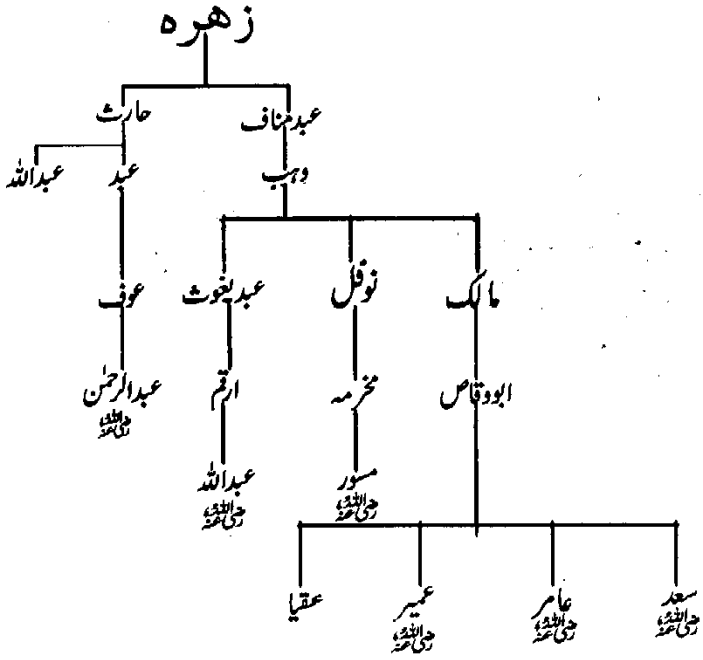
نقشہ شجرہ مندرجہ بالا میں چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجداد کے علاوہ ''حارث'' کے دو بیٹے ظاہر کئے گئے ہیں، ایک ''عبد'' جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے دادا ہیں، دوسرے عبداللہ۔

ہماری بحث کا لب لباب یہی عبداللہ اور ان کی اولاد ہے، یہ عبداللہ حضرت امام زہری رحمہ اللہ کے جدِّ اعلیٰ ہیں، شجرہ مندرجہ ذیل میں امام زہری کے اجداد ملاحظہ ہوں:
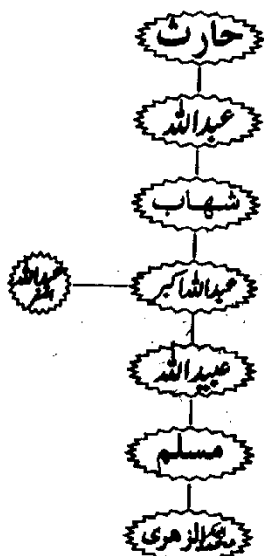
شجرہ مندرجہ بالا میں علاوہ اجدادِ زہری رحمہ اللہ کے '' شہاب '' کے دو بیٹے ظاہر کیے گئے ہیں، ''عبداللہ اکبر'' جو امام زہری رحمہ اللہ کے پڑدادا ہیں، دوسرے '' عبداللہ اصغر'' جو امام زہری کے پڑنانا اور صحابی رسول رضی اللہ عنہ ہیں۔

الاستیعاب لابن عبدالبر (۱ / ۳۸۶) میں ہے:

"قَالَ الزُّبَيْرُ: هُمَا أَخَوَانِ عَبْدُ اللّٰهِ الْأَكْبَرُ وَعَبْدُ اللّٰهِ الْأَصْغَرُ اِبْنَا شِهَابِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ زُهْرَةَ بْنِ كِلَابٍ ، كَانَ اسْمُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شِهَابٍ الْأَكْبَرِ عَبْدَ الْجَانِ فَسَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَبْدَ اللّٰهِ كَانَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ إِلَى أَرْضِ الْحَبَشَةِ وَمَاتَ بِمَكَّةَ قَبْلَ الْهِجْرَةِ إِلَى الْمَدِيْنَةِ وَأَخُوْهُ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ شِهَابٍ الْأَصْغَرِ شَهِدَ أُحُدًا مَعَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ أَسْلَمَ بَعْدُ ."

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں بھائی مسلمان تھے، لیکن میری تحقیق یہ ہے کہ عبداللہ

....

الاصغر مہاجرین حبشہ میں سے تھے۔ " تلقيح فهوم أهل الأثر لابن الجوزي " (ص:۲۱۱) میں ہے:

" عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ شِهَابٍ جَدُّ الزُّهْرِيِّ مِنْ قِبَلِ أُمِّهٖ . "

اور ان کو مہاجرین حبشہ کے باب میں ذکر کیا ہے اور عبداللہ اکبر جنگ احد میں مشرکین مکہ کی طرف سے شامل ہوئے۔

(ملاحظہ ہو: زاد المعاد، مصری: ۱/ ۳۵ و سیرت ابن ہشام بر حاشیہ زاد المعاد : ۱/ ۳۵۸)

اوپر کے تمام دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ امام زہری کے اجداد قبیلہ زہرہ سے تھے اور ان کے پڑنانا، پڑدادا صحابی رسول رضی اللہ عنہ تھے اور امام زہری رحمہ اللہ کو "ابن شہاب" کہنا حقیقت پر مبنی ہے۔

الاستيعاب لابن عبدالبر میں صرف عبداللہ بن شہاب الاصغر کو ذکر کیا ہے۔

" الإصابه "(٤/ ٨٥) میں ہے:

" عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ شِهَابٍ جَدُّ الزُّهْرِيِّ مِنْ قِبَلِ أَبِيهِ وهو الَّذِي شَجَّ وَجْهَ النَّبِيِّ ﷺ

وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ شِهَابٍ جَدُّ الزُّهْرِيِّ مِنْ قِبَلِ أُمِّهٖ الَّذِي هَاجَرَ إِلَى الْحَبَشَةِ . "

اصابہ (۲/ ۸۵)، طبقات ابن سعد (ج:۳/ ق:۱ص: ۹۲) میں ہے:

"عَبْدُ اللّٰهِ الْأَصْغَرُ بْنُ شِهَابٍ ابْنُ أُخْتِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَجَدُّ الزُّهْرِيِّ مِنْ قِبَلِ أُمِّهٖ "

اور ان کو مہاجرین حبشہ میں ذکر کیا ہے۔

ان کو موالی بنی زہرہ کہنا صرف مولانا تمنا عمادی کی ہٹ دھرمی اور تجدد پسندی بلکہ جہالت ہے،

دوسرا اعتراض مولانا کا شہاب پر ہے، جو عبداللہ الاکبر و عبداللہ الاصغر کے والد ہیں۔

مولانا کا دعویٰ ہے کہ جاہلیت میں شہاب نام کا کوئی شخص نہیں ملتا اور نہ ہی صحابہ کرام میں اس نام سے کوئی صحابی موسوم نظر آتا ہے، یہ سوال بھی کوتاہ بینی اور تنگ نظری پر مبنی ہے، اگر مولانا تاریخ اور انساب کی کتابیں دیکھتے تو ان کو اس اعتراض کی جرأت نہ ہوتی۔

" استیعاب لابن عبدالبر: ۱/ ۵۸۰" میں تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لکھے ہیں:

....

④ شهاب بن المجنون الحرمي

⑤ شهاب بن مالك الحامي

⑥ شهاب الانصاري

اسی طرح ابن الجوزی نے " تلقیح" (۱۰۱، ۱۰۲) میں سات نام ذکر کیے ہیں، زمانہ جاہلیت میں بھی یہ نام ملتے ہیں، ملاحظہ ہو:

(۱) طارق بن شہاب (استیعاب: ۸۹۹)

(۲) کثیر بن شہاب (استیعاب: ۹۹۱)

حماسہ (مطبوعہ دیوبند: ۱۴۵) میں جاہلی شاعر ربیعہ کا ایک شعر ہے:

أن يقتلوك فقد ثللت عروشهم

بعتيبة بن الحارث بن أبي شهاب ❶

اصل حقیقت یہ ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ قبیلہ بنی زہرہ سے ہیں، موالی نہیں، امام مالک رحمہ اللہ کے استاد ہیں، امام مالک نے اپنی مؤطا میں ان سے ایک سو اکتیس جگہ حدیث بیان کی ہے، ان کا قصور اگر ہے تو یہ ہے کہ انھوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت میں حدیث کو مدوّن کیا اور یہی ایک چیز ہے جو منکرین حدیث کو کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور ہمارے نزدیک یہی چیز ان کا بڑا کمال ہے۔

جزاه الله عن سائر المسلمين .

إذا أتتك مذمتي من ناقص

فهي الشهادة لي بأني كامل ❷

❶ اگر وہ تجھے قتل کریں تو عتیبہ بن حارث بن شہاب کے ساتھ ان کی حکمرانی جاتی رہے!

❷ جب کوئی کوتاہ بین تمھارے پاس میری مذمت کرے تو یہ میرے کامل ہونے کی گواہی ہوگی۔

۴۔ امام زہری کا وطن

صحت روایت اور ثقاہت کے لیے مدنی ہونا شرط نہیں، ائمہ حدیث اسلامی قلمرو کے تمام شہروں میں موجود تھے، شروط روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام سے حدیث نقل کی جاتی۔ مدینہ منورہ درسِ حدیث کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا تھا، اکثر صحابہ مدینہ ہی میں اقامت فرما رہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے درس نے اس شان کو اور بھی دوبالا کر دیا، اکثر ائمہ حدیث اور اس فن کے طالب علم مدینہ کی اقامت کو ترجیح دیتے تھے، ارشاد نبوی ”والمدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون“ [1] نے مدینہ کی اقامت کو اور بھی قابل رشک بنا دیا۔

امام زہری رحمہ اللہ کی جائیداد شام میں تھی اور زیادہ تر اقامت مدینہ میں رکھتے تھے، کاروباری سلسلہ میں امام کی آمد و رفت کا تعلق شام سے بھی رہا۔ بعض حلقوں نے امام زہری رحمہ اللہ کی مدینہ میں اقامت کا انکار کیا ہے:

> ”غرض نہ مدینہ طیبہ کبھی ان کا یا ان کے آباؤ اجداد کا وطن رہا، نہ انھوں نے وہاں وفات پائی، نہ ہی وہاں دفن ہوئے۔“

(طلوع اسلام: جلد: ۳/ شمارہ: ۹)

اگر وطنیت کے لئے آباؤ اجداد کا قیام یا وفات اور وہاں دفن ہونا ضروری ہے، تو ہم اعتراف کرتے ہیں کہ زہری مدنی نہ تھے، واقعی یہ تینوں شرطیں امام زہری میں نہیں پائی گئیں، لیکن شاید ان شرائط سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مدنی کہنا درست نہ ہو، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد نے مدینہ کی اقامت کبھی اختیار نہیں فرمائی

---

[1] صحيح البخاري: أبواب فضائل المدينة، باب من رغب عن المدينة، رقم الحديث (١٧٧٦)
صحيح مسلم: كتاب الحج، باب الترغيب في المدينة عند فتح الأمصار، رقم الحديث (١٣٨٨)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مدنی کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ ان کی وفات کوفہ میں ہوئی اور دفن بھی مدینہ میں نہیں ہو سکے۔ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ قسطنطنیہ میں شہید ہوئے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں شہید ہوئے، ان سے کسی کو بھی مدینہ کا باشندہ کہنا، ان شرائط کے مطابق درست نہ ہوگا، جدید تحقیق ''قابل تحسین'' ہے!

حقیقت حال:

یہ ہے کہ یہ عبارت محض ایک مغالطہ ہے اور حدیث اور اہل حدیث اور ائمہ حدیث کے استخفاف کے لیے ایک ''ہوش مندانہ'' حیلہ ہے، وطنیت کے لئے اس قدر کافی ہے کہ آپ چند سال کسی جگہ اقامت فرمائیں، محدثین چار سال یکجا اقامت کو نسبت اور وطنیت کے لئے کافی سمجھتے ہیں، جیسے کتب اصول حدیث میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے۔ [1]

امام زہری رحمہ اللہ کی مدینہ میں اقامت سے انکار کے لیے اس طویل مقالہ میں اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ملی کہ امام کی جائیداد مقام "أیلہ" میں تھی اور یہ کوئی پختہ دلیل نہیں، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی جائیداد اسلامی قلمرو کے تمام شہروں میں تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جائیداد بھی مختلف شہروں میں تھی، آج کل اقامت کہیں ہوتی ہے اور صاحب ثروت جائیداد دوسری جگہ خریدتے ہیں۔ اقامت اور جائیداد دونوں کی مصالح مختلف ہوتی ہیں، بہت سے دیہاتی امراء کی جائیداد بڑے بڑے شہروں میں ہوتی ہے اور عموماً شہری امراء مربعہ جات اور زمین دیہات میں خریدتے ہیں، اس سے وطنیت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

بحث کا وقت:

اس بحث کے لیے مناسب وقت قریب کی صدیوں ہی میں ہوسکتا ہے، اتنی

---

[1] تدریب الراوي (۲/ ۳۸۵)

صدیوں کے بعد اس تحقیق کے لیے اچھے نتائج کی توقع مشکل ہے، پھر اس بحث کا حق امام زہری رحمہ اللہ کے رفقاء اور ائمہ حدیث ہی کو ہے، جو اوطان اور بلاد کے بہتر واقف اور آشنا تھے۔ محترم تمنا اور ان کے رفقاء صدیوں بعد محض قرائن اور مفروضات کی بناء پر صحیح فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے، خصوصاً جب کہ فیصلہ پہلے کر لیا گیا ہو اور دلائل کی تلاش بعد میں حسب ضرورت کی گئی ہو، تمنا صاحب کتنا ہی دعویٰ کریں، مگر وہ صاحب فن نہیں، ان کا شمار بہر حال فن حدیث کے مخالفین ہی میں ہوگا، اس لئے ایسے دعوے جھوٹ اور بڑی بات ہی کے مصداق ہونگے!

ائمہ فن کا فیصلہ:

ائمہ فن اور علماء موالید نے امام زہری کے شام سے تعلقات کا ذکر فرمایا ہے، ان کی جائیداد کا تذکرہ بھی شام میں معلوم ہے، اس کے باوجود ان کی مدنیت پر متفق ہیں، علامہ جزائری "توجیه النظر" (نوع: ٤٩) میں تابعین سے مشاہیر ائمہ حدیث کے ذکر میں فرماتے ہیں:

" فمنهم من أهل المدينة: محمد بن مسلم الزهري "[1] (صفحه: ١٩٩)

حافظ سلیمان بن موسیٰ فرماتے ہیں کہ الجزیرہ کا علم میمون بن مہران کی معرفت اور بصرہ کا علم حسن بصری کی معرفت اور حجاز کے علوم امام زہری کے توسط سے اور شام کے علم بواسطہ مکحول اگر ملیں، تو قابل قبول ہونگے۔[2] اہل فن کے نزدیک حجاز کے علوم میں امام زہری سب سے زیادہ مستند ہیں، انھیں شامی تصور کیا جائے یا مدنی، بہر حال

---

1. توجيه النظر (١/ ٤٦٨)
2. دیکھیں: الكامل في الضعفاء لابن عدي (٣/ ٢٦٤) الثقات لابن حبان (٥/ ٤١٨) تهذيب الكمال (٢٨/ ٤٧١)

حجازی اور مدنی علوم میں انھیں مقام استناد حاصل ہے، یہی اصل تکلیف ہے جس کی نیابت مولانا تمنا فرماتے ہیں۔

مدینہ اور شام:

امام زہری رحمہ اللہ شام میں پیدا ہوئے، پونے تین ماہ میں قرآن عزیز پڑھا، اس کے بعد علوم سنت کی طرف توجہ فرمائی، اس لئے مدینہ کی اقامت کو مفید سمجھا، سعید بن المسیب کی خدمت میں آٹھ سال ٹھہرے اور حدیث اور اس کے متعلقات حاصل فرماتے رہے، چنانچہ ایک دفعہ قحط پڑا، امام نے محسوس کیا کہ اس کا اثر ان کے خاندان پر شام میں بھی ضرور ہوگا، شام پہنچے، خلیفہ عبدالملک کو ایک مسئلہ کے متعلق تشویش تھی، سعید بن میّب سے حضرت عمر کا فیصلہ سن چکے تھے، مگر اب حافظہ میں مستحضر نہ تھا، امام زہری سعید بن میّب کے علوم اور ادبیات میں کافی مہارت رکھتے تھے، انھیں عبدالملک کے پاس حاضر کیا گیا، امام زہری کی ملاقات سے عبدالملک کو تسکین ہوگئی، عبدالملک ان کی ذہانت اور استحضار سے خوش ہوئے اور ان کے خاندان کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا۔[1] امام زہری کا تشیع بقول مولانا عمادی شاید اسی معمولی وظیفہ کا اثر ہوگا! ﴿ كبرت كلمة تخرج من أفواههم ﴾[2]

اس کے بعد امام زہری قیام مدینہ کے باوجود شام آتے رہے اور طلب علم میں مشغول رہے، خود امام زہری کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

”فقضىٰ ديني وأمر لي بجائزة وقال: اطلب العلم فإني أرىٰ لك عينا حافظة، وقلبا ذكيا، فرجعت إلى المدينة أطلب العلم وأسمعه“

(البدایہ: ۹/ ۳٤۱)

---

[1] طبقات ابن سعد (۲/ ۳۸۹) المعرفة والتاريخ (۱/ ٦۲۰) سير أعلام النبلاء (٥/ ۳۲٦)

[2] الكهف: ٤

یعنی عبدالملک نے میرا قرض ادا کر دیا، مزید وظیفہ عطا فرمایا اور کہا کہ علم پڑھو، تمھاری آنکھوں سے حفظ کے آثار نمایاں ہیں اور تم بہت ذہین معلوم ہوتے ہو، چنانچہ میں مدینہ منورہ واپس آ کر تعلیم میں مشغول ہوگیا اور علم کے لیے تگ ودو کرنے لگا۔

امام زہری فرماتے ہیں:

" لكنت خمسا وأربعين سنة أختلف من الحجاز إلى الشام ومن الشام إلى الحجاز فما كنت أسمع حديثا أستطرفه "

(البدایه: ۹/ ۳٤۲)

میں پینتالیس سال حجاز اور شام میں آتا جاتا رہا، میری نظر میں کوئی حدیث نئی معلوم نہیں دیتی۔

یعنی میرے پاس احادیث کا اتنا ذخیرہ ہوگیا کہ میری نظر میں کوئی حدیث نئی نہ رہی۔

امام مالک فرماتے ہیں:

" كان الزهري إذا دخل المدينة لم يحدث بها أحد حتى يخرج "

(البدایه: ۹/ ۳٤۳)

"جب زہری مدینہ میں رہتے، ان کی موجودگی میں کوئی شخص حدیث کا درس نہ دیتا۔"

ابن عیینہ فرماتے ہیں:

" محدثوا أهل الحجاز ثلاثة: الزهري ويحيىٰ بن سعيد وابن جريج " (البدایه: ۹/ ۳٤۳)

مدینہ میں مستقل اقامت کیوں نہ فرمائی؟ اس کا جواب امام زہری خود فرماتے ہیں، سفیان فرماتے ہیں لوگوں نے زہری سے کہا، آپ عمر کا آخری حصہ مدینہ میں

مستقل اقامت کریں اور مسجد نبوی میں تشریف رکھیں اور تعلیم و تذکیر کا سلسلہ شروع کریں، انھوں نے جواب دیا کہ پھر تو لوگ میرے پیچھے چلنا شروع کر دیں گے، میں ایسا نہیں چاہتا، میں دنیا میں زاہدانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ [1]

ابن خلکان فرماتے ہیں:

"أحد الفقهاء والمحدثين وأعلام التابعين بالمدينة" [2] (۱/ ٤٥١)

زہری مدینہ میں فقہاء و محدثین میں بہت بڑے عالم تھے۔

غالباً امام زہری کی مدنیت میں اب کوئی شبہ نہیں رہے گا۔محترم مولانا تمنا صاحب بے مقصد مضامین پر اتنا لمبا اور پھر بے دلیل لکھتے ہیں کہ اس پر تنقید کرتے بھی شرم محسوس ہوتی ہے، تعجب ہوتا ہے کہ محترم تمنا صاحب اور ان کے رفقاء ائمہ حدیث سے کیا چاہتے ہیں؟ کیوں ناراض ہیں اور پھر ایسے اوچھے ہتھیاروں سے کیوں حملہ آور ہوتے ہیں، جن سے ان کا علم اور دیانت مشتبہ ہو رہے ہیں؟ ان پھونکوں سے تو یہ چراغ نہیں بجھیں گے، یہ روش یورپ کے مشککین کی ہے کہ وہ دور از کار احتمالات پیدا کر کے تشکیک کی راہ کھولتے ہیں، مذہبی و دینی معاملات میں ان کے دینی اکتشافات کی یہی پوزیشن ہے اور یہ راہ علم و دیانت سے بمراحل دور ہے، اگر فرصت ملی تو ان گزارشات کے آخر میں ان اوہام و تشکیکات کی تفصیل بیان کروں گا، جس سے ان شاء اللہ واضح ہوگا کہ تمنا صاحب کے یہ مضامین لوجہ اللہ نہیں لکھے گئے۔

امام زہری کے آباؤ اجداد کی اقامت حجاز تو آپ نے ذکر کی ہے، آخر وہ غزوہ بدر میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے، تو اس وقت وہ اس مقابلہ کے لیے

---

[1] المعرفة والتاريخ (۱/ ٦٤٢) تاريخ دمشق (٥٥/ ۳۷۹)

[2] وفيات الأعيان لابن خلكان (٤/ ۱۷۷)

شام سے تو نہیں آئے تھے، ان کا قیام حجاز ہی میں ماننا پڑے گا۔ اس لئے تمنا صاحب کے اس فقرہ کی میں تصدیق کرتا ہوں کہ انھوں (زہری) نے وہاں (مدینہ) وفات پائی، نہ وہاں مدفون ہوئے اور امید رکھتا ہوں کہ وہ بھی انشراح سے اس امر کی تصدیق کریں گے کہ قیام بہر حال مدینہ طیبہ میں رہا، آٹھ سال سعید بن میبّب کی خدمت اور ۴۵ سال کی آمدورفت خود امام کا اپنا بیان ہے۔ ❶

امام کی کتابیں:

''امام زہری کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔''

تمنا صاحب نے یہ فقرہ بحوالہ تذکرۃ الحفاظ للذھبي (۲/ ۱۰۶) لکھا ہے، تذکرۃ الحفاظ مطبوعہ حیدر آباد اس وقت میرے سامنے ہے، یہاں یہ حوالہ نہیں ہے، صفحہ ۱۰۶ جلد ۲ میں حافظ دارمی کا ترجمہ ہے، جس میں زہری کا نام تک نہیں، البتہ جلد اول کے صفحہ ۱۰۶ پر امام زہری کا تذکرہ موجود ہے، وہاں تمنا صاحب کا حوالہ ناپید ہے، ❷ البتہ اس کے خلاف ایک حوالہ حضرت معمر سے موجود ہے، وہ فرماتے ہیں:

ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری سے بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن خلیفہ ولید بن یزید

---

❶ حلية الأولياء (۳/ ۳۶۲) المعرفة والتاريخ (۱/ ۶۳۶) سير أعلام النبلاء (۵/ ۳۳۵)

❷ یہ حوالہ تذکرۃ الحفاظ (۱/ ۱۱۱) میں بضمن ترجمہ زہری بایں الفاظ موجود ہے: " لم يكن للزهري كتاب إلا كتاب فيه نسب قومه "

قرۃ بن عبدالرحمٰن بن حیویل کا یہ قول تذکرۃ الحفاظ میں اگرچہ مکمل سند کے ساتھ مروی نہیں، لیکن تاريخ أبي زرعة (۱/ ۴۱۰) المعرفة والتاريخ (۱/ ۶۴۱) الكامل في الضعفاء (۶/ ۵۳) تاريخ دمشق (۵۵/ ۳۲۱) میں من طريق أبي مسهر ثنا يزيد بن السمط ثنا قرة بن عبدالرحمن ...... باسند مذکور ہے، اس سند کے بنیادی راوی " قرة بن عبدالرحمن بن حيويل " پر بحیثیت راوی حدیث جرح موجود ہے، لیکن امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" ماأحد أعلم بالزهري من ابن حيوئيل " امام ابن حبان رحمہ اللہ نے اس قول پر اعتراض کیا ←

کی موت کے بعد زہری کی کتابوں کے کئی انبار جانوروں پر لدے ہوئے اٹھائے گئے۔ (أيضاً: البدايه:٩/ ٣٤٢) ❶

یہ حوالہ تمنا صاحب کے خلاف ہے۔ تذکرہ (ص: ۱۰۳) کا ایک اور حوالہ بھی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں:

"كنا نطوف مع الزهري على العلماء، ومعه الألواح والصحف." ❷

ہم زہری کے ساتھ اہل علم کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان کے پاس صحیفے اور تختیاں ہوتی۔

ایک اور حوالہ بھی سن لیجیے، ابن خلکان فرماتے ہیں:

"وكان إذا جلس في بيته وضع كتبه حوله فيشتغل بها عن كل شيء من أمور الدنيا فقالت له امرأته يوما: والله! لهذه الكتب أشد علي من ثلاث ضرائر!" (جلد: ١/ص: ٤٥١)

امام زہری کے گرد وپیش ان کے گھر میں کتابیں ہوتی تھیں، ایک دن ان کی اہلیہ نے کہا کہ یہ کتابیں تین سوکنوں سے مجھے زیادہ دکھ دیتی ہیں!

غالباً تمنا صاحب امام زہری کے متعلق ان کی اہلیہ سے زیادہ واقفیت کا دعوی نہیں کریں گے۔ ان حوالوں کے بعد اگر تمنا صاحب کا حوالہ کہیں مل بھی جائے، تو اس

← کہ زہری کے کبار تلامذہ مالک، معمر، یونس وغیرہ زہری کی حدیث کا قرہ بن عبدالرحمٰن سے زیادہ علم رکھتے ہیں، تو اس کے جواب میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ امام اوزاعی رحمہ اللہ کے قول کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ زہری کے حالات کا زیادہ علم رکھتے تھے: "فيظهر من هذه القصة أن مراد الأوزاعي أنه أعلم بحال الزهري من غيره لا فيما يرجع إلى ضبط الحديث، وهذا هو اللائق والله أعلم" (تهذيب التهذيب: ٨/ ٣٣٣) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے قبل بعینہ یہی توجیہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے۔ (تقدمة الجرح والتعديل: ٢٠٥)

❶ نیز دیکھیں: طبقات ابن سعد (٢/ ٣٨٩) المعرفة والتاريخ (١/ ٦٣٨) حلية الأولياء (٣/ ٣٦١)

❷ دیکھیں: جامع بيان العلم (١/ ١٥٥)

کا معنی یہی ہوگا کہ ان کے پاس کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جسے انھوں نے تصنیف فرمایا ہو، یہ کوئی عیب نہیں، صحابہ اکثر اصحاب التصانیف نہیں تھے، اکثر علما ایسے گزرے ہیں، جو جلالت قدر کے باوجود بحیثیت اصحاب التصانیف ان کا تذکرہ نہیں ملتا، امام زہری کا دور جمع وکتابت کا دور تو ہے، مگر تدوین کی طرف اس وقت توجہ زیادہ نہ تھی۔

۴۔ جمع حدیث اور تدوین حدیث

آج تعلیم یافتہ طبقہ عموماً ضعف حفظ کا مریض ہے، یادداشت کا تمام تر انحصار نوٹوں اور ڈائریوں پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ قوت حفظ معطل ہونے کی وجہ سے روز بروز کمزور ہو رہی ہے، یہ مریضوں کا لشکر جب ڈائریاں اور نوٹس بغلوں میں دبائے سکولوں اور کالجوں سے نکلتا ہے، تو انھیں باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا قوت حافظہ ڈائری کا کام بھی دے سکتی ہے یا نہیں؟ یا حافظہ کے اعتماد پر سینکڑوں صفحات ازبر کیے جا سکتے ہیں؟ عربوں کے حافظوں کا تذکرہ ان کی نگاہوں میں صرف ایک افسانہ ہے، ہزارہا نام از بر، لکھوکھہا اشعار کا ضبط ان کی نظر میں صرف ایک کہانی ہے، محدثین اور ائمہ رجال کی مساعی اور قوت حفظ کا تذکرہ ان کے لیے اور بھی مصیبت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں ضبط اور یقین کے لیے کامیاب ذریعہ صرف قلم ہے اور بس!

ہمارے اہل قرآن دوست بھی عموماً اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اسی گرد و پیش میں ان کی تربیت ہوئی ہے، اس لیے وہ یقین کرتے ہیں کہ حدیث کا کوئی مجموعہ آنحضرت ﷺ نے اپنی نگرانی میں نہیں لکھوایا، اس لئے حدیث کا ضبط مشکوک ہے، اگر یہ حجت ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس کے ضبط اور تحفظ کے لیے کوئی مجموعہ ضرور لکھواتے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ احادیث دین کا آدھا حصہ تھیں، تو جس رسول

نے دین کے دوسرے آدھے حصے کو اس اہتمام سے محفوظ کرا کے امت کو دیا تھا، کیا اس رسول کا یہ فریضہ نہ تھا کہ دین کے اس دوسرے جز کو بھی اسی طرح محفوظ کرا کے امت کو دیتے، سوچئے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ کیا اس سے سمجھا جائے کہ معاذ اللہ رسول اللہ نے فریضہ ابلاغ دین میں اس قدر کوتاہی کی؟ ہماری تو اس تصور سے روح کانپتی ہے، لامحالہ اس سے اسی نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ خود رسول اللہ بھی اپنی احادیث کو جزو دین نہیں سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ انھیں مرتب کر کے قرآن کی طرح لوح محفوظ کی شکل میں امت کو دیا جائے۔" (طلوع اسلام: شمارہ نمبر: ۴، جلد: ۴)

ساری تان اس چیز پر ٹوٹ رہی ہے کہ چونکہ احادیث کا مجموعہ لکھا نہیں گیا، اس لئے یہ حجت نہیں، حتی کہ پیغمبر علیہ السلام اپنی زبان سے جو فرماتے، اسے بھی دلیل کے طور پر نہیں بلکہ یونہی فرما دیتے، مخاطبین پر اس ارشاد گرامی کا ماننا ضروری نہ تھا۔

﴿كبرت كلمة تخرج من أفواههم﴾ [1]

دلیل کی معقولیت دوسری بات ہے، واقعہ کے لحاظ سے اتنا ضرور صحیح ہے کہ آج کل جب کہ حافظے خراب ہو رہے ہیں، تحریر یقیناً محفوظ ہے اور تحریر سے اعتماد بھی زیادہ ہو جاتا ہے، خود قرآن نے اخذ و اعطا کے معاملات میں لکھنے پر زور دیا ہے، [2] لیکن بحث اس میں ہے کہ آیا تحریر رد و قبول اور استناد و حجیت میں معیار کی حیثیت رکھتی ہے یا نہیں؟ ہماری حتمی رائے ہے کہ کتابت کو معیاری حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

قوت حافظہ واقعات، حوادث اور اقوال کے ضبط کے لیے ایک قدرتی عطیہ ہے، جو فطرت انسانی کو ودیعت فرمایا گیا ہے، تحریری مستندات کا انحصار بھی بالآخر قوت حافظہ پر ہے، اگر قوت حافظہ ہی معطل یا مختل ہو جائے، تو قلم کی ساری ہوش مندیاں

[1] الکھف: ۵

[2] دیکھیں: البقرۃ: ۲۸۲

وہیں ختم ہو جائیں گی، تحریر میں ظن اور کتابت میں خلل سے کتابت کی افادی حیثیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح نسیان کے امکان سے قوت حافظہ پر بے اعتمادی نہیں کی جا سکتی، نہ کتابت میں ہی کوئی ایسا معجزہ ہے، جس کی وجہ سے انسان غلطی کے متعلق بالکل مطمئن ہو اور نہ حافظہ ہی کے متعلق ایسا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، سارا انحصار نسیان اور اغلاط کی کثرت پر ہے، اگر حافظہ کثیر الغلط ہو، اس کی روایت مقبول نہیں ہوگی، اور کاتب کثیر الغلط ہو، اس کی تحریر کا بھی یہی حال ہے، فی الجملہ غلطی سے کوئی بھی محفوظ نہیں، فطرت کا فیصلہ یہی ہے، یہ بھی محدثین کا اصول ہے۔ جو لوگ کتابت پر حفظ سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، انھیں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنا چاہیے، احادیث میں حفظ پر اعتماد کی وجہ سے جو حضرات اس فن پر بدگمان ہیں، انھیں سوچنا چاہیے کہ تحریر و کتابت کی تصحیح کے لیے بھی حفظ پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔

حفظ اور قرآن:

آنحضرت ﷺ لکھنا نہیں جانتے تھے، قرآن عزیز نے آنحضرت ﷺ کی امیت کو آنحضرت ﷺ کی صداقت کے لیے دلیل قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ شروع میں قرآن مجید کو حفظ ہی سے فرماتے، صحابہ کا انحصار بھی حفظ ہی پر تھا، جو لوگ لکھتے یا لکھواتے، وہ حفظ کے بعد ان پرزوں کی حفاظت ضروری نہیں سمجھتے تھے، بعض اس قسم کے نوشتے بکریاں کھا گئیں،[1] اس سے کوئی نقصان محسوس نہیں کیا گیا، کیونکہ حافظہ نے اسے ضبط کر لیا تھا۔ البتہ نوشتہ اگر حافظہ میں نہ ہو تو اس کا ضائع ہونا زیادہ ممکن ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی میں قرآن کو مختلف یادداشتوں کی صورت میں ضرور لکھا گیا، لیکن اس کی کتابی صورت موجود نہ تھی، ترتیب کا زیادہ تر انحصار حافظہ پر ہی تھا، بصورت کتاب حفاظت کا خیال خلیفہ اول کے زمانہ میں پیدا

---

[1] دیکھیں: سنن ابن ماجه، برقم (١٩٤٤) مسند أحمد (٦/٢٦٩) اس کی سند ''حسن'' ہے۔

ہوا، جب بعض لڑائیوں میں حافظین قرآن کثرت سے شہید ہو گئے، اس وقت حفظ اور ان مختلف یاد داشتوں سے معاً استفادہ کیا گیا۔❶ قرآن عزیز کی حفاظت میں قریباً پچیس سال تک زیادہ اعتماد حفظ ہی پر رہا اور ترتیب کی حفاظت کے لیے تو حافظہ کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت ایک مستند نسخہ کی موجودگی کے باوجود جب مختلف صوبوں میں قرآن کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی گئی، تو اس وقت بھی حفاظ ہی کی خدمات سے استفادہ کیا گیا، اس لیے اس چیز کے قبول کرنے میں زیادہ تأمل کی ضرورت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور اس کے بھیجنے والے خدا نے دین کے دونوں حصوں کی حفاظت میں حفظ پر اعتماد فرمایا اور دونوں کی حفاظت میں حسب حال جو کچھ مناسب اور ضروری تھا، اس سے چشم پوشی نہیں فرمائی۔

حفاظت اور تدریجی ارتقاء:

حدیث اور قرآن میں ایک بیّن فرق ہے، وہ یہ کہ قرآن کریم کے الفاظ کی حفاظت ضروری تھی اور حدیث کے مفہوم اور مقاصد کا تحفظ مقصود تھا۔ قرآن میں قانون کی اساس اور بنیادی نصوص تھے اور حدیث میں اس کے مقاصد کی وضاحت کے لیے ہدایات اور اس ماحول کا تحفظ جس میں قرآن عزیز نازل ہوا، قرآن عزیز کے فہم میں لغت پر اعتماد کرتے ہوئے اس ماحول کو نظر انداز کرنا، جس میں وہ نازل ہوا، قرآن اور لغت دونوں پر ظلم ہے، آج بھی تقاریر کے فہم میں ماحول جس قدر معاون ہو سکتا ہے، لغت اس کی ضرورت کا بدل نہیں پیش کر سکتی۔

اس لیے حدیث کے متعلق یہ مطالبہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کتابی صورت کیوں نہ دی؟ اس کی حیثیت بال برے سے زیادہ نہیں۔ آیات قرآنی میں ربط کے باوجود اس کی مصنفانہ تبویب نہیں کی گئی، تکرار واقعات میں ایسے مقاصد پیش نظر رکھے ہوئے

❶ صحيح البخاري: كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، رقم الحديث (٤٧٠١)

ہیں، جس میں انسانی تصانیف کا تتبع نہیں کیا گیا، بلکہ ہدایت کی اہمیت پیش نظر رہی۔

حدیث کا موقف زمانہ نبوت میں:

حدیث جس میں قرآن اور امت دونوں کی خدمت مطلوب تھی، آنحضرت ﷺ کے سامنے تصنیف و کتابت کی قیود میں کیونکر آسکتی تھی؟ آنحضرت ﷺ نے نہ مصنفانہ انداز میں لکھا ہے اور نہ ہی آنحضرت ﷺ نے بحیثیت مصنف اسے مرتب فرمایا، بلکہ بعض وقت قرآن کے بعض مضامین کی وضاحت فرمائی، کبھی ایسے احکام ارشاد فرمائے، جن پر قرآن ساکت تھا، کبھی قرآن کی بعض ہدایات پر عمل فرمایا، جسے صحابہ نے نقل کر لیا، کبھی کسی غلطی پر متنبہ فرمایا، کبھی قرآن سے استنباط فرمایا، کبھی کام کو بنظر استحسان دیکھا، کبھی کسی فعل پر سکوت فرمایا، یہ حوادث کبھی سفر میں ہوئے، کبھی حضر میں، کبھی رات کو، کبھی دن کو، کبھی جماعت کے سامنے، کبھی منفرداً، کبھی گھر کی چار دیواری میں، کبھی محکمہ قضاء میں، کبھی وعظ و نصیحت کے طور پر، کبھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار خوش طبعی و مذاق سے فرمایا، کبھی رنج میں، ان تمام حالات اور ان کے مقتضیات کا مصنفانہ انداز سے جمع کرنا مشکل ہے۔

آنحضرت ﷺ سے کتابت حدیث کا مطالبہ کرنا اس نوعیت کا مطالبہ ہے، جیسے بعض غیر مسلم حضرات کہتے تھے کہ قرآن کتاب تو اچھی ہے، مگر اس میں مصنفانہ ربط نہیں، ابواب، فصول اور مقدمات نہیں، ورنہ یہ کتاب بہت ہی مفید ثابت ہوتی۔ غور فرمایئے جن مقاصد کے لیے اور جن ظروف و احوال میں قرآن عزیز نازل ہوا، آیا ان میں تبویب اور فصول ممکن اور مناسب تھے؟ ایسے سوال وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو قرآن عزیز کے متعلق ہے پوری کے مریض ہیں!

حدیث کے متعلق مصنفانہ ضبط کا مطالبہ اسی ذہن کی پیداوار ہے، جو اس کے

موقف سے نا آشنا ہے اور اس ماحول سے ناواقف ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشادات فرمائے۔

جس طرح قرآن عزیز کا نزول بمقتضائے ضرورت اور حسب وقوعِ حوادث ہوا، ربط کے باوجود اس میں کوئی فقہی تبویب نہیں یا ترتیب نہیں ہو سکی، اسی طرح حدیث اور اس کی تشریحات ظروف و احوال اور حوادث اور واقعات سے منسلک ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ کے دست مبارک سے مصنفانہ ترتیب سے جمع ہونا مشکل تھا، بعد کے آنے والوں نے قرآن میں بھی تبویب کی کوشش کی، احادیث میں بھی فقہی ترتیب سے دفاتر جمع کئے، جو آج حفاظت کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہیں، یہ ان نوشتوں کی تدریجی صورت ہے، جو مقتضیات احوال کے ساتھ ارتقا کی منازل سے گزرتی رہی۔

۵۔ کتابت حدیث

اسلام کے ابتدائی دور میں بعض اہل علم نے آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو لکھنا شروع کیا، تو آنحضرت ﷺ نے اسے حکماً بند کر دیا،[1] اس کے بعد بہت سے اہل علم صحابہ اور ائمہ تابعین نے اور بعض دوسرے ائمہ حدیث نے کتابت سے روکنے کی تصریح فرمائی۔[2] بعض اہل علم نے اسے مطلقاً نہی پر محمول فرمایا اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال کچھ مدت کافی مقبول رہا، بعض اہل علم لکھنے سے روکتے رہے، بعض اپنے نوشتوں کو دھو ڈالتے رہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بتدریج یہ نظریہ ختم ہو گیا اور تمام اہل علم نے لکھنے کی ضرورت کو قبول کر لیا،[3] البتہ ہر تحریر کے لیے شیخ کی اجازت ضروری

---

[1] صحیح مسلم: كتاب الزهد والرقائق باب التثبت في الحديث وحكم كتابة العلم، رقم الحديث (٣٠٠٤) نیز دیکھیں: تقييد العلم (ص: ٤٩)

[2] دیکھیں: تقييد العلم (ص: ٢٩) جامع بيان العلم (١/ ١٢٩)

[3] بالفاظ دیگر کتابت حدیث کے جواز و استحباب پر اجماع ہو گیا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

تصور ہوئی، عمرو بن شعیب کے نوشتہ میں یہی کمی تھی۔

منکرین حدیث کے کیمپ سے اس نہی کی بالکل نئی توجیہہ فرمائی گئی، ان کا خیال ہے کہ حدیث کی تحریر سے روکنا اس لئے تھا کہ حدیث حجت نہیں اور شرعاً اسے اصول اور استناد کی حیثیت حاصل نہیں، چنانچہ "**طلوع اسلام**" (سنہ ۵۰ء شمارہ: ۹) میں تمنا صاحب کے مضمون کے ضمن میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔ میری ناقص رائے میں یہ استدلال اتنا ہی کمزور اور ناکام ہے، جیسے چاول کی لمبائی سے زمین کی گولائی کا استدلال، تاہم یہ دلیل ایک ایسے حلقہ کی طرف سے آئی ہے، جسے اپنے علم اور اپنی قوت استدلال پر ناز ہے، بلکہ اہل علم کی تنقیص ان کا دل پسند شیوہ ہے، اس کے ساتھ ہی ان کا ایک ایسے حلقے پر اثر ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لئے مناسب ہوگا کہ اس پر مفصل گزارش کی جائے، مبحث کی نزاکت اور ہمارے دوستوں کی مغالطہ آمیز انداز کی وجہ سے بحث کے طول کو برداشت فرمایا جائے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ مانعین کتابت اور مجوزین کی فہرست آپ حضرات کے سامنے رکھی جائے، اس معاملہ میں استیعاب کا دعوی تو مشکل ہے، لیکن بہت حد تک یہ فہرست موجب تسکین ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی ان اسباب کے وجوہ کا تذکرہ جس کی بنا پر کتابت سے روکنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اگر یہ ضرورت دائمی ہو، تو رکاوٹ دائمی ہوگی، ورنہ کتابت سے روکنا وقتی ہوگا اور حجیت حدیث پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا اور نہ ہی منکرین حدیث کو اس سے کچھ فائدہ، بلکہ اگر قرائن و احوال سے استدلال کی مجھے اجازت دی جائے، تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس طائفہ کے ارادے غلط ہیں اور نیت خراب!

﴿وما أبرى نفسيْ إن النفس لأمارة بالسوء﴾ [1]

---

[1] یوسف: ۵۳

مجوزین کتابت	مانعین کتابت
۱۔ابوہریرہ	۲۔ابوسعید خدری
۲۔عبداللہ بن عمرو	۲۔ شعبی
۳۔عمر بن عبدالعزیز	۳۔زہری رحمہ اللہ
۴۔ابو الملیح	۴۔قتادہ
۵۔معاویہ بن قرہ	۵۔اوزاعی
۶۔انس بن مالک	۶۔ابراہیم
۷۔ابان	۷۔ابن سیرین
۸۔ابوامامہ باہلی	۸۔ہشام بن حسان
۹۔بشیر بن نہیک	۹۔سعید بن عبدالعزیز
۱۰۔عمر بن خطاب	۱۰۔عبیدہ
۱۱۔ابن عمر	۱۱۔مجاہد
۱۲۔سعید بن جبیر	۱۲۔ابن مسعود
۱۳۔ابن عباس	۱۳۔ابونضرہ
۱۴۔عبید المکتب	۱۴۔ابوموسیٰ
۱۵۔عبداللہ بن حنش	۱۵۔زید بن ثابت
۱۶۔رجا بن حیوہ	۱۶۔عبداللہ بن عمرو
۱۷۔عطا بن ابی رباح	۱۷۔یحییٰ بن جعدہ
۱۸۔نافع	۱۸۔أشعث عن أبیه

۱۹۔ سفیان	۱۹۔ علی بن ابی طالب
۲۰۔ حسن بن علی	۲۰۔ علقمہ
۲۱۔ سالم	۲۱۔ منصور
۲۲۔ ابن مسعود	۲۲۔ مغیرہ
۲۳۔ ضحاک	۲۳۔ اعمش
۲۴۔ ابن شہاب زہری	۲۴۔ یحییٰ بن سعید
۲۵۔ امام مالک رحمہ اللہ	۲۵۔ ابوہریرہ
۲۶۔ امام احمد بن حنبل	
۲۷۔ یحییٰ بن معین	
۲۸۔ ابن عبدالبر	
۲۹۔ امام بخاری	
۳۰۔ امام مسلم	
۳۱۔ امام ترمذی	
جمیع ائمہ حدیث	

یہ فہرست سنن دارمی [1] اور جامع بیان العلم لابن عبدالبر [2] اور بعض دوسری کتب حدیث سے ماخوذ ہے۔ [3]

---

[1] سنن الدارمي (۱/ ۱۳۰، ۱۳۶)

[2] جامع بیان العلم (۱/ ۱۲۹، ۱۴۱)

[3] مندرجہ بالا جدول اختصار کے پیش نظر بعض کتب سے مدون کیا گیا ہے، ذیل میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے کتابت حدیث کا جواز قولاً یا عملاً مروی ہے: ←

لکھنے سے کیوں روکا گیا؟

اس فہرست پر غور کرنے سے آپ محسوس کریں گے کہ بعض ائمہ کے اسماء گرامی مانعین میں بھی مرقوم ہیں اور مجوزین میں بھی، اس لئے قدرتاً آپ کو اضطراب ہوگا اور آپ ان اسباب و وجوہ کی تلاش کریں گے، جن کی وجہ سے یہ دو متضاد فتویٰ اتنے بڑے قابل اعتماد اور مستند ائمہ سے سرزد ہوئے، اس سے آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ اس فتویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

← ۱۔ابوبکر صدیق ۲۔عبداللہ بن عمرو ۳۔ ابو ہریرہ ۴۔ أبو أمامة باهلی ۵۔ أبو أيوب الأنصاری ۶۔ أبوبکر الثقفی ۷۔ أبو رافع ۸۔ أبو سعيد خدری ۹۔ أبو شاه يمنی ۱۰۔ ابوموسیٰ اشعری ۱۱۔ ابو ہند داری ۱۲۔ابی بن کعب انصاری ۱۳۔ اسماء بنت عمیس ۱۴۔ اسید بن حضیر ۱۵۔ انس بن مالک ۱۶۔ براء بن عازب ۱۷۔ جابر بن سمرہ ۱۸۔ جابر بن عبداللہ ۱۹۔ جریر بن عبداللہ بجلی ۲۰۔ حسن بن علي ۲۱۔ رافع بن خدیج ۲۲۔ زید بن ارقم ۲۳۔ سبيعه السميه ۲۴۔ سعد بن عبادہ ۲۵۔ سلمان فارسی ۲۶۔ سائب بن یزید ۲۷۔ سمرہ بن جندب ۲۸۔ سھل بن سعد انصاری ۲۹۔ شداد بن اوس ۳۰۔ ابو ریحانہ انصاری ۳۱۔ ضحاک بن سفیان کلابی ۳۲۔ ضحاک بن قیس ۳۳۔ عائشہ صدیقہ ۳۴۔ عبدالله بن ابي اوفیٰ ۳۵۔ عبداللہ بن زبیر ۳۶۔ عبداللہ بن عباس ۳۷۔ عبداللہ بن عمر بن خطاب ۳۸۔ عبداللہ بن مسعود ۳۹۔ عتبان بن مالک ۴۰۔ علی بن ابی طالب ۴۱۔ عمر بن خطاب ۴۲۔ عمرو بن حزم انصاری ۴۳۔ فاطمه زهراء بنت رسول الله ﷺ ۴۴۔ فاطمہ بنت قیس ۴۵۔ محمد بن مسلمة ۴۶۔ معاذ بن جبل ۴۷۔ معاویہ بن ابی سفیان ۴۸۔ مغیرہ بن شعبہ انصاری ۴۹۔ ام المؤمنین میمونہ ۵۰۔ نعمان بن بشیر انصاری ۵۱۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہم!

دیکھیں: سنن الدارمي (۱/ ۱۳۰) المدخل إلیٰ السنن الکبری (۲/ ۱۲۶) تقييد العلم (ص: ۶۵) جامع بيان العلم (۱/ ۱٤۱) دراسات في الحديث النبوی وتاریخ تدوينه (۱/ ۹۲)

علاوہ ازیں مندرجہ بالا مصادر و مراجع میں سینکڑوں تابعین اور اتباع وغیرہم کے اسماء گرامی مذکور ہیں، جو کتابت حدیث کو جائز بلکہ بسا اوقات مستحب سمجھتے تھے۔

”لا نكتبكم خذوا منا كما أخذنا من نبينا ﷺ“ (۱/۶۱) ❶

ہم تمھیں لکھنے کی اجازت نہیں دیں گے، جس طرح ہم نے آنحضرت ﷺ سے سیکھا، تم بھی اسی طرح سیکھو۔

دوسرے لفظ اس طرح ہیں:

”فاحفظوا كما كنا نحفظ“

تم بھی اسی طرح حفظ کرو، جیسے ہم نے حفظ کیا۔

تیسرے موقعہ پر فرماتے ہیں:

”تريدون أن تجعلوها مصاحف الخ“ کیا تم اسے قرآن بنانا چاہتے ہو؟

اس سے چند امر واضح ہوتے ہیں:

① وہ حدیث کو قرآن کے ہم پایہ نہیں سمجھتے تھے۔

② اس کے باوجود وہ حدیث کا حفظ ضروری سمجھتے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کے ہاں حدیث حجت ہے۔

③ جب مصحف کے متعلق یہ کھٹکا نہ رہے، تو ان کو کتابت حدیث پر کچھ اعتراض نہیں، رکاوٹ کا حکم صرف وقتی ہے اور ضرورت کے لیے کہ کہیں قرآن عزیز سے اختلاط نہ ہو جائے۔ ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ احادیثِ علماء اور فتووں کو لکھنا ناپسند فرماتے تھے، آنحضرت ﷺ کی احادیث کا لکھنا ان کی نظر میں ممنوع نہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ جس کے پاس کوئی نوشتہ ہو، اسے دھو ڈالے:

---

❶ مصنف ابن أبي شيبه (۵/ ۳۱۴) تقييد العلم (ص: ۳۷) المحدث الفاصل (ص: ۳۷۹) جامع بيان العلم (۱/ ۲۴۶)

❷ دیکھیں: تقييد العلم (ص: ۵۷) فتح الباري (۱/ ۲۰۸)

" إنما هلك الناس حيث تتبعوا أحاديث علمائهم وتركوا كتاب ربهم " ❶ (١/ ٦٤)

"لوگوں نے احادیث علماء کا اتباع کیا اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا تو تباہ ہوئے۔"

اس سے احادیث رسول مراد لینا غلطی ہے یا مغالطہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال ہے، فرماتے ہیں:

" لا كتاب مع كتاب الله " ❷ کوئی کتاب کتاب اللہ کی ہمسر نہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

" لا أشوب كتاب الله بشيء أبدا " ❸ میں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی آمیزش گوارا نہیں کر سکتا۔

زید بن ثابت مشتبہ احادیث کا لکھنا ناپسند فرماتے تھے:

" فقال: لعل كل شيء حدثتكم به ليس كما حدثتكم " ❹ (جامع: ٦٥)

جو چیز میں بطور حدیث بیان کروں، ممکن ہے وہ فی الواقع حدیث نہ ہو۔

یہ احتیاط پتہ دیتی ہے کہ حدیث حجت ہے اور ائمہ اسے حجت شرعی سمجھتے تھے،

---

❶ مصنف ابن أبي شيبه (٥/ ٣١٤) جامع بيان العلم (١/ ٢٤٦) اس کی سند میں "جابر بن يزيد الجعفي" راوی ضعیف ہے۔ (تهذيب التهذيب: ٢/ ٤١)

❷ جامع بيان العلم (١/ ٢٤٨)، یہ اثر امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، لہٰذا منقطع اور ضعیف ہے۔

❸ جامع بيان العلم (١/ ٢٤٨) نیز دیکھیں مصنف عبدالرزاق (١١/ ٢٥٧) تقييد العلم (ص: ٤٩) مذکورہ بالا الفاظ کی سند میں عروہ بن زبیر رحمہ اللہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔ (جامع التحصيل: ٢٣٦) سير أعلام النبلاء (٤/ ٤٢٢)

❹ مصنف ابن أبي شيبه (٥/ ٣١٥) جامع بيان العلم (١/ ٢٥٠)

ورنہ اس تاکید اور احتیاط کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے علقمہ اور اسود کی ایک کتاب دھو ڈالی، ابو عبید اس روایت کے راوی فرماتے ہیں:

" إن هذه الصحيفة أخذت من أهل الكتاب فلهذا كره عبدالله النظر فيها "[1] (جامع: ١/ ٢٢)

"یہ کتاب اہل کتاب کے نوشتوں سے ماخوذ تھی، اس لئے عبداللہ بن مسعود نے اسے دیکھنا بھی پسند نہ فرمایا۔"

اہل کتاب کی احادیث پر احادیث نبوی کو قیاس کرنا غلطی ہے، اگر عمداً ایسا کیا جائے، تو خلاف دیانت!

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ لکھنا پسند نہیں فرماتے تھے،[2] لیکن اس کے بعد انھوں نے حدیث کی متعدد کتابیں لکھیں، چنانچہ بشیر بن نہیک فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث لکھیں اور آتی دفعہ میں نے وہ کتاب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر پیش کی اور ان سے اجازت حاصل کی۔[3]

یہی حال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، عنترہ اپنے باپ سے روایت کرتے

---

[1] جامع بیان العلم (١/ ٢٠٤) اسی طرح کے ایک دوسرے اثر کے بعد امام مرہ ہمدانی فرماتے ہیں: "اگر اس صحیفہ میں قرآن مجید یا سنت لکھی ہوتی، تو ابن مسعود اس کو نہ مٹاتے، لیکن وہ اہل کتاب کی کوئی کتاب تھی۔" سنن دارمي (١/ ١٣٤)

[2] سنن الدارمي (١/ ١٣٣) كتاب العلم لأبي خيثمه (ص: ١٤٠) جامع بيان العلم (١/ ٢٥٣) تقييد العلم (ص: ٤٢)

[3] سنن دارمي (١/ ١٣٨) كتاب العلم لأبي خيثمه (ص: ٣٢) المدخل إلى السنن الكبرىٰ (٢/ ٢٤٣)

ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ [1] شعبی فرماتے ہیں:

"ما كتبت سوداء في بيضاء قط ولا استعدت حديثا من إنسان مرتين" [2]

نہ میں نے کبھی لکھا اور نہ ہی کبھی کوئی بات دوبارہ دریافت کی۔

استعادت یہ ہے کہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر وہ اپنے حافظہ کی جودت اور اچھائی کا ذکر فرماتے ہیں کہ نہ مجھے لکھنے کی ضرورت ہے اور نہ بار بار دریافت کرنے کی، اس سے حدیث لکھنے کے خلاف استدلال خوش فہمی ہے۔

ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ تحریری علم مفید نہیں، اس میں تحریر پر اعتماد ہوتا ہے۔ [3] کما قیل: "علم درجلد خویش باید نہ در جلدیش" [4]

یہ ایک نظریہ تھا اور عرصہ تک ائمہ حدیث کو اصرار رہا، وہ تحریر سے حفظ پر زیادہ یقین اور اعتماد کرتے تھے، ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"من ذكرنا قوله في هذا الباب فإنما ذهب في ذلك مذهب العرب لأنهم كانوا مطبوعين على الحفظ مخصوصين بذلك الخ" [5]

"جن لوگوں سے ہم نے لکھنے کے خلاف اقوال نقل کیے ہیں، یہ قدماء عرب کے مسلک کو پسند کرتے تھے، وہ طبعاً حفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ان کی فطری

---

[1] سنن دارمي (١/ ١٣٩) نیز دیکھیں: صحيح البخاري، برقم (٢٣٧٩) صحيح مسلم في المقدمه (ص: ٢٢) مصنف ابن أبي شيبه (٥/ ٣١٤) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اتنی زیادہ کتابیں تھیں کہ اونٹ پر اٹھائی جاتیں۔ طبقات ابن سعد (٥/٢٩٣) المدخل إلى السنن الكبرىٰ للبيهقي (٢/ ٢٤٤)

[2] سنن دارمي (١/ ١٣٥) كتاب العلم لأبي خيثمه برقم (٢٨) جامع بيان العلم (١/ ٢٥٧)

[3] جامع بيان العلم (١/ ٢٦٠)

[4] علم اپنی جلد میں ہونا چاہیے، نہ کہ دوسرے کی جلد میں۔

[5] جامع بيان العلم (١/ ٢٦٣)

خصوصیت تھی۔“

اسی طرح صفحہ (٦٨) میں فرماتے ہیں:

”قال أبو عمر: من كره كتابة العلم إنما كرهه لوجهين:

أحدهما: أن لا يتخذ مع القرآن كتاب يضاهي به،

ثانيهما: ولئلا يتكل الكاتب علىٰ ما كتب فلا يحفظ فيقل الحفظ“ [1]

جن حضرات نے لکھنے سے روکا ان کے دو مطلب تھے کہ ان تحریروں کو قرآن کے برابر اور مشابہ نہ سمجھا جائے اور کتابت پر اعتماد نہ کیا جائے، تاکہ حفظ میں تعطل نہ پیدا ہو جائے۔

حفظ و کتابت حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک لکھا ہوا صحیفہ موجود تھا، جو ہمیشہ ان کی تلوار کے میان میں رہا، [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ممالک اور حکومتوں کی طرف خطوط لکھوائے، زکوۃ کا نصاب اور اس کی مقدار ایک مکتوب حکم نامہ کی صورت میں اطراف ممالک تک پہنچائی۔ [3] زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہ، خالد بن سعید رضی اللہ عنہ، ابان بن سعید رضی اللہ عنہ، علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بطور پرائیویٹ سیکرٹری کام کیا۔

---

[1] جامع بيان العلم (١/ ٢٦٠)

[2] صحيح البخاري: كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يكره من التعمق والتنازع في العلم والغلو في الدين والبدع، رقم الحديث (٦٨٧٠) صحيح مسلم: كتاب الحج، باب فضل المدينة و دعاء النبي صلی اللہ علیہ وسلم فيها بالبركة، رقم الحديث (١٣٧٠)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: دوام حدیث (١/ ١٤٣)

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور شفا نے لکھنا سیکھا۔ ❶ ان حالات میں کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ حدیث لکھنا شرعاً ممنوع تھا؟ مناسب ہوگا کہ منکرین حدیث اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کریں۔ ﴿لعلهم يتقون أو يحدث لهم ذكرا﴾ ❷

حفظ و کتابت میں موازنہ:

قوت حافظہ پر ہمارے ان دوستوں کو اعتماد نہیں، روایات کی اصطلاحی ظنیت سے جس قدر شکوک اور اوہام پیدا ہوئے ہیں، اس کی اصل وجہ قوت حافظہ پر بدگمانی ہے، کتابت کے بعض نقائص کا تذکرہ میری گزارشات میں بھی آیا ہے، اس سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو کہ میں صنعت کتابت کا منکر ہوں یا کتابت میں جو نقائص پائے جاتے ہیں، ان کی وجہ سے بھی کتابت حدیث پر بدگمانی ہے، بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نقائص سے نہ حفظ خالی ہے نہ کتابت، حفظ کے باوجود ہم ظن مصطلح سے مطمئن نہیں ہو سکتے، تو کتابت میں بھی ہمیں اس ظن سے مخلصی میسر نہیں آ سکتی۔

حفظ میں تو ممکن ہے کہ بعض معلومات نسیان کی نذر ہو جائیں، لیکن کتابت کی تصحیفات سے تو حقائق مکتوبہ کا حلیہ ہی بگڑ جاتا ہے، کتابت کی بدحواسیاں اتنی خطرناک ہیں کہ حفظ کی خرابیوں کو اس سے نسبت ہی نہیں۔ اس لیے جو لوگ حفظ کی خرابی کی وجہ سے حدیث کو ظنی سمجھتے ہیں، وہ تحریر و کتابت پر کیوں مطمئن ہیں؟ عقل و دانش کی

---

❶ سنن أبي داود، كتاب الطب، باب ما جاء في الرقى، رقم الحديث (٣٨٨٧) نیز دیکھیں: فتوح البلدان (٣/ ٥٨٠) علاوہ ازیں أم كلثوم بنت عقبہ، عائشہ بنت سعد اور کریمہ بنت مقداد بھی کتابت اور قرأت کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ (فتوح البلدان: ٣/ ٥٨١)

مزید برآں عبداللہ بن سعید بن عاص اور عبادہ بن صامت اہل صفہ کو کتابت اور قرأت کی تعلیم دیا کرتے تھے، دیکھیں: مسند أحمد (٥/ ٣١٥) الإصابة (٢/ ١٠٢)

❷ سورہ طہ: ١٣

موجوگی میں یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنی احادیث کو دین کا جزو نہیں سمجھتے تھے اور اسی لئے انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ انھیں مرتب کر کے قرآن کی طرح محفوظ شکل میں امت کو دیا جائے؟ یہ استدلال، طریق استدلال قطعی غیر معقول ہے اور واقعات سے بے خبری پر مبنی!

کتابت اور آسمانی صحیفے:

تورات اور انجیل کا نظم ایسا نہ تھا، جسے حافظہ قبول کر سکتا، اس لئے ان کتابوں کی حفاظت کا ذریعہ کتابت ہی تھا، ان کا نزول بھی الواح مکتوبہ کی صورت میں رہا، ارباب مذاہب نے بھی ان کی حفاظت کتابت ہی سے کی، کیا پھر کتابت انھیں من وعن محفوظ رکھ سکی؟ اگر کتابت میں مکتوب کی حفاظت کے لیے کوئی جادو کا اثر ہوتا، تو ان کتابوں کی یہ نہ حالت ہوتی، آج عہد جدید میں قریباً ۲۱ آیات ہیں، جن کے متعلق مسیحی علماء یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ متن کا جزو ہیں یا حاشیہ؟ آج ان کتابوں کے تراجم ہمارے سامنے ہیں، اصل زبان میں جو نسخے پائے جاتے ہیں، وہ بھی کسی زبان سے ترجمہ ہو کر آئے ہیں، اصل مکتوب نسخے جو الواح مکتوبہ یا صحف کی صورت میں نازل ہوئے تھے، آج کی دنیا میں ناپید ہیں اور کتابت انھیں محفوظ نہیں رکھ سکی۔ اس ناکام تجربہ کے لیے حدیث اور ائمہ حدیث کو کیوں مطعون کیا جا رہا ہے؟ اگر حدیث زمانہ نبوت میں نہیں لکھی گئی، تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑا؟ جب کتابت کی ضرورت محسوس ہوئی، اسی وقت لکھنے والے پیدا ہو گئے۔

قرآن عزیز:

قرآن عزیز لفظاً متواتر ہے اور اس تواتر کا تعلق بھی حفظ وقراءت سے ہے، کتابت سے نہیں، سب سے پہلا نسخہ خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے حکم سے لکھا گیا، اس کی

حیثیت تذکرہ اور ذاتی یادداشت کی تھی، خلیفہ ثالث نے چند مزید نسخے لکھوا کر مختلف صوبوں اور صدر مقامات میں بھیجے، ان کی تعداد بھی چھ سات سے زیادہ نہ تھی، [1] یہ عدد بھی تواتر کے لیے مفید نہیں، بلکہ اس کی حیثیت بھی حکومت کے تذکرہ ہی کی ہے، تاکہ تصحیح کے لیے بوقت ضرورت اس سرکاری دستاویز کی طرف رجوع کیا جا سکے، یہاں کتابت سے ضبط و تصحیح کا فائدہ تو ہوا، مگر اتنے نسخوں کے وجود سے نہ مصطلحہ ظنیت رفع ہو سکتی ہے، نہ تواتر اصطلاحی ثابت ہو سکتا ہے اور نہ قرآن عزیز کی حجیت میں کوئی نقص واقع ہو سکتا ہے۔ اگر حجیت کے لیے لکھنا ضروری ہو، تو شاید کوئی مسخرہ قرآن عزیز کے اس دور میں اس کی حجیت کا انکار کر دے، جبکہ خلیفہ اول نے اس کے لکھنے کا حکم نہیں دیا تھا اور کچھ بعید نہیں کہ ہمارے مجتہدین کہیں ایسا ہی فرمانے لگیں!

تواتر معنی:

یہ یقین و تواتر کی بحث قرآن عزیز کے الفاظ تک ہے، کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ واقعی قطعی الثبوت اور متواتر ہیں، جہاں تک قرآن عزیز کے مفہوم کا تعلق ہے، اس پر اگر معاف فرمایا جائے، تو عرض کروں گا کہ صرف اہل قرآن کی مختلف پارٹیاں اگر فہم قرآن میں متفق ہو جاتیں، تو ہمیں خوشی ہوتی، مولوی عبداللہ صاحب آنجہانی سے شروع ہو کر مولوی احمد دین، مولوی عنایت اللہ مشرقی، مولوی محمد رمضان گوجرانوالہ، رشید الدولہ گجرات، ملتان اور ڈیرہ غازیخاں کے منکرین حدیث، ادارہ طلوع اسلام اور مصنفین معارف القرآن اگر کسی ایک مفہوم کی تعیین پر مطمئن ہو جائیں، تو ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے معانی کو متواتر تصور کر لیا جائے، لیکن کون نہیں جانتا کہ صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ پھر آپ حضرات غور

---

[1] صحيح البخاري: كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، رقم الحديث (٤٧٠١، ٤٧٠٢)
نیز دیکھیں: فتح الباري (٩/ ٢٠)

فرمائیں کہ تواتر لفظی اور کتابت کو صحت حدیث کے لیے معیار قرار دینے سے کیا حاصل ہے؟

مفہوم تو قرآن عزیز کے لکھا جانے کے باوجود ظنی ہوگا اور ہر مفہوم پر الفاظ کی دلالت ظنی ہوگی۔ خیال ہے کہ مولانا اسلم جیرا جپوری ان گزارشات پر غور کرنے میں ادارہ طلوع اسلام کی اعانت فرمائیں گے اور یقین فرمائیں گے کہ ظن کے بھوت اور انسانی مساعی کے نقائص میں حفظ و کتابت مساوی ہیں۔ حدیث اس لئے ظنی ہے کہ اس کی حفاظت کے تمام ذرائع انسانی حدود کے اندر ہیں، تو قرآن عزیز کی حفاظت کے لیے اس دنیا میں ملائکہ کی کون سے جماعت متعین فرمائی گئی ہے؟ اس شبہ میں مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی بھی اہل قرآن کی طرح انسانی نارسائیوں کے شاکی ہیں، [1] اس لئے وہ بھی سوچیں کہ انسان انسانی اسبابِ تحفظ سے بلند پردازی پر کہاں تک قدرت رکھتا اور اس ظن کا دامن کس قدر وسیع ہے اور اس سے بچنا کس قدر ناممکن؟ ﴿لا يكلف الله نفساً إلا وسعها﴾ [2]

اسباب حفاظت:

حفظ اور کتابت میں نقائص ہیں، جیسے تفصیلاً عرض ہوا، ان دونوں کے ملنے سے بھی نقائص دور نہیں ہو سکے، البتہ ان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ذمہ داری ضروری ہے، انسانی اسباب کو ہر وقت ہموار کرنا، انسانی دلوں کو خدمت کے لیے ہر وقت آمادہ کرنا، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ قرآن کے لیے ہر وقت جمع، ہر وقت حفظ اور حسب اقتضاءِ وقت کتابت کا میسر آنا، یہ خدا کا کام تھا، تورات و انجیل خدا کا کلام ہیں، لیکن ان کو یہ اسباب ہر وقت میسر نہ آ سکے، اس لئے وہ آج موجود ہونے کے باوجود ناپید ہیں۔

---

[1] دیکھیں: تفہیمات (۱/ ۳۵۵)

[2] البقرۃ: ۲۸٦

علم حدیث کی تدوین:

یہی حال احادیث کا ہے، اس کے جمع اور تدوین کا کام تو آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا:

① " رحم اللّٰه امرأ سمع كلامي فوعاها ثم أداها كما سمعها "[1]

اللہ اس شخص پر رحم فرمائے، جس نے میرا کلام سنا اور اسے بعینہ دوسروں تک پہنچایا۔

اس حدیث میں دو چیزیں بالکل ظاہر ہیں:

① آنحضرت ﷺ کے ارشاد صحیح ضبط کرنے کی ترغیب۔

② پھر صحیح طور پر ادا کرنے کا حکم۔

اگر یہ ارشادات شرعاً حجت نہ ہوں، تو یہ مؤکد پابندی بالکل بے سود ہے۔

② "بلغوا عني ولو آية، وحدثو عن بني إسرائيل ولا حرج ومن كذب علي متعمداً فليتبوأ مقعده من النار "[2] (أحمد، بخاری، ترمذی)

''مجھ سے جو کچھ سنو، اسے پہنچاؤ، بنی اسرائیل کی باتیں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، جس نے مجھ پر جان کر جھوٹ بولا، اس کی جگہ جہنم ہے۔''

---

[1] یہ حدیث مختلف الفاظ اور طرق کے ساتھ مروی ہے، دیکھیں: سنن أبي داود (٣٦٦٠) سنن ترمذی (٢٦٥٧) بعض اہل علم نے اس حدیث کو متواتر احادیث میں بھی ذکر کیا ہے، دیکھیں: كشف الخفاء برقم (٢٨١٣) نظم المتناثر (ص: ٤) بعض روایات میں مولف رحمہ اللہ کے ذکر کردہ بعض الفاظ بھی موجود ہیں، دیکھیں: جزء فيه قول النبي ﷺ: نضر الله امرءاً سمع مقالتي فأداها لأبي عمرو المديني (ص: ٣١) الكفاية للخطيب (ص: ١٩١)

[2] صحيح البخاري: كتاب الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل، رقم الحديث (٣٢٧٤)مسند أحمد (٢/ ١٥٩) سنن الترمذي: كتاب العلم، باب ما جاء في الحديث عن بني إسرائيل، رقم الحديث (٢٦٦٩)

سیاق بتا رہا ہے کہ آیت سے مراد آنحضرت ﷺ کے تمام ارشادات ہیں۔ [1]
آیت کا لفظ قرآن اور حدیث دونوں کو شامل ہے، "بلغو" اور كذب على النبي کی مذمت سے حدیث کا مقام اور اس کی حجیت بالکل ظاہر ہے۔

③ "حدثوا عني بما تسمعون، ولا تقولوا إلا حقا ومن كذب علي بني له بيت في جهنم يرتع فيه" [2]

(طبراني عن أبي قرصافه، بحواله قواعد التحديث : ٦٢)

جو کچھ مجھ سے سنو، اسے عوام تک پہنچاؤ اور سچ کہو، جو مجھ پر جھوٹ بولے گا، اس کا مقام جہنم ہے۔

اس حدیث کے الفاظ نے آیت کے مفہوم کی وضاحت فرما دی ہے۔

ان ارشادات سے آنحضرت ﷺ کا مقصد بالکل واضح ہے، حدیث کا ضبط، تبلیغ اور شرعاً اس کی ضرورت بالکل عیاں ہے، صحابہ میں اس کا عملی اثر بھی کتب سنت سے واضح ہے، اس تبلیغ کی تاکید قرآن میں بھی مذکور ہے اور یہ احادیث ان قرآنی آیات کی عملی تفسیر ہیں، اس کا تذکرہ اپنی سابقہ گزارشات میں بارہا کر چکا ہوں۔

④ "عن عبدالله بن عمرو بن العاص قال بينما نحن حول رسول الله ﷺ

---

[1] دیکھیں: فتح الباري (٦/ ٤٩٨)

[2] المعجم الكبير للطبراني (٣/ ١٨) المحدث الفاصل (ص: ١٧٢) الكنى والأسماء للدولابي (١/ ١٤٥)

اس کی سند میں واقع " عزة بنت عياض " کے بارے میں توثیق و تعدیل نہیں مل سکی، دیکھیں: تكملة الإكمال للبغدادي (٤/ ١٥٧) اسی طرح اس کی سند میں " أيوب بن علي بن الهيصم الكناني الفلسطيني " کے بارے میں بھی کوئی توثیق نہیں ملی، امام ابو حاتم فرماتے ہیں: " شيخ " (تاريخ الإسلام للذهبي : ١٨/ ١٨١)

نکتب إذ سئل رسول الله ﷺ أي المدينتين تفتح أوّلا قسطنطينية أو رومية فقال النبي ﷺ لا بل مدينة هرقل أوّلا "[1] (دارمی: ٦٨)

"ہم آنحضرت کے حلقہ درس میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات لکھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا، قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا یا رومیہ؟ فرمایا ہرقل کا شہر مسلمان پہلے فتح کریں گے۔"

اس میں آنحضرت ﷺ کے سامنے احادیث لکھنے کا ذکر ہے۔ تدوین علم کا یہی مطلب ہے کہ اس کے حلقہ ہائے درس قائم ہوں، اس علم کی اشاعت کے متعلق اساتذہ فن مخصوص ہدایات دیں، یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں آپ کے سامنے ہوا، آپ کے حلقہ درس میں ہوا۔[2] آنحضرت ﷺ نے اس علم کی تبلیغ کے متعلق کھلی اور واضح ہدایات دیں، اس فن میں جھوٹ بولنے سے خاص طور پر منع فرمایا۔

⑤ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے جہاں اپنے تلامذہ کو حدیث لکھنے سے روکا، اس میں بھی ایک خاص ہدایت فرمائی ہے:

---

[1] مسند أحمد (٢/ ١٧٦) سنن دارمي (١/ ١٣٧) مصنف ابن أبي شيبه (٤/ ٢١٩) المستدرك (٤/ ٥٥٣) مسند احمد اور مصنف وغیرہ کی روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو سے سوال کیا گیا کہ سب سے پہلے قسطنطنیہ فتح کیا جائے گا یا رومیہ؟ تو انھوں نے ایک صندوق منگوایا اور اس میں ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگے، اس کے بعد اس روایت کے بھی وہی الفاظ ہیں، جو مولف رحمہ اللہ نے نقل کیے ہیں، امام ہیثمی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"رواه أحمد ورجاله رجال الصحيح غير أبي قبيل وهو ثقة" (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٢٣) نیز اس حدیث کو امام حاکم، ذہبی، عبدالغنی مقدسی اور البانی رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ (السلسلة الصحيحة: ١/ ٣٣)

[2] اسی طرح آنحضرت ﷺ کے سامنے کتابت حدیث کی عملی مثال کے لیے دیکھیں: مسند أحمد (٢/ ١٩٦)

" ولن نجعله قرآنا ولكن احفظوا "[1] ہم احادیث کو قرآن کا ہم پایہ نہیں کرنا چاہتے، تمہیں احادیث ضبط کرنی چاہئیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ میں درس و تدریس اور حفظ احادیث کا مشغلہ عام تھا، اساتذہ قرآن اور احادیث کے امتیازی مقام کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے اور اپنے شاگردوں کو اس کے متعلق واضح ہدایات فرماتے۔

۶۔ تدوین علم اور تدوین کتب

آنحضرت ﷺ کے زمانہ خیر میں اسی طرح خلفاء کے دور میں کتب احادیث کی تدوین واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی صحابہ کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا عام مشغلہ رہا، لیکن تدوین کتب اور دواوین سنت کی تدوین و اشاعت کے لیے جن ابتدائی امور کی ضرورت تھی، ان کی تیاری آنحضرت ﷺ کے سامنے ہی شروع ہوگئی تھی، حدیث کی چھان بین اور صحت کے لیے شہادتیں اور قسمیں لینا خلیفہ ثانی نے شروع کیا۔[2] رواۃ پر تنقید اور اس میں تاریخی موشگافیاں پہلی صدی کے آغاز ہی میں شروع ہوگئیں۔[3]

(مقدمہ صحیح مسلم)

احادیث کا حفظ اور اس کے متعلق تحریری یادداشتیں لکھنا اسی وقت شروع ہوگیا تھا، بعض احکام تو آنحضرت ﷺ نے خود قلم بند فرمانے کی ہدایت فرمائی، یہی نوٹ اور یادداشتیں کسی وقت پر فن کی تدوین اور علم کی اشاعت کا موجب ہوسکتی ہیں،

[1] كتاب العلم لأبي خيثمه (ص: ٢٤) سنن دارمي (١/ ١٣٣) تقييد العلم (ص: ٣٨) حضرت ابو سعید خدری سے بھی بعض احادیث لکھنا مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود (٣٦٤٨) مسند أحمد (٣/ ٦٠) تقييد العلم (ص: ٩٣)

[2] تثبت کے لیے شہادتیں طلب کرنا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ (مسلم، برقم: ٢١٥٤) لیکن قسمیں لینا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: الكفاية (ص: ٨٣)

[3] مقدمه صحيح مسلم (ص: ١٢)

مشاہیر اہل علم کی ڈائریاں برسوں بعد شائع ہوتی ہیں اور ان پر کسی کو اشتباہ نہیں ہوتا۔

اس لئے اس مبحث پر غور کرتے ہوئے تدوین علم اور تدوین کتب کے فرق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، آنحضرت ﷺ اور صحابہ کا دور علم حدیث کی تدوین کا دور ہے، گو اس وقت تدوین کتب کا کام شروع نہیں کیا گیا، تدوین کتب کے لیے ذخیرہ ہوتا رہا، تدوین کتب کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوسرے وقت کا فیصلہ فرما دیا تھا، جس کا آغاز دوسری صدی میں ہوا۔

فن حدیث میں تدریجی ارتقاء:

پہلی صدی کے شروع میں جب قرآن اتر رہا تھا، عوام کا ذہن قرآن اور سنت کے امتیاز پر قادر نہ تھا، اس وقت حدیث لکھنے کی ممانعت کر دی گئی، جب لوگ نظم قرآن سے آشنا ہو گئے، قرآن اور ماسوئ القرآن میں امتیاز کرنے لگے، تو احادیث کے حفظ اور ضبط کی تلقین فرمائی گئی اور بوقت ضرورت لکھنے کی اجازت دی گئی، لیکن تحریر کا معاملہ اختیاری رہا، جب خطرات اور اہم ہوئے اور حدیث میں اختلاط کا خطرہ بڑھ گیا، علوج اور غیر ملکی رعایا کے ظن اور غلط نوازی کی وجہ سے خطرہ تھا کہ حدیث میں اغلاط کی کثرت نہ ہو جائے، تو حکماً لکھنے کی تاکید فرمائی گئی۔ حضرت انس، حضرت عمر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم تینوں کا ارشاد ہے:

"قیدوا العلم بالکتاب" [1] (الجامع لابن عبدالبر : ۷۲)

---

[1] یہ اثر مندرجہ ذیل صحابہ کرام سے مروی ہے:

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، سنن دارمي (۱/ ۱۳۸) المستدرك (۱/ ۱۸۷) جامع بيان العلم (۱/ ۳۰۹) المحدث الفاصل (ص: ۳۷۷) حلية الأولياء (۵/ ۳٤۰)

(۲) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، تقييد العلم (ص: ۸۹)

(۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، كتاب العلم لأبي خيثمه (ص: ۳٤) جامع بيان العلم (/ ۳۱۰) ←

"علم کو تحریر سے پابند کر دو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ۶۸ھ میں فوت ہوئے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ۹۲ یا ۹۳ھ میں انتقال فرمایا۔[1] اس سے ظاہر ہے کہ پہلی صدی کے قریباً وسط میں حدیث لکھنے اور اس کے تحریری ضبط کا رواج عام ہوگیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے انتقال تک تحریر کی ضرورت محسوس ہوئی، احادیث کا لکھنا عام ہوگیا، اسی صورت حال کو میں نے تدوین علم سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتووں کا بہت سا حصہ مشکوک سمجھ کر ضائع فرما دیا،[2] اس سے فن حدیث کی اہمیت، اس کی تدوین اور اس کی حجیت کا بیّن ثبوت ملتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اگر اہل بدعت مجملاتِ قرآن سے استدلال کریں، "فاضربوهم بالسنن" تو انھیں سنت سے جواب دو۔[3]

صحابہ کا تثبت:

اوائل صدی میں رواۃ پر تنقید کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، احادیث کے بیان پر حلف لیا جاتا، شہادت طلب ہوتی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ بعض صحابہ کو کہنا پڑا:

← ④ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ان سے یہ اثر مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح مروی ہے۔ مرفوع روایت کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے کثرت طرق کی بناء پر "صحيح لغيره" قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٥/ ٤٠) دوام حدیث (١/ ١٥٣)

1. الإصابة لابن حجر (٤/ ١٥١، ١/ ١٢٨)
2. مقدمه صحيح مسلم (ص: ١٢)
3. سنن دارمي (١/ ٦٢) الفاظ مختلف ہیں۔

" لا تکونن وبالا علی أصحاب رسول الله ﷺ " [1]

آپ کی یہ شدت صحابہ کے لیے وبال جان ہو رہی ہے!

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی کتابوں کا ایک مجموعہ جلا دیا (تذکرۃ الحفاظ) [2]

یہ روایت بشرط صحت تثبت کی دلیل ہے، [3] اس قسم کی احتیاط اسی وقت کی جاتی ہے، جب معاملہ اہم اور عدم احتیاط سے برے نتائج کا کھٹکا ہو، حدیث کا یہ مقام

---

[1] صحیح مسلم: کتاب الآداب، باب الاستئذان، رقم الحدیث (۲۱۵٤) ولفظه: " فلا تکونن عذابا علی أصحاب رسول الله ﷺ ! "

[2] تذکرۃ الحفاظ (۱/ ۵)

[3] بشرط صحت یہ روایت اس بناء پر تثبت کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نقل حدیث میں عدم اطمینان کی بدولت اس مجموعہ کو جلا دیا، بعض لوگ اس اثر سے کتابت حدیث کے عدم جواز پر استدلال کرتے ہیں، لیکن یہ اثر مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر نا قابل استدلال ہے:

① اس کی سند میں " علي بن صالح " مجہول راوی ہے، اس کے علاوہ بھی اس کی سند میں بعض قابل نظر راوی ہیں۔ (الأنوار الکاشفه للمعلمی: ۳۸، دراسات فی الحدیث النبوي: ۱/ ۹۳)

② اس اثر کو حافظ ذہبی، ابن کثیر اور دیگر اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۵، کنز العمال: ۱۰/ ۱۷۵)

③ اس اثر سے کتابت حدیث کا جواز ثابت ہوتا ہے، کیونکہ انھوں نے پہلے احادیث لکھی، بعد ازاں نقل حدیث میں عدم اطمینان کی بدولت اس کو جلا دیا، اگر ان کے نزدیک کتابت حدیث جائز نہ تھی، تو ابتداءً ہی احادیث کو ضبط تحریر میں نہ لاتے۔ اس اثر کے الفاظ سے صراحتاً ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے کتابت حدیث سے ممانعت کی بنا پر احادیث نہیں جلائی تھیں، بلکہ نقل حدیث میں واسطہ پر عدم اطمینان کی وجہ سے اس مجموعہ کو جلا دیا تھا۔

④ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کتابت حدیث ثابت ہے۔ (صحیح البخاري: برقم : ۱۳۸۰) اور ان کی موجودگی میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے سن کر احادیث لکھا کرتے تھے۔ (مسند أحمد: ۲/ ۱۹۶)

اسی صورت صحیح ہوسکتا ہے کہ اسے اہل سنت کی طرح حجت شرعی سمجھا جائے، ورنہ اس احتیاط، تحقیق اور تثبت کی ضرورت ہی کیا ہے، جب شرعاً اس کا ماننا ضروری ہی نہیں؟ اس مقام کو سامنے رکھتے ہوئے صحابہ کے زمانہ سے اس کے حفظ و تدریس اور ضبط و تحریر کا انتظام ہوگیا اور علمی حلقے اس فکر میں ہوگئے کہ وضع و تخلیق کی وجہ سے اس چشمہ صافی کو مکدر نہ کیا جا سکے، اس لئے حدیث کی حفاظت دونوں طریق سے کی گئی، نہ صرف حفظ پر اعتماد کیا گیا اور نہ ہی تحریر و کتابت کو آخری اور قطعی ذریعہ سمجھا گیا، بلکہ تدریجی ارتقاء اور وقت کے تقاضوں کے مطابق جب کسی طریق کی ضرورت اور اہمیت محسوس ہوئی، اسے استعمال فرمایا گیا۔

تدوین علم کے مراحل:

تدوین علم کا یہ دور پہلی صدی کے آخر تک رہا، پہلی صدی کے آخری سالوں میں ائمہ نے جو کتابیں لکھیں، ان میں احادیث کے ساتھ صحابہ و تابعین کے فتویٰ بھی جمع کر دیئے گئے۔ اس قسم کا ذخیرہ امام زہری رحمہ اللہ کے پاس بہت زیادہ تھا،[1] اس نوع کی تصانیف پہلی صدی کے اواخر میں کافی تھیں، چنانچہ مختلف شہروں میں ائمہ نے اس نہج پر فن حدیث کی خدمت کی، ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک اور ابن اسحاق نے مدینہ میں، ربیع بن صبیح، سعید بن عروبہ اور حماد بن سلمہ نے بصرہ میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، مقسم نے واسط میں، معمر نے یمن میں، جریر بن عبدالحمید نے رے میں، عبداللہ بن مبارک نے خراسان میں اس میں ملی جلی کتابیں لکھیں۔[2] ان میں ضعیف اور صحیح احادیث کو یکجا جمع کر دیا گیا، غرض جو ملا بطور سرمایہ اور ذخیرہ کے جمع کر لیا گیا، یہ تمام ائمہ پہلی صدی کے آخر اور دوسری کے

---

[1] دیکھیں جامع بیان العلم (١/ ١٠٦)

[2] دیکھیں: المحدث الفاصل (ص: ٦١١) الجامع للخطیب (٢/ ٤٢٥) ھدي الساري (ص: ٦)

آغاز میں اس خدمت کے لیے متعین فرمائے گئے۔

دوسرا دور:

اس کے بعد صرف احادیث کا دور آیا، اقوال رجال اور علماء کے فتووں کو الگ کر کے صرف احادیث نبویہ کو جمع کیا گیا، مسدد بن مسرہد بصری اور عبیداللہ بن موسیٰ کوفی اور اسد بن موسیٰ اور نعیم بن حماد نے مسانید لکھیں۔اس کے بعد امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور حافظ عثمان بن ابی شیبہ نے اپنی اپنی مسانید اور مصنفات لکھیں، اس کے بعد امام بخاری نے اپنے شیخ اسحاق بن راہویہ کی منشا کے مطابق صرف صحیح احادیث جمع فرمائی، [1] الجامع الصحیح تحریر فرما کر دنیائے اسلام پر احسان فرمایا، امام مسلم نے امام بخاری کا اتباع کیا اور صحیح مسلم لکھی۔ اس دوسرے دور میں تصانیف اس کثرت سے ہوئیں اور حدیث کے تحریری انضباط کا اس قدر اہتمام فرمایا گیا، جس کی نظیر کم ملے گی، اسے تدوین حدیث کا طوفانی دور کہنا چاہیے۔

دورِ علم کی تدوین کا آغاز **الحافظ الثقة الامام ابن شهاب الزهري القرشي** اور أبوبكر بن عمرو بن حزم نے فرمایا اور مجدد مائة أول حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی پوری حمایت اس کو حاصل تھی، سعید بن زیاد فرماتے ہیں:

"سمعت ابن شهاب يحدث سعد بن إبراهيم قال أمرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفتراً دفتراً فبعث إلى كل أرض له عليها سلطان دفتراً" [2] (جامع بيان العلم: ٧٦)

''ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے احادیث جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے کئی دفتر لکھ دیئے، انھوں نے اپنی حکومت کے تمام گوشوں تک یہ دفتر پہنچا دیئے۔''

یہ تو عمر بن عبدالعزیز کے احکام کی تعمیل تھی، جن کی حکومت کا دور کل ڈھائی

---

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (٢/ ٥) هدي الساري (ص: ٦) تدريب الراوي (١/ ٩٣)

[2] تاريخ ابن أبي خيثمه (٢/ ٢٤٧) جامع بيان العلم (١/ ١٥٥)

سال رہا، لیکن چونکہ جمع احادیث کا مسئلہ وقت کی اہم ضرورت تھی، اس لئے خلفاءِ بنی امیہ اپنی بعض عملی کمزوریوں کے باوجود جمع احادیث کے متعلق کافی مستعد تھے، چنانچہ امام احمد بواسطہ معمر، زہری سے نقل فرماتے ہیں:

"كنا نكره كتابة العلم حتى أكرهنا عليه هؤلاء الأمراء فرأينا أن لا نمنعه أحدا من المسلمين" (جامع بيان العلم: ۷۷) ❶

"ہم علم کو لکھنا ناپسند کرتے تھے، مگر ہمارے بادشاہوں نے ہمیں مجبور کیا، تو ہم نے مناسب سمجھا کہ عامۃ المسلمین کو بھی اس سے محروم نہ رکھا جائے۔"

امام زہری سے بروایت أیوب بن أبی تمیمہ مرقوم ہے:

"قال استكتبني الملوك فأكتبتهم فاستحييت الله إذ كتبها الملوك ألا أكتبها لغيرهم" (جامع بيان العلم : ۷۷) ❷

جب مجھے بادشاہوں کے لیے لکھنا پڑھا، تو میں دوسرے مسلمانوں کے لئے کیوں نہ لکھوں؟

ہشام بن عبدالملک نے دو منشی مقرر کیے، تاکہ وہ امام زہری کے علوم کو نقل کریں، وہ ایک سال تک امام کے علوم کو لکھتے رہے۔ ❸

امام زہری کا علم صرف احادیث تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ شعر وسخن کے بھی وہ امام تھے، چنانچہ یونس بن یزید فرماتے ہیں:

امام زہری کے پاس میں نے دواوین شعر دیکھے۔ ❹

---

❶ مصدر سابق

❷ جامع بيان العلم (۱/ ۱۵۶)

❸ حلية الأولياء (۳/ ۳٦۱) جامع بيان العلم (۱/ ۱۵٦) ایک سال تک لکھوانے کے بعد جب خلیفہ ہشام بن عبدالمالک نے کہا کہ ہم نے تو آپ کو خالی کر دیا ہے؟ تو امام زہری رحمہ اللہ نے جواب دیا: ابھی تو میں بلندی سے نیچے اترا ہوں!

❹ جامع بيان العلم (۱/ ۱۵٦) نیز دیکھیں: حلية الأولياء (۳/ ۳٦۱) المعرفة والتاريخ (۱/ ٦۲۳)

امام مالک فرماتے ہیں:

”أول من دون العلم ابن شهاب“ [1] (جامع بيان العلم: ٧٦)

علم کے پہلے مدون امام زہری تھے۔

امام زہری کا دور:

محمد بن شہاب زہری رحمہ اللہ قریباً ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، ان کی عمر قریباً ۷۴ سال ہوتی ہے، اس لحاظ سے امام زہری رحمہ اللہ کی پیدائش حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۶۰ھ میں ہوا اور یزید بن معاویہ مسند حکومت پر متمکن ہوا، یزید کی حکومت سے پہلے ہی امام زہری طلب علم کے دور میں داخل ہو چکے تھے، امام زہری کی زندگی میں مندرجہ ذیل خلفاء نے حکومت کی:

(۱)۔معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ۶۰ھ، (۲)۔یزید بن معاویہ ۶۴ھ، (۳)۔معاویہ بن یزید ۶۴ھ، (۴)۔مروان بن حکم ۶۵ھ، (۵)۔عبدالملک بن مراون ۸۶ھ، (۶)۔ ولید بن عبدالملک ۹۶ھ، (۷)۔سلیمان بن عبدالملک ۹۹ھ، (۸)۔عمر بن عبدالعزیز ۱۰۱ھ، (۹)۔یزید بن عبدالملک ۱۰۵ھ، (۱۰)۔ ہشام بن عبدالملک ۱۲۵ھ۔

امام زہری کی قریباً چوہتر سالہ عمر میں دس بادشاہ گزرے ہیں، ان کے ذاتی اخلاق اور سیاسی مصالح سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی علمی اور دینی خدمات پر غور

[1] تاريخ ابن أبي خيثمه (٢/ ٢٥٠) حلية الأولياء (٣/ ٣٦٣) جامع بيان العلم (١/ ١٠٤)

یہ قول عبدالعزیز بن محمد الدراوردی سے بھی مروی ہے، (جامع بيان العلم: ١/ ١٥٠) لیکن دونوں اقوال کا بنیادی راوی ”محمد بن حسن بن زبالہ“ ہے، جو سخت ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے، دیکھیں: تهذيب التهذيب (٩/ ١٠١) البتہ امام مالک سے یہ قول ثابت ہے کہ:

” أول من أسند الحديث ابن شهاب “ (تقدمة الجرح والتعديل: ١/ ٢٥)

فرمایئے، تو آپ ان کو اتنا بدنام نہیں پائیں گے، جس قدر وہ سیاسی طور پر بدنام ہیں، پھر علی العموم علماء کی خدمت کرتے، خود بھی بقدرِ ضرورت علم حاصل کرتے، مدارس اور علمی معاہد کی حوصلہ افزائی فرماتے، بلکہ بعض اوقات خود بھی روایت حدیث کا شغل فرماتے۔ عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک کا دور اس لحاظ سے بے حد روشن دور ہے، ان سب امراء نے جمع و تدوین حدیث میں ائمہ اسلام کی اعانت فرمائی، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلی تاریخ کی کتاب لکھوائی، اس میں ملوک اور زبانوں کی تاریخ تھی، اس کے مصنف عبید بن شریہ کو یمن سے منگایا گیا تھا۔ [1]

(ابن ندیم: ۱۳۲)

یزید بن معاویہ کی فصاحت اور خلفاءِ بنوامیہ کی خطابت تاریخ کے مسلّمات سے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے دور حکومت میں اسلامی علوم سے بے اعتنائی برتی جاتی؟

نتائج:

اوپر کی گزارشات سے مندرجہ ذیل نتائج کا سمجھنا مشکل نہ ہوگا:

1. امت کا یہ دور حدیث کو شرعاً حجت سمجھتا تھا، اسی لیے وہ اس کی حفاظت کے لیے فکر مند تھا، رواۃ اور روایت پر دونوں لحاظ سے اس وقت تنقید ہوتی تھی۔
2. اس وقت جمع حدیث، کتابت حدیث اور حفظ حدیث کا عام رواج تھا۔
3. خدمت علم اور حفاظت کی فکر صرف علماء ہی کو نہ تھی، بلکہ بادشاہ اور امراءِ وقت بھی اس فکر مندی میں شامل تھے۔
4. جو علماء وقتی مصالح کی بنا پر حدیث لکھنا پسند نہ کرتے تھے، ان کو حکام وقت مناسب ذریعہ سے مجبور کرتے تھے کہ وہ صرف حفظ پر کفایت نہ کریں، بلکہ قلم کو

[1] الفهرسة لابن نديم (ص: ١٣٢) الإصابة (٥/ ١١٥)

بھی اس حفاظت میں شریک کریں۔

۵ چنانچہ اس مسئلہ میں اکثر علماء کی رائے بدل گئی اور انھوں نے حکومت کی خوشنودی کے علاوہ خدمت علم اور خدمت خلق کے جذبہ سے یہ کام کیا، ان میں امام زہری اور ان کے رفقاء اور تلامذہ کا نام سرفہرست ہے۔

۶ ان محدثین اور ائمہ سنت کا تعلق منافقین عجم سے نہ تھا، بلکہ حکومت اور عامۃ المسلمین کی خدمت کے سوا کوئی جذبہ یہاں کارفرما نہ تھا۔

۷ جب تمام لوگ یا اکثر بادشاہ اس کو علمی اور دینی بلکہ ملکی ضرورت تصور کرتے ہوں، تو عمر بن عبدالعزیز کے سیاسی اسباب یا ابوبکر بن حزم کا عزل اور علیحدگی کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔

۸ یہ کام ۱۰۱ھ سے کہیں پہلے بلکہ ۵۰ھ سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔

جمع حدیث کے متعلق ایک اور نظریہ

اب جمع و حفظ احادیث کے متعلق ایک اور نظریہ سنیے:

’’میں شروع ہی میں لکھ چکا ہوں کہ ابوبکر بن حزم مدینہ طیبہ کے قاضی تھے، ان کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ اتنا بڑا کام سرانجام دے سکتے؟ آپ شاید قاضی ابوبکر کو لیاقت علی خان اور دولتانہ پر قیاس فرما رہے ہیں اور پھر اس حکم کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز شہید کر دیے گئے اور فوراً ہی ابوبکر بن حزم اپنے عہدہ سے معزول ہو گئے، اس لیے ابوبکر بن حزم اس مہم کو سر نہ کر سکے اور یہ کام رہا ہی چاہتا تھا کہ منافقین عجم کی ایک جماعت نے اپنا رسوخ فی الدین اور ظاہری زہد و تقویٰ دکھا کر ابن شہاب زہری کو جمع احادیث پر آمادہ کیا، یہ اپنے تجارتی اور زراعتی کاروبار کی وجہ سے اپنے وطن ایلہ میں رہا کرتے تھے، مگر ایک بہت بڑی دینی خدمت سمجھ کر اس مہم پر آمادہ ہو گئے اور ۱۰۱ھ کے بعد مدینہ آ کر یہاں کے لوگوں سے حدیثیں لیں، پھر

کوفہ، بصرہ، مصر وغیرہ مقامات سے بھی روایتیں حاصل کیں اور ہر راہ چلنے سے جو حدیث بھی مل جاتی لکھ لیتے اور یاد کر لیتے اور پھر وہی منافقین خود بھی ان کے پاس آ آ کر حدیثیں لکھوانے لگے اور دوسرے وضّاعین و کذّابین کو ان کے پاس بھیج بھیج کر ان سے بھی حدیثیں ان کے پاس جمع کرانے لگے۔''

(طلوعِ اسلام: ۹/ص: ۵۰، بابت ستمبر: ۵۴)

''یہ امام زہری، حضرت زین العابدین علی بن الحسین کے خاص اصحاب اور ان کے معتمدین میں شمار کئے جاتے تھے، اس لیے شیعوں میں بھی ان کی ایک امتیازی حیثیت تھی، یہاں تک کہ متقدمین شیعہ ان کو اپنی ہی جماعت کا ایک فردِ فرید سمجھتے تھے، مگر یہ اپنے کو شیعہ نہیں کہتے تھے، اس لئے اہل سنت ان کو اپنی جماعت میں داخل سمجھتے تھے۔'' (بحوالہ مذکور)

''اس لیے اگر اس وقت ابن شہاب زہری دونوں جماعتوں میں ممدوح و معتمد رہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، ہوسکتا ہے کہ اسی وجہ سے منافقین نے اس کام کے لیے انھیں منتخب کیا ہو، اور یہ واقعہ ہے کہ ذہانت و فطانت اور غیر معمولی قوت حافظہ کی وجہ سے ان کا انتخاب ایک کامیاب انتخاب ثابت ہوا۔'' (حوالہ مذکور)

''واضح رہے کہ ابن شہاب زہری کی دیانت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے نیک نیتی سے حدیثیں جمع کرنا شروع کیں۔'' (حوالہ مذکور)

''خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے زہری کو جمع احادیث کا حکم نہیں دیا تھا، کتابتِ احادیث کی تمام روایات آحاد ہیں اور ان سے استدلال مصادرہ ہے۔''

(صفحہ: ۵۵)

''پہلی صدی کے اواخر میں فتنہ روایات کا سیلاب آ گیا تھا۔'' (صفحہ: ۵۳)

نتائج:

اس نظریہ اور حوالوں سے مندرجہ ذیل نتائج سمجھے جا سکتے ہیں:

① زہری شیعہ تھے، لیکن سنّیوں میں بھی ان کو قبولیت حاصل رہی۔

۲ جمع احادیث کا خیال ابتداءً منافقین عجم کو ہوا۔

۳ امام زہری سادگی کی وجہ سے ان کے دھوکے میں آ گئے، ان کی دیانت داری پر کوئی شبہ نہیں۔

۴ اس تجویز سے پہلے امام زہری ایلہ میں قیام پذیر رہے۔

۵ ۱۰۱ھ سے پہلے جمع و تدوین کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

۶ منافقوں نے یہ کام ایک منظم سکیم کے ماتحت کیا تھا۔

۷ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے جمع و تدوین کے لیے حکم نہیں دیا تھا۔

۸ پہلی صدی کے اواخر میں فتنہ روایات کا سیلاب آ گیا۔

۹ امام زہری ۱۰۱ھ سے پہلے نہ کسی سے روایت سن سکے، نہ کسی سے کچھ کہہ سکے۔

یہ نمبر وار نتائج اوپر کی محوّلہ عبارات سے ماخوذ ہیں، واقعات کے اثبات میں قطعی حوالوں کی ضرورت ہوتی ہے، ظن اور تخمین سے واقعات ثابت نہیں ہو سکتے ''ہو سکتا ہے'' ''ہوا ہو گا'' کے الفاظ بے فائدہ ہیں، افسوس ہے کہ عمادی صاحب ان اوہام کے متعلق کوئی حوالہ نہیں پیش کر سکے، بلکہ ساری عمارت ذہنی توہّمات پر رکھی گئی ہے اور عمادی صاحب کی کتاب الاوہام کے سوا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، نہ کوئی حوالہ اس کے متعلق مل ہی سکتا ہے۔ ایک علمی مبحث میں جس کی اہمیت یہ ہے کہ وہ امت میں ایک مسلّمہ عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس قسم کی کھلی غلط بیانی اور جھوٹ ایک مجرمانہ جسارت ہے اور شرمناک عیب، مضمون نگار کا فرض تھا کہ وہ منافقین کی اس کمیٹی کے ممبران کے نام گنواتے، جو احادیث کی وضع و تخلیق کے لیے بنی، پھر امام زہری کے ساتھ ان کے تعلقات کی تاریخی سند ذکر فرماتے۔ اگر یہ مفروضہ ثابت ہو جاتا، تو معاملہ صاف ہو جاتا، زہری کی دیانت داری یا سادگی کے منافقانہ اعتراف کا کیا فائدہ؟

زہری کی شیعیت کے لیے زین العابدین کی مصاحبت کوئی دلیل نہیں، بشرط ثبوت زین العابدین میدان کربلا کے بقیۃ السیف ہیں، یہ اس وقت قریباً اٹھارہ سال کے تھے، [1] عبیداللہ بن زیاد نے ان کو زندہ چھوڑنے کی سفارش کی اور یہ یزید کی حکومت سے وظیفہ لیتے رہے اور عموماً اموی حکومت کے حامی رہے۔ زہری کی شیعیت تو دوسری بات ہے، واقعات کی شہادت تو زین العابدین کی شیعیت کے بھی خلاف ہے۔ امام زہری کا رجال شیعہ میں تذکرہ ان کی شیعیت کا ثبوت نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں دوسرا احتمال قوی ہے کہ شیعہ حضرات نے عمادی صاحب ایسے سادہ لوح برخود غلط لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے امام زہری کا تذکرہ اپنے رجال میں کر دیا، حالانکہ ان کی روایات میں امام زہری کا ذکر بحیثیت راوی ناپید ہے، اپنی سادہ لوحی کو چھپانے کے لیے امام زہری کو سادہ لوح کہنا عجیب ہے!

یہ تعارض بھی معمہ ہے کہ زہری سادہ لوح اور بیوقوف بھی ہوں، (معاذ اللہ) منافقین کا دھوکہ بھی کھا جائیں اور ذہین وفطین اور بلا کے حافظ بھی ہوں، اگر ظنون اور تخمینات سے کوئی واقعہ تصنیف ہوسکتا ہے اور امکانات و احتمالات سے حقائق کی تخلیق عمل میں آسکتی ہے، تو ادباً ہمیں بھی گزارش کرنے کی اجازت دیجیے:

ہماری قطعی رائے ہے کہ مولانا عمادی ایسا ''ذہین'' اور ''فطین'' آدمی ''سادہ لوحی'' سے شیعوں کا آلہ کار بن گیا ہے، تاکہ وہ اہل سنت میں احادیث کے متعلق بدگمانی پیدا کر سکے اور انھیں اپنے رجال اور اپنے ائمہ اور اپنے عقائد سے متعلق شبہ میں ڈال سکیں۔ ''ادارہ طلوع اسلام'' چونکہ فرنگیوں کے ایجنٹ ہیں، فرنگی اور شیعہ عقائد اہل سنت کی تخریب اور تشکیک کے لیے متفق ہیں، اس لئے یہ لوگ عمادی

---

[1] زین العابدین کی عمر تیئیس (۲۳) سال تھی، جب ان کے والد دس محرم ۶۱ھ کو شہید ہوئے۔
(تہذیب التہذیب: ۷/۲۶۹)

صاحب اور ان کے رفقا کی غلط صحیح ترجمانی کر رہے ہیں!!

یہ ساری باتیں، "قرینہ" سے معلوم ہوتی ہیں، آپ حضرات کی دیانت پر حملہ مقصود نہیں، آپ حضرات کے دل کا حال تو خدا ہی کو معلوم ہے، ظاہری قرائن اور حالات کا تقاضا یہی ہے، جو عرض کیا گیا ہے۔

امام زہری اور ائمہ حدیث کے کارنامے اس قدر روشن اور بے غبار ہیں کہ ان پر کوئی دیانت دار آدمی شبہ نہیں کر سکتا، مگر ہمارے عمادی صاحب کی جرأت کا یہ حال ہے کہ وہ منافقین عجم کا فسانہ تصنیف فرماتے ہیں، پھر وضع و تخلیق کو سیاسی انتقام کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، پھر حوالہ دیئے بغیر ان واقعات میں امام زہری کا جوڑ لگاتے ہیں، پھر تصور فرماتے ہیں کہ امام زہری ایلہ میں پورے پچاس سال محض زمینداری کے کام میں مشغول رہے، ۱۰۱ھ میں جب منافقین سے سودا ہو گیا، تو امام زہری نے علمی مشغلہ کا آغاز فرمایا، ﴿ ظلمات بعضها فوق بعض ﴾[1] اور نمبر وار جھوٹ اور غلط بیانیاں ہیں، جو اوہام کی بنا پر نوک قلم سے ٹپک گئیں۔ پھر عمادی صاحب یہ تذکرہ اس وثوق سے بیان فرماتے ہیں کہ حضرت یہاں بطور دلال موجود تھے اور ان کی موجودگی میں منافقین عجم نے امام زہری سے سودا کیا، محترم مولانا اپنے ضعف بصارت کے شاکی تھے، مجھے محترم کے متعلق فقدان بصیرت کا شکوہ ہے، ان میں بعض حوادث کو اس طرح مرتب کیا گیا، جس سے مولانا کی علمی دیانت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے اور ایک عالم کے لیے یہ طریق کار عیب ہے!

امت کا عمل اور حدیث:

حدیث کا جمع، حفظ اور تدوین جس طرح عمل میں آیا، یہ خدا تعالیٰ کی توفیق ہے، جو صرف اسی امت کو میسر آئی، تصنیف کتب میں اور حفظ آثار میں جو محنت کی

[1] النور: ٤٠

گئی، وہ معجزہ سے کم نہیں، کوئی امت اپنے آثار کو اس طرح محفوظ نہیں رکھ سکی، جس طرح علماء کرام نے اپنے آثار کو محفوظ فرمایا۔ قرآن عزیز کا ارشاد: ﴿إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون﴾ [1] قطعی ہے، اور قرآن عزیز اور احادیث نبویہ کی حفاظت کا عالم اسباب میں یہ انتظام اس کی عملی تصدیق ہے، امت کا یہ عمل تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور قابل صد تشکر: ﴿فمن شاء فليؤمن ومن شاء فليكفر﴾ [2]

پھر آنے والے لوگوں نے جس نگاہ سے اسے دیکھا، کسی نے رجال کا تذکرہ لکھا، کسی نے غریب الفاظ کی لغت لکھی، کسی نے جرح و تعدیل کی راہ کھولی، کسی نے جرح و تعدیل کے اصول لکھے، کسی نے تنقید حدیث کے اصول لکھے، کسی نے قرآن و حدیث کے فہم کے لیے قواعد وضع فرمائے، ان مقامات کی تعیین میں کتابیں لکھیں، جن کا ذکر احادیث میں ضمناً آیا تھا، شروح لکھیں، مشکلات کا حل لکھا، مختلف المفہوم احادیث کی تطبیق میں مستقل کتابیں لکھیں، رفع شکوک کے لیے تاویل مختلف الحدیث پر ضخیم دفاتر لکھے، صحابہ کے احوال میں بہترین تاریخی ذخائر جمع کیے، ایک نام کے مختلف ناموں میں وجوہ تمییز کی راہیں پیدا کیں، قرائن تلاش کیے، مبہم اسماء کی تعیین کے لیے تحقیقی کتابیں لکھیں، کتابت کی غلطیوں اور ان کی متنوع تصحیفات پر سیر حاصل مباحث لکھے، اسانید اجازت، آداب شیخ و سامع کے مفید ذخائر جمع فرمائے، سیرت نبوی میں بڑی بڑی موشگافیاں فرمائیں، ابواب مغازی کے ہزاروں اوراق لکھے۔

ہر دور کی ترقیات میں اسلام کی ہدایات اور ان کی اہمیت سنت ہی کی روشنی میں فرمائی گئی، اختلاف مذاہب اور فقہی فروع میں ہر فریق کے مستدلات کا انحصار چونکہ کتاب اللہ اور سنت پر تھا، اس لیے ان کی تنقیح فقہی نقطہ نظر سے فرمائی گئی، تخریج احادیث میں لاکھوں صفحات لکھ دیئے گئے، مستدرکات، مسانید، جوامع، اجزاء، سنن

[1] الحجر: ٩

[2] الكهف: ٢٩

وغیرہ تصانیف کے مستقل عنوان ہیں، جنھیں خدمت حدیث کے طور پر انجام دیا، اس طرح خدمت کا یہ شرف دنیا کے شائد کسی علم کو حاصل نہیں ہوا۔

یہ قبول عام ایک ایسے تواتر کی طرف رہنمائی کرتا ہے، جس کا انکار عقلمندی کے منافی ہوگا، آپ ان خدمات اور قبولیت عامہ کا تذکرہ کسی غیر مسلم متعصب کے سامنے فرمائیے، وہ آپ کی تعلیم پر اعتراض کر سکے گا، آپ کے اعمال پر تنقید کر سکے گا، وہ مسائل پر جزوی شبہات وارد کر سکے گا، لیکن یہ جرأت ناممکن ہوگی کہ وہ یہ کہہ دے کہ وہ ذخیرہ ہی امت کی نظر میں سرے سے غیر مستند ہے یا اسے حجت ہی نہیں سمجھا گیا۔

یہ حدیث کا وہ پہلو ہے جس کے ہوتے ہوئے سند کی بحث، رواۃ کا تذکرہ، ارسال و تدلیس کے مباحث جزوی اور ضمنی مباحث تصور ہوں گے، اصولی طور پر حدیث اور سنت کی حجیت قطعی غیر مشتبہ ہو جائے گی، متواتر کو حجت اور قطعی تصور کرنے والے اس قبول عام پر غور کریں، جو معصوم و مرحوم امت نے اپنے پیغمبر کے آثار کے متعلق اظہار فرمایا اور سوچیں کہ آیا یہ سب کچھ حجیت کی تعبیر نہیں تھا؟

امت کی اس مخلصانہ توجہ اور قبول اور خدمات کی اس فہرست کو آپ ایک طرف رکھیں اور منکرین حدیث کے ان خیالات کو جو وہ لوگ اس فن کے متعلق ظاہر فرماتے ہیں ایک طرف ،ادارہ طلوع اسلام اور مولانا عمادی ایسے مصلحت اندیش مذبذب حضرات، جو تخریبی طور پر خدمت اسلام فرمانا چاہتے ہیں، ان کی دو رخی خدمات کو بھی نظر میں رکھیں، انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ کو ان دو چیزوں میں سے ایک کو اختیار فرمانا ہوگا، آپ ساری امت کو جاہل کہہ دیں اور یا پھر اس پارٹی کے دماغ کو ماؤف تصور کریں، اگر ان حضرات کے ارشادات اور عملی خدمت اسلام ہے، تو پھر اسلام اور کفر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

کتب احادیث، ان کی شرائط اور تنوع سے اس تدریجی ارتقاء کا پتہ چلے گا، جو اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور معلوم ہوگا کہ یہ فن جامد نہیں ، نصوص میں

اضافہ تو اب ناممکن ہے، لیکن نصوص کے متعلق بحث و نظر کے بیسیوں دروازے کھلے ہوئے ہیں، اصول حدیث ایک متحرک اصول ہے، جس میں وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے ہر زمانہ میں بحث ہوئی اور اس میں اہل حق کے نزدیک کوئی بندش نہیں۔

۷۔ مرسل اور اس کی حجیت:

''طلوع اسلام'' شمارہ (۹) ۱۹۵۰ء میں عمادی صاحب کا ایک طویل مضمون امام زہری کے متعلق شائع ہوا ہے، جس میں امام زہری رحمہ اللہ کے اساتذہ اور ان کی مرسل احادیث کا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے، جس سے غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اہلِ علم اور اصولِ حدیث سے ممارست رکھنے والے حضرات تو ان مغالطوں سے متاثر نہیں ہو سکتے، ممکن ہے کہ عمادی صاحب اور ان کی معلومات کے متعلق ان لوگوں کو بدگمانی ہو، مگر عوام ایسے مضامین سے ضرور متاثر ہو سکتے ہیں۔ بظاہر عمادی صاحب کا مقصد بھی یہی ہے کہ فنِ حدیث کے متعلق عوام کی بدگمانیاں اور زیادہ ہوں۔ مضمون میں جو معلومات شائع کی گئی ہیں، ان کی ترتیب اس طرح عمل میں آئی ہے، جس سے فنِ حدیث پر اعتماد میں نقص ہو سکتا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرسل کی بحث ذرا تفصیل سے آ جائے، تاکہ ناظرین پر حقیقت واضح ہو جائے اور مرسل کی حجیت کے متعلق ائمہ سنت میں جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت ہو جائے۔

اصطلاحی الفاظ کے سمجھنے میں قارئین کو دقت ضرور ہوتی ہے، لیکن فنی مسائل میں اس کے سوا چارہ نہیں۔ اس لئے ناظرین ''الاعتصام'' کا فرض ہے کہ وہ ایسے مضامین سے گھبرائیں نہیں، بلکہ غور سے پڑھیں، یہ مضامین اس قدر مشکل نہیں کہ غور کے بعد بھی سمجھ میں نہ آ سکیں۔

ارسال کی ضرورت:

مرسل کی بحث سے پہلے مناسب ہے کہ اس ضرورت کا اظہار کر دیا جائے کہ ارسال کی ضرورت کیوں ہوئی؟ روزانہ واقعات کے سلسلہ میں جہاں متکلم اور مخاطب دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہوں، واقعہ ذکر کر دیا جاتا ہے، فریقین سن کر اس کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق رائے قائم کر لیتے ہیں اور سند کی ضرورت معلوم نہیں کرتے۔ واقعہ کی غلطی پر اتفاق ہو یا اس کی صحت پر، سند کے تذکرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ واقع کے صحیح ہونے میں اگر شبہ ہو، متکلم اور مخاطب کی رائے میں اختلاف ہو، تو واقع کی سند کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ یہ ایسا قدرتی اصول ہے، جسے ہم مکالمات میں روزانہ استعمال کرتے ہیں۔

صحتِ واقع کے لیے سند کی ضرورت پر یقین کرتے ہوئے بھی بلا ضرورت اس کے تذکرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے، خود فنِ حدیث میں سند ایسے ہی تدریجی ارتقاء کے طور پر آئی۔ صحابہ میں صدق غالب تھا، جو لوگ عام گفتگو میں غلط بیانی سے پرہیز کرتے تھے، وہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات میں یہ مداہنت کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ [1] کبار تابعین کے زمانہ میں بھی صورت حال اس کے قریب قریب تھی، لوگ جھوٹ بولنے سے پرہیز بھی کرتے تھے اور گریز بھی۔

صحابہ باہم آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا تذکرہ فرماتے اور یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ اس کی سند دریافت کی جائے۔ ارشادات نبوی کی چھان پھٹک کے متعلق ہر طبیعت میں ایک معیار موجود تھا، جو آنحضرت ﷺ کی مصاحبت سے خود بخود طبائع میں پیدا ہو چکا تھا۔ حسن عمل کی برکت سے طبائع میں از خود ایک توازن پیدا ہو گیا تھا،

[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو حدیث بیان کرتے وقت جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے، نیز فرماتے ہیں:

''خدا کی قسم! ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے، بلکہ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جھوٹ ہوتی کیا چیز ہے؟''

(المعجم الكبير للطبراني (١/ ٢٤٦)، مفتاح الجنة للسيوطي: ٧٧)

جس کے ہوتے سند کی ضرورت نہ تھی، إلا أن یضطر إلی ذلك !

رفقاء اس قدر پاکیزہ تھے کہ کسی کو کسی پر بدگمانی نہ تھی، اگر کسی وقت شبہ ہوا، تو ادنی وضاحت سے دور ہوگیا، کبھی معمولی سی تاکید سے معترض کی طبیعت صاف ہوگئی، یہ سب ماحول اور گردو پیش کی برکت تھی۔

تابعین کا ابتدائی دور بھی اسی نوعیت کا تھا، عموماً کبار تابعین صحابہ سے نقل فرماتے اور صحابہ کا صدق و ثقاہت از قبیل مسلمات تھے، اس لیے نہ سند کی ضرورت تھی، نہ اتصال اور انفصال کا شبہ، انقطاع اور اعضال دونوں کے لیے یہاں گنجائش نہ تھی۔

صغار تابعین کے زمانہ میں بدعات کا شیوع ہوا، ان کی حمایت کے لیے حدیث سازی کا مشغلہ بھی بعض اوقات اختیار کیا گیا، جسے اہل علم کی دور بین نگاہوں نے تاک لیا اور اسی وقت سند کی ضرورت پیش کی گئی:

”عن ابن سیرین أنه قال: کانوا لا یسألون عن الإسناد فلما وقعت الفتنة قیل سموا لنا رجالکم فینظر إلی أهل السنة فیؤخذ عنهم وإلی أهل البدعة فلا یؤخذ عنهم“ [1]

(مقدمہ صحیح مسلم، أیضا: إرشاد الفحول، صفحہ: ٦٢)

ابن سیرین فرماتے ہیں: ابتداء میں سند کی بابت کوئی نہیں پوچھتا تھا، جب فتنہ واقع ہوگیا، تو رجال کی تحقیق شروع ہوئی، اہل سنت کی روایات قبول کی جاتیں اور اہل بدعت کی روایات ترک کر دی جاتیں۔

سچائی کے عام رواج کی وجہ سے سند کی بابت پڑتال نہیں ہوتی تھی، اس کا یہ معنی نہ سمجھا جائے کہ اس وقت سند فی الوقوع ناپید تھی، بلکہ اس کی ضرورت نہ تھی،

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم (ص: ١٢) العلل و معرفة الرجال (٢/ ٥٥٩) الضعفاء للعقیلي (١/ ١٠) إرشاد الفحول (ص: ٩٨)

لوفور سجیة الصدق ۔ [1]

ایسا کہنے اور سننے والے دونوں اصل سند کو جانتے تھے، آج کل بھی معاصر ایک دوسرے کے اساتذہ اور تلامذہ کو سمجھتے ہیں، ایک دوسرے کے تعلیمی حالات، معاصرت، لقاء، سماع وغیرہ کا رفقاء کو عموماً علم ہوتا ہے، مثلاً میرے سب رفقاء جانتے ہیں کہ میں نے حدیث کا سماع حضرت الشیخ الامام حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ سے کیا، مجھے میاں صاحب رحمہ اللہ سے شرف تلمذ نہیں۔ اس کے باوجود میاں صاحب رحمہ اللہ کی بیسیوں باتیں بلا سند مجلس میں ذکر ہوجاتی ہیں۔ رفقاء یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ باتیں میں نے حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ سے نہیں سنی، بلکہ ان کے بعض تلامذہ ہی سے سنی ہیں، اس قسم کا ارسال بالکل عادتاً ہے۔

بعض ثقات ائمہ حدیث سے جو ارسال منقول ہے، وہ اسی نوعیت کا تھا، مثلاً سعید بن مسیّب، ابراہیم نخعی، سالم بن عبداللہ، ابو سلمہ بن عبدالرحمان، قاسم بن محمد رحمہم اللہ، یہ لوگ ارسال کسی بری نیت یا استاد کے نام کو چھپانے کے لیے نہیں کرتے تھے، اخفاء کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے، جب اسناد میں کوئی ضعف یا عیب ہو۔ کبار تابعین کے اساتذہ عموماً صحابہ ہی ہوتے ہیں، انھیں بدنیتی سے چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے ثقات ائمہ میں یہ عمل یا عادتاً ہوگا یا سہو ونسیاں سے۔ اس سے یہ فیصلہ کہ

"غرض بالقصد جب ارسال کیا جائے، تو یہ بھی اسنادی تدلیس کی ایک قسم ہے اور یقیناً یہ بھی ایک طرح کا کذب و دجل ہے، اس سے چشم پوشی کھلی ہوئی مداہنت فی الدین ہے۔" (طلوع اسلام، شمارہ ۹، ص:۷۶)

یقیناً یا جہل اور لاعلمی ہے یا بدنیتی، قاتل اللہ قائل ذلك و معتقداہ!

---

[1] سچائی کی خصلت عام ہونیکی بدولت۔

اصول حدیث سے فی الجملہ ممارست اور معتاد امور پر نظر رکھنے والا اگر دیانت دار ہے، تو یقیناً ایسی جہالت آمیز جسارت نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں حضرات منکرین حدیث کے زبان وقلم میں یہ جسارت کیوں ہے؟ عوام میں شہرت کے لیے شاید یہ آسان راہ ہے!!

میں نے اس گروہ کے اکثر بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جتنا بڑا جہل ہو، اسے اتنی ہی بڑی جرأت سے کہنا شروع کر دیتے ہیں، تاکہ عوام اسے صحیح تصور کرنے لگیں! ارسال کو محققین ائمہ حدیث نے کبھی تدلیس سے تعبیر نہیں فرمایا، لیکن ہمارے دوست عمادی صاحب ہیں کہ جو اس جھوٹ سے پرہیز کرے، اسے مداہن فی الدین فرماتے ہیں، زبان کی یہ درازی افسوسناک ہے!

صحابہ اور کبار تابعین اور معاصرین ائمہ فن میں ارسال ایک مسامحت ہے، جسے وہ بعض اوقات عادتاً کر گزرتے ہیں، ان کی نیت خراب نہیں ہوتی، البتہ بعد میں آنے والوں کو اس میں ضرور دقت ہوتی ہے اور اسی دقت کی وجہ سے اسے پسند نہیں کیا گیا۔ معاصر تو اسے جانتا ہے، مگر بعد میں آنے والے لوگ اس غیر مذکور آدمی کے متعلق رائے قائم کرنے میں دقت محسوس کرتے ہیں، اس کے ضعف و ثقاہت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔

میری دانست میں ارسال ایک اضافی عیب ہے، جب تک مرسل کی نیت کا علم نہ ہو، اس کی ذات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے آخر مضمون میں عمادی صاحب نے جس قدر اجتہادات فرمائے ہیں اور زہری اور ائمہ حدیث کی شان میں گستاخی کی ہے، وہ غلط ہے اور اصول حدیث سے بے خبری پر مبنی ہے۔ جب تک ارسال میں شبہات نہیں پیدا ہوئے، ائمہ حدیث اسے قبول فرماتے رہے:

" قال ابن جرير: أجمع التابعون بأسرهم على قبول المرسل ولم يأت عنهم إنكاره ولا عن أحد من الأئمة بعدهم إلى رأس المائتين " [1] (تدريب الراوي، ص: ٤٧)

مرسل کے قبول پر تابعین کا اجماع ہے، دوسری صدی کے اوائل تک کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔

ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" أما المراسيل فقد كان أكثر العلماء يحتجون بها فيما مضى مثل سفيان الثوري و مالك و الأوزاعي حتى جاء الشافعي رحمه الله فتكلم في ذلك و تابعه عليه أحمد وغيره"

(قواعد التحديث، ص: ١١٥)

"اکثر علماء مرسل کو حجت سمجھتے تھے، جیسے سفیان ثوری، مالک اور اوزاعی، یہاں تک کہ امام شافعی نے اس میں گفتگو کی اور امام احمد نے ان کی موافقت کی۔"

امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے جمہور اہل علم مرسل کو حجت سمجھتے رہے، سب سے پہلے اس کے متعلق تنقید امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمائی۔ [2] اس دور میں بعض ایسے وجوہ پیدا ہوگئے تھے، جن کی وجہ سے مرسل کی حجیت پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ تابعی، صحابی کا نام حذف کر کے ارسال کرے، اس میں کوئی حرج نہ تھا، لیکن بعض اوقات تابعی تابعی سے نقل کرتا ہے اور یہ سلسلہ استقراء کے بعد چھ اور سات واسطوں

[1] تدريب الراوي (١/ ١٩٨)

[2] امام شافعی رحمہ اللہ سے پہلے بھی اہل علم مرسل روایت پر نقد اور اسے ناقابل احتجاج ہی تسلیم کرتے تھے، جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عمر بن عبدالعزیز، سعید بن مسیب، ابن سیرین، ابن شہاب زہری، مالک بن انس، اوزاعی، شعبہ بن حجاج، یحییٰ قطان، عبداللہ بن مبارک اور عبدالرحمٰن بن مہدی جیسے اساطین فن قابل ذکر ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیں: توضيح الكلام في وجوب القراءة خلف الإمام للعلامة إرشاد الحق الأثري حفظه الله (ص: ٥٣٨)

تک پہنچا، کما ذکرہ الحافظ ابن حجر رحمہ اللہ۔

اس لئے محذوف کے متعلق اس زمانہ میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ وہ صحابی ہے یا تابعی؟ اور پھر وہ تابعی ثقہ ہے یا ضعیف؟اس لئے ائمہ حدیث میں بناء علی الدلیل امام شافعی کی رائے کو ترجیح دی گئی، کما ذکرہ مسلم فی مقدمۃ صحیحہ:

" والمرسل من الروايات في أصل قولنا وقول أهل العلم بالأخبار ليس بحجة " انتھی [1]

مرسل کے متعلق ہمارا اور اہل علم کا قول ہے کہ وہ حجت نہیں۔

ایک متحرک فن جس میں تقلید آمیز جمود نہ ہو، ایسے اختلافات سے خالی نہیں ہوسکتا، بلکہ ذخیرہ احادیث کی حفاظت ہی کے لیے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ نے مرسل کو قبول کیا اور اسی ذخیرہ کی حفاظت کے لیے امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا اور مسترد کر دیا، والبصیر لا یریب فیہ [2]۔ زمانہ صحابہ کا قرب اور وفورِ صدق اس کے قبول کا داعی تھا، عوام کی غیر محتاط روش سے متاثر ہو کر اسے مسترد کرنا ضروری سمجھا گیا۔

جمود پسند حضرات نے اسے حنفی اور شافعی اختلاف کی صورت دے کر ایک نزاعی مسئلہ بنا دیا، حالانکہ یہ اختلاف احوال وظروف کا تقاضا ہے، جس سے کوئی متحرک فن خالی نہیں۔ جو خطرات مرسل کے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانہ میں محسوس کئے گئے، اگر امام مالک رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے اس وضاحت سے آجاتے، تو وہ یقیناً مرسل کی حجیت کا انکار فرماتے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم (ص: ١٢)

[2] صاحب بصیرت اس میں شک نہیں کرسکتا!

احتیاط پسند طبیعت کبھی اسے قبول نہ کرتی اور امام شافعی رحمہ اللہ اگر صدق وصفا کے دور کو پالیتے، جس کے کافی اثرات حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے سامنے تھے، تو امام شافعی رحمہ اللہ اس کی حجیت پر بحث نہ فرماتے۔ احوال کی اس تبدیلی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا جہالت ہے کہ ''ارسال بھی تدلیس ہی کی ایک صورت ہے''۔

مرسل کے متعلق اصطلاحی بحث:

مرسل کے متعلق یہ طبعی افتاد آج بھی ہماری زندگی کا جزو ہے، شرعی حجیت سے قطع نظر اظہار واقعات میں ہم واقعات کے ان ذرائع کا اظہار ضروری نہیں سمجھتے، جن سے ہمیں ان واقعات کا علم ہوا۔ لیکن اگر ان واقعات میں شبہ پیدا ہو، تو ان ذرائع کے چھان پھٹک کا احساس ہوتا ہے اور تحقیق ہی کی جاتی ہے۔ بسا اوقات ایسی روایات پر بے اعتمادی بھی ہوجاتی ہے، بعض ایسے آدمی سامنے آجاتے ہیں، جن کی نقل میں ضعف اور طریق وصول میں اشتباہ یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے، فن حدیث میں بھی ارسال کی قریب قریب یہی صورت ہے۔ جب تک صداقت طبائع پر غالب رہی، وسائط اور ذرائع کے علم کے باوجود بحث وتنقید کی نوبت نہ آئی اور جب طبائع کا رجحان سچائی سے ہٹتا نظر آیا، رواۃ اور ذرائع بحث ونظر کی کسوٹی پر پرکھے جانے لگے۔ اس لئے ارسال ایک اضافی عیب ہے، جسے اسباب وقرائن سے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے اور بوقت ضرورت اس پر مواخذہ بھی ہوسکتا ہے۔ محدثین نے اس پر اسی انداز سے بحث کی، خود امام شافعی رحمہ اللہ جنھیں مرسل کی حجیت پر نقض کا شرف حاصل ہے، مرسل کو بالکلیہ رد نہیں فرماتے اور ائمہ حدیث جو اس فن کے مختلف گوشوں پر ناقدانہ نظر رکھنے کے عادی ہیں، وہ بھی مرسل کو علی الاطلاق رد نہیں فرماتے:

'' قال الشافعي: يقبل إن اعتضد بمجيئه من وجه آخر يباين الطريق الأولى مسندا كان أو مرسلا، ليترجح احتمال كون

المحذوف ثقة في نفس الأمر“ [1] (نزهة النظر،ص: ٥٠)

امام شافعی فرماتے ہیں: اگر مرسل کی تائید کسی دوسرے طریق سے ہو جائے، قطع نظر کہ وہ طریق مسند ہے یا مرسل، تو مرسل کو قبول کیا جائے گا، غرض صرف یہ ہے کہ محذوف راوی کی فی نفسہ ثقاہت کا یقین ہوجائے۔

جمہور محدثین کا مسلک اور بھی محتاط ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر محدث ثقات سے ارسال کا عادی ہو، تو بھی اس کی روایت میں توقف کیا جائے گا، کیونکہ صرف یہ عادت محذوف راوی کی ثقاہت کی دلیل نہیں ہوسکتی، بلکہ ضروری ہے کہ غیر مذکور راوی کے متعلق صحیح علم ہو اور اس کی ثقاہت یا ضعف کے متعلق ہمارے پاس واضح قرائن ہوں۔ گو مرسل کی بحث سابقہ گزارشات میں کافی صاف ہوچکی ہے اور اس اختلاف کی حقیقت بھی واضح ہوچکی ہے، جو ائمہ حدیث ،احناف، موالک اور حنابلہ میں پایا جاتا ہے، تاہم مناسب ہے کہ اصطلاحی الفاظ میں بھی اس کا تذکرہ ہوجائے۔

اختلافِ تعبیر:

① ” الإرسال عدم الإسناد وهو أن يقول الراوي: قال رسول اللهﷺ من غير أن يذكر الإسناد “ (شرح التوضيح لمتن التنقيح :٢/٧) [2] “

مرسل اسے کہتے ہیں، جس کی سند نہ ہو، کوئی راوی ”قال رسول اللهﷺ “ کہہ دے اور سند ذکر نہ کرے۔

② ” المرسل وهو أن يترك التابعي الواسطة بينه وبين رسول اللهﷺ ويقول: قال رسولﷺ “ (إرشاد الفحول،ص:٦١)

تابعی واسطہ ترک کر کے خود آنحضرت ﷺ سے نقل کرے۔

③ ”المرسل قول من لم يلق النبيﷺ قال رسول اللهﷺ “(عند جمهور

---

[1] الرسالة للشافعي (ص: ٤٦١) نزهة النظر (ص: ١٠٢)

[2] شرح التلويح على التوضيح لمتن التنقيح في أصول الفقه (٢/ ١٤)

أهل الأصول) (إرشاد) [1]

مرسل اس شخص کی روایت کو کہتے ہیں، جو آنحضرت ﷺ سے نہیں ملا اور آنحضرت ﷺ سے بلا واسطہ نقل کرے۔

یہ اور اس قسم کی مختلف تعبیرات ہیں، جو ائمہ اصول اور ائمہ حدیث سے منقول ہیں۔ پہلی تعریف صرف تخیل ہے، اسے ایک فنی تعریف کہنا مشکل ہے، اس کا اطلاق مسند اور صحیح کے سوا قریب قریب اکثر اقسام حدیث پر ہو سکتا ہے۔ ارسال کی تعریف میں "عدم الاسناد" عجیب ہے، عدم کے ساتھ ایک وجودی چیز کی تعریف فن کے اعتبار سے غیر مانوس ہے۔

تیسری تعریف عام ائمہ اصول فقہ کے نزدیک ہے، یہ ایک اصطلاح ہے، ورنہ یہ بھی قبول اور عدم قبول میں مبحث نہیں قرار دی جا سکتی، اصل مبحث ائمہ حدیث کی تعریف ہے، جسے نمبر۲ میں ذکر کیا گیا ہے۔

ائمہ اصول کی تعریف کے متعلق امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" إطلاق المرسل على هذا، وإن كان اصطلاحا، ولا مشاحة فيه لكن محل الاختلاف هو المرسل باصطلاح أهل الحديث الخ "

ائمہ اصول اسے بطور اصطلاح مرسل کہتے ہیں، اصل محل خلاف مرسل باصطلاح اہلحدیث ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ از قسم ضعیف ہے، اس لئے حجت نہیں، ممکن ہے کہ محذوف راوی صحابی نہ ہو اور ضعیف ہو۔ [2]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور جمہور معتزلہ اسے حجت سمجھتے اور قبول فرماتے ہیں، آمدی رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک پسند کیا ہے، بعض انتہا پسند غالی اسے مسند سے بھی بہتر سمجھتے ہیں۔ قاضی عیسیٰ بن ابان قرون مشهود لها بالخير کی مراسیل کو حجت سمجھتے ہیں،

---

[1] إرشاد الفحول (١/ ١٧٣)

[2] إرشاد الفحول (١/ ١٧٣)

قاضی عیسیٰ بن ابان محتاط قسم کے معتزلی ہیں۔ ابن حاجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ناقل ائمہ نقل سے ہو، تو اس کی مرسل مقبول ہوگی۔ حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ناقل محتاط نہ ہو، ارسال غیر ثقہ راوی سے بھی کرے، تو ایسی مرسل حجت نہ ہوگی۔ [1]

امام مالک رحمہ اللہ بھی اس مسئلہ میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہم آواز ہیں:

" وأصل مذهب مالك و جماعة من أصحابه أن مرسل الثقة يجب به الحجة ويلزم به العمل كما يجب بالمسند سواء " [2]

(إرشاد، ص: ٦١)

امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے رفقاء مرسل کو مسند ہی کی طرح حجت سمجھتے ہیں اور اس پر عمل ضروری سمجھتے ہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں قدماء سے بھی مرسل کے ضعف اور عدم حجیت کا تذکرہ فرمایا، [3] لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث فرمائی اور ان تمام نقائص کی نشاندہی فرمائی، جو مرسل کی حجیت سے پیدا ہو سکتے تھے، [4] اس لئے عموماً امام شافعی رحمہ اللہ اس اختلاف میں مشہور ہیں، والحق أن له فيه سلفا والحق فيه معه بحسب الدليل ! [5]

مذاہب ائمہ کی اس مختصر تفصیل سے میرا مطلب یہ ہے کہ مرسل کوئی ہوّا نہیں، جس سے تمنا صاحب اور ادارہ طلوع اسلام گھبرا کر بدحواس ہو رہا ہے، بلکہ ایک عرصہ

---

1. مصدر سابق
2. إرشاد الفحول (١/ ١٧٥)
3. مقدمہ صحیح مسلم (ص: ١٢)
4. دیکھیں: الرسالة (ص: ٤٦١)
5. حق یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کے سلف ہیں اور اس مسئلہ میں دلائل کے اعتبار سے حق ان کے ساتھ ہے۔

تک ائمہ اسے حجت سمجھتے رہے، اس لئے اسے تدلیس کی ایک قسم قرار دینا فن حدیث سے لاعلمی پر مبنی ہے یا غلو اور بے اعتدالی پر!

ارسال کی حقیقت کو سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہوگا کہ ارسال سے بلاشبہ ضعف کا خطرہ ہوسکتا ہے، لیکن اس فعل سے راوی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، راوی ارسال کا کتنا ہی عادی کیوں نہ ہو، اس کی جو احادیث اس عیب سے خالی ہوں گی، وہ بلا انکار مقبول ہوں گی۔ تدلیس ایسا عیب ہے، جس کا اثر مدلس کی تمام ان روایات پر پڑے گا، جہاں وہ تحدیث کی تصریح نہ کرے، لیکن ارسال کا حال اس سے بالکل مختلف ہے:

لأنه عيب في الرواية والراوي بمعزل عنه ![1]

عبیداللہ بن عدی بن خیار، ابو امامہ بن سہل بن حنیف، عبداللہ بن عامر بن ربیعہ ایسے کبار تابعین اور سعید بن مسیب، سالم بن عبداللہ، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن، قاسم بن محمد، علقمہ بن مسروق، حسن بصری، ابن سیرین، امام شعبی، سعید بن جبیر، امام زہری، قتادہ بن دعامہ، ابو حازم اور یحییٰ بن سعید تمام ائمہ سے مراسیل کی روایت ثابت ہے، لیکن ان کی ذات پر اس کا کوئی اثر نہیں، نہ ان کی ثقاہت پر کوئی عیب! مفصل بحث کے لیے تدریب الراوي في شرح التقريب للنواوي، إرشاد الفحول وغیرہ مطولات کی طرف رجوع کریں۔[2]

اہلحدیث جماعت کا مسلک مرسل کی حجیت کے متعلق امام شافعی سے بھی کچھ آگے ہے، مگر ہم مرسل سے گھبراتے نہیں، بحث ونظر سے جو ثابت ہو، اسے قبول کرتے ہیں، اور جو ثابت نہ ہو سکے، اس کو رد کرنے میں تامل نہیں، العهدة على النظر والدليل !

---

[1] کیونکہ وہ روایت میں عیب ہے اور راوی اس سے دور ہے۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: الكفاية (ص: ٣٨٤) مقدمة ابن الصلاح (ص: ٣١) فتح المغيث (١/ ١٣٤) تدريب الراوي (١/ ١٩٥) توضيح الأفكار (١/ ٢٨٣) إرشاد الفحول (١/ ١٧٢)

۸۔ امام زہری اور ان کے اساتذہ:

امام زہری رحمہ اللہ اپنے وقت کے اکابر اہلحدیث سے ہیں، اکثر احادیث امام زہری ہی کے توسط سے ائمہ حدیث تک پہنچی ہیں، عمادی صاحب نے اپنے مضمون کے ایک حصہ میں امام کے اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے، فن کے لحاظ سے کسی محدث کے استاد کا ضعف یا تدلیس محدث کی ذات پر اثر انداز نہیں ہوتی اور واقع بھی یہی ہے کہ ذاتی خصائص یا ذاتی نقائص کا اثر صاحب خصائص کی ذات سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

پیغمبر کے آباؤ اجداد کا کفر پیغمبر کی ذات پر موثر نہیں اور نہ پیغمبر کی عصمت سے پیغمبر کی اولاد متاثر ہو سکتی ہے: ﴿منهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات﴾ [1] یہ اصل مسلّم ہے، اس لیے رواۃ میں بھی شاگرد کا ضعف استاد پر اثر انداز نہیں ہوتا اور استاد کی ثقاہت تلمیذ کے ضعف میں کمی نہیں کر سکتی۔

حدیث پر ہر راوی کی صفات کا اثر البتہ ہو سکتا ہے، جس سے محدثین پوری طرح آگاہ ہیں اور ان صفات ہی کی بنا پر حدیث کے ضعف و سقم کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

عمادی صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ ''طلوع اسلام'' ستمبر ۵۰ء کے شمارہ (۹) کے آخر میں امام زہری کے اساتذہ کا ذکر کیا ہے، پورے مضمون میں محدثانہ دیانت ناپید ہے، لیکن یہ حصہ خصوصیت کے ساتھ دیانت کے معیار سے بہت پست ہے اور سچ یہ ہے کہ ایک منکر حدیث کو اس موضوع پر لکھنا بھی نہیں چاہیے، فن اور اصحاب فن سے بغض کے بعد رجال فن کے تذکرہ میں دیانت کا قائم رہنا مشکل ہے۔

شبہات:

مضمون نگار نے امام زہری کے شیوخ سے پندرہ سولہ بزرگوں کے تذکرہ کو کسی قدر صراحت سے لکھا ہے، نو بزرگوں کا سن وفات بھی نقل کیا ہے اور سات حضرات

---

[1] فاطر: ۳۲

کے سنین وفات غالباً ان کو کتب محدثین سے نہیں مل سکے، اس لئے ان کے متعلق جو جی میں آیا فرماتے گئے۔

تعجب یہ ہے کہ عمادی صاحب اس بے ضرورت طول کے باوجود یہ نہیں فرماتے کہ ان کو ان بزرگوں سے رنج کیا ہے اور وہ کون سا دکھ ہے جس کی وجہ سے اتنا قلق اور بے قراری ہے؟ بتکرار پڑھنے کے باوجود میں اس حصہ کو بے سود اور بے تعلق سمجھتا ہوں، نہ محدثانہ طور پر اس سے کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی فقہی نکتہ!

عمادی صاحب اس غلطی میں ہیں کہ حدیث کی جمع و تدوین کا سلسلہ ۱۰۱ھ میں شروع ہوا، اس لئے جو اساتذہ ۱۰۱ھ سے پہلے انتقال فرما چکے تھے، ان سے امام زہری کا سماع درست نہیں، یہ روایات مرسل ہیں اور امام زہری کے ان اساتذہ کا علم جن سے وہ براہ راست نقل فرماتے ہیں، مشکل ہے۔

جمع و تدوین حدیث کے متعلق ۱۰۱ھ کی تخصیص غلط ہے، جس کا تذکرہ مختصراً سابقہ گزارشات میں کیا جا چکا ہے، تفصیل کے لیے کسی دوسری صحبت کا انتظار فرمائیں۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ حدیث کی جمع و تدوین کس سال میں ہوئی؟ اس کو زہری کے سماع سے کیا تعلق ہے؟ کسی فن میں کتاب لکھنا اور چیز ہے اور اساتذہ فن سے استفادہ بالکل دوسری چیز، استاد اور شاگرد ہم زمانہ ہوں، موانع سماع ناپید ہوں، زیادہ سے زیادہ لقاء ثابت ہو، حدیث متصل ہوگی، اس کی جمع و تدوین کا وقت گو برسوں نہیں صدیوں بعد میں آئے، اس لئے آپ امام زہری رحمہ اللہ کے بعض اساتذہ کے سن وفات محفوظ رکھیں اور خود سوچیں کہ مضمون نگار میں دیانت کی کمی ہے یا علم کا نقص؟!

① عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ۹۴، ۹۸ھ

② ابوعبدالرحمان مسور بن مخرمہ ۶۴ھ

③ خارجہ بن زید بن ثابت ۱۰۰ھ

④ عبداللہ بن محمد بن حنفیہ ۹۸، ۹۹ھ

⑤ ابو سلمہ بن عبدالرحمان بن عوف ۹۴، ۱۰۴ھ

⑥ عمرہ بنت عبدالرحمٰن الأنصاریہ ۹۴، ۱۰۶ھ

⑦ حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف ۹۵، ۱۰۵ھ

⑧ سلیمان بن یسار الہلالی ۹۴، ۱۰۰ھ

امام زہری رحمہ اللہ کی پیدائش ۵۰ھ کے قریب قریب ہے اور ان کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا، جن ائمہ کا انتقال پہلی صدی کے اواخر میں ہوا، امام زہری کو ان سے تحصیل حدیث اور استفادہ کے لیے قریباً نصف صدی کا طویل موقعہ ملا، ائمہ حدیث کے نزدیک تو لقاء کی چند گھڑیاں اتصال حدیث اور انقطاع کی نفی کے لیے کافی ہیں، عمادی صاحب کے علم کی طغیانی کا یہ حال ہے کہ پچاس سال کے اخذ وسماع، افادہ و استفادہ، لقاء، تلمذ، تعلیم و تدریس کے تمام اثاثہ کو بہا لے جا رہی ہے۔ اللهم إني أعوذ بك من زلة الفكر و قلة العلم و فقدان الديانة !

اور کبر ونخوت کا یہ حال ہے کہ محدثین کی سب سے بڑی غلطی یہ بتائی جا رہی ہے کہ ان لوگوں نے حکومت کے عہدے کیوں نہ قبول کیے؟ وہ شامل ہو کر اصلاح کی کوشش کرتے، گویا حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کے اشتراک کے نتائج ان کے سامنے نہیں، حضرت امام ابو حنیفہ اس معاملہ میں دوسرے ائمہ حدیث کے ہمنوا تھے، وہ یقین فرماتے تھے کہ حکومت کا مزاج، ائمہ حدیث کا معاملہ تو دوسرا رہا، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ ایسے ذہین اور وسیع المشرب انسان کے لیے بھی سازگار نہیں، حضرت امام ابو یوسف نے آپ کے حسب منشاء حکومت سے پورا پورا اشتراک کیا، لیکن پھر عباسی حکومت کے اربابِ اقتدار میں کون سا انقلاب آ گیا، بلکہ الٹے امام ابو یوسف رحمہ اللہ بدنام ہوگئے، بہت سی ایسی چیزیں ان کی طرف منسوب کر دی گئیں، جو حضرت امام کے

مقام سے فروتر ہیں۔ امام محمد کا بھی یہی حال ہوا۔ بعض دوسرے ائمہ حدیث نے بھی اس بارہ میں مخلصانہ کوششیں فرمائی، فلم ينجح غير خفي حنين!

معلوم نہیں ہمارے ان یتیم الفکر حکماء کو کس نے بتایا ہے کہ وہ ان گزرے ہوئے بزرگوں کو اپنی تنقیدات کا تختہ مشق بنائیں، جو اپنے زمانہ کے مزاج سے کہیں زیادہ آشنا تھے اور اپنے وقت کے ارباب اقتدار کی ناہمواریوں کو زیادہ سمجھتے تھے۔ ادباً گزارش ہے کہ ہم گنہگار حاضر ہیں، ہم پر مشق ناز فرمایئے اور ائمہ حدیث اور بزرگان سلف کو ان مقدس مشوروں میں نظر انداز فرمایئے۔

تو کارے زمین را نکو ساختی [1]
کہ با آسماں نیز پرداختی

ان تمام شیوخ میں جن کا تذکرہ امام زہری کے شیوخ کے ضمن میں کیا گیا ہے، صرف حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ۳۴ھ سے امام کی روایت مرسل ہو سکتی ہے، [2] ممکن ہے محذوف شیخ صحابی ہو یا تابعی، اور میں نے عرض کیا ہے کہ ارسال روایت میں جرح کا سبب ہو سکتا ہے، راوی پر اس سے کوئی نقص نہیں آتا، معلوم نہیں عمادی صاحب نے یہ ہنگامہ کیوں بپا کیا ہے؟!

"سنين أبو جميله" کو عمادی صاحب نے تابعی لکھا ہے، محدثین انھیں صحابی کہتے ہیں، (ملاحظہ ہو: تقریب لابن حجر اور اصابہ و استیعاب) [3] حافظ رحمہ اللہ نے

---

[1] تو نے زمین کے کام ٹھیک کر لیے ہیں کہ آسمان کی آرائش کرنے چل پڑے ہو!

[2] حافظ ابو الحجاج المزی رحمہ اللہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے امام زہری کی روایت کو مرسل قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں: "لم يدركه" (تهذيب الكمال: ١٤/ ١٨٥، ٢٦/ ٤٢٢) کیونکہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ۳۴ھ یا ۴۵ھ کو امام زہری کی ولادت ۵۰ھ سے پہلے وفات پائی۔
(الإصابة: ٣/ ٦٢٦، تهذيب الكمال: ١٤/ ١٨٩)

[3] الاستيعاب لابن عبد البر (ص: ٢٠٨) الإصابة (٣/ ١٩٣) تقريب التهذيب (ص: ٢٥٧) اثبات صحبت کے طرق میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ راوی خود صحابیت کا دعویٰ کرے اور ابو جمیلہ رضی اللہ عنہ نے ←

صراحت فرمائی ہے کہ وہ صغار صحابہ میں سے تھے، گو ان کا سن وفات معلوم نہیں ہو سکا، لیکن صغار صحابہ کا صغار تابعین سے لقاء ممکن ہے، اس لئے ارسال کا دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔

باقی چھ اساتذہ کرام کے لقاء میں شبہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے، جب ان کا سن انتقال یقینی طور پر معلوم ہو، ابو الاحوص، عثمان بن اسحاق، محمد بن عبداللہ بن حارث کا بھی یہی حال ہے، ان کی وفات کتب رجال سے معلوم نہیں ہو سکی، اس لئے عمادی صاحب نے ابہام ہی میں ارسال کا شبہ پیدا کر دیا ہے، عمادی صاحب نے راوی سے زیادہ روایت کی تخریب کا ذمہ لے رکھا ہے!

مثال کے طور پر محمد بن عبداللہ بن حارث بن نوفل نوفلی کو لیجیے، عمادی صاحب کو ان کی وفات کا سال کتب رجال سے نہیں مل سکا، اس لئے عمادی صاحب نے فیصلہ کر دیا کہ امام زہری کی روایت ان سے مرسل ہوگی، حالانکہ اگر دیانتاً قرائن پر غور کیا جائے، تو یہ دعویٰ بالکل غلط ثابت ہوگا، خلاصہ میں امام زہری کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کو بھی ان کے تلامذہ میں شمار کیا گیا ہے۔[1] اگر ہمارے عمادی صاحب کی بصیرت ان سے تعاون کرتی اور دیانت ان کی راہنمائی کرتی، تو وہ یقین فرماتے کہ جب ان سے عمر بن عبدالعزیز کے سماع پر محدثین متفق ہیں، تو زہری کی روایت کو مرسل کیوں کر کہا جا سکتا ہے، وهما قرينان! بلکہ امام زہری کے علمی مشاغل حضرت عمر بن عبدالعزیز سے کہیں زیادہ ہیں، مگر جب ارادے درست نہ ہوں، تو نصیحت بے سود ہے۔

إذا كان الطبائع طبائع سوء فلا أدب يفيد ولا أديب[2]

← نبی علیہ السلام کو پانے کا خود ذکر کیا ہے۔ (صحیح البخاري، برقم: ٤٠٥٠) (الاستیعاب: ٢٠٨) نیز دیکھیں: فتح الباري (٥/ ٢٧٤)

[1] خلاصہ تذهيب التهذيب للخزرجي (ص: ٣٤٤)

[2] جب مزاج خراب ہوں، تو نہ کوئی ادب فائدہ مند رہتا ہے نہ کوئی ادیب ہی!

اب اس طریق استدلال پر تھوڑی دیر غور فرمایئے کہ چونکہ ابوالاحوص یا محمد بن عبداللہ بن حارث نوفلی یا سلیمان الاغر یا سلیمان بن ارقم ، ابوالاسود وغیرہ کا سن وفات ائمہ حدیث نے نہیں لکھا، یا عمادی صاحب کو اس کا علم نہیں ہوسکا کہ یہ بزرگ کب اس دنیا سے رخصت ہوئے؟ اس لئے امام زہری کی روایت ان سے صحیح نہیں، بلکہ منقطع ہے۔ اپنے قلت اور فقدان فہم سے دوسرے کی خطا پر استدلال یہ ہمارے عمادی صاحب کی نئی منطق ہے، جو الہاماً ایجاد فرمائی گئی ہے، اہل علم کے نزدیک تو عدم علم سے عدم شی پر استدلال صحیح نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اس کی اجازت ہے کہ عدم علم سے عدم شی پر استدلال کیا جائے۔

یہ تیرے زمانے میں دستور نکلا !

ایک علمی طغیانی:

معروضات کا دامن اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود پھیلتا جا رہا ہے اور ابھی اس منتشر اور غیر مربوط مضمون کے کئی گوشے ہنوز باقی ہیں، جن سے اس مقدس فن کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں، اس کے باوجود اس آخری گزارش کے بعد ان معروضات کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور بوقت ضرورت حاضری کے وعدہ پر آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

ہمارے عمادی صاحب نے لفظ ''مدین'' کی تحقیق میں ایک عجیب علمی طغیانی کا ثبوت دیا ہے، معلوم نہیں عام منکرین حدیث کے انکشافات کی طرح یہ بھی ایک انکشافی طغیانی ہے یا کوئی جدید تحقیق؟ فرماتے ہیں:

''قاموس میں ہے کہ ''ایلہ'' مصر اور ینبع کے درمیان ایک شہر ہے، مگر معجم البلدان (۱/ ۲۹۱) میں ہے کہ ''ایلہ'' شام کے قریب بحر قلزم کے ساحل پر واقع ہے، ایک قول ضعیف یہ بھی لکھا ہے کہ ''ایلہ'' حجاز اور شام کی سرحد پر

آخر حجاز و آغاز شام میں واقع ہے۔ یہ شہر ایلہ بنت مدین بن ابراہیم کے نام پر آباد ہوا، مگر مدین بن ابراہیم کا وجود محل اعتراض ہے، حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے، اسماعیل اور اسحاق، یہ تیسرے کہاں سے آ گئے؟''

(طلوع اسلام: ۹/۲ ۷، حاشیہ:۱)

امام زہری رحمہ اللہ چونکہ ایلہ کے رہنے والے تھے، اس لئے ایلہ کے محل وقوع کے متعلق یہ حاشیہ لکھا گیا۔ عمادی صاحب کا عام طریق استدلال تو یہ ہوتا ہے کہ جہاں اختلاف ہوا، وہ اصل واقعہ ہی کا انکار فرما دیا کرتے ہیں، جیسے تحقیق رواۃ میں ان کی روش ہے، اچھا ہوتا کہ وہ مقام ایلہ ہی کا انکار فرما دیتے، امام زہری کے لیے کس قدر مشکل پیدا ہوتی، انھیں عمادی صاحب کے انکار کے بعد پیدا ہونے اور ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہ ملتی، نہ روایت کا موقعہ ملتا اور نہ روایات کا یہ فتنہ بپا ہوتا، جو امام زہری نے بپا کر دیا، مگر ہم ممنون ہیں کہ عمادی صاحب نے یہاں یہ طریق اختیار نہیں فرمایا۔

وہ ایلہ بنت مدین کے وجود سے اس لئے انکار فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا کوئی تیسرا بیٹا عمادی صاحب کے علم میں نہیں اور شاید عمادی صاحب سے یہ لغزش اپنی قرآن دانی کے زعم میں ہوئی ہے، کیونکہ قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بوڑھا بیان فرماتا ہے، عمادی صاحب کا خیال ہے کہ بوڑھے میاں کے ہاں دو بیویوں سے دو بچے تو ہو گئے، مگر یہ تیسرے ''مدین کہاں سے آ گئے؟ (یہ فقرہ مقام ادب سے کس قدر گرا ہوا ہے!)

ہم عمادی صاحب سے علمی تعاون کے طور پر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ہم عرض کریں گے کہ ''مدین کہاں سے آ گئے؟'' ملاحظہ ہو:

'' ذكر أولاد إبراهيم الخليل، أول من ولد له إسماعيل من هاجر

القبطية المصرية ثم ولد له إسحاق من سارة بنت عم الخليل ثم تزوج بعدها قنطورا بنت يقطن الكنعانية فولدت له ستة مدين و زمران و سرج ويقشان ونشق ولم يسم السادس ثم تزوج بعدها حجون أمين فولدت له خمسة كيسان وسورج وأبهم ولوطان ونافس، هكذا ذكره أبوالقاسم السهيلي في كتابه التعريف والإعلام" (البداية لابن كثير : ۱/ ۱۷۵)

"پہلے حضرت اسماعیل ہاجرہ قبطیہ سے پیدا ہوئے، پھر حضرت اسحاق سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے، پھر آپ نے قنطورا سے نکاح کیا، ان سے چھ بچے پیدا ہوئے، پھر حجون بنت امین سے عقد فرمایا، ان سے پانچ بچے پیدا ہوئے۔"

حسب روایت سہیلی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چار بیویاں اور تیرہ بچے ہوئے، غالباً اس گزارش سے اتنا پتہ چل جائے گا کہ یہ تیسرے "مدین کہاں سے آئے۔"! غالباً اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی پرکھ قرآن کے معیار پر ہوگی، اس لئے بہتر ہے کہ ایک بیچارے مدین ہی کی مصیبت نہ آئے، دس اور بیٹے بھی اس کے ساتھ ہوں۔ غالباً تاریخی واقعات میں حضرت خلیل کی یہ اولاد موجود ہے، اب قرآن کے معیار پر دلائل ہی سے ان کی موت آئے گی اور یہ بیچارے کاغذات میں اہل قرآن ججوں کی مسل پر مریں گے:

اور ہم بھی دیکھیں گے کہ تماشا ہوگا !

معذرت:

تمنا صاحب کا مضمون از بس بے ربط اور لمبا تھا، مجھے امید نہ تھی اہل علم ایسی چیزوں پر توجہ دیں، ماہرین فن حدیث پر اس کا کوئی اثر بھی نہیں تھا، خطرہ تھا کہ عام طالب علم اور مغرب زدہ حضرات ان مغالطات سے متاثر ہوں، اس لئے میں نے

متعدد اقساط میں اس پر لکھا، میری گزارشات کا غیر مربوط ہونا قدرتی تھا، کیونکہ یہ اسی مضمون کا تتبع تھا، تاہم میں نے بہت سمیٹنے کی کوشش کی اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے ائمہ حدیث اور خدام سنت کی طرف سے مدافعت کی، وعند اللّٰہ فی ذلك الجزاء!

اس قسم کے مضامین ''الاعتصام'' ایسے اسبوعی اخبار کی بجائے ایک ماہوار مجلّہ کے لیے زیادہ مناسب ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ جماعت کو ایک مجلّہ شہریہ [ماہانہ] کی از بس ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ کسی صاحب ہمت کو توفیق دے، تو یہ ایک وقت کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں اہلحدیث پریس کے بعد جماعت کا یہ اولیں فرض ہے۔

ان طویل گزارشات میں مجھے اعتراف ہے کہ میرا لہجہ بعض جگہ سخت ہوگیا اور آج کل کے عرفی اور منافقانہ اعتدال سے الگ رہا ہوں، میں نے منکرین حدیث کی دیانت پر شبہ کیا اور میں اسے اپنا حق سمجھتا ہوں، تنقید ائمہ حدیث کی محبوب ترین ایجاد ہے اور اس کا بے خطر استعمال فن کی امانت ہے اور ہم خدام حدیث بحمد اللہ تنقید سے نہیں گھبراتے، لیکن ائمہ حدیث اور خدام فن کی بے ادبی اور محض ظن وتخمین کی بنا پر تہمت تراشی اور الزام نہ فن کی خدمت ہے نہ علمی مشغلہ!

منکرین حدیث کے اکثر جہلاء اسے فخر سمجھتے ہیں اور قدماء اور اسلاف امت پر کیچڑ اچھالنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، ایسے حضرات کے جواب میں مناسب تلخی میرا حق ہے، جس میں نہ تو مجھے معذرت کرنا ہے اور نہ ہی اپنے اس حق سے دست بردار ہونا ہے، بلکہ یہ حق اہل سنت کے لئے ہمیشہ سے محفوظ ہے۔

من سب بالبرھان لیس بظالم
والظلم سب المرء بالبھتان [1]

آئندہ بھی جو صاحب فن حدیث اور ائمہ حدیث کے متعلق متانت سے لکھیں گے، ان کا جواب اسی انداز سے ہوگا اور جو حضرات تہمت تراشی اور الزام کی راہ

[1] ظالم وہ نہیں جو دلیل کے ساتھ گالی دے، ظلم تو آدمی کو بہتان کے ساتھ گالی دینا ہے!

اختیار کریں گے، ان کا جواب قصاص کی میزان پر تلے گا:

﴿ إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله ﴾ ❶

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه اللهم وفقنا لما تحب وترضىٰ!

---

❶ هود: ٨٨

مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ

ماہنامہ ''اسلامی زندگی'' (مئی ۱۹۴۹ء) کے شمارے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک مضمون ظن کے مفہوم کے متعلق شائع ہوا تھا، جس کے جواب میں تمنا عمادی نے ماہنامہ ''البیان'' (جنوری ۱۹۵۰ء) میں ایک تنقیدی مضمون لکھا، جس میں ظن کے مفہوم اور حدیث نبوی کے مقام احتجاج کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کیے گئے، چنانچہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے تمنا عمادی کے مذکورہ بالا تنقیدی مضمون کے جواب الجواب میں مندرجہ بالا مضمون لکھا، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۳ مارچ ۱۹۵۰ء) کی پانچ اقساط میں شائع ہوا، ان سطور میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے فتنۂ انکار حدیث کا پس منظر، اغراض و مقاصد، سنت کا جدید مفہوم، سنت کے مواقع استعمال، حدیث کا تشریعی استقلال، مقام رسالت، حفاظت سنت، ظن اور خبر واحد کی حجیت وغیرہ کئی دیگر امور پر روشنی ڈالی۔

تمنا عمادی کے مذکورہ بالا مضمون کے جواب میں مولانا عبداللہ لائل پوری رحمہ اللہ نے بھی ہفت روزہ ''الاعتصام'' (جلد: ۱، شمارہ: ۳۰، ۳۱) کی دو اقساط میں ایک مقالہ ''مولانا تمنا کے مضمون پر ایک اور تعاقب'' کے عنوان سے سپرد قلم فرمایا تھا، جس میں انھوں نے علم حدیث اور علم اسماء الرجال کے متعلق عمادی شبہات کا ازالہ کیا، افادیت کے پیش نظر اسے بھی حواشی میں درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا تمنا کے تنقیدی مضمون کا علمی محاسبہ

البیان جنوری ۵۰ء میں ایک مضمون شائع ہوا، جس میں مولانا تمنا نے میری بعض گزارشات پر تنقید فرمائی ہے، جو ظن کے مفہوم کے متعلق ''اسلامی زندگی'' میں شائع ہوئیں۔

مولانا کا مقالہ بہت لمبا ہے، جس کا زیادہ حصہ مولانا نے اپنی بعض تصنیفات کے لیے بطور تعارف لکھا ہے، اگر تشہیر مصنفات کے لیے کسی دوسری فرصت کا انتظار فرما لیا جاتا، تو مقالہ کا طول وعرض بہت مختصر ہوتا۔

میری گزارشات کے متعلق مولانا نے بہت کم لکھا ہے، اگر مولانا کا مقالہ اصل موضوع پر لکھا جاتا، تو ہمیں بہت زیادہ استفادہ کا موقع ملتا۔ اگر مولانا نے زیرِ تصنیف مسودات شائع فرمائے اور صحت وفرصت میسر آئی، تو ان پر بھی ان شاء اللہ اظہار رائے سے گریز نہ ہوگا، اس وقت ان ضمنی مباحث پر لکھنے کا ارادہ نہیں۔

اہل قرآن کے مسلک:

مولانا عبداللہ آنجہانی اور ان کے رفقاء حجیت حدیث کے منکر ہونے کے ساتھ ائمہ حدیث اور دواوین حدیث پر تبرا بھی فرمایا کرتے تھے، بہت سے متواتر مسلّمات میں ترمیم کے قائل تھے اور بہت سے مسائل الف لام اور اضافت سے کشید فرمانے کی کوشش کرتے تھے!

امرتسر کی جماعت میں تبرا کی عادت کسی قدر کم تھی، مسلّمات متواترہ میں

ترمیم کا رواج بھی ان میں کم تھا، لیکن تاویل ہمرنگ تحریف کے بادشاہ تھے۔ معجزات میں تاویل اور نیچریت کا رنگ غالب تھا۔ دینی علوم اور علوم آلیہ میں دسترس بہت کم تھی، اس لیے ان کی تصنیفات کا انداز لیڈرانہ ہے۔

گوجرانوالہ کی جماعت علمی لحاظ سے کچھ قابل تعریف نہیں، مزاج میں بے ادبی غالب، بے عملی اور بدعملی ان حضرات کا امتیازی نشان ہے، ایک صاحب ان میں مدعی نبوت بھی تھے!

گجرات، ڈیرہ غازی خان اور ملتان کے اہل قرآن دوستوں میں الحاد غالب ہے۔ دہلی سے جو لوگ اب کراچی تشریف لائے، وہ سیاسی شیرینی میں انکار حدیث کا زہر سمونے میں تجربہ کار مشاق ہیں، گفتگو کے انداز لیڈرانہ، علوم خادمہ سے بہت کم آشنا، انگریزی علوم کے ساتھ فرنگیانہ طریق استدلال طبائع پر غالب ہے۔ زبان اچھی لکھتے ہیں، عامی آدمی ان کی تحریروں سے جلدی دھوکا کھا جاتا ہے اور قدر مشترک یہ ہے کہ علوم حدیثیہ سے کافی ناآشنا ہیں، علوم خادمہ پر بھی نظر نہیں، اس کا اثر جو قرآن فہمی پر ہونا چاہیے، نمایاں ہے۔

مولانا تمنا بظاہر حدیث کو حجت سمجھتے ہیں، لیکن محدثین کی تنقید اور اصول تنقید سے غیر مطمئن ہیں، ان کا خیال ہے کہ قرآن کو جو معیاری مقام حاصل ہونا چاہیے، وہ اسے نہیں دیا گیا۔ مولانا کا انداز تنقید اتنا تلخ اور مبنی برغلو ہے کہ ان کی حدیث اور سنت سے معمولی دلچسپی بھی انکار حدیث کے مراوف ہے، بلکہ اہلسنت کے لیے زیادہ مضر! میرا خیال ہے کہ ان کی تلخ نوائی جاہل اہل قرآن کے تبرا سے کم نہیں۔ میری آئندہ گزارشات مولانا کی اس مرکب پالیسی کو سامنے رکھتے ہوئے ہوں گی۔

مولانا ائمہ حدیث کو چور اور ڈاکو سمجھتے ہیں اور خود بحیثیت کوتوال ”قرآنی ٹارچ“ لے کر ان چوروں کے گھروں سے اپنا مال برآمد فرمانے کی کوشش میں مصروف

ہیں، إناللّٰہ!

تحقیق کے جس مقام پر مولانا اس وقت فائز ہو رہے ہیں، یہاں پہنچ کر حضرات اہل قرآن عموماً دہریت کی آغوش میں استراحت فرماتے ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوۃ ،غرض اکثر فرائض سے دلبرداشتہ ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو اس تباہی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے!

مقالہ کا اجمالی جائزہ:

مولانا کو ظن سے نفرت ہے وہ اس سے بچنا چاہتے ہیں، مناسب ہوگا کہ وہ اپنے گرامی مقالہ کا جائزہ لیں کہ آیا وہ ظن کی گرفت سے باہر ہیں یا ظن ان پر محیط ہے؟

(۱)'' قرآن مجید یقینی دستاویز ہے، لیکن اس کے مدلول کو متعین کرنے کے لیے احادیث کی طرف رجوع ضروری ہے''۔ (البیان، ص:۲۲)

اور احادیث مولانا کی نظر میں ظنی ہیں!

(۲)'' اہل لغت نے موضوع احادیث سے کافی حد تک استناد کیا ہے، اہل لغت نے اکثر استناد موضوع حدیثوں سے کیا ہے اور بعض الفاظ کے غلط معنی کیے ہیں''۔ (البیان،ص:۳۸)

اس لئے لغت بھی ظنی!

(۳) متواتر احادیث عام عقلاء ، متکلمین اور محدثین کے نزدیک یقینی ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ

''کوفہ اور خراسان کے واضعین نے یہ معاملہ بھی خراب کر دیا، محتاط محدثین کی تعریف کے مطابق بھی متواتر پر اعتماد کرنا مشکل ہے''۔

مولانا فرماتے ہیں:

''اس قسم کی حدیثیں دس بیس ہی نہیں، سو دو سو بھی مل جائیں تو کچھ تعجب نہیں''۔ (البیان، ص:۴۰)

(۴) صحیح احادیث کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

''مگر وہ شرائط ایسے ہرگز نہیں کہ کسی حدیث کو قطعی الصحت ثابت کر سکیں''۔

(البیان،ص:۳۹)

یقین کے تمام اسباب و دواعی مولانا کے نزدیک ظنی ہیں، ان سے نظری اور استدلالی علم بھی نہیں ہو سکتا، تو میرے مخاطب محترم ہی فرمائیں کہ وہ ظن کی گرفت میں ہیں یا آزاد؟!

''قرآنی ٹارچ'' تو شاید آپ کے ہاتھ میں ہوگی، لیکن سیل (Cell) بے کار ہوں گے، تو نظر کچھ نہیں آئے گا۔ اور میری دانست میں ٹارچ ہے بھی ایک معذور کے ہاتھ میں، جس کی آنکھیں بصیرت اور بصارت دونوں سے محروم ہیں، اس لیے ٹارچ بھی ٹوٹی ہوئی سمجھیے اور ہمارے محترم ظن کے نرغے میں:

كبهيمة عمياء قاد زمامها أعمى على عوج الطريق الحائر [1]

منطق کے علاوہ تمام علوم خادمہ میں قواعد کی کلیت ناپید ہے اور منطق کی اہمیت شرعاً معلوم! اب ہر طرف ظن ہے اور ہمارے محترم بھائی ظنون کے سمندر کی تہہ میں تشریف فرما ہیں!

محدثین کو چور کہہ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوئی، ان پر مزید بد دیانتی کا الزام اس طرح عائد فرماتے ہیں کہ

''ہر جھوٹی اور موضوع حدیث کو اپنے مسلک کی تائید میں پیش کر سکتے ہیں''۔

بدگمانی کا یہ عالم اور معلومات کی طغیانی کا یہ حال کہ ہر چیز پر بے اعتمادی، ظن

---

[1] اندھے چوپائے کی طرح جس کی قیادت ایک اندھا گم گشتہ اور ٹیڑھے راستے پر کر رہا ہے!

اور اس کے نتائج سے گریز ہے اور اس سے مفر کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی:

ہم نے لاکھوں ہی آشیاں بدلے
ابر کی برق باریاں نہ گئیں

اس نفسیاتی تجزیہ کے بعد جو مولانا کے مقالہ سے ظاہر ہے، مولانا حدیث کا انکار کریں یا اقرار، اسے قبول فرمائیں یا رد کریں، نتائج میں کوئی فرق نہیں۔ ان خیالات کی اساس خلوص و دیانت پر ہو یا جحود و عناد پر، غلطی بہر حال غلطی ہے۔ جس طرح قانون سے لاعلمی جرم کی نوعیت کو نہیں بدل سکتی، اسی طرح اصول و عقائد کا انکار اور لاعلمی انسان کو اس پاداش سے نہیں بچا سکتی، جو اس انکار پر مرتب ہوگی۔ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے انکار کرنے والے سب کے سب بدنیت اور معاند نہ تھے۔

مولانا کے معیار کا نتیجہ:

البیان (ص: ۲۲) کا ملخص یہ ہے کہ حدیث سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، مولانا کی سنت مصطلحہ حدیث کے دفاتر ہی سے ملے گی، مولانا کا خیال ہے کہ قرآنی ٹارچ کی مدد سے اس کی سراغ رسانی ہو سکتی ہے، ورنہ حدیث کے بغیر اگر قرآن کا مطالعہ براہ راست کیا گیا، تو باپ، بیٹا، بیٹی، داماد، بہو سب کا دین الگ الگ ایک دوسرے سے جدا ہوگا۔

یقیناً اگر قرآن پر براہ راست غور کیا گیا، تو اس کے نتائج تفرقہ کے سوا کچھ نہیں۔ حضرات اہل قرآن کی نصف صدی کی کوششیں ظاہر ہیں کہ سارے قرآن مجید سے آج تک نماز بھی کشید نہیں ہو سکی، اس قدر اختلاف ہوا کہ فقہاء کے فروعی اختلافات کی ان کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اب سوال ”قرآنی ٹارچ“ کا ہے، اس میں روشنی کہاں سے آئے گی؟ سیل (Cell) کہاں سے بنیں گے؟ اگر یہ

صرف قرآن سے بنائے گئے، تو اس میں پھر اختلاف اور طوائف الملوکی کا خطرہ ہوگا، اگر حدیث سے استفادہ کیا گیا، تو وہ ذخیرہ ظنی ہے۔ تاریخ کی روشنی سے یقین کیسے پیدا ہوگا؟! اگر مولانا کی سنت مصطلحہ کو اس ضرورت کے لیے استعمال کیا جائے، تو وہ بھی حدیث کے ظنی دفاتر ہی میں کہیں ناپید ہو رہی ہے۔ اس لیے ظن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ اتنا طویل مقالہ لکھنے کے بعد تا حال وہیں ہیں، جہاں سے انھوں نے اپنا سفر شروع فرمایا!

سنت باصطلاحِ جدید:

ترکِ حدیث یا اس کی ظنیت سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے پاٹنے کے لیے مولانا نے ایک نئی اصطلاح وضع فرمائی ہے، مولانا کے طویل سلبی مقالہ میں یہی ایک ایجابی چیز ہے، جس پر اس وقت ہمیں غور کرنا ہے:

> ''سنت اس دینی دستور اور مذہبی رواج کا نام ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے وقت میں قائم فرمایا تھا۔ پھر آپ کے بعد تک وہ دستور و رواج دینی حیثیت سے اسی طرح قائم رہا، کم از کم عہدِ فاروقی تک، کیونکہ خیر القرون کی مدت حضرت فاروقِ اعظم کے بعد ختم ہو جاتی ہے''۔ (صفحہ: ۳۰)

سنت کی یہ تعریف خود خلافِ سنت ہے، نہ آنحضرت ﷺ نے اپنے وقت میں اسے قائم فرمایا اور نہ زمانہ فاروقی تک اہلِ علم کی محفلیں اس سے آشنا ہوسکیں اور نہ ہی دینی رواج و دستور میں اس کا کبھی تذکرہ ہوا۔

''دین'' ''مذہب'' ''دستور'' ''رواج قائم کرنا''، اس طرح کے الفاظ تعریف میں عجیب ہیں۔ مقامِ نبوت کو رواج کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے، سارا زور رواج اور دستور پر ہے۔[1]

① فرض کیجیے آنحضرت ﷺ ایک حکم نافذ فرماتے ہیں، لیکن کچھ عرصہ کے

[1] سنت کی ایک تعریف تو وہ ہے جو ائمہ حدیث و سنت زمانہ سلف سے لے کر اب تک کرتے چلے ←

بعد وہ رواج ترک ہوجاتا ہے، جیسے نماز میں ثناء، جسے مکرر رواج دینے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ثناء بالجہر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ (مسلم)[1]

۲ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رواج قائم فرمایا، لیکن بعد میں مصالح کی بنا پر اس کی جگہ دوسرے دینی رواج نے لے لی۔ (طلاق ثلاثہ یک دفعہ)[2]

۳ فروعی مسائل میں بعض وقت دو رواج دوش بدوش دینی حیثیت سے قائم رہے۔[3] اس تعریف کے مطابق معلوم نہیں سنّیت کا شرف کس کو حاصل ہوگا اور کس طرح؟!

۴ ''اسی طرح'' کے لفظ سے گریز پائی کے لیے کتنا بڑا سامان مہیا فرمایا گیا ہے!!

← آئے ہیں، جسے مؤلف رحمہ اللہ نے آئندہ صفحات میں نقل کر دیا ہے، اور سنت کی دوسری تعریف وہ ہے، جس پر تمنا عمادی، فراہی، امین احسن اصلاحی اور غامدی گروپ کو اصرار ہے۔ اگر آپ ثانی الذکر تعریف کا مستشرقین کی تعریف سنت کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیں، تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ہمارے ان ''مجتہدین'' کی تعریف کسی مخلصانہ تحقیق اور بحث ونظر پر مبنی نہیں، بلکہ یہ انھی اعداءِ دین وسنت کا چربہ اور بازگشت ہے، جو ان کی معنوی اولاد ''خدمت دین'' کے نام پر بلند کیے ہوئے ہے، اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے کہ مستشرقین کے ''اجتہاد'' کی اتباع کرنی چاہیے یا مخلصین امت ائمہ حدیث وسنت کی تعریف پر قناعت کرنی چاہیے، جو کتاب وسنت کے مخلصانہ فہم ومطالعہ پر مبنی ہے! تفصیل کے لیے دیکھیں: دراسات في الحديث النبوي و تاريخ تدوينه (۱/ ۱)

[1] صحيح مسلم كتاب الصلاة، باب حجة من قال لا يجهر بالبسملة، رقم الحديث (۳۹۹) مصنف ابن أبي شيبه (۱/ ۲۱۰) سنن دار قطني (۱/ ۳۰۱)، نیز دیکھیں: إرواء الغليل (۲/ ٤۹)

[2] دیکھیں: صحيح مسلم: كتاب الطلاق، باب الطلاق الثلاث، رقم الحديث (۱٤۷۲)

[3] جیسے نماز میں تشہد کے الفاظ، جو ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، ابوموسیٰ اشعری اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں، دیکھیں: صفة الصلاة للألباني (ص: ۱٦۱) ان مروی الفاظ میں سے کوئی بھی الفاظ پڑھ لیے جائے، تو سنت پر عمل متصور ہوگا۔

⑤ پھر رواج دینے کے لیے اس تنوّر [روشن خیالی] اور تفرنج [انگریز نقالی] کے زمانہ میں کیا صورت اختیار کرنا ہوگی؟ اس کے لیے کوئی پریس کانفرنس بلانا ہوگی یا سرکاری گزٹ میں اشاعت لازمی ہوگی؟ مولانا کے شبہات کی زبان میں کوئی ایسی ہی صورت ضروری ہوگی۔ روشنی کا زمانہ ہے محترم بھائی کے اوہام بھی نئی روشنی ہی کے پیداوار ہیں، منطقی طور پر تو اس تعریف کی قیمت کچھ زیادہ نہیں، مناسب ہوگا برادر محترم اس پر نظر ثانی فرمالیں۔

فن حدیث، فن رجال اور اصول حدیث اغیار کی نگاہ میں اسلام کے محاسن سے شمار ہوتے ہیں، تعجب ہے کہ اپنوں کی بے قراریاں روز افزوں ہیں! یہاں یہ اس قدر بار دوش ہے کہ اس کی افادی حیثیت بھی زیر بحث ہے اور پھر جن دشواریوں سے آپ حضرات گھبرائے تھے، وہ انکار حدیث کے بعد مضاعف ہوگئیں۔

سنت کا مفہوم:

اہل سنت کی کتابوں میں مدت سے یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے، اس لیے جب یہ لفظ عرف میں بولا جائے گا، تو اس کا وہی مفہوم ہوگا، جو علماءِ سنت استعمال فرماتے ہیں:

① "السنة سنة النبي ﷺ أصلها الطريقة، وتطلق سنته ﷺ على الأحاديث المروية عنه ﷺ" (تهذيب الأسماء و اللغات)[1]

سنت کا معنی آنحضرت ﷺ کا طریق اور راستہ ہے اور احادیث پر بھی یہی لفظ بولا گیا ہے۔

② "قال الراغب: تنح عن سنن الطريق، و سُننه، و سِننه فالسنن جمع سنة، وسنة الوجه طريقته، وسنة النبي طريقته التي كان

[1] تهذيب الأسماء واللغات للنووي (٢/ ٤١٠)

یتحراها "[1]

راستہ سے ہٹ جاؤ، سنت کی جمع ہے، اس کے معنی طریقہ ہیں اور آنحضرت ﷺ کا طریق جس کے جناب پابند تھے۔

③ لأن لفظ السنة شامل لقول الرسول وفعله عليه السلام "[2]
(كشف الأسرار: ٢/٩٧٩)

لفظ سنت آنحضرت ﷺ کے قول اور فعل کو شامل ہے۔

④ " السنة لغة: الطريقة المسلوكة...... إلى: وأما معناها شرعاً أي في اصطلاح أهل الشرع فهي قول النبي ﷺ وفعله و تقريره"[3]
(إرشاد الفحول، ص:٣١)

لغت میں سنت کے معنی راستہ ہیں اور شرعاً اس کے معنی آنحضرت ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کے ہیں۔[4]

سنت کے مواقع استعمال:

① سنت بمقابلہ بدعت۔

② بمعنی غیر واجب۔

③ واجب۔

④ آنحضرت ﷺ سے جو قولاً وفعلاً اور تقریراً ثابت ہو۔[5]

---

❶ مفردات القرآن (١/ ٥٠٤)

❷ كشف الأسرار (٢/ ٥٢٠)

❸ إرشاد الفحول (١/ ٩٥)

❹ مؤلف رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ "جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث" میں سنت کی تعریف میں بیس کے قریب اقوال نقل کیے ہیں، جنھیں ملاحظہ کرنے کے بعد سنت کا معنی و مفہوم مزید واضح ہوجاتا ہے اور مذکورہ رسالہ میں انھوں نے سنت کی خود ساختہ جدید تعریف پر بھی کڑی گرفت کی ہے، جس سے اس جدید اصلاحی تعریف کی خامیاں تشت از بام ہوجاتی ہیں، جزاه الله خير ما يجزي به عباده الصالحين!

❺ دیکھیں: إرشاد الفحول (١/ ٩٥)

۵ عادتِ الٰہی: جو کائنات کی تخلیق، تربیت، فناء اور بقاء میں اختیار فرمائی گئی ہے: ﴿فلن تجد لسنة الله تبديلا ۚ ولن تجد لسنة الله تحويلا﴾ [1]

۶ سنة الأولين: قوموں کا نظام حیات اور اس کے باہر سے نتائج:

﴿وما منع الناس أن يؤمنوا إذ جاءهم الهدى ويستغفروا ربهم إلا أن تأتيهم سنة الأولين أو يأتيهم العذاب قبلا﴾ [2]

لوگوں کو ایمان اور استغفار سے صرف ایک چیز مانع ہے کہ ان پر پہلوں کی سنت پوری کی جائے اور اپنے سامنے عذاب آتا دیکھیں۔

۷ سنة الرسل: حق کی حمایت اور غلط کار لوگوں کی اذیت پر صبر وتحمل:

﴿سنة من قد أرسلنا قبلك من رسلنا......﴾ [3]

۸ سنة النبي ﷺ: آنحضرت ﷺ کا طریق زندگی، جو عبادات، معاملات، معیشت، مخالفین یا اپنے رفقاء سے عموماً اختیار فرمایا۔

یہی مفہوم ہے جس کے متعلق آج کی صحبت میں گزارش کرنا مطلوب ہے، اس کا دوسرا نام ''هَدْي'' ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''زاد المعاد في هدي خير العباد'' کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی صحیح کا اصل نام ہے: ''الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول الله ﷺ و سننه و أيامه'' [4]

ایسی جامع صحیح جس میں آنحضرت ﷺ کی سنت اور سیرت بیان کی گئی ہے۔

اس معنی کے لحاظ سے سنت اور حدیث ہم معنی ہیں، بلکہ قرآن بھی سنت ہے۔

---

1. الفاطر: ٤٣
2. الكهف: ٥٥
3. الإسراء: ٧٧
4. دیکھیں: تهذيب الأسماء واللغات للنووى (١/ ٨١) هدى الساري (ص: ٨) عمدة القاري (١/ ٥) مقدمة ابن الصلاح (ص: ١٠) المقنع لابن الملقن (ص: ٧٤)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "کان خلقه القرآن" [1] آنحضرت ﷺ کے اخلاق کی بنیاد قرآن پر تھی۔

فہم قرآن میں جو مقام صاحب قرآن کو حاصل تھا، دوسرا اس کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ قرآن عزیز کے مطالب کی عملی صورت آنحضرت ﷺ کی سیرت میں پائی جاتی ہے، اس لئے مولانا تمنا صاحب کا یہ فرمانا کہ

"حدیثیں اگر دین کے لیے ضروری ہوتیں، تو ضرور قرآن کی طرح لکھوائی جاتیں۔"

تعارض کے علاوہ قطعاً غلط ہے۔

سنت کا استعمال:

لفظ سنت کے مختلف استعمال میں نے اختصار سے عرض کر دیئے ہیں، مولانا عمادی نے سنت کے معنی میں رواج کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش فرمائی ہے، وہ اس انداز سے اس میں تواتر کی روح ظاہر فرمانا چاہتے ہیں۔ حدیث پر بے اعتمادی، رواۃ پر بدگمانی اور ائمہ حدیث سے سوءظن کے بعد رواج اور دستور کا سہارا لیا گیا ہے، اور اس کا امتداد زمانہ فاروقی تک رکھا ہے۔

اولاً ایسی تحدیدات تاریخی خیالات سے نہیں کی جاتیں، اس کے لیے صریح نص کی ضرورت ہے، قرآن یا سنت متواترہ سے اس کا مرتبہ کم نہ ہونا چاہیے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی ساری مملکت میں حال برابر نہیں تھا، کوفہ، بصرہ، شام اور نو مفتوحہ علاقے مصر وغیرہ مقامات کے رواجات مختلف تھے، معلوم نہیں مولانا کس دستور اور کون سے رواج کو استناد کا شرف بخشیں گے؟ اچھا ہو کہ امام مالک رحمہ اللہ کی

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٩١) نیز دیکھیں: صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرین و قصرها، باب جامع صلاة اللیل ومن نام عنه أو مرض، رقم الحدیث (٧٤٦)

طرح مدینہ کا تعامل حجت مان لیں۔

مقام حدیث اور مقام نبوت:

حدیث کے طریقِ حفاظت پر بحث کرنے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ حدیث ہے کیا اور دین میں اس کا مقام کیا ہے؟ اگر یہ واقعی آنحضرت ﷺ کی سیرت ہے، جو قرآن کی رہنمائی میں مکمل ہوئی، اس میں زندگی کے وہ عملی گوشے ہیں، جن کی طرف قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں، تو یقیناً اسے مثل القرآن اور مع القرآن تسلیم کرنا پڑے گا۔ میں نے سابقہ گزارشات میں عرض کیا تھا کہ فرض کیجئے کہ آنحضرت ﷺ آج ہم میں تشریف لے آتے ہیں یا ہمیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف میسر آتا ہے اور ہمیں آپ کوئی دینی حکم ارشاد فرماتے ہیں، آیا ہم اسے قبول کریں گے یا آنحضرت ﷺ سے حوالہ دریافت کریں گے کہ یہ حکم قرآن کی کس آیت سے ماخوذ ہے؟ اگر دوسری صورت ہے، تو ساری بحث ختم ہوجاتی ہے، حفاظتِ سند، رواۃ سب بے کار ہیں۔ اگر یہ صحیح معیار پر اتر بھی آئیں، تو بھی اس کے رد و قبول میں ہم مختار ہیں۔

قرآن حکیم کے تواتر پر ایک نظر:

جب تک آنحضرت ﷺ کے مقام کا تعین نہ ہوجائے، قرآن سے موافقت یا عدم موافقت کی بحث بھی قبل از وقت ہے۔ قرآن حکیم کا تواتر آنحضرت ﷺ سے شروع ہوتا ہے، آنحضرت ﷺ اور جبرائیل علیہ السلام کا تعلق، آنحضرت ﷺ اور خدا تعالیٰ کا تعلق تو صرف آنحضرت ﷺ کے ارشاد اور اعتماد پر موقوف ہے۔ آنحضرت ﷺ پیغمبر ہیں، اس کی بنیاد آنحضرت ﷺ کے ارشاد اور دعویٰ پر ہے، اس پر نہ کوئی تواتر شاہد ہوسکتا ہے اور نہ کوئی شہادت کہ یہ قرآن وہی ہے، جو آنحضرت ﷺ نے

جبریل علیہ السلام سے سنا اور جبریل علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے، اس کا انحصار آنحضرت ﷺ کے قول کی حجیت پر ہے، اگر یہ ارشادات حجت ہیں، تو رسول کے دوسرے ارشادات بھی حجت ہونے چاہئیں، ان کی حفاظت اور صحتِ نسبت بالکل دوسری بحث ہے۔

مولانا تمنا کا طویل مقالہ اس موضوع پر کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکا، رسول کے مقام کے متعلق غالباً پرانے اہل قرآن بزرگوں کا مسلک یہ تھا کہ رسول لغتاً پیغامبر ہے، اسے پیغام کی توضیح کا حق نہیں اور نہ ہی ہم اس کی توضیح کو قبول کرنے کے مکلّف ہیں، ہم آج ایسی تفسیر کر سکتے ہیں، جو حالات کے تقاضوں کو پورا کرے، گو رسول کے خلاف ہو!

ہمارا مسلک:

اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال، اجتہادات وتقریرات شرعاً حجت ہیں، بشرطیکہ اس کے خلاف دوسرا حکم نہ دیا گیا ہو۔ ہمیں ان سے یہ دریافت کرنے کا حق نہیں کہ آپ کے ارشاد کا حوالہ کہاں ہے؟ اگر اہل سنت کے نزدیک ان ارشادات کی یہ حیثیت نہ ہوتی، تو اس ذخیرہ کے جمع کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟!

مقام حدیث:

جو احادیث قرآن کے مطابق ہوں، انھیں قبول کرنا پیغمبر پر احسان ہے نہ ائمہ پر کوئی مہربانی، وہ قرآنی ہیں، انھیں بہر حال قبول کرنا ہے، اور جو احادیث قرآن کے صریح خلاف ہیں، (بالفرض) وہ قطعی ناقابل قبول ہیں، تاویل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلّمات عقلیہ اور متواترات کا بھی یہی حال ہے، جو حدیث ان کے خلاف ہو، مقبول نہیں ہوتی، بلکہ وہ حدیث حدیث ہی نہیں ہوگی، ائمہ حدیث نے اس

کی تصریح فرما دی ہے، ابن حزم رحمہ اللہ، ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی تصنیفات پر نظر رکھنے والوں سے یہ اصل مخفی نہیں۔ [1]

بحث صرف یہ ہے کہ مطابقت یا مخالفت کا معیار کیا ہوگا؟ اگر مطابقت اور مخالفت میں میرا اور آپ کا طریقِ فکر معیار قرار پائے، تو یہ مخالفت آپ کے ذہن سے ہوگی، قرآن سے نہیں، آپ کے ذہن کا نام قرآن نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی حدیث کو آپ حضرات کے اذہان پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ کوئی ناطق قرآن لایئے، جو خود بولے، میری اور آپ کی زبان سے بولنے کی ضرورت نہ رہے۔ خوارج اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی گفتگو [2] میں بھی یہی مشکل پیش آئی تھی کہ قرآن کی زبان سمجھنا مشکل ہوگیا تھا، وہ خود نہیں بولتا تھا۔

میں نے بطور فرض یہ گزارش کی ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مقام نبوت کو سمجھ لینے کے بعد حدیث یا سنت کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پیغمبر اگر قرآن کی مخالفت کرے، تو قرآن کے لیے کوئی مقام ہے، نہ پیغمبر کے لیے!

جن احادیث کے متعلق قرآن ساکت ہے، ان کا تعلق احکام سے ہو یا معاشرت سے، پیش گوئیاں ہوں یا سیاسی مصالح، حسب مرتبہ حجت ہوں گی، ان کا ماننا فرض ہوگا، وہ مثل القرآن ہیں اور مع القرآن۔

﴿ما فرطنا فی الکتاب من شیء﴾ [3] اور ﴿تبیانا لکل شیء﴾ [4] کو

---

[1] دیکھیں: الموضوعات لابن الجوزي (۱/ ۱۰٦)

[2] دیکھیں: سنن أبي داود: کتاب اللباس، باب لباس الغلیظ، رقم الحدیث (۴۰۳۷) سنن النسائي الکبری (۵/ ۱٦۵) المستدرك (۲/ ۱٦۴) سنن البیهقي (۸/ ۱۷۹) المعجم الکبیر للطبراني (۱۰/ ۲۵۷)

[3] الأنعام: ۳۸، مذکورہ بالا آیت میں لفظ "الکتاب" سے مراد لوح محفوظ ہے، جیسا کہ اسی آیت کے سیاق وسباق سے واضح ہوتا ہے، نیز دیکھیں: تفسیر الطبري (۵/ ۱۸٦) تفسیر البغوي (۱/ ۱۴۱) ←

انکار حدیث کے لئے بہانہ اور آڑ نہیں بنایا جائے گا، بلکہ اسے قرآن کی زبان اور عرب کے محاورات کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔ بلقیس کی حکومت کے متعلق ہدہد کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ملکہ سباً کے پاس ہر چیز ہے:﴿ إني وجدت امرأة تملكهم وأوتيت من كل شيء ولها عرش عظيم ﴾[1] حالانکہ سلیمان علیہ السلام کی ساری حکومت اس ﴿كل شيء ﴾ سے خارج ہے، نہ حاضرین نے اعتراض کیا، نہ حضرت کو جھوٹ کا شبہ ہوا۔

پیغمبر کا استقلال:

ہمارے نزدیک جو ایسی احادیث کی حجیت میں اینچ پینچ کرے، وہ منکر حدیث ہے، اسے چھپانے کے لیے وہ کتنی ہوش مندی سے کام کیوں نہ لے۔ پیغمبر کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے اور اس کے مزاج کی ساخت میں ایک معیار ودیعت فرمایا گیا ہے، جس کی موجودگی میں جو بھی وہ کہے گا، وہ کبھی منشاءِ الٰہی کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا یہ بیان عین قرآن ہے، اس آیت ﴿ تبيانا لكل شيء﴾ اور آیت ﴿ ما فرطنا ﴾ کے مطابق اگر یہ احادیث شرائطِ صحت کو پورا کرسکیں، تو یہ قرآن کی صحیح تفسیر ہوگی اور ان سے قرآن کے مقاصد کی تکمیل ہوگی۔

← تفسير القرطبي (٦/ ٣٨٤) فتح القدير (٢/ ١٦٤) مزید برآں قرآن مجید کے بیان سے ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض اور نافرمانی حرام ہے، مثلاً دیکھیں: الحشر: ٧، الأحزاب: ٣٦.

4 النحل: ٨٩، اس آیت سے بھی حدیث و سنت کی تشریعی حیثیت سے انکار ناممکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں یہ واضح فرما دیا ہے کہ بیان اور شرح کی ذمہ داری ہمارے پیغمبر کے سپرد ہے، فرمایا:﴿ وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ﴾ (النحل: ٤٤) کیا اس کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت تسلیم کر لے اور دوسری کا انکار کر دے؟!

[1] النحل: ٢٣

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م ۷۹۰ھ) کا خیال ہے کہ احادیث قرآن کی تفسیر ہیں اور تشریح۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ائمہ حدیث کی رائے یہ ہے کہ تفسیر و توضیح کے علاوہ سنت اور صاحبِ سنت کے مقام میں ایک استقلال موجود ہے، [1] منزّل قرآن کے ساتھ پیغمبر ایک چلتا پھرتا قرآن ہے، جو خدا کی زبان سے بولتا ہے: ﴿ وما ينطق عن الهوىٰ ۝ إن هو إلا وحي يوحي ﴾ [2] "ہویٰ" کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ مسئلہ اتنا صاف ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اطاعت رسول پر قرآن میں بار بار زور دیا گیا ہے، خدا کی اطاعت کے ساتھ اسے مکرر بالاستقلال ذکر فرمایا گیا، یہاں کسی نزاع کا ذکر ہی نہیں کیا، تاکہ کسی دوسری طرف رد کی ضرورت محسوس ہو۔ جہاں تک مقام نبوت کا ذکر ہے، یہاں کوئی تذبذب قبول نہیں کیا جا سکتا، ظن و یقین کے متعلق سند و روایت سے اور مقام نبوت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

مولانا تمنا نے کمزور اور دو دلی سے ضرورت حدیث کے لیے جس تھوڑی بہت آمادگی کا اظہار فرمایا ہے، وہ بھی مقام نبوت ہی کی وجہ سے ہے، اس لئے اگر مقام نبوت میں شک نہ ہو، تو حدیث اور سنت کی حجیت کی بحث تو ختم ہوجاتی ہے، اسی وجہ سے ائمہ اسلام نے بالاتفاق حدیث کی اسی مستقل حیثیت کو تسلیم فرمایا ہے:

"اعلم أنه قد اتفق من يعتد به من أهل العلم على أن السنة المطهرة مستقلة بتشريع الأحكام وأنها كالقرآن في تحليل الحلال و تحريم الحرام ......الخ" (إرشاد الفحول، ص: ۳۱)

---

[1] دیکھیں: الموافقات للشاطبي (٤/ ٢٧) إرشاد الفحول (١/ ٩٦)

[2] النجم: ٣، ٤

اہل علم متفق ہیں کہ تشریع احکام اور حلال وحرام کی تعیین میں سنت قرآن کی طرح ہے۔

اور پھر (صفحہ: ۳۲) فرماتے ہیں:

"والحاصل أن ثبوت حجية السنة المطهرة واستقلالها بتشريع الأحكام ضرورة دينية لا يخالف في ذلك إلا من لا حظ له في دين الإسلام" [1]

احکام کی تشریع اور تعیین میں سنت مستقل حجت ہے، یہ ایک دینی ضرورت ہے، اس کی مخالفت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔

اگر مقام نبوت محض لغوی زبان دانی سے متجاوز نہ ہو، تو سنت کا یقیناً یہ مقام نہیں ہو سکتا۔ محترم مخاطب مولانا تمنا کے ارشادات کا تعلق سلسلہ روایت سے ہے، جس کی تفصیل اس کے بعد آئے گی، إن شاء اللّٰہ!

قرآن عزیز نے پیغمبر کے لیے ایک مستقل مقام مقرر فرمایا ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس کے ارشادات کی پابندی کریں:

﴿ وما آتاكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا واتقوا الله إن الله شديد العقاب﴾ [2]

﴿ آتاكم ﴾ میں اموال غنیمت کی تقسیم کے علاوہ اوامر اور شرائع بھی چونکہ شامل ہیں، اس لئے اس کے بالمقابل ﴿نهاكم﴾ فرمایا گیا ہے اور تقوی کی تلقین کے بعد عذاب کی شدت سے ڈرایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اگر یہ مقام حاصل نہ ہوتا، تو اجتباء اور اصطفاء کوئی نعمت ہے نہ ہی کوئی احسان، نبوت کے لیے انتخاب و اصطفاء اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے، جب اس کا مقام لغوی

---

[1] إرشاد الفحول: (۱/ ۹۷)

[2] الحشر: ۷

رسالت سے الگ اور اعلیٰ ہو۔ حدیث "مثله" اور "معه" [1] کا بھی یہی مطلب ہے۔ مفصل بحث تو اس پر اس وقت ہوگی، جب مخاطب محترم اس حدیث پر روایتاً یا درایتاً بحث کریں گے۔ طریق حفاظت اور روایت کے مباحث کے لحاظ سے کوئی بھی سنت اور حدیث کو مثلِ قرآن نہیں کہتا۔

حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کا اثر:

حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کا اثر [2] حقیقت کا ترجمان ہے، میں نے اسے تبعاً اور طرداً ذکر کیا ہے، مولانا تمنا نے اسے ایک مستقل اور اہم مبحث کی صورت دے دی۔ پیغمبر کی یہ حیثیت نص قرآن سے ثابت ہے، بلکہ ایمان و دیانت کی جان ہے، اگر حدیث "مثله" اور "معه" یا اثر حسان بن عطیہ رحمہ اللہ بالکل نہ ہوتے، تو بھی میں حدیث اور سنت کو وحی سمجھتا۔

مولانا تمنا اور مقام نبوت:

محترم مخاطب حدیث کو مانتے ہیں، ان کے مذاق سے میں یہ سمجھتا ہوں، وہ قرآن کی موافقت کو زیادہ اہمیت دینا چاہتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ اصول حدیث میں اسے تبرکاً رکھا گیا ہے، مولانا اسے تبرکاً سے کچھ زیادہ اہمیت دلانا چاہتے ہیں، محدثین کی نفسیات سے وہ مطمئن نہیں ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تنقید حدیث میں مولانا کی نفسیات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ اس کے بعد وہ حدیث کے ذخائر کو قبول فرماتے ہیں اور ان شرائط کے ساتھ وہ حدیث سے مایوس نہیں ہونا چاہتے، بلکہ وہ اپنی خود

---

[1] سنن أبي داود (برقم: ٤٦٠٤)

[2] یعنی جس میں حسان بن عطیہ رحمہ اللہ (تابعی) بیان کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن لے کر آیا کرتے تھے، اسی طرح سنت لے کر آتے تھے اور جس طرح قرآن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ (سنن دارمي: ١/ ١٥٣، السنة للمروزي: ٣٣)

ساختہ سنت کے لئے بھی حدیث کے دفاتر کی ضرورت کو قبول فرماتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حدیث کو کیوں مان لیا گیا ہے؟ اس لئے کہ رسول کو فہم قرآن میں دخل ہے، اس کا فہم جو ہے: ﴿ثم إن علينا بيانه﴾ [1] کے مطابق اس کا بیان خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس کے ارشادات میں "هوى" کو دخل نہیں، اس کی عملی زندگی ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے، اس کا مقام رسالت، رسالت لغویہ سے کہیں بلند تر ہے، الفاظ قرآن کے علاوہ بھی وہ جو کچھ کہتا ہے وہ خدا کے حکم اور وحی سے کہتا ہے:

﴿ليعلم أن قد أبلغوا رسالات ربهم وأحاط بما لديهم وأحصىٰ كل شيء عددا﴾ [2]

خدا کی حفاظت اس کے علم و عمل پر محیط ہوتی ہے، اس کے قلب اور زبان پر خدا کے پہرے ہوتے ہیں، اس کے ارشادات میں شیطانی اثرات قطعاً سرایت نہیں کر سکتے۔ [3]

اگر مخاطب محترم کے ارشادات کا میں نے یہ تجزیہ درست کیا ہے، تو پھر حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کے اثر میں اس سے زیادہ کیا تھا، جو قرآن میں نہیں؟ تعجب ہے جو "قرآنی ٹارچ" سے چوروں کے گھر کا کونا کونا ٹٹولنا چاہتے ہیں، وہ اس ٹارچ کو خود قرآن میں کیوں استعمال نہیں فرماتے؟!

مقام رسالت:

مخاطب محترم کے لیے یہاں دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ خود فرمائیں کہ پیغمبر الفاظ

---

1. القيامة: ١٩
2. الجن: ٢٨
3. جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی اعانت سے شیطان سے محفوظ ہو گیا ہوں، دیکھیں: سنن الترمذي (١١٧٢) سنن النسائي (٣٩٦٠)

قرآن کے لیے بالکل نہیں بولتے تھے، اس کی تفسیر و توضیح کا ان کو کوئی حق نہ تھا، نہ ہے، ان کے عمل کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہ تھی، جیسے مولوی عبداللہ اور ان کے رفقاء کا خیال تھا، یا وہ قبول فرمائیں کہ آنحضرت ﷺ قرآن عزیز کے الفاظ سے الگ جو فرماتے یا کرتے تھے، اس میں خدا تعالیٰ کی مرضی اور اعانت شامل تھی، اگر بتقاضائے بشریت کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا، جو منشائے خداوندی کے موافق نہ ہوتا، تو فوراً متنبہ فرما دیا جاتا۔ اس صورت میں پیغمبر کے اقوال و افعال کے متعلق ماننا پڑے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کی وحی اور ارشاد کے مطابق ہوتے تھے۔ پھر حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کے اثر میں اس سے زیادہ کیا تھا، جس پر محترم اس قدر ناراض ہوئے کہ اتنا بھی نہ سوچ سکے کہ یہ مرفوع حدیث ہے یا موقوف؟ میرا مقصد اس اثر سے محض اس حقیقت کی تائید ہے، جس کا تذکرہ میں نے اوپر کی سطور میں کیا ہے اور ائمہ سلف کے مذہب کا اظہار۔

بعض اہل قرآن حضرات کا خیال ہے کہ قرآن کے الفاظ کے بعد پیغمبر اپنے قول و کردار میں بالکل ہماری طرح ہے، ان کے خیال میں امت کے لوگ آپ سے بہتر قرآن کی تفسیر کر سکتے ہیں۔ یہ قرآن کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے، سردست میں اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ اس قابل ہے کہ اس پر کچھ کہا جائے!

اثر حسان بن عطیہ کی سند:

مولانا تمنا کی محنت قابل شکریہ ہے کہ انھوں نے اس کی سند کے لیے روافض تک کی کتب چھان ماریں، حالانکہ میرے مسلک کے لحاظ سے مجھ پر وہ کتابیں حجت نہیں، تاہم میں اور حدیث کا طالب علم مولانا کا ممنون احسان ہوگا۔ تحقیق کا یہ ذوق قابل صد ہزار تحسین ہے، اثر مذکور کے مفہوم کو میں چونکہ ایک طے شدہ اور مسلّمہ قرآنی حقیقت اور علماء امت میں اسے سنت مستمر سمجھتا تھا، اس لئے میں نے اسے بلا تامل نقل کر دیا اور اس لئے بھی کہ یہ کسی قدر مفصل تھا۔ آثار چونکہ انفرادی لحاظ سے

حجت نہیں، اس لئے ان کی نقل میں اہل علم وہ احتیاط استعمال نہیں فرماتے، جو مرفوع احادیث کی نقل میں ان کے دامن گیر ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو سنن دارمی اور مصنف ابن ابی شیبہ اور معاجم، جو آثار کا بہت بڑا ذخیرہ ہیں، لیکن ان کی اسانید میں وہ وثوق نہیں، جو امہات ستہ میں عموماً پایا جاتا ہے۔

مولانا کا فخر:

مولانا کو اپنے اس اکتشاف پر اتنا فخر ہے کہ وہ امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ حدیث کی نفسیات پر اس سوءِ ادب سے حملہ آور ہوئے ہیں، جو ایک ذی علم آدمی کے لیے مناسب نہیں، اگر مولانا اپنی نفسیات کو ایسے موقع پر معتدل رکھ سکتے، تو مجھے خوشی ہوتی اور میں مولانا کو ایک انتہا پسند نقاد تصور کرتا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ مولانا کا لہجہ بے ادب منکرین حدیث سے بھی زیادہ قابل شکایت ہے، دعا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں اللہ تعالیٰ آپ کی رہنمائی فرمائے!

شاید اسی فخر و استکبار ہی کا اثر ہے کہ مولانا کی یہ محنت بھی چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئی، واقعی خطیب کی روایت میں محمد بن موسیٰ اور محمد بن یعقوب مجہول الحال ہیں، ہماری کتبِ رجال میں ان کا ذکر نہیں پایا گیا، [1] لیکن امام اوزاعی رحمہ اللہ

---

[1] کتب رجال میں ان دونوں رواۃ کا ترجمہ وتوثیق موجود ہے:

۱۔ محمد بن موسیٰ: "أبو سعيد محمد بن موسیٰ بن الفضل بن شاذان الصيرفي النيسابوري"

(۱) حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الشيخ الثقة المأمون، أحد الثقات والمشاهير بنيسابور".

(۲) حافظ أبوبكر البغدادي لکھتے ہیں: "شيخ ثقة"

انھوں نے ۴۲۱ھ کو وفات پائی، تفصیل کے لیے دیکھیں: التقييد لمعرفة رواة السنن والمسانيد (ص: ۱۱۰) سير أعلام النبلاء (۱۷/ ۳۵۰) تاريخ الإسلام (۲۹/ ۶۷) شذرات الذهب (۳/ ۲۲۰) ←

خود مصنف ہیں، انھوں نے فقہ الحدیث میں دو کتابیں مدون فرمائی، ایک کا نام کتاب السنن ہے، اور دوسری کا نام کتاب المسائل ہے۔ (فہرست ابن ندیم، ص: ۳۱۸)
یقین ہے کہ یہ اثر کتاب السنن سے ماخوذ ہے، خطیب نے اسے اپنی سند سے نقل فرمایا ہے، اسی لئے خطیب نے سند کے آخری حصہ کی پرواہ نہیں کی، تدوین کے بعد ظاہر ہے کہ ان رواۃ کا سند پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ [1]

← ۲۔ محمد بن یعقوب: "أبو العباس محمد بن یعقوب بن یوسف بن معقل بن سنان بن عبداللہ المعقلي الشیباني النیسابوري الأصم"

انھیں ابن أبی حاتم، ابن خزیمہ، أبو الولید الباجي اور ابن اثیر نے "ثقہ" قرار دیا ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "الإمام المفید الثقة محدث المشرق"

تفصیل کے لیے دیکھیں: تاریخ دمشق (٥٦/ ٢٨٧) تذکرۃ الحفاظ (٣/ ٨٦٠) الوافي بالوفیات (٥/ ٢٢٣) شذرات الذھب (٢/ ٣٧٣)

[1] حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے یہ اثر مندرجہ ذیل اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے:

(۱) قال الخطیب: أنا الحسن بن أبي بکر أنا أبو سھل أحمد بن محمد بن عبداللہ بن زیاد القطان نا عبداللہ بن أبي مسلم الخراساني حدثنا علي بن المدیني نا عیسی بن یونس نا الأوزاعي عن حسان بن عطیة ......

(۲) قال الخطیب: أخبرني أبو یعلیٰ محمد بن الحسین بن محمد الفراء الحنبلي نا عیسی بن علي بن عیسی الوزیر نا عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز نا عبدالرحمن بن صالح نا عیسیٰ بن یونس عن الأوزاعي عن حسان بن عطیة ......

(۳) قال الخطیب: أخبرني أبو القاسم عبدالعزیز بن محمد بن نصر الستوري نا أبو القاسم عبدالرحمن بن العباس بن عبدالرحمن بن زکریا البزار نا إسحاق بن إبراھیم بن سنین الختلي قال: نا عمران بن ھارون نا رواد بن الجراح أبو عصام العقلانی قال سمعت الأوزاعي یقول: کان جبریل ...... (الفقیه والمتفقه: ١/ ٢٦٦)

(۴) قال الخطیب: أخبرنا أبو سعید محمد بن موسیٰ بن الفضل بن شاذان الصیرفي ←

خطیب رحمہ اللہ کی نفسیات کا جو تجزیہ مولانا نے فرمایا ہے، اس کی امید کسی پرہیز گار آدمی سے نہیں کی جا سکتی، صحیح صورت یہی ہے جو میں عرض کر رہا ہوں، چنانچہ علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م سنہ ۷۹۰ھ) نے یہ اثر ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

"وروى الأوزاعي عن حسان بن عطية قال: كان الوحي ينزل على رسول الله ﷺ ويحضره جبريل بالسنة التي تفسر ذلك.

قال الأوزاعي: الكتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب.

قال ابن عبدالبر: يريد أنها تقضي عليه وتبين المراد منه"

(موافقات: ۱۵/٤)[1]

"وحی آنحضرت ﷺ پر اترتی تھی اور اس کی تفسیر کے لیے جبریل سنت لے کر آتے تھے۔ اوزاعی فرماتے ہیں: کتاب اللہ سنت کی زیادہ محتاج ہے، ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ سنت کتاب اللہ کے مفہوم کو بیان فرماتی ہے۔"

ابن قیم رحمہ اللہ اس اثر کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"وقال الأوزاعي عن **حسان بن عطية** : كان جبريل ينزل بالقرآن والسنة ويعلمه إياها كما يعلمه القرآن" (صواعق مرسلہ: ۳٤۰/۲)

← بنيسابور قال حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب الأصم قال ثنا محمد بن إسحاق الصغاني قال حدثنا روح بن عبادة قال حدثنا الأوزاعي عن حسان بن عطية ......

۞ أخبرنا أبو الحسن علي بن أحمد بن محمد بن بكران الفوي بالبصرة قال ثنا الحسن بن محمد بن عثمان الفسوي قال ثنا يعقوب بن سفيان قال ثنا محمد بن عقبة قال ثنا أبو إسحاق الفزاري عن الأوزاعي عن حسان بن عطية ...... (الكفاية: ص: ۱۲، ۱۵)

ان اسانید پر نظر ڈالنے سے جہاں خطیب بغدادی رحمہ اللہ پر تمنا عمادی کے مجرمانہ حملے کی قلعی کھل جاتی ہے، وہیں موصوف کے "**محدث العصر**" ہونے کے ادعا کی حقیقت بھی آشکارہ ہو جاتی ہے، عامله الله بما يستحق !

[1] الموافقات للشاطبي (٤/ ٢٦) نیز دیکھیں: جامع بيان العلم لابن عبدالبر (٢/ ٣٦٨)

جبریل قرآن اور سنت دونوں نازل فرماتے اور سنت کی تعلیم بھی اسی طرح آنحضرت کو دیتے جس طرح قرآن کی۔

شاطبی رحمہ اللہ اور ابن قیم رحمہ اللہ نے اسے اوزاعی رحمہ اللہ ہی سے روایت کیا ہے، اوزاعی رحمہ اللہ کی کتابیں آج کل ناپید ہیں، لیکن ائمہ کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اوزاعی رحمہ اللہ کی تصانیف سے روایت کیا گیا ہے۔

مولانا تمنا جس سند کو موضوع ثابت فرمانے کی سعی فرما رہے تھے وہ بعض ائمہ حدیث کے "أصح الأسانيد" میں شمار کی گئی ہے، ملاحظہ ہو: حواشي شيخ أحمد شاكر على اختصار علوم الحديث للحافظ ابن كثير (ص: ١١):

"وقد ذكروا إسنادين عن إمامين من التابعين، ويرويان عن الصحابة فإذا جاء نا حديث بأحد هذين الإسنادين، وكان التابعي منهما يرويه عن الصحابي كان إسناده من أصح الأسانيد أيضا، وهما:

① عن شعبة عن قتادة عن سعيد بن المسيب عن شيوخه من الصحابة،

② والأوزاعي عن حسان بن عطية عن الصحابة"

دو اور سندیں ہیں، جن میں تابعی صحابہ سے نقل فرماتے ہیں، یہی " أصح الأسانيد" ہیں:

① شعبہ، قتادہ، سعید بن میبّب، صحابہ سے۔

② اوزاعی، حسان بن عطیہ، صحابہ سے۔

مولانا نے جو دلخراش ریمارک خطیب رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین کے متعلق اس حدیث کی بنا پر فرمائے ہیں، مجھے ان سے رنج ہوا۔ اس اثر کی اسناد کی تصحیح کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اپنے اسلاف کی برأت کا فرض ادا کیا۔[1]

[1] یہ اثر "الأوزاعي عن حسان بن عطية" کی سند سے مندرجہ ذیل کتب میں مروی ہے: ←

﴿ ربنا لا تجعل في قلوبنا غلا للذين امنوا ...... ﴾ [1]

اثر حسان بن عطیہ اور قرآن:

اثر حسان بن عطیہ کی تائید قرآن حکیم سے بھی ہوتی ہے:

① ﴿ لا تحرك به لسانك لتعجل به ۝ إن علينا جمعه وقرآنه ۝ ثم إن علينا بيانه ﴾ [2] (قیامہ)

آپ جلدی نہ فرمائیں، قرآن کا جمع و حفظ ہمارے ذمہ ہے، جس بیان کا تذکرہ تراخی سے کیا گیا ہے۔

یہ نزول قرآن اور اس کے حفظ وضبط کے بعد ہونا تھا اور وحی جسے جبرئیل لے کر نازل ہوتے تھے، اس کی ضرورت تراخی سے ہوتی ہے۔

② ﴿ ما آتكم الرسول فخذوه وما نهاكم عنه فانتهوا ﴾ [3]

''آنحضرت ﷺ جو کچھ آپ کو دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں رک جاؤ۔''

③ ﴿ وما ينطق عن الهوى ۝ إن هو إلا وحي يوحى ﴾ [4]

← سنن دارمي (١/ ١٥٣) الزهد لعبدالله بن المبارك (ص: ٩٣) السنة للمروزي (ص: ٣٢) جامع بيان العلم (٢/ ١٩١) الفقيه والمتفقه (١/ ٢٦٦) الكفاية (ص: ١٢) المراسيل لأبي داود (ص: ١٦٧) الإبانة لابن بطة (١/ ٢٥٤) شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي (١/ ٨٣) ذم الكلام للهروي (٢/ ٦٢) حسان بن عطیہ رحمہ اللہ تک اس کی سند صحیح ہے، خالد بن نزار کہتے ہیں کہ میں نے امام اوزاعی سے کہا: حسان بن عطیہ کس سے؟ (بیان کرتے ہیں) تو امام اوزاعی نے فرمایا: ہم حسان جیسے شخص کے لیے کہہ سکتے تھے کہ وہ کس سے؟ (بیان کرتے ہیں) (تهذيب التهذيب: ٢/ ٢١٩) اسی معنی میں ایک اثر عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ السنة للمروزي (ص: ٣٤)

❶ الحشر: ١٠

❷ القيامة: ١٦، ١٧، ١٩

❸ الحشر: ٧

❹ النجم: ٣، ٤

''آنحضرت جو کچھ فرماتے ہیں، وہ وحی ہے، وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے۔''

④ ﴿ وما أرسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله ﴾ [1]

''ہر رسول کی اطاعت اللہ کے اذن سے ہوتی رہی۔''

⑤ ﴿ إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما أراك الله ولا تكن للخائنين خصيما ﴾ [2]

''ہم نے تم پر کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ تم اپنے صوابدید سے لوگوں میں فیصلے کرو اور خیانت پیشہ لوگوں کی حمایت مت کرو۔''

⑥ ﴿ من يطع الرسول فقد أطاع الله ﴾ [3]

''رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔''

یہ مقام اس وقت صحیح ہوسکتا ہے، جبکہ پیغمبر کے ارشادات کو وحی کی حیثیت حاصل ہو، حسان بن عطیہ کے اثر کا اس کے سوا کچھ مطلب نہیں۔

ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کی تمام تر سہولت اور جامعیت علوم نبوت ہی کی وجہ سے ہے، علوم نبویہ کو اگر نظر انداز کر دیا جائے، تو قرآن کا سمجھنا سخت مشکل ہوگا، اہل قرآن کی پوری تاریخ اس کی شاہد ہے، ترک حدیث کے بعد نصف صدی سے نماز کی ہیئت کو متعین نہیں فرما سکے، رکعات ، اذکار، ہیئت نماز کو چھوڑیے صرف اوقات میں پانچ ، تین ، چار کا فیصلہ نہیں ہوسکا!

﴿ فإنما يسرناه بلسانك لتبشر به المتقين وتنذر به قوما لدا ﴾ [4]

---

1. النساء: ٦٤
2. النساء: ١٠٥
3. النساء: ٨٠
4. مريم: ٩٧

''ہم نے اسے تیری زبان پر آسان کیا ہے، تاکہ نیک دل لوگوں کو بشارت دے اور کج بحث لوگوں کو ڈرائے۔''

اس آیت میں قرآن کی آسانی کو پیغمبر کی زبان سے مخصوص فرمایا، منکرین سنت و حدیث کو کبھی وہ آسانی میسر نہیں آسکتی، جو قائلین سنت کو مرحمت فرمائی گئی ہے!

سنت کی حفاظت:

جب قرآن کا سنت کے ساتھ یہ رابطہ ہو تو سنت کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے، جس قدر کہ قرآن کی حفاظت ضروری ہے۔ مجھے اصولی طور پر قبول کرنا پڑے گا کہ سنت کو محفوظ ہونا چاہیے، جس طرح قرآن کے لیے حفاظت کا سامان فرمایا گیا ہے، حفاظ اور کاتب اس کے لیے متعین فرما دیئے گئے، غرض مادی طور پر تمام حفاظت اللہ تعالیٰ نے انسانی ہاتھوں سے کرائی، اسی طرح سنت کی حفاظت کا سامان ہونا ضروری ہے، ورنہ قرآن کی حفاظت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا:

﴿ إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون ﴾ [2] میں ''ذکر'' کا عموم سنت کو اسی طرح شامل ہوگا، جس طرح قرآن پر مشتمل ہے، مقام نبوت اور مقام حدیث کی تعیین کے یہ مباحث اصولاً خود بخود طے ہو جائیں گے، معلوم نہیں محترم مولانا کے یہاں موقف کیا ہے؟ طریقہ حفاظت کا تذکرہ آگے آئے گا، ان شاء اللہ۔

سنت ایک دوسرے نقطہ نظر سے:

ہمارے اہل قرآن دوست حدیث کے متعلق ''مثلہ'' اور ''معہ'' کے لفظ سے گھبرا جاتے ہیں، لیکن اہل علم کے نزدیک ایک دوسرا نظریہ بھی ہے، علامہ شیخ موسیٰ

---

[2] الحجر: ۹

جار اللہ رحمہ اللہ مصنف ”الوشیعة في النقد علی عقائد الشیعة“ ایک روسی عالم ہیں، جن کا انتقال حال میں ہوا ہے، بڑے نقاد اور وسیع النظر عالم تھے، فرماتے ہیں:

”السنة أصل أول من بین أصول الأدلة الأربعة في شرع الإسلام في إثبات الإحکام، لم یثبت حکم في الإسلام أول ثبوته إلا بالسنة وآیات الکتاب الکریم کانت تنزل بعدُ مؤیدة مثبتة لفعل النبي الکریم وإقراره وأقواله“

(کتاب السنة لموسیٰ جار اللہ، صفحہ: ٣٢)

”اثبات احکام کے لحاظ سے ادلہ اربعہ میں سنت کا درجہ سب سے اول ہے، اسلام کے تمام احکام اولاً سنت میں ثابت ہوئے، اس کے بعد قرآن عزیز نے ان کی تائید فرمائی اور یہ تائید آنحضرت ﷺ کے اقرار، اقوال، افعال سب کو حاصل ہوئی۔“

شیخ فرماتے ہیں:

”ایمان، ارکان دین، فرائض ابتداءً سنت سے ثابت ہوئے، اس کے بعد قرآن مجید نے ان کی تائید فرمائی۔ سورہ مائدہ ٦ھ ہجری میں نازل ہوئی اور اس میں وضو کا ذکر فرمایا گیا، نماز اس سے بہت پہلے مکہ معظّمہ میں فرض ہوئی، معلوم ہے کہ سالہا سال تک نماز بے وضو تو ادا نہیں ہوتی رہی، ظاہر ہے کہ وضو کا حکم آنحضرت ﷺ کو وحی سنت کے طور پر بتا دیا گیا تھا، ٦ھ ہجری میں قرآن حکیم نے اس حکم کی تائید فرما دی۔ معذوریاں انسان کے لوازم سے ہیں، عرب کی سرزمین میں پانی کی قلت معمولات سے ہے، بیماریاں بھی کسی قاعدہ کی پابند نہیں، معلوم ہے کہ ان حالات میں تیمّم کے سوا چارہ نہیں، لیکن تیمّم کا حکم مائدہ کی آیت (٦) میں مرقوم ہے، جو ٦ھ ہجری کے بعد اتری، اصل تیمّم سنت سے ثابت ہوا، قرآن نے اس کی تائید فرمائی، حج، زکوۃ اور ان

کی تفصیلات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ سنت سے ثابت ہوئیں، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو قرآن نے اس کی تائید فرما دی۔''

علامہ موسیٰ جار اللہ کی تائید دوسرے مقامات سے بھی ہوتی ہے:

الثاني: آية الوضوء، فالآية مدنية إجماعا وفرض الوضوء كان بمكة مع فرض الصلوة...... إلى قوله: كآية الجمعة فإنها مدنية والجمعة فرضت بمكة.

(مفتاح السعادة والسيادة لطاش كبرىٰ زاده (م۹٦۳ھ): ۲/ ۲٤٦)

''آیت وضوء مدینہ میں اتری اور وضو بالاتفاق مکہ مکرمہ میں فرض ہوا، اسی طرح جمعہ مکہ میں فرض ہوا، لیکن سورہ جمعہ مدینہ میں اتری۔''

اسی طرح تفسیر اِتقان میں بھی موجود ہے۔[1]

حدیث کا مفہوم:

مولانا نے حدیث کے مفہوم میں صحابہ اور تابعین کے ارشادات اور اعمال وغیرہ کو بھی شامل فرمایا ہے، علامہ طیبی کا یہی خیال ہے لیکن تعریف عام فنی حیثیت سے تو درست ہے، کتب حدیث بعض ائمہ کے آثار اور صحابہ کے فتاوی میں بھی ذکر کیا ہے، لیکن جہاں تک حجیت اور استدلال کا تعلق ہے، حدیث صرف آنحضرت ﷺ کے ارشادات، اعمال وتقریرات سے عبارت ہے:

قال شيخ الإسلام ابن حجر في شرح البخاري: المراد بالحديث في عرف الشرع ما يضاف إلى النبي ﷺ،[2] (تدريب للسيوطى: ٤)

شرعاً حدیث وہ اقوال وافعال ہیں، جو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہوں۔

---

[1] دیکھیں: الإتقان للسيوطي (١/ ١٠٦)

[2] فتح الباري (١/ ١٩٣)

سلسلہ روایت میں شبہات:

① رواۃ حدیث میں ہر قسم کے آدمی پائے گئے ہیں، جھوٹے، وضاع، ضعیف۔ بد اعتقاد لوگ بھی اس سلسلہ میں پائے گئے ہیں، اسی طرح ثقات، صلحاء وفضلاء اور اتقیاء بھی اسی راہ میں پائے گئے ہیں، اس لحاظ سے محدثین نے خبر واحد کو ظنی قرار دیا ہے، رجال حدیث میں وضع وتخلیق کی عادت بھی پائی گئی ہے، اس سے بھی ظنیت میں اضافہ ہوا ہے۔

② آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی تدوین حدیث کا کام شروع نہیں کیا گیا، بلکہ کچھ عرصہ بعد علماء نے اس طرف توجہ فرمائی، اس لئے غلطی کا احتمال بعد میں بڑھ گیا ہے۔

③ محدثین انسان تھے، وہ کتنی بھی کوشش فرما دیں، بہر حال اس انسانی کوشش میں ان پر پورا اطمینان نہیں کیا جا سکتا، اس لیے یہ مساعی حدیث کی ظنیت میں کمی نہیں کر سکیں۔

④ کوفہ اور خراسان میں شیعی، خارجی تحریکات نے اپنے خیالات کی حمایت کے لیے احادیث کی تخلیق اور وضع کا کام کیا، جس سے حدیث کا ذخیرہ مشکوک ہوگیا اور صحیح وغیر مستند احادیث میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔

قریباً یہی شبہات ہیں جو حدیث کی ظنیت یا غیر مستند ہونے پر اجمالاً یا تفصیلاً وارد کئے گئے ہیں، یہ شبہات ہیں جو اہل قرآن اور مخاطب محترم ایسے صرف ''مسلمان'' فن حدیث پر وارد فرماتے ہیں۔

اعتراف حقیقت:

مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ نقل کے لحاظ سے حدیث کو وہ وثوق وتواتر میسر نہیں آسکا، جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، اور جو تواتر

نماز اور بعض دوسرے اعمال میں پایا گیا ہے، وہ قرآن عزیز کے تواتر سے اعلیٰ و ارفع ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہل سنت کے نزدیک حدیث کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے۔ بلحاظ نقل حدیث کے متعلق کبھی "مثله معه" کا دعویٰ نہیں کیا گیا، مجھے افسوس ہے ہمارے دوست حدیث کے خلاف لکھتے وقت عموماً جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور فرق حیثیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں عفا الله عنا وعنهم وهدانا وإياهم سواء الطريق!

ظن اور اس کا مفہوم:

ظن اور اس کے مفہوم کے متعلق میں نے مفصل عرض کیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ مخاطب محترم نے اس پر مناسب توجہ نہیں فرمائی، اگر اپنی تصنیفات کے تعارف میں زیادہ وقت نہ فرماتے، تو اصل موضوع پر زیادہ توجہ فرمائی جا سکتی۔ بذات خود حدیث کی ظنیت کا مسئلہ چنداں اہم نہیں، لیکن حدیث کی مخالفت کے کیمپ میں اس شبہ کو ایک اساسی حیثیت دے دی گئی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر مزید غور کیا جائے۔

وضعاً ہر خبر صدق اور کذب کی محتمل ہے، ہر گواہ کے متعلق سچ اور جھوٹ کا امکان ہے، ہر فیصلہ کے غلط اور صحیح ہونے کا خیال کیا جا سکتا ہے، شرعی معاملات، قرآن کی تفسیر اور آیات میں، ان کی مراد کی تعیین میں غلطی اور صحت کے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں، یہی حال خبر واحد کا ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ روایت صحیح اور درست ہو اور ممکن ہے کہ غلط ہو، احتمالات کی دنیا ہمارے پورے ماحول پر محیط ہے، اس میں دین کی نہ دنیا کی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں، اس کے باوجود دین کے معاملات میں بھی ان ظنون کی وجہ سے کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، بلکہ عمل کی درستگی اور کاروبار کو صحیح طور پر چلانے کے لیے ہم یقین اور وثوق کے لیے کوئی نہ کوئی راہ پیدا کر لیتے ہیں، یہی حال احادیث اور روایات کا ہے، ان احتمالات کے باوجود جو اس راہ میں پیدا ہو گئے ہیں، صحیح، ضعیف میں تمیز ہو سکتی ہے اور احادیث کو بالکلیہ ساقط الاعتبار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ

اس ظن سے مخلصی کے لیے قرائن مل سکتے ہیں، ائمہ حدیث کی تنقید، فن رجال کی ضرورت، اصول حدیث یہ سب ان مشکلات ہی کے لئے وضع کیے گئے ہیں۔

جس طرح ہر خبر فی نفسہ صدق و کذب کی محتمل ہے، اسی طرح ہر حدیث میں غلط اور صحیح کا احتمال ہو سکتا ہے، اس احتمال کے باوجود ہم سچی خبروں کو قبول کرتے ہیں، عدالتی شہادتوں میں سچ اور جھوٹ میں تمیز کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، قرائن و احوال کی بنا پر یقین کی راہ پیدا کر لی جاتی ہے۔

دنیا میں متواتر خبریں بہت کم ہیں، اسی طرح متواتر احادیث بھی زیادہ نہیں، میری گذارشات کا یہی مقصد تھا کہ قرائن کی تشخیص کے بعد ظن کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے، آپ قرآن حکیم پر ایک نظر ڈالئے، وہاں بھی اخبار آحاد اور ظنون پر کس قدر اعتماد فرمایا گیا ہے؟ حالانکہ وہاں بھی صدق و کذب کا احتمال موجود تھا۔

① حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے مدین تشریف لے گئے، مدین کے قریب دو لڑکیاں بکریاں روک کر پانی کے پاس کھڑی تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دریافت پر انھوں نے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور ملازم کوئی نہیں، حضرت نے اسی خبر واحد پر یقین فرما کر ان کی امداد فرمائی اور پانی پلا دیا، یہ خبر واحد تھی، جس پر یقین کیا گیا۔

② لڑکیاں چلی گئیں، تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی آئی، اس نے کہا: میرے والد تمھیں بلاتے ہیں، حضرت موسیٰ ایک لڑکی کے پیغام پر اس کے ساتھ ہو لئے۔

③ حضرت موسیٰ نے لڑکیوں کے والد سے اپنی سرگذشت کہہ سنائی، انھوں نے صحیح سمجھ کر فرمایا:

﴿ لا تخف نجوت من القوم الظالمین ﴾[1]

---

[1] دیکھیں: القصص: ۲۳، ۲۴، ۲۵

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں، اب ظالموں کی گرفت سے کوئی خطرہ نہیں۔''

④ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی راشن لینے کے لیے کنعان سے مصر گئے، کنعان کے واقعات سن کر انھیں راشن دے دیا گیا، یہ خبر واحد ہی تھی۔

⑤ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے اپنی بریت کے متعلق جو کچھ کہا، اس کی تائید ایک دوسرے شاہد نے کی اور تصدیق کر لی گئی۔ ❶

⑥ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی کی مدد فرمائی، جب اس نے اپنی مظلومیت کا تذکرہ کیا۔ ❷

اس قسم کی ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں، جس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ظن یقین کی صورت میں بدل گیا اور اس کے تقاضوں پر بے خطر عمل کیا گیا۔

زمانہ نبوت میں اس ظن کی حیثیت:

آنحضرت نے صلح حدیبیہ کے بعد طریقہ تبلیغ کو بدل دیا، اس سے پہلے اسلام کی اشاعت کا رخ عوام کی طرف تھا، اب براہ راست سلاطین کو مخاطب فرمایا، امراء کو خطوط بھیجے، ان تمام خطوط کی حیثیت خبر واحد کی تھی، معلوم نہیں ہمارے اہل قرآن دوست ان تبلیغی کوششوں کو دینی سمجھتے ہیں یا توسیع حکومت کا ایک ذریعہ؟ بہر حال معاملہ کی صورت خبر واحد ہی کی ہے، جسے آنحضرت ﷺ نے مستند سمجھ کر بھیجا اور مخالفین نبوت نے اسے صحیح سمجھا اور کسی ظن یا شبہ کی وجہ سے اس کی تکذیب نہیں کی۔

① معاذ بن جبل یمن میں تبلیغ و تعلیم کے لیے۔

② عتاب بن اسید مکہ میں۔

③ دحیہ کلبی قیصر ہرقل کے پاس۔

❶ دیکھیں: یوسف: ۲۵، ۲۶، ۲۸

❷ القصص: ۱۵

④ حذیفہ سہمی کسریٰ کے پاس۔

⑤ عمرو بن امیہ ضمری نجاشی حبشہ کے پاس۔

⑥ عثمان بن ابی العاص طائف میں۔

⑦ حاطب بن ابی بلتعہ مقوقس کے پاس سکندریہ میں۔

⑧ شجاع بن وہیب اسدی دمشق میں۔

اگر خبر واحد اور ظن کی بحث کو وہی اہمیت دی جاتی، جو آج کل فن روایت کے خلاف دی جا رہی ہے، تو امراء ممالک کہہ سکتے تھے کہ خطوط ظنی ہیں۔ آپ حضرات اپنی ڈاک پر بھی ایسے شبہات وارد نہیں فرماتے، جو حدیث کے متعلق پیدا کرنے شروع کر دیتے ہیں!

تحصیل صدقات کا نظام:

یہ نظام بھی بالکل دینی ہے، عموماً آنحضرت ﷺ اس خدمت کے لیے مختلف بستیوں میں ایک ایک دو دو آدمی بھیجا کرتے تھے، نہ ہی اس منطقی ظن کا خیال آنحضرت نے فرمایا اور نہ ہی اصحاب صدقات نے یہ حجت پیدا کی کہ یہ پیغام ظنی ہے، ورنہ بے حد مشکل ہوتی اور سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

مندرجہ ذیل حضرات کو تحصیل صدقات کے لیے آنحضرت ﷺ نے بھیجا:

(۱) مالک بن نویرہ، (۲) زبرقان بن بدر، (۳) زید بن حارثہ، (۴) عمرو بن عاص، (۵) عمرو بن حزم، (۶) اسامہ بن زید، (۷) عبدالرحمٰن بن عوف، (۸) ابو عبیدہ بن جراح وغیرہم رضی اللہ عنہم۔

آنحضرت ﷺ کے نظام مملکت اور متعلقہ امور پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے، تو دینی اور غیر دینی معاملات میں تفریق محض ایک مناظرانہ حجت ہے، اس تفریق کی کوئی دلیل نہ قرآن سے ملتی ہے نہ سنت سے، بلکہ انسانی زندگی کے تمام

زاویے ظن کی گرفت میں ہیں۔

ایک نفسیاتی جائزہ:

ظن اور یقین ایک قلبی کیفیت ہے، حوادثات اور واقعات کی بنا پر اس کا اثر قلب پر یکساں ہوتا ہے، دلائل کی وجہ سے جو اثر طبیعت انسانی پر پڑتا ہے، وہ کسی دنیوی امر سے متعلق ہو یا دینی مسئلہ سے اس کے تقاضوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، دنیا کے معاملات میں جب تک نتائج کی بہتری کے لیے مناسب وثوق نہ ہو، کام کرنے کے لیے جرأت نہیں ہوتی، جہاں تک قلب کے تأثر کا تعلق ہے، دین کے معاملات میں بھی اس کی یہی حالت ہے، صورت حال کی یگانگت کے بعد یہ دلیل بہت ہی بھونڈی معلوم ہوتی ہے کہ حدیث دین کا معاملہ ہے، یہاں ظن قبول نہیں کیا جا سکتا، دنیا کے معاملات میں ہمیں ظن سے انکار نہیں ہے۔ محترم مخاطب اور ان دوستوں سے گزارش کروں گا کہ وہ اس نفسیاتی تجزیہ پر غور کریں، دلائل اور حوادث کے بعد دل کی اس کیفیت کو ملاحظہ فرمائیں، جو اس کے ردو قبول میں کارفرما ہے، تو وہ اس حیلہ کی کمزوری کو خود محسوس کریں گے، یہ مذہب کے نام پر محض ایک جذباتی اپیل ہے، حقائق کی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں، دل ایک، دلائل کی نوعیت ایک، تاثرات یکساں، پھر نتائج کے تقاضوں میں فرق کیوں؟ ردو قبول میں امتیاز کیوں؟

ایک اور جائزہ:

جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، جن اسباب پر ہماری علمی اور عملی زندگی کا انحصار ہے، اس میں نفسیات کی مقدار کس قدر ہے، ہمارے ذرائع علم جن پر ہمارے ظن اور یقین کا انحصار ہے، یقین کی تحصیل اور تشکیل میں ہماری مدد کر سکتے ہیں، کان، آنکھیں، ذوق، حس، وغیرہ ذرائع علم نے سورج، چاند، ستاروں کے متعلق

جو اندازے لگائے اور ان کی مقدار کے متعلق جو فیصلہ کیا، حقیقت اس سے کہیں زیادہ نکلی۔ دلیل عقلی نے ان ظاہری کوششوں کو ناقص قرار دیا، یہی حواس ہمارے پاس یقین کی پیدائش کے لیے آخری حربہ تھا، جس کی بے بسی کے مخلصانہ اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

اب دلیل عقلی کا بھی جائزہ لیجئے کہ اس کی پہنائیاں کہاں تک ہیں؟ فلاسفہ جنھیں عقل کے پیغمبر کہنا بجا ہوگا، ان کی محققانہ کوششیں کس سے مخفی ہیں اور ان کے حشر سے کون ناواقف ہے؟ کبھی ان دلائل نے زمین کو چپٹا کر دیا، کبھی گول، کبھی آسمان حرکت کرنے لگا، کبھی زمین چکرانے لگی، کبھی اس گردش کا وظیفہ سیاروں کے سپرد کیا گیا، طبیعات اور فلکیات میں ان کے نظریوں کی تبدیلیاں ہمارے سامنے ہیں، الٰہیات میں اپنی بے بسی کے وہ خود بھی معترف ہیں اور دراصل یہ عقل اور اس کی نارسائیوں ہی کی داستان ہے، جس کی حمایت میں ہم انبیاء اور ان کی تعلیمات سے دست بگریباں ہوتے رہے، یقین کی پیدائش کے لیے یہی مشین تھی، جس کی صنعتی کار گزاریاں ہمیشہ ناکامی سے ہم کنار ہوتی رہیں، اب خبر واحد میں یقین پیدا کرنے کے لیے کون سا آلہ ایجاد کیا جائے گا، جس کے انتظار میں ہم ظن سے دست کش ہوجائیں؟ دنیا کے حوادث میں یہی حواس کار فرما ہیں اور دین کی نصوص بھی ان کی کار فرمائی سے گریز نہیں کرسکتیں، تو پھر ہم ظن کی گرفت سے کیونکر نکل سکتے ہیں؟

﴿لا يكلف الله نفسا إلا وسعها﴾ [1]

خالق قضا و قدر نے ہمیں اسی قدر تکلیف دی ہے، جس قدر کہ ہم طاقت رکھ سکتے ہیں، اس لیے ظن سے بچنے کے لیے دین اور دنیا میں تمیز بے کار ہے۔

---

[1] البقرة: ٢٨٦

ظن سے گھبراہٹ:

ظن اور یقین دو فطری اثر ہیں، جو انسانی طبیعت میں ظاہر ہوتے اور اپنے اپنے وقت پر حسب حال انسان ان سے متاثر ہوتا ہے، لیکن بعض سے عقیدت اور بعض سے گھبراہٹ میں مبالغہ اور غلو یہ یونانی اصطلاحات کا اثر ہے۔ اصول فقہ کی تشکیل میں متکلمین اور معتزلہ کافی حد تک دخیل ہیں، اس لئے علماء اصول بھی ان مبالغہ آمیزیوں سے کافی حد تک متاثر ہیں، کعبی اور ابو الحسن متواتر سے جو علم حاصل ہو، اسے بھی نظری اور استدلالی سمجھتے ہیں، آمدی اور مرتضیٰ اس میں توقف فرماتے ہیں، بعض نظار کا خیال ہے کہ متواتر سے بھی یقین حاصل نہیں ہو سکتا، براہمہ سرے سے خبر کی افادی حیثیت ہی کے منکر ہیں،[1] اس کے باوجود ان کے اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں، وہ بدستور اپنی کاروباری زندگی میں ان خبروں پر اعتماد کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ محض فنی بحثیں ہیں، جو فرصت کے اوقات میں رونق محفل کے طور پر پیدا ہوتی رہیں، مثلاً خبر واحد کے متعلق ان حضرات نے آٹھ شرطیں لگائی ہیں، چار مخبر میں، چار خبر میں۔ مخبر کے لیے ضروری ہے کہ مسلم ہو، عقل مند ہو، ضابط اور عادل ہو، اور خبر کے لیے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کے خلاف نہ ہو، سنت متواترہ کے خلاف نہ ہو، عموم بلوی کے خلاف نہ ہو اور اختلاف میں متروک الاحتجاج نہ ہو، اس کے باوجود ظنی ہوگی، اس سے یقین اور طمانیت حاصل نہیں ہو سکے گی، جبائی اور بعض متکلمین کا خیال ہے کہ اس پر بھی عمل واجب نہیں۔[2]

اب فرمایئے! اگر ان شرائط کے باوجود خبر قابل یقین نہ ہو، تو پھر یقین کیا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: الإحكام للآمدي (٢/ ٢٦) كشف الأسرار (٢/ ٥٢٤) إرشاد الفحول (١/ ١٢٨)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: إرشاد الفحول (١/ ١٣٣، ١٣٩) الإبهاج للسبكي (٢/ ٣١١)

آسمان سے آئے گا؟ ان مباحث میں مناظرانہ موشگافیوں کے سوا کچھ بھی نہیں، یہ لوگ نفسیات سے قطعی ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، قرائن حال اور اشخاص کی خصوصیات اور احوالِ رجال اور ان کے نتائج موثرہ سے ہمارے متکلمین بالکلیہ ناآشنا معلوم ہوتے ہیں، یہ علم کو کاروباری اور عملی زندگی سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں۔

لسنا نقر بلفظة موضوعة
في الاصطلاح لشيعة اليونان
احذر تزل رجليك هوة
كم قد هوىٰ فيها على الأزمان ❶

(ابن قیم)

اس فنی بیماری سے آزاد، نفسیات سے صحیح آگاہ، علم و عمل کی سرحدوں کے ما بہ الاشتراک اور ما بہ الامتیاز سے صحیح آگاہ علماء اہلحدیث تھے، جو ہمیشہ ان ہوائی موشگافیوں سے الگ تھلگ رہے، ان کا فیصلہ بھی سن لیجیے:

" ومذهب أكثر أصحاب الحديث منهم أحمد بن حنبل و داود الظاهري أن الاخبار التي أقر أهل الصنعة بصحتها يوجب علم اليقين لأن خبر الواحد لو لم يفده لما جاز اتباعه للنهي عن اتباع الظن لقوله ﴿لا تقف ما ليس لك به علم﴾ "

(القول المأمول في علم الأصول، ص: ٤٨)

امام احمد اور شیخ داود ظاہری اور عام اہلحدیث کا مسلک یہ ہے کہ جب کوئی حدیث اہل فن کی شرائط کے مطابق صحیح ہو جائے، تو اس سے علم و یقین کا فائدہ ہو سکتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے اتباع کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ شرعاً ظن کی پیروی ممنوع ہے۔

---

❶ العقيدة النونية لابن القيم (ص: ۱۸۸، ۲۱۲) ہم گروہ یونان کی اصطلاح میں وضع کردہ لفظ کا اقرار نہیں کرتے، بچ! کہیں تیرے پاؤں گڑھے میں نہ پھسل جائیں، مدتوں سے کتنے ہی لوگ اس میں گرتے آئے ہیں!

مولانا عمادی نے اپنے مقالہ میں فرمایا ہے کہ میں نے ظن کا جو مفہوم ذکر کیا، اس کے لیے کتبِ فن سے حوالہ نہیں دیا۔ بدیہاتِ فن اور اساسی چیزوں کے لیے عموماً مناظرانہ حوالوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب محدثین خبرِ واحد کو ظنی فرماتے ہیں، پھر شرائطِ فن کی موجودگی کے بعد اس پر عمل کو واجب فرماتے ہیں اور اسے علم و یقین کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں، اس کا مطلب واضح ہے کہ یہ ذخیرہ بحیثیت مجموعی ظنی ہے، تحقیق و بحث اور شرائط فن کی موافقت کے بعد جو احادیث صحیح ثابت ہوں گی، وہ ظنی نہیں ہوں گی۔ اوپر کا حوالہ القول المأمول ، إرشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول، کشف الأسرار للشیخ عبدالعزیز أحمد البخاري شرح أصول البزدوي اور کتاب التحقیق للحسامي کی طرف توجہ فرمائیں۔ [1]

ظن کو متعارف معنیٰ میں لینے کے بعد ائمہ حدیث کے لیے تو علمی دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے، وہ ایسے ظنون و اوہام کی پیروی ممنوع سمجھتے ہیں۔ حدیث کے ظنی ہونے کا یقیناً وہی مطلب ہے، جو میں نے عرض کیا۔ گزارشات خلاف امید طویل ہو رہی ہیں، اس لئے نصوصات و حوالہ جات کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا ایسے صاحب بصیرت اور مخلص حضرات کے لیے نصوص کتاب اللہ کے بعد مزید حوالوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟

کتابت اور تدوین حدیث:

اس موضوع کو مخالفین حدیث نے بہت پھیلایا ہے، بعض نے مذاق سے اور بعض نے دردمندی سے فن حدیث پر بحث فرمائی ہے۔ اس وضاحت کے بعد کہ حدیث کا درجہ بلحاظ نقل قرآن کے بعد ہے، یہ بحث بے جان سی معلوم ہوتی ہے،

[1] أصول البزدوي (ص: ١٥٢) کشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي (٢/ ٥٣٨) . لفحول (١/ ١٣٣)

حضری پراپیگنڈا کے سوا اس میں کچھ بھی نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حدیث کے لکھنے سے روکا، اس کے مختلف وجوہ تھے:

① قرآن سے بے توجہی نہ ہو۔

② نظم قرآن میں خلط نہ ہو۔

③ یہودی اور مسیحی نوشتے دینی نصوص کے ساتھ خلط نہ ہو جائیں۔

اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں، جن کا تذکرہ ابن عبد البر نے جامع میں اور دوسرے ائمہ حدیث نے بھی فرمایا ہے۔[1] اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے تحریر کی اجازت دی، صحابہ نے یادداشتیں لکھیں، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے **صادقہ** لکھا، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس احادیث کا ایک ذخیرہ تھا، مقادیرِ زکوۃ، نصاب زکوۃ آنحضرت کی تحریر سے موجود تھا۔ نماز، روزہ، حج تواتر سے ثابت ہو چکے، اذکارِ نماز آپ کی سنت مصطلحہ سے ثابت ہیں، بلکہ جو اختلافات آپ حضرات کے لیے اضطراب کا سبب ہیں، وہ اختلافات بھی آپ کی اصطلاحی سنت میں آجاتے ہیں، یعنی نماز بایں اختلافات زمانہ عمر رضی اللہ عنہ میں موجود تھی۔

کتابت کی ممانعت:

جہاں تک تحریر سے نہی کا خلجان تھا، وہ اس اجازت سے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ شبہ تو باقی نہیں رہتا کہ آنحضرت ﷺ کے روکنے کے بعد کیوں لکھا گیا؟ اب یہ ذخیرہ کتنا تھا، تھوڑا تھا یا زیادہ؟ یہ کوئی اساسی سوال نہیں۔ آپ حضرات کو حدیث پر اعتراض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے خدا تعالیٰ کا وعدہ نہیں، جو کچھ ہوا، وہ انسانی کوشش ہے، (اس شبہ کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا) اگر ساری حدیث لکھ لی جاتی، حفاظِ قرآن کی طرح حافظ اس کا دور کرتے، تراویح پڑھی جاتی، تو پھر بھی یہ انسانی

[1] جامع بیان العلم (۱/ ۱۳۹) تقیید العلم (ص: ۴۹)

کوشش تھی اور آپ کا شبہ بدستور قائم رہتا۔ کتابت میں غلطیاں ہوتیں، کاتب انسان ہوتے، پھر بھی انسانوں کا عذر آپ حضرات کے لئے اضطراب کا سبب ہوتا، حدیث حفظ ہوتی، حافظ دور کرتے، پھر بھی یہ حافظ انسان ہوتے اور آپ کی یہ بے قراریاں اور غم گساریاں بدستور قائم رہتیں۔ ہم اس ذخیرہ کو علی علاتہ [خامیوں کے باوجود] قبول کرتے ہیں، اس لئے انسانی استطاعت سے جو ہوسکتا تھا، ہو چکا۔

حفاظت حدیث کے ذرائع:

حدیث کی حفاظت میں حفظ اور کتابت دونوں ذرائع استعمال کئے گئے، محدثین دور بھی کرتے رہے۔ اگر آپ اسے نفسیاتی نقطہ نظر سے ملاحظہ فرمائیں، تو یہ دونوں امر زائد ہیں، اگر یہ دونوں چیزیں زمانہ صحابہ میں نہ ہوتیں، تو بھی یہ ذخیرہ بحمد اللہ غیر مشکوک ہوتا۔ آنکھوں کی دیکھی چیزیں ذہن پر مرتسم ہوتی ہیں، عبارات کے حفظ سے ذہن میں ارتسام کی وہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوسکتی، جو رؤیتِ بصری سے ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے اعمال کو دیکھنے والے اس امر کے محتاج نہ تھے کہ اس فعل کی عربی عبارت بنائیں، پھر اسے یاد کریں، تاکہ حضرت مولانا تمنا عمادی صاحب کو وہم پیدا نہ ہو۔ اواخر صدی میں جبکہ صحابہ رخصت ہو رہے تھے، یہ مرئی واقعات ان دیکھنے والوں کی زبان سے حفظ اور تحریر دونوں طریقوں سے منضبط ہوگئے، کتابیں، مدون ہوگئیں، مالک، سفیان ثوری، محمد بن الحسن، امام شافعی، سفیان بن عیینہ، اوزاعی، ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم اہل علم تصنیف و تدوین کے میدان میں آ گئے، اس لئے قرآن عزیز کے بعد جو حفاظت ممکن تھی وہ حدیث کو حاصل ہوگئی۔ اور وہم کا علاج تو کہتے ہیں لقمان کے پاس بھی نہ تھا، تاہم رؤیت اور حفظ کی کیفیتِ ارتسام میں جو فرق ہے، اس پر توجہ دیجئے، میرا خیال ہے کہ اس سے بہت سے شبہات دور ہوجائیں گے،

لمن ألقى السمع وهو شهيد !

وضع حدیث کا فتنہ:

تابعین کے زمانہ میں یقیناً فتنوں کا شیوع تھا، جھوٹ اور سیاسی رقابتوں کی گرم بازاری تھی، وضع وتخلیق احادیث کا مشغلہ کافی تھا، لیکن جناب یقین فرمائیں ساری دنیا بد دیانت نہ تھی، اہل حق موجود تھے، حفظ و تدوین کی حدود کو سمجھتے تھے، ان خطرات کو دیکھتے ہوئے ان کو وہ خرابیاں نہیں سوجھیں، جو آپ کو سوجھ رہی ہیں۔ کوفہ اور خراسان کے وضّاعین کی منظّم سازشیں ان حضرات کی نگاہ میں تھیں، اہل زمانہ اور ہم قرن اپنے زمانہ کے حالات، اپنے رجال، ان کے مختلف اطوار سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ أهل مكة أعلم بشعابها ! [1]

اس زمانہ کی چوریاں آج تلاش کی جائیں، اس زمانہ کو آج کے اوہام کی عینک سے دیکھا جائے اور آج کے فیصلے ان حوادث پر ناطق تصور کیے جائیں، اس وقت کی سچائیوں کو آج کے جھوٹوں اور ان کے اسباب و دواعی کی روشنی میں دیکھا جائے؛ یہ مضحکہ ہوگا، دماغی توازن کی خرابی کا کرشمہ ہوگا اور دانشمندی کے بالکل خلاف!

”خیر القرون“ کا مفہوم:

مخاطب محترم نے خیر القرون کے طول، عرض اور انقباض پر بھی بحث فرمائی ہے اور اپنی نکتہ آفرینی کا ثبوت دیا ہے، فرماتے ہیں:

> ”اول صاحبِ قرن آنحضرت ہیں، ان کی وفات پر پہلا قرن ختم ہوا، دوسرے صاحبِ قرن حضرت ابوبکر ہیں اور تیسرے صاحب قرن حضرت عمر، دونوں کے انتقال پر تین قرن ختم ہوئے۔“

[1] اہل مکہ اپنی گھاٹیاں خوب جانتے ہیں!

نکتہ تو خوب ہے لیکن افسوس ہے کہ ہوائی نکتہ سے اس کی اہمیت زیادہ نہیں

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم"[1] (نسائی)

"الذین" اور "یلونہم" میں موصول اور ضمیر جمع ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب قرن ایک جماعت ہے اور ان سے ملنے والے بھی ایک جماعت، اس سے یہ نکتہ کچھ کامیاب معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ قرن کو کہاں تک پھیلنا یا سمٹنا ہے؟ لیکن مجھے خود پسند ہے کہ اس پر کچھ انضباط اور کنٹرول ہو جائے۔ مولانا کی توجہ غالباً خلافت راشدہ کی طرف تھی کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک ختم ہوگئی اور یہ مناسب بھی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے حدیثِ خلافت اور حدیثِ قرون میں خبط سا ہو گیا ہے۔

کتابت اور تدوین حدیث کی جو صورت اس وقت ہمارے سامنے ہے، اسے اگر کوئی قبول نہیں کرنا چاہتا، تو اس کی خوشی ہے، لیکن جن شبہات کی بنا پر انکار کیا جا رہا ہے، ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

حفاظت کے لیے انسانی کوششیں:

حدیث کی حفاظت کے مستند ذرائع کا جب ذکر آتا ہے اور وہ مخلصانہ مساعی جو اس راہ میں ائمہ نے فرمائیں ہیں، جب نظر کے سامنے آتی ہیں، تو اس سے ایک گونہ سکون حاصل ہوتا ہے، لیکن بعض متوہم طبائع کو اس سکون پر قناعت نہیں ہوتی، وہ بڑی

[1] صحيح البخاري: كتاب الشهادات، باب لا يشهد على شهادة جور إذا أشهد، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم، رقم الحديث (٢٥٣٥) سنن النسائي: كتاب الأيمان والنذور، باب الوفاء بالنذر، رقم الحديث (٣٨٠٩) روایت کے الفاظ مختلف ہیں، نیز دیکھیں: التلخيص الحبير (٤/ ٢٠٤)

دل سوزی سے فرماتے ہیں کہ یہ مساعی بے شک قابل تشکر ہیں، مگر ہیں تو یہ سب انسانی کوششیں! انسانی کمزوریوں سے اسے بالا تو نہیں سمجھا جا سکتا؟

یہ شبہ صحیح ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ حدیث کی حفاظت انسانوں نے کی اور وہ انسان کمزوریوں سے مبرا نہ تھے، مگر سوال یہ ہے کہ اس ہست و بود کے عالم میں کون سا کام ہے جسے رب العزت براہ راست فرما رہے ہیں؟ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے یے ایک قانون ہے اور ایک نظام!

① ہدایت و گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن اس کے لیے بھی قانون ہے، شیطان موجود ہے اور اس کی امت، انبیاء ہیں اور ان کے اُتباع۔

② رزق کا قبض و بسط اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اس مادی دنیا میں اس کے بھی قانون ہیں اور اسباب۔

③ عزت و ذلت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، مگر اس دنیا میں اس کا ظہور مادی اسباب اور انسانی ہاتھوں ہی سے ہو رہا ہے:

﴿قل اللهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء ......﴾ [1]

④ انسان کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، لیکن اس کی عملی صورت اسباب و ذرائع کے سوا کچھ بھی نہیں:

﴿له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من أمر الله﴾ [2]

⑤ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، لیکن اس کی صورت دنیا میں کیا ہے؟ کبھی خدا تعالیٰ نے قرآن کا دور فرمایا؟ کسی نے رب العزت کے

---

1. آل عمران: ٢٦
2. الرعد: ١١

پیچھے نماز تراویح ادا کی؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز کا کوئی نسخہ تحریر فرمایا؟ یقیناً ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں اس کا ایک قانون ہے اور ایک سنت مستمرہ، اسی کے مطابق سب کام ہو رہے ہیں اور اس کا انتظام انسانی ہاتھوں ہی سے ہوتا ہے، تو کس قدر تعجب ہے کہ جب یہی عام اسباب حدیث کی حفاظت کے لیے استعمال ہوں، محدثین اسے لکھیں، ضبط کریں، تدوین فرمائیں، احادیث کا لغت لکھیں، شروح لکھیں، رجال کا انضباط کریں، علوم حدیث کی ترویج فرمائیں اور آپ منہ بسور کر فرمائیں کہ محدثین کی مساعی تو ٹھیک، مگر ہیں تو سب انسانی کوششیں!!

قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ:

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے لی ہے:

﴿إنا نحن نزلنا الذکر وإنا له لحافظون﴾[1] کے مطابق ذکر کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے، قرآن مجید یقیناً ذکر ہے، لیکن یہ کہاں فرمایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے سوا ذکر کا مصداق اور کوئی نہیں؟ تمام وحی ذکر میں شامل ہے، پوری شریعت ذکر ہے اور اس کی حفاظت خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ قرآن کا محافظ خدا ہے، حدیث کا محافظ خدا ہے، اسی طرح شریعت اور دین کا محافظ بھی خدا ہی ہے اور یہ حفاظت سنت الٰہی کے مطابق انسانوں ہی کی معرفت ہوتی رہی:

﴿فلن تجد لسنة الله تبديلا ۖ ولن تجد لسنة الله تحويلا﴾[2]

جب دین کا مدار ان دو چیزوں پر ہے، تو ان دونوں کی حفاظت بھی خدا تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

---

[1] الحجر: ۹

[2] فاطر: ٤٣

ذکر سنت کو بھی شامل ہے:

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا خلاف بین أحد من أهل اللغة والشریعة في أن کل وحي نزل من عند الله تعالیٰ فهو ذکر منزل فالوحي کله محفوظ بحفظ الله تعالیٰ له بیقین" (الإحکام: ۱/۱۲۱)

اہل لغت اور شریعت اس امر پر متفق ہیں کہ وحی کی تمام اقسام ذکر ہیں اور تمام وحی کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"والذکر اسم واقع علی کل ما أنزل الله علی نبیه ﷺ من قرآن أو من سنة" (الإحکام: ۱/ ۱۲۱)

ذکر کا لفظ قرآن اور سنت دونوں کو شامل ہے۔

اس کی تائید قرآن عزیز سے بھی ہوتی ہے:

﴿ وأنزلنا إلیك الذکر لتبین للناس ما نزل إلیهم ......﴾ [1]

ہم نے تم پر ذکر اس لئے نازل کیا کہ تم "ما نزّل" کو بیان کرو۔

"ما نزّل" اور "الذکر" میں اتنا ہی فرق ہے، جس قدر کہ "بیان" اور "البیان" میں ہے، اس لئے اس آیت میں "الذکر" کا مطلب یہاں حدیث ہی ہوسکتا ہے۔

حدیث کیا ہے؟

① یہ لفظ قرآن مجید پر بھی بولا گیا ہے: ﴿ فبأیّ حدیث بعده یؤمنون ﴾ [2]

---

[1] النحل: ٤٤

[2] الأعراف: ١٨٥

② آنحضرت ﷺ کے ارشاد: ﴿إذ أسر النبي إلى بعض أزواجه حديثا﴾ [1]

③ تباہ شدہ قوموں کے تذکرے: ﴿فجعلناهم أحاديث﴾ [2]

④ آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال، افعال اور تقریر۔ (علامہ طیبی رحمہ اللہ)

(تدریب الراوی)

⑤ آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریر،

قال شيخ الإسلام ابن حجر في شرح البخاري:

"المراد بالحديث في عرف الشرع ما يضاف إلى النبي ﷺ"

(تدريب: ٤)

قال في منهج الوصول:

"سلف اطلاق لفظ حدیث براقوال و افعال و تقاریر صحابہ و تابعین و آثار و فتاویٰ می کردہ اند اما لغۃً و تجوزاً حقیقۃً و اولی ہمیں ست کہ ایں لفظ خاص وارند بقول نبوی و بر مقولات دیگر ے اطلاقش نہ کنند تا غیر حدیث ملتبس بحدیث نشود زیرا کہ قول غیر وے ﷺ صحابی باشد تابعی ہم وزن قول معصوم نیست واحتجاج مستقل نمیرسد۔" [3]

مخاطب محترم نے حدیث کے مفہوم کی وضاحت میں علامہ طیبی کا قول اختیار فرمایا، تقسیم فنون میں حدیث سے مراد یہی مفہوم ہے، جسے طیبی نے ذکر فرمایا، لیکن

---

[1] التحریم: ٣

[2] سبأ: ١٩

[3] سلف نے صحابہ و تابعین کے اقوال، افعال، تقاریر، آثار اور فتاویٰ پر لفظ حدیث کا اطلاق کیا ہے، لیکن لغت اور مجاز کے اعتبار سے بہتر اور حقیقت یہی ہے کہ یہ لفظ فرمان نبوی کے ساتھ خاص ہے اور دیگر اقوال پر اس کا اطلاق نہ ہو، تا کہ حدیث کے ساتھ وہ چیز ملتبس نہ ہو جائے، جو حدیث نہیں ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے علاوہ صحابی ہو یا تابعی اس کی بات نبی ﷺ کی بات کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی مستقل حجت ہے۔

جب ادلہ شرعیہ کا ذکر ہو اور حجیت شرعیہ کی بحث ہو، تو حدیث سے مراد صرف آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال، تقریر اور اجتہاد ہی مراد لیے جاتے ہیں، صحابہ، تابعین، اتباع تابعین کے اقوال و افعال علی الاطلاق حجت نہیں، نہ ادلہ شرعیہ میں ان کا شمار کیا گیا ہے۔ اس لئے مولانا تمنا نے حدیث کا ذکر جس انداز سے کیا ہے، اس کی صحت قابل اعتراض ہے، ائمہ فن حدیث سے یہ مفہوم نہیں سمجھتے۔

اسناد اور شبہات:

① رواۃ حدیث میں ہر قسم کے آدمی پائے گئے ہیں، جھوٹے، وضاع، ضعیف الحفظ، اہل بدعت اور اسی طرح ثقات، حفاظ، صلحاء اور اہل تقویٰ نے بھی اس فن کی خدمت کی ہے، اس لیے محدثین نے احادیث کو ظنی فرمایا ہے۔

② آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تدوین حدیث کا کام باقاعدہ نہ تھا، اس ضرورت کی طرف علماء کی توجہ کچھ عرصہ بعد میں ہوئی، اس لیے غلطی کا احتمال زیادہ ہوگیا۔

③ محدثین کی کوششیں قابل شکریہ ہیں، وہ کتنی بھی کوشش فرمائیں، بہر حال وہ ایک انسانی کوشش ہے، جس پر مکمل اطمینان دشوار ہے۔ اس سے حدیث کی ظنیت میں کمی نہیں ہوتی۔

④ کوفہ اور خراسان میں عجمی عصبیت نے شیعہ اور خارجی تحریکات کی صورت اختیار کی اور اپنے اپنے خیالات کی حمایت کے لیے احادیث کی وضع اور تخلیق سے بھی پرہیز نہیں کی، اس لئے حدیث کا ذخیرہ اور بھی مشکوک ہوگیا، صحیح اور غیر مستند احادیث میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔

قریب قریب یہی شبہات ہیں جو احادیث کے غیر مستند اور ظنی ہونے کے متعلق اجمالاً یا تفصیلاً وارد کئے گئے ہیں جو اہل قرآن اور میرے مخاطب ایسے "صرف

مسلمان'' اس فن کے متعلق ظاہر فرماتے ہیں۔

اعترافِ حقیقت:

یہ واقعی ایک حقیقت ہے کہ نقل کے لحاظ سے حدیث کو وہ وثوق و تواتر میسر نہیں آسکا، جو قرآن مجید میں پایا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ حدیث اور اہل سنت کے نزدیک حدیث کا درجہ قرآن کے بعد ہے، اس حیثیت سے حدیث نہ " مثله" ہے، نہ " معه "۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے دوست حدیث کے خلاف لکھتے وقت جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور فرقِ حیثیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ عفااللہ عنا وعنهم وهدانا وإياهم سواء الطريق! یہی سبب ہے جس کی وجہ سے حدیث کو ظنی کہنے کا رواج ہوا۔

ظن اور اس کا مقام:

ظن عرفاً یقین سے کچھ کم ہے، منطقی اسے شک سے کسی قدر بہتر سمجھتے ہیں، میں نے رسالہ'' اسلامی زندگی'' میں مفصل عرض کیا تھا، برادر محترم اپنی تصنیفات کے تعارف میں مشغول ہوگئے اور میری گزارشات پر مناسب توجہ نہ دے سکے، حالانکہ بہت سی دشواریوں کا حل ان گزارشات میں موجود تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ محدثین کا مطلب حدیث کی ظنیت سے ایک ایسا ذخیرہ مراد ہے، جس میں فکر و نظر اور قرائن و ادلہ سے بحث کی گنجائش ہے، قرائن اور دلائل اگر کسی حدیث کی صحت کا فیصلہ کر دیں، تو وہاں شکوک وشبہات اور ظنون کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

ان دلائل کی بنا پر صحیحین کی احادیث کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان سے علم و یقین حاصل ہوتا ہے:

" واختار ابن الصلاح أن ما أخرجه الشيخان في صحيحيهما أو رواه

أحدهما مقطوع بصحته والعلم اليقيني النظري واقع به“ ......الخ
(حواشي اختصار علوم الحديث: ٢٤) ❶

ابن صلاح کے نزدیک صحیحین کی احادیث کی صحت قطعی ہے اور ان سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔

قال الحافظ أبو نصر السجزي:

” أجمع الفقهاء وغيرهم أن رجلا لو حلف بالطلاق أن جميع ما في البخاري صحيح قاله رسول الله ﷺ لا شك فيه لم يحنث...... “ الخ
(تدريب، ص : ٣٧) ❷

ابو نصر فرماتے ہیں کہ فقہاء نے اجماع کیا ہے کہ اگر کوئی شخص (تعلیقات کے علاوہ) صحیح بخاری کی ان روایات کے متعلق جو مقاصد کتاب میں شامل ہیں، قسم اٹھا لیتا ہے کہ یہ سب صحیح ہیں اور آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، تو اس کی قسم صحیح ہوگی۔

مولانا تمنا نے فرمایا ہے کہ محدثین حدیث کی صحت پر حلف نہیں کھاتے۔ یہ یہاں فقہاء کا اجماع مرقوم ہے، چونکہ یہ یقین نظری ہے ضروری نہیں، اس لئے اہل فن اور محدثین ہی اس کی حقیقت کو پا سکتے ہیں:

” ثم حكى أن الأمة تلقت هذين الكتابين بالقبول سوى أحرف يسيرة انتقدها بعض الحفاظ كالدار قطني وغيره ثم استنبط من ذلك القطع بصحة ما فيها من الأحاديث لأن الأمة معصومة عن الخطاء فما ظنت صحته و جب عليه العمل به ولابد أن يكون صحيحا في نفس الأمر “
(اختصار علوم الحديث للحافظ ابن كثير: ٢٣)

امت نے صحیحین کی احادیث کو (منتقد احادیث کے سوا) قبول کیا ہے اور

---

❶ مقدمة ابن الصلاح (ص: ١٠)

❷ تدريب الراوي (١/ ١٢٢)

امت معصوم عن الخطا ہے، امت کو جن احادیث کی صحت کا ظن ہے، وہ فی الواقع صحیح ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جن احادیث کو امت نے قبول کیا، وہ قطعی اور یقینی ہیں، قاضی عبدالوہاب مالکی، شیخ ابو حامد اسفرائینی، قاضی ابو الطیب طبری، شیخ ابو اسحاق شیرازی شافعی، ابن حامد، ابو یعلی بن فراء، ابن الخطاب، ابن زاغونی اور شمس الائمہ سرخسی اور اکثر متکلمین اور اکثر اشاعرہ اس کے قائل ہیں، تمام اہلحدیث کا یہی مذہب ہے اور ائمہ سلف کا یہی خیال تھا۔''

(اختصار ،ص ۲، صواعق مرسلہ: ۲/ ۳۶۲)

ہر صحیح حدیث کے متعلق محققین ائمہ حدیث کا یہ مذہب ہے کہ وہ قطعی الثبوت ہے، حافظ داود ظاہری، حسین بن علی کرابیسی، حارث بن اسد محاسبی، امام مالک اور حافظ ابن حزم اندلسی کا بھی یہی مذہب ہے۔ حافظ بلقینی نے علوم الحدیث میں یہی اختیار فرمایا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اسے پسند کیا ہے۔

" إن الحديث الصحيح يفيد العلم القطعي سواء كان في الصحيحين أم في غيرهما، وهذا العلم اليقيني علم نظري برهاني لا يحصل إلا للعالم المتبحر في الحديث العارف بأحوال الرواة و العلل "

(اختصار مع الحواشي: ص ۸: روضة الناظر للمقدسي : ۱/ ۲۶۴) ❶

یہ علم یقینی ہر صحیح حدیث کے متعلق ہے صحیحین میں ہو یا کسی دوسری کتاب میں، یہ علم نظری اور برہانی ہے۔ اہل فن اور متبحرین کو حاصل ہوتا ہے۔

آخر میں فرماتے ہیں:

❶ نیز دیکھیں: محصول (۱/ ۱۳۳)

" ودع عنك تفريق المتكلمين في اصطلاحاتهم بين العلم والظن فإنهم يريدون معنى آخر غير ما نريد" ❶

متکلمین کی اصطلاحات کو علم وظن کے متعلق نظر انداز کر دو، ان کا مقصد اور ہے اور ہمارا مطلب اور۔

امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے خبر واحد کے منکر کی تکفیر فرمائی ہے۔ (صواعق: ۲/ ۲٦۸)

مولانا نے یہی ایک حوالہ تھا، جو سارے مضمون میں مجھ سے دریافت فرمایا، جو ظن مصطلح کے متعلق عرض کر دیا۔ محدثین کا مقام اور اصطلاح اور ہے اور متکلمین کی اصطلاح اور!

مخاطب محترم نے میرے طویل مضمون پر دو جگہ گفتگو فرمائی تھی:

① ظن مصطلح کا حوالہ۔

② اثر حسان بن عطیہ کی سند۔

شکر ہے کہ دونوں مطالبے پورے ہو گئے، والحمد للّٰہ رب العالمین!

صحابہ کا تثبت:

حدیث حجت تھی، سلف میں کوئی بھی اس کے خلاف نہ تھا، مبتدع فرقے، روافض اور خوارج بھی نفسِ حجیت کے منکر نہ تھے۔ ابن حزم فرماتے ہیں:

لو أن امرءا قال لا نأخذ إلا ما وجدنا في القرآن كان كافرا بإجماع الأمة (الإحكام: ۲/ ۸)

اگر کوئی صرف قرآن کی پابندی پر مصر ہو، تو باتفاق امت وہ اسلام سے خارج ہے۔

❶ حواشي العلامة أحمد شاكر على اختصار علوم الحديث لابن كثير (ص: ۲٥)

صحابہ کا عمل یہ تھا کہ جب آنحضرت ﷺ کا ارشاد معلوم ہو جاتا، تو فوراً تسلیم فرماتے۔ صحابہ کے آخری دور میں جھوٹ کا رواج ہوگیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آنحضرت ﷺ پر غلط الزام لگائے جاتے، جھوٹی احادیث اور غلط فتاوی ان کی طرف منسوب کیے جاتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب کوئی آنحضرت ﷺ کا نام لیتا، تو ہم لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے، لیکن جب لوگوں نے غلط، صحیح کہنا شروع کر دیا، اب ہم جب تک کوئی چیز ثابت نہ ہو جائے توجہ نہیں کرتے۔[1] (مقدمہ مسلم)

خبروں میں غلط اور صحیح میں تمیز اور رواۃ کے احوال سے استدلال و استفادہ کی اجازت بلکہ قرآن میں تاکید فرمائی گئی:

﴿إن جاء كم فاسق بنبأ فتبينوا أن تصيبوا قوما بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين﴾[2]

جب کوئی غیر مستند آدمی بات بیان کرے، تو اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے، ایسا نہ ہو بعد میں ندامت حاصل ہو۔

اس لئے حسب ضرورت روایات اور احادیث میں تثبت فرماتے تھے، جب حدیث کی صحت کے متعلق یقین ہو جاتا، قبول فرما لیتے۔ صحابہ کا یہ تشدد حدیث کے حجت ہونے پر دلیل ہے، اگر حدیث ان بزرگوں کی نظر میں حجت نہ ہوتی، تو اس تشدد اور تثبت کی ضرورت کیوں محسوس کرتے؟

بعض منکرین سنت نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانصد حدیث جلا ڈالیں، یہ روایت بلحاظ سند قطعی غیر مستند ہے۔[3] اگر میں محترم مخاطب کی طرح ضمنی

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم (ص: ۱۲)

[2] الحجرات: ٦

[3] اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے، دیکھیں: (ص)

مباحث پر زور دینا چاہتا، تو اس سند پر اسماء الرجال کی کافی نمائش کی جا سکتی تھی، لیکن میں برادر محترم کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر ان کو اس کی صحت پر اصرار ہوا، تو ان شاء اللہ اس اثر پر مفصل تنقید کی جا سکے گی۔ مجھے وثوق ہے اور ظن غالب کہ مولانا اس ضعف کو خوب جانتے ہیں، لیکن اگر اسے کوئی حیثیت دی جائے، تو یہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حدیث کو حجت تصور فرماتے تھے، وہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ ادلہ صحیحہ میں غلط اور جھوٹی احادیث خلط ہو جائیں، اس لئے جب ان پر شبہ گزرا، تو ان کو جلا دیا۔ لیکن جب کوئی صحیح حدیث سامنے آئی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً قبول فرمایا:

1. جدّہ (دادی) نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنے پوتے کی وراثت کا مطالبہ کیا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کتاب اللہ میں تیرا کوئی حصہ نہیں، جب وہ چلی گئی، تو محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ جب کوئی حاجب نہ ہو، تو جدّہ کو چھٹا حصہ ملے گا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دادی کو بلا کر اسے حصہ دلوایا۔[1]
2. حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کی بابت دریافت فرمایا اور قبول کیا۔
3. حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے متعلق مطالبہ فرمایا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنا کر انھیں خاموش کر دیا:

"نحن معاشر الأنبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکناہ صدقة"[2]

---

[1] یہ اثر منقطع ہے، اس کی تخریج گزر چکی ہے، دیکھیں (ص:)

[2] صحیح البخاري: کتاب الخمس، باب فرض الخمس، رقم الحدیث (۲۹۲۶) صحیح مسلم: کتاب الجهاد والسیر، باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث، رقم الحدیث (۱۷۵۹) (الفاظ مختلف ہیں) اس حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں: میں بھی ویسا ہی عمل کروں گا، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، میں اس کو نہیں چھوڑوں گا، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی امر چھوڑ دیا، تو کہیں گمراہ نہ ہو جاؤں!

انبیاء کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔

اس لیے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انکار اور چیز ہے اور تثبّت اور چیز، تثبّت سنت ہے اور انکار کفر۔ شتّان بینهما!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عمل بالحدیث:

اس باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام بڑے وثوق سے لیا جاتا ہے، ان کے تشدد اور تثبت فی الروایه کا تذکرہ چٹخارے لے لے کر بیان کیا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلک وضاحت سے ذکر کر دیا جائے:

"عن **عمر بن الخطاب**: سيأتي قوم يجادلونكم بشبهات القرآن فخذوهم بالأحاديث فإن أصحاب السنن أعلم بكتاب الله" [1]

(موافقات : ٤/ ٩ ، أيضا: مختصر جامع لابن عبدالبر:٢/ ١٩٣)

تمھیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑے گا جو قرآن کے مشتبہات پر بحث کریں گے، ان پر احادیث سے گرفت کرو، اہل حدیث قرآن کو بہتر سمجھتے ہیں۔

شاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"صرف کتاب اللہ پر انحصار ان لوگوں کا خیال ہے، جن کو ایمان سے حصہ نہیں ملا، ان کا اعتقاد ہے کہ کتاب اللہ ہر چیز کا بیان ہے، ان لوگوں نے سنت کو ترک کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت سے الگ ہو گئے، اور کتاب اللہ کو بھی نہ سمجھ سکے۔" (موافقات : ٤/ ٨)

مندرجہ واقعات سے ثابت ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حدیث کو حجت سمجھتے تھے یا نہیں؟

(1) حدیث استیذان، دوسرے گھر میں داخل ہونے کے لیے آواز دینا چاہیے، محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے قبول فرمایا۔ [2]

---

[1] سنن دارمي (١/ ٦٢) جامع بيان العلم (٢/ ٢٤٤) الموافقات للشاطبي (٤/ ١٧)

[2] صحيح مسلم: كتاب الآداب، باب الاستيذان رقم الحديث (٣٧) اس روایت میں شہادت دینے والے صحابی کا نام ابوسعید رضی اللہ عنہ مذکور ہے۔

۳۔ یہود و نصاریٰ کی جزیرۃ العرب سے جلا وطنی کا فیصلہ حدیث کی بنا پر ہوا۔[1]

۴۔ وبا زدہ علاقے میں داخل ہونے سے رک گئے، جب عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کا ذکر فرمایا۔[2]

۵۔ عیدِ فطر اور عید اضحیٰ کی تعیین، (ابو واقد لیثی کی روایت)۔[3]

۶۔ ہجر کے مجوسیوں پر جزیہ لگایا۔ (حدیث عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ)[4]

۷۔ اموالِ کعبہ کی تقسیم حدیث کی وجہ سے ترک فرما دی۔

۸۔ معذور عورتوں کو طواف وداع کی رخصت حدیث کی بنا پر دی۔[5]

۹۔ ہاتھ کی انگلیوں کی دیت میں برابری حدیث کی وجہ سے قبول فرمائی۔[6]

۱۰۔ خاوند کی دیت سے بیوی کو حصہ ضحاک بن سفیان کی حدیث کی وجہ سے دلایا۔[7]

۱۱۔ مجنونہ کا رجم حدیث کی وجہ سے ترک فرما دیا۔[8]

---

[1] صحيح البخاري: كتاب الشروط، باب إذا اشترط في المزارعة إذا شئت أخرجتك، رقم الحديث (٢٥٨٠)

[2] صحيح البخاري: كتاب الطب، باب ما يذكر في الطاعون، رقم الحديث (٥٣٩٧) صحيح مسلم: كتاب السلام، باب الطاعون والطيرة والكهانة ونحوها، رقم الحديث (٢٢١٩)

[3] اصل روایت یوں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے عیدین کی نماز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے بارے میں سوال کیا تھا، جس کا انھوں نے جواب دیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز میں سورہ ق اور سورہ قمر کی قراءت کیا کرتے تھے۔ (صحیح مسلم، برقم: ۸۹۱)

[4] صحيح البخارى: أبواب الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب، رقم الحديث (٢٩٨٧)

[5] فقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (ص: ٢٦٦)

[6] مصنف عبدالرزاق (٣٨٥/٩) أقضية الخلفاء الراشدين (٢/ ٧٣٥)

[7] سنن أبي داود: كتاب الفرائض، باب في المرأة ترث من دية زوجها، رقم الحديث (٢٩٢٧)

[8] سنن أبي داود، برقم (٤٣٩٩)

⑪ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے قریباً پانصد احادیث مروی ہیں۔[1] (مسند احمد و کتب احادیث)

اگر انکار حدیث میں کسی دیانت داری کا امکان ہے، تو پھر اس مسلک کی نسبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف کرنا بہت بڑا ظلم ہوگا، تثبّت فی الروایه اور چیز ہے اور حسبنا کتاب اللہ اور چیز!

باقی صحابہ کا بھی یہی حال ہے، اس کے متعلق صحابہ کی تفصیل ان شاء اللہ کسی دوسری صحبت میں آئے گی۔

روایاتِ حدیث اور عددِ احادیث پر غور:

حجۃ الوداع میں صحابہ کی تعداد قریباً ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی، جن میں روایتِ حدیث کا مشغلہ قریباً تیرہ سو سے کچھ زیادہ صحابہ فرماتے تھے، ان میں اصحاب افتاء اور محدث قریباً تین صد حضرات تھے۔[2] ایک اچھے معاشرہ میں جہاں شب و روز علم و تقویٰ کے چرچے ہوں اور نظام حکومت علم و دیانت کی حوصلہ افزائی کرتا ہو، وہاں یہ تعداد بالکل مناسب ہے، وضع وتخلیق کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر مولانا محترم ظن کی گرفت سے کچھ آزاد ہو کر مسئلہ پر غور فرمائیں، تو زمانہ تابعین میں بے شک فسادات ہوئے، سیاسی جھوٹ کا چرچا بھی رہا، لیکن حدیث سازی کی کوئی باقاعدہ ایجنسی نہ تھی، جیسے آپ کے ذہن میں سما چکا ہے۔ اعمش رحمہ اللہ اور ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ پر آپ نے تہمت لگانے میں بڑی جرأت سے کام لیا ہے، ﴿إن بعض الظن إثم﴾[3] سے ذہول افسوسناک ہے۔

---

[1] الخلاصة للخزرجي (ص: ٢٨٢)

[2] دیکھیں: إعلام الموقعين (١/ ١٣)

[3] الحجرات: ١٢

رفض اور تشیع میں جو فرق ہے، وہ اہل علم سے مخفی نہیں، [1] " فيه تشيع " کے الفاظ اور بھی بے وزنی ہیں، یہ الفاظ حافظ خطیب رحمہ اللہ نے سلیمان بن مہران اعمش کے متعلق لکھے ہیں۔ [2] ان کا تشیع صرف اس قدر تھا کہ ان کا رجحان اہل بیت کی طرف تھا، وہ خوارج کی روش کو بھی پسند نہ کرتے تھے اور اہل شام کی مخاصمانہ پالیسی کو بھی برا سمجھتے تھے، یہ اگر جناب کی نظر میں جرم ہے، تو ایسا نہیں جسے رفض کہا جائے یا اس کی بنا پر روایت ترک کر دی جائے۔ محض کوفہ میں پیدا ہونا کوئی جرم نہیں، آپ پر شیعیت سے اس قدر گھبراہٹ ہے کہ تشیع کا لفظ آتے ہی آپ بے چارے اعمش پر حملہ آور ہو گئے!

اعمش رحمہ اللہ ۱۴۸ھ میں فوت ہوئے، ان کا زمانہ عباسی انقلاب کا دور ہے، جبکہ اہل بیت اور اموی بغض کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، کسی نے ذرا استبداد کی مخالفت کی، تو " فيه تشيع " کا خطاب پا لیا، آپ نے اپنا سیاسی انقلاب دیکھا، تقسیم کے نظریہ کی مخالفت یا موافقت کی بنا پر کتنی جلدی لیگی اور کانگریسی کے فتوے چسپاں ہوتے تھے، "فيه تشيع " کا فتویٰ اعمش پر اسی نوعیت کا ہے۔

آپ نے جہاں میزان الاعتدال سے ابن مبارک رحمہ اللہ اور مغیرہ بن مقسم رحمہ اللہ کا قول : " أهلك أهل الكوفة أبو إسحاق و أعمشكم...... الخ" نقل فرمایا ہے، وہیں مرقوم ہے:

" وإلا فالأعمش عدل صادق ثبت صاحب سنّة وقرآن "

(میزان : ١/ ٤٢٣، أيضا: تاريخ بغداد :٩/ ٩)

---

1. تفصیل کے لیے دیکھیں: لسان الميزان (١/ ٩)
2. حافظ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے یہ الفاظ امام عجلي رحمہ اللہ سے نقل کیے ہیں، دیکھیں: تاریخ بغداد(٩/ ٦) الثقات للعجلي (١/ ٤٣٤)

’’اعمش عادل ثقہ اہل السنۃ اور صاحب قرآن ہے۔‘‘

برادرم محترم! اعمش کے سنّی ہونے پر رحم نہ سہی، اس کے اہل قرآن ہونے پر ہی رحم فرمایا ہوتا!!

مولانا! آپ نے محدثین کی نفسیات کی شکایت فرمائی ہے، میں جناب کی نفسیات کی جناب ہی سے شکایت کرتا ہوں کہ آپ نے اعمش رحمہ اللہ اور ابو اسحاق رحمہ اللہ کے متعلق اچھی نفسیات کا ثبوت نہیں دیا، ان پر صرف اس قدر عیب لگایا گیا ہے کہ ”یحسن الظن بمن یحدثہ“ [1] وہ اپنے اساتذہ پر بہت زیادہ حسن ظن رکھتے ہیں، گویا ان پر ناقدانہ نظر نہیں رکھتے۔ لیکن آپ نے تخلیق احادیث کے لیے کمیشن ایجنٹ بنا دیا کہ کوفہ اور خراسان میں ان کی ایجنسیاں قائم تھیں، إنا للہ......!

ایک متدین آدمی کے لیے یہ عادت مناسب نہیں، قرآن نے ﴿إن بعض الظن إثم﴾ [2] فرمایا ہے۔ یہاں تو آپ کا خیال سرے ہی سے غلط ہے، آپ کی نفسیات کا محاسبہ کون کرے؟

← علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بہت سے رواۃ کو اتہاماً شیعی، خارجی، اور ناصبی وغیرہ کہہ دیا جاتا ہے، جس کی کوئی اصل نہیں ہوتی، اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین کے بہت سے رواۃ پر ’’تشیع‘‘ کی تہمت لگائی گئی ہے، جب میں نے شیعہ کی کتب رجال کا مراجعہ کیا، تو صحیحین کے پچیس رواۃ میں سے جن پر تشیع کا الزام تھا، مجھے صرف کتب شیعہ میں دو راویوں کا ذکر ملا، بقیہ رواۃ کا کوئی ذکر تک مجھے نظر نہیں آیا، جس سے ایک انتہائی اہم قاعدہ معلوم ہوا! کہ اگر کسی شخص کا بدعت کی طرف انتساب ملے، تو ہمیں اس مذہب کی کتب رجال کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تاکہ اصل حقیقت حال معلوم ہو سکے۔‘‘ (قواعد التحدیث ص: ۱۹۴، مختصراً)

1. میزان الاعتدال (۳/ ۳۱۶)
2. الحجرات: ۱۲

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

یہی حال ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ کا ہے، وہ بہت بڑے عالم اور محدث تھے، آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہوگیا،[1] جریر بن عبد الحمید عن مغیرہ بن مقسم کی روایت پر آپ نے اعتماد فرما کر بزرگوں پر اتہام لگایا ہے، خدا آپ کو معاف فرما دے!

فن حدیث میں تین چیزیں از بس ضروری ہیں، جرأت، انصاف، احتیاط، آپ کا مقالہ پڑھنے کے بعد مجھے یہ اجازت دیجئے کہ آپ میں یہ تینوں ناپید ہیں، اس لئے آپ نئے اصول حدیث اور اصول تنقید وضع کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔

جریر بن عبدالحمید، اعمش کے شاگرد ہیں، ان کے متعلق بھی مشہور ہے کہ مغیرہ بن مقسم عن ابراهیم سے انھوں نے طلاق اخرس کے متعلق حدیث بنائی۔ (میزان الاعتدال: ۱/ ۱۸۳)[2] لیکن ثقات محدثین کی توثیق کے بعد اس قسم کی جرحیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

احادیث کی گنتی:

موجودہ کتب احادیث میں چند ہزار احادیث پائی جاتی ہیں، یہ بلحاظ رجال

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: الکواکب النیرات (ص: ٦٦)

[2] ان کی طرف وضع حدیث کا انتساب درست نہیں کیونکہ انھوں نے صرف کسی مجہول آدمی سے وہ روایت بیان کی تھی، دیکھیں: تاریخ بغداد (۷/ ۲٦۰) میزان الاعتدال (۲/ ۱۲۰)
مزید برآں اس قصے کو نقل کرنے والا راوی "سلیمان بن داود الشاذکوني" جھوٹا اور متروک ہے۔
دیکھیں: الجرح و التعدیل (٤/ ۱۱٤) لسان المیزان (۳/ ۸٤) الکشف الحثیث عمن رمي بوضع الحدیث (ص: ۱۲۹)

صحابہ کوئی بڑا عدد نہیں، اگر ان کتب میں وضع و تخلیق کو دخل ہوتا، تو احادیث اور روایت کا عدد اس سے کہیں زیادہ ہوتا۔ ❶

مولانا کے مقالہ کے ابھی کئی گوشے قابل توجہ ہیں، لیکن گزارشات بہت طویل ہوگئی ہیں، اب اسے ختم کرتا ہوں، اگر ضرورت ہوئی تو مکرر رونق محفل کی سعی ہوگی، والسلام۔ ❷

---

❶ صحابہ کرام اور احادیث نبویہ کی عمومی تعداد کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیں: بحوث في تاريخ السنة المشرفة (ص: ٣٧٣)

❷ مؤلف رحمہ اللہ نے تمنا عمادی کے مضمون میں مذکور زیادہ تر ظن کے مفہوم کے متعلق اشکالات و اعتراضات کا جائزہ لیا تھا، لیکن تمنا عمادی کے تنقیدی مضمون میں علم حدیث اور اسماء الرجال کے متعلق بھی کئی جگہ بے جا تنقید اور اعتراضات مرقوم تھے، جن کا جواب مولانا عبداللہ لائل پوری رحمہ اللہ نے انھی دنوں لکھا تھا، جو "الاعتصام" میں اشاعت پذیر ہوا، مذکورہ مضمون کی افادیت کے پیش نظر اسے ذیل میں ←

....

درج کیا جا رہا ہے:

''مولانا تمنا کے مضمون پر ایک اور تعاقب''

مولانا تمنا صاحب عمادی نے رسالہ "البیان" جنوری ۵۰ء میں مولانا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ کے ایک مقالہ پر تنقیدی بحث کی ہے، جہاں تک مولانا اسماعیل صاحب کے مضمون کا تعلق ہے، وہ صرف ''ظن کے اصطلاحی معنی'' پر مشتمل ہے، ہر صاحب علم کو حق حاصل ہے کہ دیانت سے اپنی رائے کا اظہار کرے۔ مولانا تمنا صاحب نے شروع میں اگرچہ وعدہ فرمایا ہے اور آخر میں بیان کیا ہے کہ میرا یہ مضمون صرف احقاق حق کے لیے ہے، مثلاً وہ "البیان" (ص:۱۹) میں فرماتے ہیں:

''میری غرض کسی مناظرے کا سلسلہ جاری کرنا نہیں، صرف احقاق حق مراد ہے اور بس''

آخری صفحہ (۴۷) میں فرماتے ہیں:

''میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، محض دیانتاً عرض کیا ہے اور وہی لکھا ہے جس کو دیانتاً حق سمجھتا ہوں۔''

لیکن افسوس ہے کہ مولانا نے اپنے مضمون میں بہت جگہ مغالطہ دہی سے کام لیا ہے، جیسا کہ ناظرین آگے ملاحظہ فرمائیں گے۔

مضمون کا عنوان ''ظن کے اصطلاحی معنی'' ہے، جو چودہ ورقوں اور اٹھائیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، جس میں اصل مبحث کے حصہ میں صرف گیارہ صفحے ہی آتے ہیں، باقی سترہ صفحے حدیثوں پر تنقید، تابعین پر پھبتیاں، ائمہ محدثین کی تنقیص اور قراء امت پر استہزاء کرنے میں صرف ہوئے ہیں۔

''ظن کے اصطلاحی معنی'' کے متعلق مولانا اسماعیل صاحب وضاحت سے روشنی ڈال چکے ہیں، علم الرجال کے متعلق تمنا صاحب نے جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں، ان پر چند سطریں لکھنا چاہتا ہوں۔

مولانا تمنا کے دعاویٰ اور خود ساختہ کلیات:

مولانا تمنا صاحب نے چند دعوے کئے ہیں، جن کو ان کی کلیات کہنا بجا ہوگا:

① فرماتے ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ امام بخاری کی کتاب میں "باب جمع القرآن" والا پورا باب ہی داخل کر دیا گیا ہے۔'' (البیان: ۲۳)

....

مطلب صاف ہے کہ صحیح بخاری میں "باب جمع القرآن" میں جو حدیثیں مذکور ہیں، وہ اصل بخاری میں موجود نہیں تھیں، امام بخاری رحمہ اللہ کے بعد کسی نے فریب سے لکھ دیں، نعوذ باللہ من ذلك!

اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ مولانا اس اصل نسخہ کا پتہ بتائیں، جس میں یہ باب موجود نہیں ہے، آخر کہیں دنیا کے کسی کتب خانے میں تو وہ موجود ہوگا، یا کسی محدث کی تصریح نقل کریں، جس میں اس باب کے الحاقی ہونے کا ذکر ہو، صرف دعووں کو کون مانتا ہے؟

② فرماتے ہیں: ''خدا بھلا کرے ابن شہاب زہری کا، جنھوں نے جمع احادیث کا کام شروع کر کے ربوبیت کبریٰ کے منشا فیض کی تکمیل کی داغ بیل ڈال دی۔'' (البیان : ۲۰)

''عبید بن سباق سے روایت کرنے والے بہتیرے تھے، مگر عبید نے جمع قرآن کی روایت صرف زہری سے بیان کی، اس لئے کہ یہ ہر رطب ویابس روایت کو لکھ لیتے اور کوئی چوں و چرا نہیں کرتے تھے۔'' (صفحہ: ۲۸)

یہ زہری پر خفگی اور ناراضگی صرف اس لئے ہے کہ وہ جمع القرآن کی روایت کے راوی ہیں۔
سوال یہ ہے کہ جب وہ باب ہی اصل بخاری میں نہیں، تو پھر روایتوں پر جرح سے کیا فائدہ؟
یاللعجب!

③ فرماتے ہیں: ''خیر القرون کی مدت حضرت فاروق اعظم کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔''
(صفحہ : ۳۰)

اور حدیث " خير القرون قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم " پیش کی ہے اور پھر اس کو کھینچ کر تان کر پہلا قرن رسول اللہ ﷺ کا اور دوسرا قرن صدیق اکبر اور تیسرا قرن فاروق اعظم کا ثابت کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اس حدیث کا، جس کو آپ نے پیش کیا ہے، راوی ابن شہاب زہری ہو، جو رطب ویابس کو بغیر چوں و چرا کے لکھ لیتا ہے، تو پھر دیانت یہی کہتی ہے کہ جمع قرآن والی حدیث کی طرح اس کو بھی چھوڑ دیجیے اور پھر اسی پر بس نہ کیجیے، بلکہ کھل کر اور صاف واضح الفاظ میں یوں فرمائیے کہ جس حدیث کو زہری بیان کرے، اس کو ہم پیش نہ کریں گے۔

....

← (۳) فرماتے ہیں: ''زہری کے ہزاروں شاگرد تھے، امام مالک، عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، اوزاعی، ابن ابی ذئب، ابن عیینہ وغیرہم۔'' (صفحہ: ۳۸)

میں پوچھتا ہوں کہ امام مالک وغیرہ اصحاب جو آپ نے ذکر کیے ہیں، انھوں نے زہری کو کیوں نہ چھوڑ دیا؟ حالانکہ وہ بقول آپ کے رطب و یابس کو بغیر چوں و چرا کے لکھ لیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ نعوذ باللہ، وہ بھی سب اس سازش میں شریک تھے، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ زہری پر کیا منحصر ہے، اس کے شاگرد بھی جو روایت کریں، چھوڑ دیجیے، معاملہ صاف ہے۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جان ست [1]

جرح پر نظر اور تعدیل سے انحراف:

جرح و تعدیل ایسا فن ہے جس میں جرأت، دیانت، احتیاط اور عدل و انصاف کی سخت ضرورت ہے، مولانا تمنا نے دیانت کا وعدہ تو کیا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسے ایفاء نہیں کیا، یعنی جرح کے پہلو کو تو لیا ہے، مگر تعدیل کو چھوا تک نہیں اور جرح بھی ایسے رنگ میں پیش کی ہے، جس میں احتیاط اور عدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

فرماتے ہیں: ''دونوں (سبیعی، اعمش) نے مل کر باہمی مشورے سے (غالباً) کچھ ایسے ایجنٹ پیدا کر لیے تھے، جو صرف انھی دونوں سے حدیثیں لے لے کر خراسان، نیشاپور، طبرستان اور شام و عراق و مصر کے دیہاتوں میں جا جا کر پھیلایا کرتے تھے۔'' (ص: ۲۷)

اور اس الزام پر میزان الاعتدال کا حوالہ پیش فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

''حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت معن بن عیسیٰ اور جوزجانی وغیرہ: ان دونوں سے بہت خفا تھے اور لوگوں سے کہتے تھے:

''أفسد حدیث أھل الکوفة أبو إسحاق السبیعي و أعمشکم ھذا.''

(میزان الاعتدال: ۱/ ۴۲۳)

افسوس یہ ہے کہ رجال کے بارے میں مولانا اتنے غیر محتاط، کثیر بیونت کے عادی اور ←

---

[1] آہستہ چل بلکہ نہ چل، تیرے قدم تلے ہزار جان ہے!

....

معنوی تحریف کے حامل ہیں کہ اس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔

میزان الاعتدال (۱/ ۳۴۵) میں جوزجانی کا مقولہ اس طرح مرقوم ہے:

" قال أبو إسحاق الجوزجاني كعوائده في فظاظة عبارته: كان من أهل الكوفة قوم لا يحمد الناس مذاهبهم، هم رؤوس محدثي أهل الكوفة مثل أبي إسحق و منصور وزبيد اليامي والأعمش وغيرهم من أقرانهم احتملهم الناس لصدق ألسنتهم في الحديث و توقفوا عند ما أرسلوا "

ناظرین خط کشیدہ عبارت پر خصوصیت سے غور کریں، صاحب میزان کہتے ہیں کہ جوزجانی اپنی سخت عادت کے ماتحت ایسے الفاظ کہہ رہے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا جوزجانی کی یہ جرح کس حد تک قابل قبول ہے؟ سو اس کے لئے حافظ ابن حجر صاحب **لسان المیزان** کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ فرمائیے:

"ومما ينبغي أن يتوقف في قبول قوله في الجرح من كان بينه وبين من جرحه عداوة سببها الاختلاف في الاعتقاد فإن الحاذق إذا تأمل ثلب أبي اسحاق الجوزجاني لأهل الكوفة رأى العجب، وذلك لشدة انحرافه في النصب، وشهرة أهلها بالتشيع، فتراه لا يتوقف في جرح من ذكره منهم بلسان ذلقة، و عبارة طلقة حتى إنه أخذ يلين مثل الأعمش وأبى نعيم وعبيدالله بن موسىٰ الخ " (لسان الميزان: ١/ ١٦)

''یعنی ایسے شخص کی جرح سے احتراز کرنا چاہیے، جو بوجہ عداوت کے ہو، سمجھدار آدمی جب جوزجانی کی اہل کوفہ کے متعلق جرح اور مثالب دیکھے گا، تو تعجب کرے گا، کیونکہ اس کو بوجہ ناصبی ہونے کے ان سے ایک طرح کی کد تھی، لہٰذا وہ اس کد کی بنا پر محدثین کوفہ کو مورد جرح ٹھہراتا۔''

دوسرا حوالہ مولانا نے **میزان الاعتدال** (۱/۴۲۳) کا دیا ہے، میزان کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:

....

← " قال الجوزجاني قال وهب بن زمعة المروزي سمعت ابن المبارك يقول: أفسد حديث أهل الكوفة أبو إسحاق والأعمش لكم "

اس جگہ بھی وہ جوز جانی ہے، جو اپنے مطلب کے لیے عبداللہ بن مبارک کا قول پیش کر رہا ہے، حالانکہ ابن المبارک کا مقصد وہ نہیں ہے، جس کو مولانا تمنا سمجھ رہے ہیں اور یوں تشہیر کر رہے ہیں، اصل چیز جو اعمش اور سبیعی میں ہے، وہ تدلیس ہے، جس کا ذکر میزان میں اس جگہ پر ہے، مگر مولانا تمنا کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اس کا بھی ذکر کریں، انھیں تو اپنے مطلب سے غرض ہے۔

سنئے! صاحب میزان خود فرماتے ہیں:

" أحد الأئمة الثقات عداده في صغار التابعين ما نقموا عليه إلا التدليس "

لفظ " أفسد " جس سے دھوکا دیا جاتا ہے، اس کے متعلق صاحب میزان کا بیان دیکھنے کے قابل ہے:

" كأنه عنى الرواية عمن جاء وإلا فالأعمش عدل، صادق، ثبت، صاحب سنة و قرآن، يحسن الظن بمن يحدثه ويروي عنه ولا يمكننا أن نقطع عليه بأنه علم ضعف ذلك الذى يدلسه فإن هذا حرام " (ميزان: ١/ ٤٢٣)

دوسرا عیب اعمش پر تشیع کا ہے، نہ کہ رفض کا، اور تشیع اس وقت یہی تھا کہ حضرت علی کو نسبتاً محبت وعقیدت کا مرکز ٹھہرایا جائے، اس میں روافض کا وہ غلو نہیں تھا، جو بعد میں پیدا ہوا۔ (تهذيب على التقريب: ٣)

اور اس سے تو شاید مولانا تمنا صاحب بھی نہ بچے ہوں گے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

"فهذا كثير في التابعين وأتباعهم مع الدين والورع والصدق" . الخ (لسان: ١/ ٩)

یہ حالت تو مولانا تمنا صاحب کے حوالہ جات کی تھی، اب ائمہ جرح وتعدیل کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

① علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (١/ ١٤٥) میں اعمش کو "شیخ الإسلام" کا لقب ←

....

← عطا فرمایا ہے۔

② صاحب خلاصہ نے فرمایا ہے: "أحد الأعلام الحفاظ"

(حاشیہ تذکرۃ الحفاظ: ۱۴۵)

③ ابن عیینہ فرماتے ہیں:

"كان الأعمش أقرأهم لكتاب الله وأحفظهم للحديث وأعلمهم بالفرائض"

④ فلاس کہتے ہیں: "كان الأعمش يسمى المصحف من صدقه"

⑤ یحییٰ قطان کا مقولہ ہے: "الأعمش علامة الإسلام"

⑥ ابن المدینی نے فرمایا ہے:

"حفظ العلم على أمة محمدﷺ ستة: عمرو بن دينار بمكة، والزهري بالمدينة وأبو اسحاق السبيعي، والأعمش بالكوفة" (تهذيب ٤/ ٢٢٣)

⑦ "وقال يحيىٰ بن معين: كان جرير إذا حدث عن الأعمش قال هذا الديباج الخسرواني!".

⑧ ابن معین نے فرمایا:

"الأعمش فقير صبور مجانب للسلطان ورع عالم بالقرآن"

⑨ سبیعی کے متعلق علامہ ذہبی نے "أحد الاعلام" فرمایا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۰۸)

اور امام احمد بن حنبل نے ثقہ قرار دیا ہے۔ (تهذيب: ٨/ ٦٤)

جمع قرآن میں مغالطہ دہی:

امت محمدیہ کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ قرآن مجید تئیس سال کی مدت میں حسب ضرورت نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، جو متفرق طور پر صحابہ کرام کے سینوں میں محفوظ اور کاغذوں، کھالوں، ہڈیوں وغیرہ پر لکھا جاتا تھا، جس کو سب سے پہلے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں حضرت زید بن ثابت (کاتب قرآن در عہد نبوی) سے لکھوایا، پھر عہد عثمانی میں متعدد نسخے لکھوائے گئے اور وہی قرآن اب تک متواتر دنیا میں موجود ہے، اس پر مجھے چنداں بحث کی ضرورت نہیں ہے، ←

....

کیونکہ اس پر امت محمدیہ کا اتفاق ہے۔

لیکن مولانا تمنا کا عقیدہ اور مذہب یہ ہے کہ قرآن مجید عہد نبوی میں مکمل طور پر ایک جلد کی شکل میں مدون تھا، عہد صدیقی و عہد عثمانی والا قصہ من گھرٹ ہے، فرماتے ہیں:

"یہ ام المومنین کے پاس ایک قرآن مرتب و مدون موجود تھا، یہاں تک کہ بعض کے کاتبوں کے نام بھی حدیث و رجال کی کتابوں میں مذکور ہیں، جیسے عمرو بن رافع، جو حضرت حفصہ کے مصحف کے کاتب تھے۔" (تهذيب : ٨/ ٣٣)

ابو یونس حضرت عائشہ صدیقہ کے مصحف کے کاتب تھے۔

(كتاب المصاحف ابن أبي شيبه : ٢،٢٢)

اور بعض صحابہ کتابت مصاحف کا مشغلہ رکھتے تھے، مثلاً حضرت ناجیہ الطفاوی وغیرہ

(استیعاب: ١/ ٣٠٦الخ) (البیان: ٢٢)

مولانا کی مندرجہ بالا محولہ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ حضرت حفصہ و حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کے پاس زمانہ نبوی میں قرآن مرتب و مدون تھا، اب سنئے! اصل حقیقت کیا ہے۔

پہلے عمرو بن رافع کی، جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے مصحف کے کاتب تھے، کیفیت ملاحظہ ہو۔

تہذیب کے اسی صفحہ پر، جس کا مولانا نے حوالہ دیا ہے، یہ الفاظ بھی ملتے ہیں: " ذكره ابن حبان في الثقات " سوال یہ ہے کہ اگر انھوں نے عہد نبوی میں قرآن لکھا تھا، تو ابن حبان کو توثیق کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیونکہ ثقہ ہونے کے لیے صحابہ کرام کا صحابی ہونا ہی کافی ہے۔

تقریب (ص: ۳۱۹) میں ہے: " عمرو بن رافع العدوي مولاهم مقبول من الرابعة "

"مقبول" کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ صحابی نہیں ہیں اور، پھر " من الرابعة "لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ یہ تابعی ہیں۔

ان کی روایت صحاح ستہ اور مسند احمد میں نہیں ہے، موطا امام مالک میں البتہ ان کی روایت آئی ہے إسعاف المبطا (ص: ٣٠) میں ہے:

....

← "عمرو بن رافع مولی عمر قال: "كنت أكتب مصحفا لأم المؤمنين حفصة" الحديث، وعنه زيد بن أسلم وأبو جعفر الباقر ونافع وثقه ابن حبان، وليست له رواية في الكتب الست ولا مسند أحمد."

اب حضرت حفصہ کے اس کاتب قرآن کی طرف آیئے، مؤطا امام مالک مع شرح تنویر الحوالک (۱/ ۱۵۸) باب الصلوة الوسطى میں ہے کہ عمرو بن رافع بیان کرتے ہیں، مجھ کو ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب تو آیت ﴿حافظوا على الصلوات﴾ پر پہنچو، تو مجھے آگاہ کرنا، جب میں اس آیت پر آیا، تو میں نے ام المؤمنین کو آگاہ کیا، آپ نے مجھے یہ آیت اس طرح لکھوائی: " حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطىٰ صلوة العصر وقوموا لله قانتين "

ناظرین خط کشیدہ عبارت کو غور سے دیکھیں اور مولانا تمنا کی تحقیق کی داد دیں، کیا مولانا چاہتے ہیں کہ قرآن میں بھی اضافے ہوں؟

مولانا نے تہذیب کا حوالہ دیا ہے، تاکہ اصل حقیقت پر سے پردہ نہ ہٹ جائے، جب یہ اصل روایت مؤطا امام مالک میں موجود ہے، تو تہذیب کے حوالہ کی ضرورت کیا تھی؟

مطلب یہ تھا کہ اگر اصل کتاب کا حوالہ دیا جائے، تو قلعی کھلتی ہے اور بھید ظاہر ہوتا ہے!!

دوسرا کاتب ابو یونس مصحف عائشہ رضی اللہ عنہا کا کاتب ہے، اس کا حوالہ مولانا تمنا نے ابن أبي شيبه کا دیا ہے، غرض صاف ہے کہ نہ ابن أبي شيبه کسی کے پاس ہوگی اور نہ ہی کوئی اصل حقیقت سے واقف ہوگا، حالانکہ ابو یونس کا ذکر مؤطا امام مالک مع تنوير الحوالك (۱/ ۱۵۸) وترمذی مع تحفة الأحوذي (۴/ ۷۶) ونسائی (۱/ ۸۲) اور ایک جگہ صحیح مسلم میں بھی آیا ہے اور تهذيب التهذيب (۱۲/ ۲۸۳، ۲۸۴) میں بھی اس کا ذکر ہے اور تمام کتابوں میں عبارت وہی ہے جو مؤطا کے حوالے سے پہلے لکھی جا چکی ہے اور وہ مولانا تمنا کے مقصد خاص کے خلاف ہے۔

تعجب ہے کہ دولابی نے کتاب الکنیٰ میں ابو یونس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے اس ←

....

کا نام ذکر کیا ہے، صرف کنیت ہی سے بیان کیا ہے، اگر کسی صاحب کے علم میں یہ بات آئی ہو، تو بیان فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں۔

تیسرا کاتب قرآن جس کا ذکر مولانا نے استیعاب کے حوالے سے ذکر کیا ہے، اس کی بابت عرض ہے کہ صاحب استیعاب نے اسے صاحب الوحدان سے ذکر کیا ہے اور صحابی گردانا ہے، دوسری کتب اس پر خاموش ہیں، لیکن ہم مانتے ہیں کہ حضرت ناجیہ طفاوی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور وہ مصحف لکھا کرتے تھے، مگر اس کی تصریح کہاں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کتابت قرآن کا مشغلہ فرماتے تھے؟

حافظ ابن حجر نے جو تعداد کاتبوں کی ذکر کی ہے، وہ یہ ہے، حافظ صاحب رحمہ اللہ تحت حدیث زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" وممن كتب له في الجملة: الخلفاء الأربعة والزبير بن العوام وخالد وأبان ابنا سعيد بن العاص بن أمية وحنظلة بن الربيع الأسدی ومعيقيب بن أبي فاطمة وعبد الله بن الأرقم الزهري وشرحبيل بن حسنة وعبدالله بن رواحة في آخرين "

(فتح الباري :۹/ ۲۸ مصری)

حدیث زہری:

بخاری کی باب جمع القرآن والی پہلی روایت پر مولانا تمنا کا بڑا زور ہے، پہلے تو باب میں داخل فرمایا ہے، پھر اس پر بحث کرتے ہیں، لہٰذا ان کی اصل عبارت پیش کی جاتی ہے، تاکہ ناظرین اندازہ لگائیں کہ اس میں کتنی صداقت ہے؟ فرماتے ہیں:

"عبید بن سباق سے روایت کرنے والے بہتیرے تھے، مگر عبید نے جمع قرآن کی روایت زہری سے بیان کی، اس لئے کہ یہ ہر رطب ویابس روایت کو لکھ لیتے اور کوئی چون و چرا نہیں کرتے، زہری کے ہزاروں شاگرد تھے،[1] امام مالک، عمر بن عبدالعزیز، عمرو بن دینار، صالح بن کیسان، اوزاعی، ابن ابی ذئب، ابن عیینہ وغیرہم، مگر زہری نے جمع قرآن کی روایت کے لیے صرف چار شخصوں کو منتخب کیا، ایک تو اپنے کاتب کو، جو ان

[1] زہری کی توثیق کے لیے یہی کافی ہے۔ (لائل پوری)

کے ہم وطن اور کاتب گویا پرائیویٹ سیکرٹری یعنی شعیب بن ابی حمزہ، مگر ان سے بھی صرف ایک ہی شخص ابوالیمان روایت کرتے ہیں، جن کا ان سے سماع حدیث مشتبہ ہے، تہذیب التہذیب ترجمہ ابو الیمان ، دوسرے ابراہیم بن سعد ہیں جن کے متعلق تہذیب التہذیب ترجمہ زہری [1] میں ہے کہ ان کی حدیثیں زہری سے کچھ یوں ہی سی ہیں، کیونکہ یہ زہری کی وفات کے وقت کم سن تھے، زہری سے سماع حدیث کا وقت نہیں پایا، تیسرے یونس بن یزید تھے، جو زہری کے ہم وطن تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے غلام آزاد کردہ تھے، امام احمد بن حنبل نے ان کو زہری ہی کی حدیثوں میں خصوصیت کے ساتھ منکر حدیثیں روایت کرنے والا لکھا ہے، دیکھو: تہذیب التہذیب آخر جلد، ترجمہ یونس بن یزید، اب صرف ایک رہ گئے: عبدالرحمٰن بن خالد، یہ شیعوں کے ہاں ثقہ ہیں اور سنّیوں کے ہاں منکر الحدیث، دیکھو: تہذیب التہذیب، بس یہی چار ہیں جو اس حدیث جمع قرآن کو صرف زہری سے روایت کرتے ہیں، شعیب سے صرف ابو الیمان اپنی سماعت بیان کرتے ہیں اور عبدالرحمٰن بن خالد سے صرف لیث بن سعد روایت کرتے ہیں، اور یونس سے صرف یہی لیث اور عثمان بن عمرو اور ابراہیم بن سعد سے ان کے بیٹے یعقوب اور دو شخص اور موسیٰ بن اسماعیل اور ابو ثابت اور یہ چھ راوی امام بخاری سے کہتے ہیں، بس یہی سلسلہ روایت ہے جمع قرآن بعہد صدیقی کی داستان کا، امام بخاری سے اوپر چھ راوی اور ان چھ سے اوپر چار، چاہے وہ چار کیسے ہی ہوں، ان چھ اور چار کو سب دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اتنے لوگ روایت کر رہے ہیں، مگر اس کو نہیں دیکھتے کہ ان کے چار کے اوپر تو صرف اور تنہا ابن شہاب زہری ہیں اور زہری سے اوپر تنہا عبید بن سباق، اور عبید سے اوپر زید بن ثابت اور عبید بن سباق نے زید بن ثابت کو کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا، مگر اس حدیث پر ایسا ایمان ہے کہ اگر کوئی انکار کرے تو عجب کیا کہ فوراً کفر کا فتویٰ دے دیا جائے!'' (البیان: ۲۸، ۲۹)

مولانا کا نقشہ روایت یوں بنتا ہے:

[1] ترجمہ زہری میں نہیں، بلکہ ترجمہ ابراہیم بن سعد میں۔ (لائل پوری)

....

←

زید بن ثابت
عبید
زہری
عبدالرحمٰن — لیث — امام بخاری
یونس — لیث، عثمان — امام بخاری
ابراہیم — یعقوب، موسیٰ، ابوثابت — امام بخاری
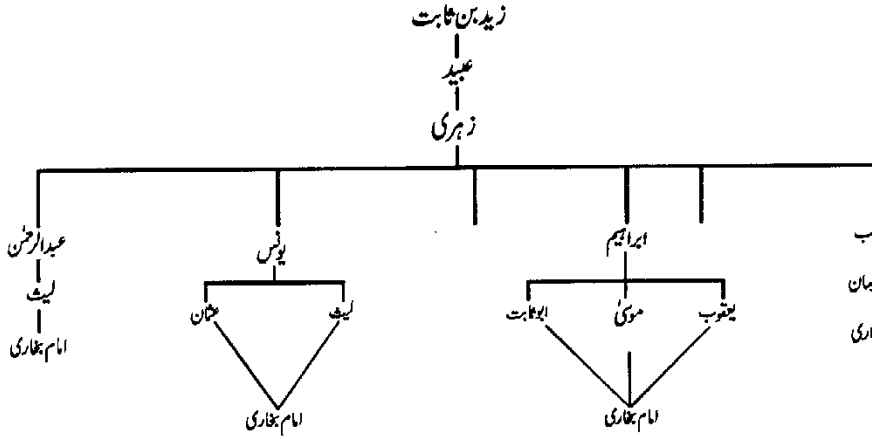
اب ناظرین کے سامنے میں اپنا نقشہ مع حوالجات پیش کرتا ہوں، پھر بعدہ مولانا کی جرح کو اٹھاؤں گا۔ انشاءاللہ
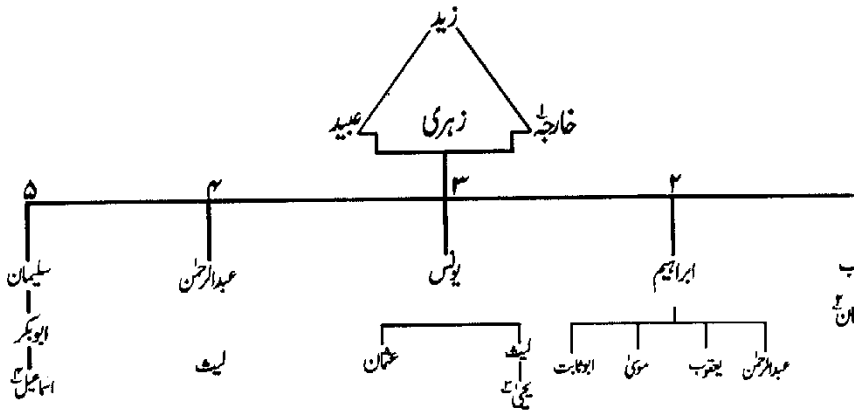
نمبر پانچ میں محمد، زہری سے، زہری خارجہ اور خارجہ اپنے باپ زید بن ثابت سے روایت ←

❶ فتح (٦/ ١٨) ❷ ترمذی مع شرح (٤/ ١٢٢) ❸ فتح، مصری (١٣/ ٣٥٣) ❹ فتح (٦/ ١٨) منه

کرتا ہے، نمبر ۱، ۳، ۴ میں "عبید أن زید بن ثابت حدثه" بیان کرتا ہے اور نمبر ۴ میں ابو ثابت عبید سے عن زیاد بن ثابت بیان کرتا ہے [1]، اس نقشہ میں زہری کے پانچ شاگرد ہیں اور ان پانچ کے آٹھ شاگرد ہیں، تتبع کتب سے اور بھی مل سکتے ہیں، میں مولانا سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا چار اور چھ میں حصر کرنا کیا ہوا؟ اور پھر اس روایت کو بخاری نے تقریباً پانچ جگہ بیان کیا ہے، کتاب الجهاد میں، کتاب التفسیر میں، کتاب الفضائل میں، **کتاب الأحکام** میں، کتاب التوحید میں، باوجود پانچ جگہ ذکر ہونے کے ان کا مضحکہ خیز دعویٰ اور پھر یقین کے ساتھ دعویٰ بھی ہے کہ اس کو باب جمع القرآن میں کسی نے داخل کر دیا ہے، اصل بخاری میں نہیں ہے، صرف یہی دلیل مولانا کے دعویٰ کی تردید کے لئے کافی ہے، لیکن صرف اسی پر بس نہیں ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں، ترمذی نے اپنی سنن میں، امام نسائی نے کتاب فضائل القرآن میں بھی اس کو ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو: عینی اور تحفۃ الاحوذی۔

تنقید کا جواب:

اول تو زہری کو لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ نہ مدنی ہیں اور نہ ہی زہرہ قبیلے سے ہیں، ان کا آبائی وطن ایلہ تھا اور یہ بنی زہرہ کے موالی ہیں اور دعویٰ پر دلیل کتاب جمع القرآن کو پیش کیا ہے، جہاں تک کتب حدیث اور کتب اسماء الرجال کا تعلق ہے، اس میں ان کو مدنی کہا گیا ہے اور زہری کا لقب بھی دلیل ہے کہ موالی بنی زہرہ نہیں، بلکہ آزاد ہیں، ان کا نسب نامہ حسب ذیل ہے:

" محمد بن مسلم بن عبيدالله بن عبدالله بن شهاب بن عبدالله بن الحارث بن زهرة بن كلاب بن مرة القرشي الزهري " (تهذيب :۹/ ٤٤٥)

مولانا کو چاہیے کہ اپنے دلائل قاطعہ کو پیش کریں، تاکہ ہم بھی مستفید ہوں، پھر زہری پر جرح کی ہے، اسماء الرجال کی جتنی کتب ہیں، ان سب میں ان کو امام الحدیث لکھا ہے، میں اگر صرف ان کی توثیق کے متعلق حوالے درج کروں، تو کم از کم چار صفحے درکار ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

" اتفقوا على إتقانه وإمامته "

[1] فتح (۱۳/ ۱۵٦) منه

(فتح الباری: ۱/ ۱۸ مصری، تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۱۰۲ اور تہذیب ۹/ ٤٤٥)

سب سے بڑا تیر جو مولانا اپنے ترکش میں زہری کے خلاف رکھتے ہیں، وہ "یکتب کلما سمع الخ" ہے، حالانکہ "کلما سمع" کا مطلب اس کے آگے ہی کھل جاتا ہے کہ انساب، حدیث، تفسیر، تاریخ، فرائض، مولدات، وفیات وغیرہ، یہ جرح نہیں بلکہ زہری کی توثیق ہے کہ یہ ہر فن میں ماہر تھے۔

آگے باری آتی ہے شعیب کی، اس کو مولانا زہری کا ہم وطن اور نئی افرنگی تہذیب میں ''پرائیویٹ سیکرٹری'' فرماتے ہیں، گویا ایک قسم کی توہین ہے، بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں کی سازش تھی جس سے یہ حدیث گھڑی گئی، لفظ ''پرائیویٹ'' کو غور سے دیکھو۔ اب ذرا ان کا حال حفاظ کی زبان سے سنئے: " ثقه متفق عليه أثنیٰ عليه الأئمة كان أصح حديثا عن الزهري وغيره "(تهذيب: ٤/ ٣٥٠)

علامہ ذہبی **تذکرۃ الحفاظ** (۱/ ۲۰۵) میں فرماتے ہیں: " الإمام الحجة المتقن "

امام زہری کی املاء پر انھوں نے خلیفہ ہشام کو کچھ حدیثیں لکھ دیں تھیں، **تذکرۃ الحفاظ** میں ہے: " كان مليح الضبط أنيق الخط " جس سے مولانا تمنا نے جان بوجھ کر ان کو پرائیویٹ سیکرٹری ٹھہرا دیا اور دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے، وہ صرف دیانت سے لکھا ہے۔ یا للعجب!

پھر فرماتے ہیں: ابو الیمان کا سماع شعیب سے مشتبہ ہے، اور حوالہ دیا ہے کہی کا، جو **تہذیب** (**جلد ۱۲**) ہے، حالانکہ ابو الیمان کا نام حکم بن نافع ہے اور ان کا ترجمہ **تہذیب** (۲/ ۴۴) میں ہے اور اس میں اس کو شعیب کا شاگرد کہا ہے، بخاری اور مسلم، امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ذہلی، ابوزرعہ کا استاد ہے، **تذکرۃ الحفاظ** (۲/ ۳۷۲) اور علامہ ذہبی نے اس کی بہت تعریف کی ہے، لیکن حضرت تمنا ہیں کہ صرف مسئلہ کا ایک ہی پہلو دیکھتے ہیں، اس پر دعویٰ ہے، دیانت کا اور احقاق حق کا۔ سبحان اللّٰہ !!

دوسری سند میں مولانا نے ابراہیم بن سعد کو مورد جرح گردان کر خوب داد دی ہے اور تلقین کی ہے کہ اس کا ترجمہ زہری کے ترجمہ میں دیکھو، ہم نے تہذیب کا وہ صفحہ، جو مولانا نے بیان

کیا، خوب غور سے دیکھا، لیکن ہم کامیاب نہ ہوئے، اصل میں ابراہیم مذکور کا ترجمہ "تهذیب: ۱/ ۱۲۱" میں ہے، نہ کہ ترجمہ زہری میں، جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں اور پھر تعجب یہ ہے کہ دعویٰ دیانت کا ہے!

اصل عبارت یہ ہے:

"قال صالح بن جزرة: حديثه عن الزهري ليس بذاك لأنه كان صغيرا حين سمع من الزهري"

یہ جرح ہے، جس پر مولانا کو ناز ہے!!

اب دیکھنا یہ ہے کہ زہری کس سن میں فوت ہوئے اور ابراہیم کس سن میں پیدا ہوئے؟ زہری کا سن وفات ۱۲۵ھ ہے اور ابراہیم کا سن ولادت ۱۰۸ھ ہے، یعنی زہری کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی، جو حافظ صالح جزرہ کے نزدیک صغرسنی کی عمر ہے، حالانکہ بلوغ ۱۴ تا ۱۵ سال تک معتبر ہے، یعنی یہ کوئی جرح نہیں ہے اور پھر ہم اہلحدیث پر یہ کوئی بڑی جرح نہیں، کیونکہ ہم تو چھ سال کے لڑکے کے پیچھے نماز جائز سمجھتے ہیں اور بلوغ کا معیار ہمارے ہاں یہ ہے کہ قوائے عقلی و نفسی مکمل ہو جائیں اور ظاہر ہے یہ عمر سے متعلق نہیں ذہن سے ہے، زیادہ تحقیق منظور ہو، تو بخاری میں "باب متى يصح سماع الصغير" کو دیکھ لیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ پر حدیث حجت ہی نہیں، آپ صرف قرآن کو سند فرماتے ہیں، حدیث کچھ نہیں!

لہٰذا عرض ہے کہ قرآن کی آیت ﴿ فلما بلغ معه السعی ﴾ کو دیکھ لیں اور لفظ "السعی" سے بلوغت کی عمر نکال لیں۔ فهو المراد!

تیسرے زہری کے شاگرد یونس بن یزید ہیں، مولانا نے تہذیب سے امام احمد بن حنبل کی جرح نقل کی ہے، لیکن خیانت سے کام لیا ہے، تہذیب کی اصل عبارت یہ ہے:

"في حديث يونس عن الزهري منكرات منها عن سالم عن أبيه فيما سقت السماء العشر الخ" (تهذيب: ۱۱/ ۴۵۱)

اس کے ساتھ ہی فضل بن زیاد نے امام احمد سے ثقہ لکھا ہے اور پھر اسی کی توثیق کئی ایک ائمہ حدیث و ائمہ جرح و تعدیل نے کی ہے، منکرات سے مراد وہ منکرات ہیں، جن کو احمد کی چند

شمار کردہ منکرات کہنا چاہیے، چونکہ امام بخاری کی شروط سخت ہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ یونس کی منکرات نہیں لاتے اور پھر یونس کے ساتھ ان کے چار ساتھی اور ہیں، جس سے درجہ بلند اور ارفع ہوجاتا ہے۔

چوتھے شاگرد عبدالرحمن بن خالد ہیں، جن کو آنجناب نے مشتبہ ٹھہرایا ہے، حالانکہ ان کے ترجمہ یعنی ترجمہ عبدالرحمن بن خالد بن مسافر الفہمی میں کوئی شیعہ سنی کا ذکر تک نہیں، دیکھیے: تھذیب (٦/ ١٤٥، ١٤٦) جس لفظ سے جناب کو شک پڑا ہے، وہ " عندھم من أھل الصدق " میں " عندھم " ہے اور اس سے محدثین مراد ہیں نہ کہ شیعہ۔ فافھم!

باقی جو ان چاروں کے شاگرد ہیں، جن کی تعداد مولانا نے چھ بتلائی ہے، ان کو نہیں چھیڑا، لہٰذا ہم بھی چپ رہتے ہیں، لیکن یہ عرض کیے بغیر نہیں رہتے کہ مولانا: إن عدتم عدنا ولدینا مزید!

آگے فرماتے ہیں: زہری کا ایک استاد صرف عبید ہے، حالانکہ ہم نے اپنے نقشہ میں عبید کے ساتھ خارجہ بن زید کو بھی بخاری سے ثابت کیا ہے، جس سے مولانا کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا، اب ایک گنجائش رہ جاتی ہے کہ خارجہ کو واقعہ جمع قرآن درعہد عثمانی کے ساتھ ملا کر اس کا تعلق عبید سے توڑا جائے، لیکن اس کے متعلق ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان سن لیجیے، کتاب فضائل القرآن تالیف شیخ عماد الدین ابن کثیر (ص: ٢٢) میں ہے:

" إنما ھذا کان حال جمع الصدیق المصحف کما جاء مصرحاً به في غیر ھذه الروایة عن الزھري عن عبید بن السباق عن زید بن ثابت "

ناظرین جن دو حدیثوں کو مولانا نے خارج از بخاری بتا کر بالکل جھوٹا ثابت کرنا چاہا تھا، اس کو آپ نے ملاحظہ فرما دیا، اب ایک اور حدیث کو میری طرف سے شرف ملاحظہ فرما کر اپنی تحقیق میں اضافہ اور مولانا تمنا کی کوشش بے کار پر صد آفریں کہیں، تفسیر إتقان (١/ ٥٧) میں ہے:

"أخرج ابن أبي داود في المصاحف بسند حسن عن عبد خیر قال سمعت علیا یقول أعظم الناس في المصاحف أجراً أبوبکر رحمة اللّٰه علی أبي بکر ھو أول من جمع کتاب اللّٰه، وفي فضائل القرآن لابن کثیر أن أبا بکر کان أول من جمع القرآن بین اللوحین، ھذا إسناد صحیح "

← یہ حدیث فتح (۹/ ۹ مصری) اور فضائل القرآن لابن کثیر (۱۲) پر بھی موجود ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو صحیح ثابت کیا ہے۔ مولانا تمنا سے استدعا ہے کہ اس پر بھی کچھ نظر کرم فرمائیں!

بخاری پر اعتراض:

ان چاروں راویوں پر جرح درحقیقت امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض ہے، سو اس کی بابت عرض ہے کہ ہمارا عقیدہ بخاری رحمہ اللہ کے متعلق یہ ہے کہ "نظر البخاري أدق من أن يعترض عليه" (فتح: ۱/ ۱۴۲ مصری) "وأنه خلق للحديث" اور ہم عقیدت کی بنا پر ہی نہیں، بلکہ حمایت دین اور حفاظت حدیث کی خاطر آپ کے ہر بیان کو تحقیق کی کسوٹی پر کسیں گے: ﴿ليهلك من هلك عن بينة ويحيىٰ من حيىٰ عن بينة﴾

ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں: "آج میری تنقیدوں سے اتنی مدت کے بعد کتنے راویان حدیث کا کذب و افتراء شارع عام پر آ رہا ہے اور کتنی ایسی حدیثیں، جن پر مدت سے لوگوں کا ایمان تھا، آج بداہتاً جھوٹی ثابت ہو رہی ہیں۔" (البیان: ۴۵)

مولانا ذرا اپنی تنقید پر میری تنقید بھی ملاحظہ فرمالیں، تاکہ مطلع صاف ہو جائے، تعجب ہے کہ آپ حدیث کو ظن کہہ کر ادبی نکتے بیان کرتے ہیں اور آپ بابِ تنقید میں صرف ظن کو استعمال کر رہے ہیں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ مولانا نے جس طرح حوالجات میں مغالطہ دہی سے کام لیا ہے، وہ آپ ہی کا کام تھا، لہٰذا اس کو سوءِ ظن کہنا چاہیے۔ وإن الظن لا يغني من الحق شيئاً!

ایک جگہ فرماتے ہیں: "ایسی حدیث جس کو تمنا جیسا جاہل شخص اس چودھویں صدی کے آواخر میں کذب و افتراء اتنی وضاحت کے ساتھ ثابت کر دے۔" (البیان: ۸۳)

جاہل شخص کا لقب مبارک ہو! لیکن معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح خدا نے آپ سے علم حدیث کا تعلق و شغف چھین لیا ہے، اسی طرح آپ کی قرآنی بصیرت بھی جواب دی چکی ہے، ملاحظہ ہو: ﴿أعوذ بالله أن أكون من الجاهلين﴾ (بقرہ) سچ ہے: من جهل شيئاً عاداه!

آپ حدیث سے نابلد ہیں، لہٰذا تنقید ہو رہی ہے اور وہ بھی صرف جہالت کی بنا پر اور ←

....

← عداوت کے ماتحت اور اس پر اگر کوئی دل جلا یہ شعر پڑھ دے تو ناراضگی معاف!

ألا لا يجهلن أحد علينا
فنجهل فوق جهل الجاهلينا ❶

مضمون طویل ضرور ہوگیا ہے جو آج کل کے مذاق کے واقعی خلاف ہے لیکن جب آپ مولانا تمنا کا مضمون اٹھائیس صفحوں پر پھیلا ہوا پائیں گے، تو تطویل مضمون ھذا ملول خاطر نہ ہوگی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ❷

(والسلام)

---

❶ ہمارے خلاف کوئی بے وقوفی کا مظاہرہ نہ کرے، ورنہ ہم بے وقوفوں کی بے وقوفی سے بھی بڑھ کر بے وقوفی کا مظاہرہ کریں گے! ❷ گفتگو مزیدار تھی، اس لئے طویل ہوگئی۔

واقعہ افک کے متعلق نئی تمنائی ریسرچ

''طلوع اسلام'' (اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء) کے شمارے میں تمنا عمادی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے تحریر کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے متعلق صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث افک موضوع اور عجمی سازش کی پیداوار ہے، چنانچہ انھی اوہام کے ازالے میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا مضمون رقم فرمایا۔

سب سے پہلے یہ مضمون ہفت روزہ ''الاعتصام'' (۲۶ فروری ۱۹۶۵ء) کی پانچ اقساط میں شائع ہوا اور بعد ازاں اس تحقیقی مقالہ کے محرک اول مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے حسب خواہش محترم ضیاء اللہ کھوکھر صاحب نے اسے ''واقعہ افک'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں ادارہ ندوۃ المحدثین کے زیر اہتمام کتابی شکل میں طبع کیا۔ جزاهم الله خير الجزاء!

واقعہ افک کے متعلق نئی تمنائی ریسرچ

تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں

چند دن ہوئے ایک دوست نے ''طلوع اسلام'' اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء کا مجموعی نمبر ارسال فرمایا، اس میں ''مولانا'' تمنا عمادی کا ایک مضمون حدیث افک کے متعلق مرقوم ہے، عمادی صاحب کا خیال ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، یہ عجمی سازش کی پیداوار ہے، باوجودیکہ یہ حدیث، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داود، ترمذی، نسائی، مسند احمد، ابوعوانہ، مسند بزار اور مستند دواوین حدیث میں منقول ہے، لیکن عمادی صاحب کو اصرار ہے کہ یہ حدیث [1] متواتر بھی ہو، تو بھی وہ اسے موضوع ہی فرمائیں گے۔ علم کا زور ہے، حضرات ''علماء'' جب کرنے پر آئیں، تو وہ حق کو باطل اور باطل کو ایک لمحہ میں حق کہہ سکتے ہیں!

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!

آج سے پہلے متواترات کا انکار یا انھیں ظنیات کا ہم مرتبہ کہنا صرف فرقہ سمنیہ کا خیال تھا، اب یہ مدعیان قرآن سمنیہ کی صفوں میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ فرقہ سمنیہ براہمنوں سے ملتا جلتا ہے، قدرت کی نیرنگی ملاحظہ ہو، براہمنوں کو تائید

---

[1] طلوع اسلام: ۴۲، بابت اگست و ستمبر ۱۹۶۴ء (مؤلف)

کے لیے چودھویں صدی کے گندم نما جوفروش مل گئے، جو قرآن کی آڑ لے کر تواتر اور عقل کو بھی خیر آباد کہہ رہے ہیں!

مضمون کے تین حصے:

پیش نظر مضمون کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں:

1. حدیث پر روایتاً بحث۔
2. درایتاً بحث۔
3. طلوع اسلام کا ضمیمہ۔

فن حدیث سے مولانا عمادی صاحب کافی حد تک بے خبر ہیں، وہ نہ محدّث کی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اہل سنت کی شرائط کا کوئی خاکہ ان کی نظر میں ہے۔

غزوہ بنی مصطلق کی تاریخ:

اس حصہ میں کہ غزوہ بنی المصطلق کس سنہ میں ہوا؟ اختلاف ہے، امام بخاری رحمہ اللہ محدّث ہیں، اخباری نہیں، بخاری کی شرائط کا تعلق احادیث سے ہے، تاریخی نظریات پر محاکمہ کتاب کے موضوع سے خارج ہے، "أصح الکتب" حدیث کی حد تک ہے، اجتہادات یا تاریخی اختلافات کا فیصلہ امام نے اپنے ذمہ نہیں لیا، عمادی صاحب نے یہاں اپنا اور ناظرین کا وقت ضائع فرمایا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے غزوہ بنی المصطلق کے متعلق دو قول باحوالہ نقل کیے ہیں،[1] غلطی کے امکان کے باوجود ناقل پر صرف صحت نقل کی ذمہ داری ہو سکتی ہے۔ ابن خلدون رحمہ اللہ جیسے تاریخ کے امام نے بھی اسے ۵ھ کے حوادث میں ذکر کیا ہے:

---

[1] صحیح البخاري (۷/ ۴۳۰، مع الفتح)

" وأقام رسول الله ﷺ إلى شعبان من هذه السنة السادسة ثم غزا بني المصطلق من خزاعة " (ابن خلدون: ۲/ ۷۸۱، طبع لبنان)

آنحضرت ﷺ شعبان ۶ھ تک مدینہ منورہ میں اقامت پذیر رہے، پھر غزوہ بنی المصطلق کے لیے تشریف لے گئے۔

بظاہر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ ۵ھ میں ہوا، لیکن اس سے بخاری کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑتا، ام رومان رضی اللہ عنہا کے انتقال کی تاریخ میں بھی اسی طرح اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ ام رومان کا انتقال ۴ھ میں ہوا۔ [1]

أوهام الثقات:

ماہرین فن جانتے ہیں غلطی کا امکان ہر مقام پر ہوسکتا ہے، ثقہ راوی اور بڑے بڑے حفاظ سے اوہام ہو سکتے ہیں، [2] شریک بن عبداللہ کی روایت میں، جو معراج نبوی کے متعلق مروی ہے، باتفاق ائمہ حدیث اوہام موجود ہیں۔ [3]

---

[1] الإصابة (۸/ ۲۰۸) بعدازاں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے۔

[2] چنانچہ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کون ہے جو وہم سے بچ سکا ہے؟''

ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' مجھے اس سے تعجب نہیں ہوتا جو حدیث بیان کرتا ہے تو غلطی کرتا ہے، بلکہ تعجب اس شخص پر ہوتا ہے، جو حدیث بیان کرتا ہے اور درست ہی بیان کرتا ہے!''

ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس طرح کی جرح میں بھی توقف کرنا چاہیے کہ جب کسی آدمی پر صرف اس بنا پر جرح کی جائے کہ اس نے کسی حدیث میں غلطی کی ہے یا وہ وہم کا شکار ہوا ہے یا وہ کسی روایت میں منفرد ہے، تو یہ کوئی مستقل جرح نہیں اور نہ ہی اس بنیاد پر اس کی حدیث رد کی جائے گی۔'' (لسان المیزان: ۱/ ۱۷)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: فتح الباري (۱۳/ ۴۸۰)

حضرت ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے لئے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی درخواست راوی کا وہم ہے۔[1] اندرون کعبہ نماز کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نفی وہم ہے۔[2]

صحیحین کی صحت انسانی مساعی کا شاہکار ہے، ائمہ کے استدراکات کے باوجود دنیائے علم کو اسے "أصح الکتب بعد کتاب اللّٰه "علی رغم الأعداء ماننا پڑا!

اسی طرح "حدیث إفک" میں ہوسکتا ہے سعد بن معاذ کا تذکرہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہو، میں یہ بہ طریق تنزل عرض کر رہا ہوں، ورنہ غزوہ بنی المصطلق اگر ۵ھ میں ہو، تو واقعات کا انطباق ممکن ہے، لیکن تمنا صاحب کی اس بے ضرورت اور غلط بحث کو قبول کرتے ہوئے بھی میں صحیح بخاری کی صحت کو محفوظ سمجھتا ہوں اور "حدیث إفک" کے وضع پر اس سے استدلال تمنائی ہفوات سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا!

کسی واقعہ کی تاریخ میں اگر اختلاف ہو جائے، تو اس سے اصل واقعہ کا انکار عقلمندی کا تقاضا نہیں، تاریخ اور رجال کی کتابیں ایسے اختلافات سے بھری پڑی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے، معراج کی تاریخ کے تعین میں اختلاف ہے، روزہ، زکوۃ اور حج کے اوقات فرضیت میں اختلاف ہے، کیا اس اختلاف کی بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود اور باقی حوادث کا کلی طور پر انکار کر دیا جائے؟ ممکن ہے اہل قرآن کے عقلاء کو اس پر اصرار ہو، دنیا کے دانش مند تو یہ اصل قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے تمنا صاحب کی بحث کا یہ حصہ لا حاصل اور بے سود ہے، یہ اختلافات نہ ہوں، تو علمی مباحث اور اہل علم کی محنت اور کاوش کی ضرورت ہی نہ رہے، جہاں کسی معاملہ میں جزوی اختلاف ہوا، واقعہ کا انکار کر دیا اور چھٹی ہوئی!

ایسے بے سود مباحث کو بے ضرورت طول دینے میں غالباً تمنا صاحب کو مرزا

---

[1] دیکھیں: صحیح مسلم مع شرح النووي (۱۶/ ۶۲)

[2] دیکھیں: فتح الباري (۳/۴۶۳، ۴۶۸)

غلام احمد صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہے، مرزا صاحب تکرار سے اذہان میں تشویش پیدا کر دیتے تھے، یہی عمادی صاحب کا کام ہے!

عمادی صاحب نے ''طلوع اسلام'' میں ایک دفعہ امام زہری کے متعلق لکھا تھا کہ یہ عجمی ہیں اور موضوع اور غلط روایات کرنا ان کی عادت ہے، اس کا جواب اسی وقت پوری تفصیل سے ''الاعتصام'' میں دے دیا گیا تھا۔

(ملاحظہ ہو: الاعتصام: ٦ اپریل ١٩٥١ء)

"حدیث إفک" میں کوفے اور بصرے اور قاتلان عثمان کا تذکرہ تاریخی بدحواسی ہے اور ایک جذباتی انداز، چونکہ حدیث کی وضع وتخلیق کے معاملہ میں شیعہ حضرات کافی بدنام ہیں اور ان کے ہاں تقیّہ کی بے اعتدالی نے جھوٹ کے لیے شرعاً بھی کچھ وجہ جواز پیدا کر دی ہے، عمادی صاحب افک پر بحث فرماتے ہوئے ان جذبات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، ورنہ "حدیث إفک" اتنی اسانید سے مروی ہے کہ وہاں کوفے یا بصرے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہاں مدنی اور شامی حضرات بھی کافی ہیں۔

حدیث افک اور امام زہری رحمہ اللہ:

عمادی صاحب نے مضمون کے آغاز میں ایک عجیب ڈینگ ماری ہے، جس سے غرض یہ اثر دینا ہے کہ عمادی صاحب نے "حدیث إفک" کی ساری اسانید پر عمیق نظر کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے، حالانکہ اس کی حیثیت ایک تُک اور ڈینگ سے زیادہ نہیں۔ محترم عمادی صاحب فنِ حدیث سے ناواقف ہیں، کتب رجال کے متعلق ان کا ذوق ائمہ سنت اور اہل فن سے بالکل مختلف ہے، عمادی صاحب فرماتے ہیں:

''اس واقعہ مکذوبہ کے متعلق جتنی روایتیں خصوصاً آپ کو صحاح میں ملیں گی، وہ

سب کی سب ابن شہاب زہری ہی سے ملیں گی اور ابن شہاب زہری کا حال میں پوری تفصیل کے ساتھ "طلوع اسلام" میں لکھ چکا ہوں، وہ منافقین و کذابین کے نادانستہ ہی سہی مگر مستقل ایجنٹ بنے ہوئے تھے۔"

(طلوع اسلام: ۳۳، اگست ستمبر ۱۹۶۴ء)

ان سطور میں عمادی صاحب نے کئی دعوے کئے ہیں:

1. قصہ افک کی تمام روایات زہری سے ہی مروی ہیں۔
2. یہ سب روایات مکذوبہ ہیں۔
3. زہری منافقین اور کذابین کے ایجنٹ ہیں۔

عمادی صاحب نے بڑی عنایت فرمائی کہ انھوں نے امام زہری رحمہ اللہ کو منافقین اور کذابین کا ایجنٹ فرمایا، اگر عمادی صاحب اپنی اردو عبارت کو سمجھ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام زہری رحمہ اللہ خود نہ جھوٹے ہیں نہ منافق، بلکہ نا دانستہ طور پر ان کے پاس کذب اور نفاق کی صرف ایجنسی ہے، مگر پورے مضمون میں نفاق اور جھوٹ کے اصل مالک اور تاجر کا عمادی صاحب پتہ نہیں دے سکے، کوفے بصرے اور قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ایسے مبہم یا مجمل دعاوی سے کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا۔ آپ کا دراصل ایک فوج داری کیس ہے، جو آپ کسی پارٹی کے خلاف علم و دیانت کی عدالت میں پیش کر رہے ہیں، مگر اصل مدعی علیہ کا پتہ نہیں دیتے، اس لیے آپ کا یہ مضمون بالکل بے کار اور بے سود ہے، زہری رحمہ اللہ تو بچارے دانستہ یا نادانستہ ایجنٹ ٹھہرے، آپ کے ذمہ بحیثیت مدعی یہ فرض ہے کہ اصل وضّاع اور جھوٹے کا صاف صاف نام لیں، ایجنٹ بے چارہ جب تک اسے حقیقت حال کا علم نہ ہو، مجرم نہیں، علم بھی ہوجائے، تو ترتیب کے لحاظ سے مدعی علیہ نمبر ۲ ہوگا اور آپ پاکبازوں پر تہمت لگانے کے فوجداری جرم میں اول مجرم ہیں!

رمی المحسنین اگر جرم ہے، تو آپ ۸۰ کوڑوں کے مستحق ہیں، تہمت تراشی محسن پر ہو یا محصن پر جرم میں کوئی فرق نہیں!

اب رہا پہلا دعویٰ کہ یہ حدیث صرف زہری سے مروی ہے، میں اس کے تقریباً ۳۴ طرق مختلف دفاتر سنت سے پیش کر رہا ہوں، ان میں سے اکثر طرق صحیح بخاری ہی سے نقل ہیں۔

طرق حدیث الإفک:

① " قال ابن إسحاق: حدثنا الزهري عن علقمة بن وقاص و عن سعيد بن جبير و عروة بن الزبير و عبيداللّٰه بن عبداللّٰه بن عتبة عن عائشة " (ابن كثير: ٦/ ٧٣)

② " قال ابن إسحاق: حدثني يحيىٰ بن عباد بن عبداللّٰه بن الزبير عن أبيه عن عائشة" (روض الأنف مع ابن هشام: ٢٢٠)

③ "حدثنا أبو الربيع سليمان بن داود و أفهمني بعضه أحمد بن يونس قال حدثنا فليح بن سليمان عن ابن شهاب عن عروة بن الزبير، وسعيد بن المسيب وعلقمة بن وقاص و عبيداللّٰه بن عبداللّٰه عن عائشة"، فيه سعيد بن المسيب بدل سعيد بن جبير۔ (صحيح بخاری مجتبائی: ٣٦٣)

④ "حدثنا أبو الربيع حدثنا فليح عن هشام بن عروة عن عروة عن عائشة" (صحيح بخاری: ٣٦٥)

⑤ " حدثنا أبو الربيع قال: وحدثنا فليح عن ربيعة بن أبي عبدالرحمن، ويحيىٰ بن سعيد عن القاسم بن محمد بن أبي بكر"

(صحيح البخاري:٥/ ١٨١، ١/ ٣٦٥)

⑥ " حدثني يحيىٰ بن بكير حدثنا الليث عن يونس عن ابن شهاب عن الأربعة "

⑦ " عبدالله بن أبي بكر بن محمد بن عمرو بن حزم الأنصاري عن عمرة أخبرني أبي عن عائشة " (ابن کثیر: ۶/ ۷۳)

⑧ " وقال أبو أسامة عن هشام بن عروة قال أخبرني أبي عن عائشة الخ " (ابن کثیر : ۶/ ۷۳)

"حدثنا ابن أبي عدي عن محمد بن إسحاق عن عبدالله بن أبي بكر عن عمرة "

⑨ " أخبرنا علي بن عاصم أخبرنا حصين عن أبي وائل عن مسروق عن أم رومان " (احمد، ابن کثیر: ۶/ ۷۶)

⑩ "بخاری عن موسیٰ بن إسماعيل عن أبي عوانة ومحمد بن سلام عن محمد بن فضيل كلاهما عن حصين و لفظ أبي عوانة: قال مسروق: حدثني أم رومان"

⑪ " ورواه بعضهم عن مسروق عن عبدالله بن مسعود" (ابن کثیر: ۶/ ۷۷)

⑫ " حدثني محمد بن عثمان الواسطي حدثنا جعفر بن عون عن المعلى بن عرفان عن محمد بن عبدالله بن جحش قال: تفاخرت زينب و عائشة الخ " (ابن کثیر: ۶/ ۷۸)

⑬ "قال محمد بن عمر الواقدي: حدثنى ابن أبي حبيب عن داود بن الحصين عن أبي سفيان عن أفلح مولىٰ أبي أيوب أن أم أيوب قالت لأبي أيوب: ألا تسمع ما يقول الناس في عائشة " (ابن کثیر: ۶/ ۷۹)

⑭ " حدثنا حجاج ثنا عبدالله بن عمر النميرى "

(صحیح بخاری: ۱/ ۳۵۹ مجتبائی)

”حدثنا يونس عن ابن شهاب “ (أيضاً: ۱/ ۴۰۳)

⑮ ” حدثنا ليث عن يونس عن ابن شهاب “

(۲/ ۵۷۳، ۲/ ۲۷۹، ۲/ ۹۸۵، ۲/ ۱۱۷)

⑯ ” محمد بن مقاتل أنا عبدالله أنا يونس عن الزهري “

(صحیح بخاری: ۱/ ۳۷۰)

⑰ ” حدثنا عبدالعزيز بن عبدالله حدثنا إبراهيم بن سعد عن صالح عن ابن شهاب“ (۲/ ۵۹۳)

⑱ ” حدثنا موسىٰ حدثنا أبو عوانة عن حصين عن أبي وائل حدثني مسروق بن الأجدع حدثتني أم رومان “

(صحیح بخاری: ۳/ ۲۸۰)

⑲ ” حدثنا أبو نعيم قال حدثنا سفيان عن معمر عن الزهري “

(بخاری: ۲/ ۲۹۶)

⑳ ” حدثنا يحيىٰ بن بكير قال حدثنا الليث عن يونس عن ابن شهاب “ (بخاری: ۲/ ۲۹۶، ۲/ ۱۱۲۶)

㉑ ” حدثنا محمد بن كثير قال أخبرنا سليمان عن حصين عن أبي وائل عن مسروق عن أم رومان “ (بخاری: ۲/ ۶۹۸)

㉒ ” حدثنا إبراهيم بن موسىٰ حدثنا هشام أن ابن جريج أخبرهم قال ابن أبي مليكة سمعت عائشة “ (بخاری: ۲/ ۲۹۸)

㉓ ” حدثنا محمد بن المثنىٰ قال حدثنا يحيىٰ عن عمر بن سعيد بن أبي حسين قال حدثني ابن أبي مليكة قال: استأذن ابن عباس قبل موتها على عائشة الخ “ (صحیح بخاری:۲/ ۳۹۹)

㉔ ” حدثنا محمد بن المثنىٰ قال: حدثنا عبد الوهاب بن

عبد الحميد قال حدثنا ابن عون عن القاسم أن ابن عباس استأذن على عائشة "الخ (صحیح بخاری:۲/ ۲۹۹)

㉕ " حدثنا محمد بن يوسف حدثنا سفيان عن الأعمش عن أبي الضحىٰ عن مسروق عن عائشة قالت: جاء حسان بن ثابت "
(صحیح بخاری: ۲/ ۶۹۹)

㉖ حدثني محمد بن بشار قال حدثنا ابن أبي عدي قال أنبأنا شعبة عن الأعمش عن أبي الضحىٰ عن مسروق قال: دخل حسان بن ثابت على عائشة "

㉗ " تعليقاً، قال أبو أسامة عن هشام بن عروة قال أخبرني أبي عن عائشة " (۲/ ۹۸۸)

㉘ حدثنا عبد العزيز قال حدثنا إبراهيم عن صالح عن ابن شهاب " (۲/ ۲،۱۰۹٦/ ۹۸۸)

㉙ " محمود بن غيلان حدثنا أبو أسامة عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة "(ترمذی مع تحفہ: ٤/١٥٥) وقال الترمذي:" هذا حديث حسن صحيح غريب"

㉚ " حدثنا بندار حدثنا ابن أبي عدي عن محمد بن إسحاق عن عبدالله بن أبي بكر عن عمرة عن عائشة " (ترمذی: ٤/ ١٥٧)

㉛ " أخبرنا مالك بن إسماعيل حدثنا زهير حدثنا عبدالله بن عثمان قال حدثني عبدالله بن عبيد الله بن أبي مليكة أنه حدثه ذكوان حاجب عائشة أنه جاء يستأذن علىٰ عائشة فجئت وعند رأسها ابن أخيها عبدالله بن عبدالرحمن فقلت هذا عبدالله بن عباس يستأذن عليك " الخ (ابن سعد: جلد ۸)

۳۲ " حدثنا أبو الربيع العتكي حدثنا فليح بن سليمان"

(صحيح مسلم : ٣٦٧)

۳۳ " حدثنا الحسن بن علي الحلواني وعبد بن حميد حدثنا يعقوب بن إبراهيم بن سعد حدثنا أبي عن صالح بن كيسان كلاهما عن الزهري " (أيضاً)

۳۴ " حدثنا أبوبكر بن أبي شيبة ومحمد بن العلاء قال حدثنا أبو أسامة عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة " الخ (ایضاً)[1]

نمبر۳۴ وہی حدیث ہے جس کا ۲۷ نمبر میں بخاری سے تعلیقاً ذکر آیا ہے۔

صحیح مسلم کی باقی اسانید تقریباً صحیح بخاری کی اسانید ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے قصہ افک کو صحیح بخاری میں تقریباً ۱۴ مقام پر نقل فرمایا ہے، دو مقام پر تعلیقاً اور ۱۲ مقام پر پوری اسناد کے ساتھ مرفوعاً، بعض مقامات پر موضوع اور باب کے لحاظ سے اختصار فرمایا ہے، اور بعض مقامات میں مفصل قصہ ذکر کیا ہے۔[2]

عمادی صاحب نے شہادات، مغازی، تفسیر وغیرہ مقامات پر دیکھ کر فیصلہ کر دیا کہ امام زہری کے سوا کسی سے یہ ثابت ہی نہیں، تعجب ہے ان حضرات میں کس قدر جرأت ہے؟ اس طرح ڈینگیں مارنے میں ان حضرات کو حجاب محسوس نہیں ہوتا!

---

[1] حدیث افک کے دیگر طرق کے لیے ملاحظہ کریں: مسند إسحاق بن راهويه (٢/ ٥٥٦، ٥٥٩، ٣/ ٩٧٨) صحيح ابن حبان (١٦/ ٢٢) المعجم الكبير للطبراني (٢٣/ ١٣٠، ١٣٤، ٢٥/ ٨٣) المعجم الأوسط (١/ ١٨٤) مسند أبي يعلى (٨/ ٣٣٥) سنن البيهقي (٧/ ١٠١، ٨/ ٥٦)

[2] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث: ٢٤٥٣، ٢٤٩٤، ٢٥١٨، ٢٥٤٢، ٢٧٢٣، ٣٢٠٨، ٣٨٠١، ٣٩١٠، ٣٩١٢، ٤٤١٣، ٤٤١٤، ٤٤٧٢، ٤٤٧٤، ٤٤٧٩، ٦٢٨٥، ٦٣٠١، ٦٩٣٥، ٦٩٣٦، ٧٠٦١، ٧١٠٦۔

جہالت اور لاعلمی میں یہ فائدہ ضرور ہے کہ انسان حجاب اور شرم محسوس نہیں کرتا، تمنا صاحب تو ویسے بھی ادارہ ''طلوع اسلام'' کے راجہ شمار ہوتے ہوں گے، ان کی رجال پر شدبود محل نظر ہے اور ان حضرات میں ''مخصوص انداز'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔

میں نے قصہ افک کی اسانید کا استیعاب نہیں کیا، صحیح بخاری، مسلم، ابن کثیر، ابن سعد، جامع ترمذی سے استفادہ کیا گیا ہے، طبری کا تذکرہ میں نے عمداً نہیں کیا، طبری کی تمام اسانید کا مدار امام المغازی شیخ الاسلام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ پر ہے، گو وہ سیرت اور مغازی کے امام ہیں، مگر تمنا صاحب کو ان دونوں سے حسبتاًللہ بغض ہے۔

بعض اسانید میں تکرار ہے، لیکن محدث کی طرف سے ایک دو راوی جدا تھے، میں نے اسے الگ ذکر کر دیا ہے، تاکہ دانش مند محسوس کریں کہ یہ حدیث کن اکابر فن کی نظر میں رہی، لیکن کسی کے ذہن میں یہ ذلیل کھٹکا نہیں ہوا، جو عمادی صاحب اور ادارہ طلوع اسلام کے اذہان پر مسلط ہے، یعنی عجمی سازش! اس ناسور کا آپریشن میں نے اپنے رسالہ ''حدیث کی تشریعی اہمیت'' میں کر دیا ہے۔

ان اسانید پر غور کرنے سے آپ معلوم فرما سکیں گے کہ امام العصر حافظ السنۃ ابن شہاب محمد بن مسلم زہری رحمہ اللہ کے علاوہ اور کس قدر ائمہ نے اسے روایت کیا ہے، عمادی صاحب قلت مطالعہ کے مریض ہیں، ان کو معلوم نہیں کہ ابن شہاب کے علاوہ کس قدر ائمہ حدیث نے حدیث افک کو روایت فرمایا ہے۔

میں نے ان روایات کا بھی یہاں ذکر کر دیا ہے، جن میں قصہ افک کا تذکرہ اجمالاً یا تفصیلاً نہیں، بلکہ اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ تہمت لگائی گئی یا جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مرض الموت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنا اور آپ کی براءت کا ذکر، ان احادیث کی اسانید میں بیسیوں رجال

موجود ہیں، ان اکابر علم نے ان احادیث اور اسانید کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن کسی کے دماغ میں یہ جنون نہیں سمایا، جس کا شکار بیچارے عمادی صاحب اور طلوعی خاندان ہوا ہے۔ ان ائمہ حدیث کے علاوہ صحابہ سے اس قصہ کے شاہد ام رومان رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ، زینب بنت جحش ام المومنین رضی اللہ عنہا، ابن عباس رضی اللہ عنہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم وغیرہم ہیں۔

اسانید آپ کے سامنے ہیں، تمنا صاحب اور ان کا خاندان " حفلة العميان " ملاحظہ فرمائیں، ان میں زہری رحمہ اللہ کے سوا اور بھی کوئی ہے یا نہیں؟ زہری رحمہ اللہ کے کتنے ہم قرن اس قصہ کی روایت اور حکایت میں امام زہری رحمہ اللہ کے ساتھ شریک ہیں، زہری رحمہ اللہ کے تلامذہ اور اساتذہ کی ایک بڑی جماعت اس واقعہ کی روایت میں شریک ہے، ان میں کوئی بھی عجمی سازش کا سراغ نہ لگا سکا۔ امام زہری رحمہ اللہ کا دامن تو یقیناً کذب اور نفاق سے پاک ہے اور آپ حضرات یقیناً عجمی سازش کا شکار ہیں، جس کا منصوبہ مستشرقین غرب اور مصر کے ملاحدہ نے تیار کیا اور آپ جیسے کچھ دانستہ یا نادانستہ اس سازش میں شریک ہوگئے اور آپ نے وہ کام کرنے کی کوشش کی، جو عرب اور عجم کے منافق اجتماعی طور پر بھی نہ کر سکے اور یقین ہے کہ آپ بھی نہ کر سکیں گے۔

زہری رحمہ اللہ اور روایت بالمعنیٰ:

بعض ائمہ حدیث روایت بالمعنیٰ کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی بیان کیے جائیں، لیکن چونکہ روایت بالمعنیٰ کا رواج صحابہ سے ہی آ رہا تھا، اس کا رواج عام ہوگیا، "حدیث إفک" میں امام زہری رحمہ اللہ نے اپنے چار اساتذہ سے اس واقعہ کے بعض حصص کو سنا، ان چار میں سعید بن میںب کی بجائے سعید بن جبیر کا ذکر فرمایا ہے، ہر ایک نے اس واقعہ کے بعض اجزاء ذکر

فرمائے، ان میں ایک دوسرے کی تصدیق تھی، واقعہ کی تفصیلات میں الفاظ کا اختلاف تھا، امام زہری رحمہ اللہ نے پورے واقعہ کو چاروں اساتذہ سے سن کر مرتب فرمایا، تاکہ واقعہ یک جا آ جائے، امام زہری رحمہ اللہ پر گو بعض ائمہ نے اعتراض کیا ہے، لیکن یہ روایت بالمعنی ہی کا ایک طریق ہے، عام ائمہ حدیث نے اسے پسند کیا اور زہری رحمہ اللہ سے اس حدیث کو بلانکیر روایت کیا ہے، عمادی صاحب کی دانش مندی قابل داد ہے، فرماتے ہیں کہ:

''یہ پوری حدیث خود ابن شہاب کی تالیف کردہ ہے۔''

کس قدر جرأت ہے! غلط گوئی اور جھوٹ کی کتنی دلیرانہ واردات ہے، سند موجود ہے، اساتذہ موجود ہیں اور مختلف حصص بھی کتب احادیث سے مل سکتے ہیں، لیکن دیانت ملاحظہ فرمائیے کہ ''یہ پوری حدیث زہری رحمہ اللہ کی تالیف کردہ ہے،'' یہ حضرات ہیں جو ائمہ حدیث کی دیانت پر حملہ آور ہوتے ہیں، زہری رحمہ اللہ کے اس صنیع کو ناپسند کرنا دوسری بات ہے، لیکن اسے زہری رحمہ اللہ کی تالیف کہنا دیانت داری کے منافی ہے۔

ادراج:

عام ائمہ حدیث درس و تدریس کے وقت بعض الفاظ شرح و تفسیر کے طور پر فرما دیتے، ذہین طالب علم متن اور تشریح میں امتیاز کر لیتے، اگر شبہ ہوتا تو دریافت فرما لیتے، اساتذہ ضرورتاً ایسا کرنے پر مجبور تھے، افہام و تفہیم کے لیے یہ ضروری تھا۔

عمادی صاحب کے علم کی طغیانی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ اپنے استاد امام زہری رحمہ اللہ کو ''ڈانٹ دیا کرتے تھے۔'' گویا موسیٰ بن عقبہ بھی منکرین حدیث کی طرح گستاخ اور استاد کے بے ادب تھے!

عمادی صاحب اور ان کی جماعت آزاد ہیں، اپنے اساتذہ سے جس طرح چاہیں معاملہ کریں، لیکن انھیں ائمہ سنت کے متعلق ایسی غلط تعبیر سے پرہیز کرنا چاہیے۔

امام زہری رحمہ اللہ اور عروہ بن زبیر رحمہ اللہ:

عمادی صاحب نے بے ضرورت ذکر چھیڑ دیا کہ

"امام زہری رحمہ اللہ کا سماع عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے ثابت نہیں، اگرچہ محدثین نے اجماع کر لیا ہے کہ ضرور سنا ہوگا۔"

یہ فقرہ عجیب ہے، گویا محدثین کا اجماع خلاف واقعہ ہے، غلط ہے اور حدیث پر سماع یا عدم سماع کا کوئی اثر نہیں، بہتر یہ ہے کہ عمادی صاحب یہ تذکرہ نہ چھیڑتے یا پھر اس کے لیے دلائل دیتے، بہر حال ہم عمادی صاحب کی معلومات میں اضافہ کے لیے عرض کرتے ہیں:

"روى عنه (عروة بن الزبير) عطاء وابن أبي مليكة وعراك بن مالك وأبو سلمة بن عبدالرحمن والزهري و عمر بن عبدالعزيز وبنوه"

"عطاء بن ابی ملیکہ، عراک بن مالک، ابوسلمہ اور زہری، عمر بن عبدالعزیز اور ان کے لڑکوں نے عروہ بن زبیر رحمہ اللہ سے سنا۔"

(تهذيب الأسماء واللغات: ۱/ ۳۳۱)

عروہ بن زبیر کا انتقال ۹۴ھ یا ۹۹ھ میں ہوا، امام زہری ۵۱ھ میں پیدا ہوئے، ان کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا اور وقوع وسماع دونوں موجود ہیں۔

عمادی صاحب کو معلوم نہیں کیا تکلیف ہے؟ وہ خواہ مخواہ محدثین کو بدنام کرتے ہیں، اس موضوع پر اگر مزید شواہد کی ضرورت ہو، تو عرض کیے جا سکتے ہیں، آپ کی درایت، اس کا تجزیہ بھی عنقریب ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ!

جب تک دنیا میں یہ فقراء کی جماعت موجود ہے، دلائل کی حد تک تو حدیث اور محدثین کا دفاع ہوتا رہے گا، البتہ سینہ زوری سے آپ کو روکنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ اور جنگ جمل:

پھر اس جھوٹ کے لیے بھی کوئی وجہ جواز ہونی چاہیے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ نے بقول عمادی صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بدنام کرنے کی کوشش کیوں کی؟ جنگ جمل میں کئی حضرات اور بھی شریک تھے، اسی جنگ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا سوال بڑی اہمیت سے اٹھایا، لیکن حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اسی جنگ میں قائد کی حیثیت سے شریک تھے، صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ صبح کے بعد چند گھنٹے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معیت میں چلے، لیکن جنگ جمل میں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معیت کا ہفتوں شرکاءِ جمل کو موقعہ ملا، آپ کے عجمی سازش کرنے والوں کے لیے یہ بہترین موقعہ تھا، بیک کرشمہ دوکار کی صورت ہوجاتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی بدنام ہوجاتیں، رفقاءِ جمل بھی بدنام ہوجاتے، قرآن کے نزول سے بریت کا بھی کوئی امکان نہ ہوتا، افسوس ہے کہ ان عجمی حضرات نے سازش کے لیے عمادی صاحب اور ادارہ ''طلوع'' سے مشورہ نہ کیا!

منافقین کا اطمینان:

یہ آپ نے صحیح فرمایا کہ نزول قرآن سے منافقین کا اطمینان کیسے ہوگیا؟ جو نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر مانتے تھے، نہ قرآن کو منزل من اللہ!

حقیقت یہ ہے کہ ان کا اطمینان مطلوب ہی کہاں تھا؟ ایسے واقعات میں سادہ دل مسلمانوں پر جو اثر ہوا تھا، حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ

ایسے حضرات اس افواہ سے قدرے متاثر ہوئے تھے، قرآن کے نزول سے ان مسلمانوں کی تسکین مطلوب تھی جو بحمداللہ ہوگئی، عبداللہ بن اُبیّ تو بدستور آپ کی طرح غیر مطمئن رہا۔ ﴿قاتلهم الله أنىٰ يؤفكون﴾

مرزا حیرت اور سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ:

حدیث پر کلام کے لیے نہ مرزا حیرت کے ترجمہ کی ضرورت تھی، نہ سید سلیمان صاحب رحمہ اللہ کی ترجمانی کی، یہ محض طول اور اطناب ہے، اس سے اوراق سیاہ کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں، مرزا حیرت نے گو ترجمہ کیا، لیکن حجیت حدیث کے متعلق ان کی رائے بھی اہل قرآن سے ملتی جلتی ہے، وہ ترجمہ کے بارے میں صاحب فن نہیں، بلکہ آپ کی طرح مزدور ہیں، جس طرح آپ فن حدیث سے بے بہرہ ہونے کے باوجود لکھتے ہیں، آپ کی ان مزخرفات کا اہل علم اور ماہرین پر کیا اثر ہوسکتا ہے؟

سید صاحب عالم ہیں، ان کی حدیث پر نظر ہے، انھوں نے مخلص طور پر حدیث کا مضمون واضح فرمایا، آپ کی نظر کو وہ دقت کہاں نصیب جو اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو عطا فرمائی۔ آپ نے سید صاحب کے ارشادات سمجھے بغیر ان پر تنقید شروع کر دی، طول مدعا کے لیے آپ نے سید صاحب اور مرزا حیرت کو عنوان بنا لیا، جب آپ کو امام زہری رحمہ اللہ پر اعتماد نہیں، تو سید صاحب رحمہ اللہ کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہوگی؟ اس لیے ان کو درمیان میں لانے سے کیا فائدہ؟

وضع حدیث کا زمانہ:

اس عنوان کے ضمن میں عمادی صاحب نے ایک عجیب تُک لگائی ہے، فرماتے ہیں:

> ”حدیث افک کے وضع کا آغاز جنگ جمل کے بعد قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ اور بصرہ ہی میں کر دیا تھا اور یہ ۵۰ھ یا ۶۰ھ کے پس و پیش کا زمانہ ہے۔“

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عمادی صاحب نے کوئی اہم تاریخی انکشاف فرمایا ہے، یہاں تک کہ وضع حدیث کی تاریخ اور وقت تک کی نشاندہی فرما دی ہے، لیکن اس کا نہ کوئی حوالہ دیا ہے، نہ کوئی عقلی قرینہ اس پر قائم فرمایا، بلکہ گپ لگا کر عوام کو مغالطہ میں ڈال کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عمادی صاحب نے اس حدیث کی وضع کا بہتان رئیس المحدثین امام زہری رحمہ اللہ پر لگایا ہے اور امام زہری رحمہ اللہ کی پیدائش چونکہ ۵۰ھ یا ۵۱ھ کے پس و پیش ہے، اس لیے تمنا صاحب نے تک سے یہ جوڑ لگا دیا کہ اس حدیث کے وضع کا یہی زمانہ ہے، لیکن عقل مند آدمی اتنا نہیں سمجھ سکا کہ زہری رحمہ اللہ نے پیدا ہوتے ہی حدیث کے وضع کا مشغلہ شروع کر دیا تھا؟ اگر زہری ایجنٹ تھے، تو اصل واضع کون ہیں؟ جنھوں نے امام زہری رحمہ اللہ کو ایجنسی دے کر وضع کا کاروبار شروع کیا اور وہ بھی ۵۰ھ کے پس و پیش میں ہی پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے ہی یہ کاروبار شروع کر دیا، اگر وہ لوگ پہلے سے موجود تھے، تو تمنا صاحب کا یہ اندازہ غلط ہوگا، پھر وضع کا زمانہ کئی سال پہلے ہونا چاہیے!

قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کون تھے؟

کچھ شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت امت کے لیے ایک حادثہ ہے، یہ سانحہ آنے والے حوادث کے لیے بنیاد ہے، پہلی اہم بے انصافی یہی ہے جو اس مقدس، بے قصور اور پاکباز امام کے ساتھ روا رکھی گئی، یہ لوگ آنے والے جرائم میں برابر شریک ہیں، اس میں بھی شک نہیں کہ مدینہ کے اس ہنگامہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روش اس قدر صاف نہیں، جتنا اسے صاف ہونا چاہیے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا تدبر اس وقت، وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن اس سازش سے

بالکل پاک ہے، لیکن ان کی خاموشی ان کی پوزیشن کو مشکوک ضرور قرار دیتی ہے۔

لیکن امام زہری رحمہ اللہ کا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا رابطہ تھا؟ ان کا تعلق خلفاء بنی امیہ عبدالملک بن مروان، ہشام بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیز سے تھا، یہی ارباب خیر اور ارباب اقتدار تھے، جن سے امام زہری رحمہ اللہ کے مراسم رہے، اس وقت قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کا دخل نہ اقتدار میں تھا نہ ہی علمی محفلوں میں ان کی کوئی وقعت تھی، اس لیے زہری پر قاتلین عثمان سے سازش کی تہمت عقل کا تقاضا ہی معلوم نہیں ہوتا۔

عمادی صاحب زہری رحمہ اللہ کے مراسم قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے بتاتے ہیں، مصر کا ملحد شیخ ابوریہ اور یورپین مستشرق گولڈ زیہر انھیں بنوامیہ کی وفاداری سے متہم کرتے ہیں۔

ایک ایسا آدمی جو اپنا علمی کارنامہ تدوین حدیث پورا کرنے کے بعد اپنے خدا کو پیارا ہوگیا، اس کی پوری زندگی تاریخ کی امانت ہے۔ عمادی صاحب اور ان کے رفقاء ان کو قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کا ایجنٹ سمجھتے ہیں اور ملحدین یورپ اسے بنوامیہ کا حاشیہ بردار سمجھتے ہیں، کیا اس سے زیادہ کوئی شخص تاریخی مظلوم ہوسکتا ہے؟ ملحدین یورپ کے لیے تو غلط صحیح طور پر بنوامیہ کے اقتدار کی آڑ لی جاسکتی ہے، مگر ہمارے صاحب صرف تُک بازی پر گزر فرماتے ہیں، اس باؤلے پن کا انجام مینٹل ہسپتال ہی ہوسکتا ہے!!

یہ دور بنی امیہ کے عروج کا ہے، قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے کسی حلقہ میں بھی کوئی مقام نہیں، امام زہری رحمہ اللہ ایسا عقلمند اگر دنیا کے لیے کسی غلط راہ پر بھی چلتا، تو اس کے لیے بنوامیہ کی چوکھٹ سے بہتر کوئی مقام نہ تھا، حالانکہ زہری رحمہ اللہ کے خلوص اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ عمرو بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ما رأيت الدينار والدرهم عند أحد أهون منه عند الزهري كأنها بمنزلة البعر“

زہری رحمہ اللہ کے نزدیک دینار و درہم کی وقعت لید گوبر سے زیادہ نہ تھی۔

(العبر للذهبي : ۱/ ۱۵۹، تذكرة الحفاظ: ۱/ ۱۰۹) ❶

عمادی صاحب بتا سکتے ہیں کہ امام زہری پر اس تہمت میں درایتاً ان کا کیا موقف ہے؟ نقل ان کی موید ہے نہ درایت، شیعہ سے ایک جذباتی چھیڑ کے علاوہ یہاں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے ذکر کا کوئی فائدہ بھی ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی طلب کے لیے ''جنگ

---

❶ امام زہری رحمہ اللہ کی دیانت اور صاف گوئی میں جرأت مندی کا یہ حال تھا کہ خلفاء بنی امیہ کے سامنے بھی اعلان حق سے گریز نہیں کرتے تھے، امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ایک رات ولید بن عبدالملک لیٹ کر سورہ نور کی تلاوت کر رہا تھا اور میں اس کے پاس بیٹھا تھا، جب وہ اس آیت: ﴿ والذی تولیٰ کبره منهم له عذاب عظیم ﴾ پر پہنچا، تو اس نے کہا: اے ابوبکر! اس معاملے کا بڑا ذمہ دار کون تھا؟ کیا وہ علی بن ابی طالب نہیں تھا؟ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں سوچا: میں کیا کہوں؟ اگر میں نے نفی میں جواب دیا، تو مجھے ڈر ہے کہ اس کی طرف سے مجھے کسی تکلیف کا سامنے کرنا پڑے گا اور اگر میں نے ہاں کہا، تو مجھ سے بہت بڑا کام سرزد ہو جائے گا، میں صحابیِ رسول کے ذمے ایسی بات لگا دوں گا، جو اس نے نہیں کہی، پھر میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سچائی پر بھلائی کا عادی بنایا ہے، (تو میں نے کہا) اے امیر المؤمنین: نہیں! تو اس نے دو تین بار اپنی چھڑی چار پائی پر ماری اور کہا: تو پھر کون تھا؟ یہاں تک کہ جب اس نے کئی بار کہا، تو میں نے کہا: وہ عبداللہ بن أبی بن سلول تھا، بعد ازاں پوری حدیث افک بیان کی۔

(المعجم الكبير: ۲۳/ ۹۷، فتح الباري: ۷/ ٤٣٧)

اسی طرح ایک بار امام زہری رحمہ اللہ ہشام بن عبدالملک کے پاس گئے، تو اس نے کہا کہ اس (افک) کا بڑا ذمہ دار کون تھا؟ تو امام زہری نے جواب دیا: عبداللہ بن أبي!

جس پر ہشام نے کہا: تم نے جھوٹ کہا ہے، وہ علی بن ابی طالب ہے! امام زہری نے جواب دیا: کیا میں جھوٹ بولوں گا؟ تیرا باپ نہ رہے، اللہ کی قسم! اگر آسمان سے کوئی اعلان کرنے والا اعلان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولنا حلال کر دیا ہے، میں تب بھی جھوٹ نہیں بولوں گا! بعد ازاں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو حدیث افک سنائی۔ (تاريخ دمشق: ۵۵/ ۳۷۱)

جمل'' کی قیادت فرمائی۔ زہری رحمہ اللہ نے قصہ افک کی تفصیلات روایت فرمائیں، آپ نے اس کا جوڑ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے جوڑ دیا! درست ہے یہاں چار سو بیس کے لیے کچھ گنجائش ہوگئی!

فدک، اموال خیبر کی بحث اور امام زہری رحمہ اللہ:

شیعہ حضرات، اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر تہمت لگاتے ہیں کہ ان حضرات نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت سے محروم رکھا، شیعہ سنّی نزاع میں یہ سب سے اہم مبحث ہے، اس واقعہ کی تفصیلات، فدک اور خیبر کے ساتھ مدینہ منورہ کی اراضی کی شرعی حیثیت اور وضاحت، جس سے اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر معترضین کی غلطیاں رفع ہوسکتی ہیں اور واقعہ کی شرعی حیثیت واضح ہوجاتی ہے، یہ سب امام زہری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت فرمائی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مطالبہ، پھر صحابہ کی مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشروط تفویض اور سپرداری، پھر دونوں بزرگوں کی باہمی رنجش، زمین پر دوبارہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تصرف، یہ تفصیلات بھی امام زہری رحمہ اللہ ہی نے روایت فرمائی ہیں۔ [1]

اگر اخبار کے صفحات کی تنگی کا خطرہ نہ ہوتا، تو میں ان تمام روایات کو ذکر کر دیتا، جو صحیح مسلم میں صفحہ ۸۹ سے صفحہ ۹۲ جلد ثانی میں مرقوم ہیں اور صحیح بخاری میں بھی ایسی دستاویز ہیں، جس کے بعد قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ (بزعم جناب عمادی صاحب) اور اعداء صحابہ رضی اللہ عنہم کے موقف کی کمزوری واضح ہوجاتی ہے۔

پورے باب میں امام مالک رحمہ اللہ سے صرف دو روایتیں مرقوم ہیں، جن میں

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الخمس، باب فرض الخمس، رقم الحديث (٢٩٢٦) نیز دیکھیں: رقم الحديث (٣٥٠٨، ٣٨١٠، ٣٩٩٨، ٦٣٤٦، ٦٣٤٩) و صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب قول النبي ﷺ لا نورث ما تركنا فهو صدقة، رقم الحديث (١٧٥٨)

"نحن معاشر الأنبياء لا نورث" کو سنداً ذکر کیا گیا ہے، باقی مفصل روایات ساری کی ساری امام زہری رحمہ اللہ سے منقول ہیں، مولانا عمادی غور فرمائیں ان کی اس تُک کی کیا حیثیت رہ جائے گی کہ زہری کے سوا حدیث افک کا کوئی راوی نہیں؟

صحیح مسلم جلد ثانی "باب حکم الفيء" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مطالبہ کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

① پہلی حدیث امام احمد رحمہ اللہ سے۔

② دوسری، قتیبہ بن سعید رحمہ اللہ سے۔

③ تیسری، یحییٰ بن یحییٰ رحمہ اللہ سے۔

④ چوتھی، عبداللہ بن محمد رحمہ اللہ سے۔

⑤ پانچویں، اسحاق اور محمد بن رافع سے۔

⑥ چھٹی، یحییٰ بن یحییٰ بواسطہ مالک۔

⑦ ساتویں، محمد بن رافع سے۔

⑧ آٹھویں، اسحاق بن ابراہیم وغیرہ سے۔

⑨ نویں، ابن نمیر اور زہیر بن حرب سے۔

⑩ دسویں، پھر یحییٰ بن یحییٰ سے۔

⑪ گیارھویں، محمد بن یحییٰ سے۔

⑫ بارھویں، ابن ابی خلف سے۔[1]

دسویں اور گیارھویں حدیث کے سوا، باقی تمام کا مدار زہری رحمہ اللہ پر ہے، تمام اسانید زہری رحمہ اللہ پر جمع ہوتی ہیں اور شیعہ حضرات کے شبہات کا تفصیلی جواب بھی

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب حكم الفيئ و باب قول النبي ﷺ لا نورث ما تركنا فهو صدقة۔

پہلی روایات میں ہے، یہاں امام زہری رحمہ اللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے رفقاء کا ساتھ دے رہے ہیں، یہاں اس جذباتی فقرہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، حقائق کو حقائق ہی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے!

حدیث افک کتب حدیث میں:

ذیل کے ائمہ حدیث نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے: بخاری، مسلم، ترمذی، ابن سعد، امام احمد، طیالسی، ابن ہشام، واقدی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تقریباً چودہ مقامات پر اور امام احمد رحمہ اللہ نے مسند عائشہ اور مسند ام رومان وغیرہ میں تذکرہ فرمایا ہے۔

عمادی صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق ان ائمہ کرام کے نام سے مرعوب نہیں ہوں گے، اساطین سنت کے بالمقابل وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں گے، لیکن سوال یہ ہے اس ضد اور ہٹ دھرمی میں خوبی کیا ہے؟

یہ امام فن حدیث کے ماہر ہیں، ان میں اکثر جرح و تعدیل کے امام ہیں، حدیث کی تنقید اور چھان پھٹک میں وہ قائد ہیں، ان کی روایات دلیل اور سند کا مقام رکھتی ہیں، اس کے بالمقابل عمادی صاحب اور منکرین حدیث کا پورا خاندان فن حدیث سے نابلد اور بے خبر ہے!

کیا ماہر فن اور علماء کے سامنے ضد کرنا اور نہ ماننا، خوبی ہے؟ صراف سونا کسوٹی پر کستا ہے، وہ اس کے رنگ کو پہچانتا ہے، ایک گنوار پورے استقلال سے ڈٹ گیا ہے کہ میں نہ صرّاف کی مانتا ہوں، نہ کسوٹی مجھے منظور ہے، یہ سب غلط ہے، صحیح وہ ہے جو میں کہتا ہوں۔ ممکن ہے منکرین حدیث اسے تحقیق کا نام دیں، عقل مندوں کی دنیا میں اسے حماقت اور گنوارپن سے تعبیر کیا جائے گا، ہر فن میں اہل فن ہی کی رائے مستند ہوگی۔

تخریج حدیث کے متعلق دو بڑے حوالوں کے لیے کنوز السنة للأستاذ فؤاد عبدالباقي اور خزائن المواريث للعلامة عبدالغني أفغاني الحنفي ۱۱٤۳ھ ملاحظہ فرمائیں۔

انجینئرز، ڈاکٹر اور طبیب ہی کی رائے اپنے فن میں مستند ہوسکتی ہے، مگر عمادی صاحب فرماتے ہیں کہ محدث، مجتہد، فقہاء، مؤرخین سب متفق ہوں، تو بھی عمادی صاحب کو ان پر یقین نہیں ہوگا، عمادی صاحب اپنی درایت کی لاٹھی سے سب کو ہانک دیں گے!

درایت کا مفہوم:

عمادی صاحب کی درایت اور ان کے قرائن پر غور کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ درایت کا مصطلح مفہوم سمجھ لیا جائے۔ جس درایت کو عمادی صاحب روایات کی تنقید میں استعمال فرماتے ہیں، غالباً اس کی ابتداء علامہ شبلی رحمہ اللہ نے ''سیرة النعمان'' میں فرمائی، وہ فقہاءِ عراق کی فقہیات کو درایت کا نام دے کر فقہاءِ محدثین پر انھیں ترجیح دینا چاہتے تھے، حالانکہ فقہاءِ عراق اور ائمہ اصول فقہ بھی درایت کے اس معنی سے حدیث پر تنقید کرنا پسند نہیں فرماتے، جسے عمادی صاحب درایت کہتے ہیں، یعنی سالہا سال کے بعد پیدا شدہ ماحول کو عقل کا نام دے کر صدیوں پہلے کے واقعات کی تحقیق شروع کر دی جائے، جبکہ ماحول اس سے بالکل مختلف تھا، عقل کے معیار اور اس کی اقدار ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں، ہر ماحول میں عقلیات کا انداز دوسرے ماحول پر بھی منطبق نہیں ہوتا، اس لیے جس ماحول میں واقعہ ہو، اسی ماحول کی عقلیات کے پیمانوں میں اسے ناپنا چاہیے۔

مولانا شبلی رحمہ اللہ کا یہ مفہوم ہمارے علماءِ احناف میں ''کل جديد لذيذ'' [1]

---

[1] ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے!

کی بنا پر چل نکلا ، ورنہ اگر روایات میں خرص و تخمین کے ان پیمانوں کو استعمال کیا جائے، تو حدیث کیا قرآن بھی نہیں بچ سکتا اور دنیا کے مشاہدات اور نقل کے یقینیات ان تُک بندیوں اور جعل سازیوں کی نذر ہو جائیں گے۔

پچھلے دنوں مولانا ابو الاعلیٰ صاحب نے بھی اس درایت موضوعہ کا '' مسلک اعتدال'' وغیرہ میں بے حد وظیفہ کیا اور اس تحریک کی روشنی میں بہت سے کم علم، سادہ لوح حضرات بعض صحیح احادیث کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ہم اہلحدیث ان تُک بندیوں اور تخمینوں کو روایات اور احادیث صحیحہ کی تنقید میں قطعی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

درایت کا صحیح مفہوم:

اصطلاحاً درایت کا صحیح مفہوم ائمہ سنت سے اس طرح منقول ہے:

" العلم بدراية الحديث: وهو علم باحث عن المعنى المفهوم من ألفاظ الحديث وعن المراد منها مبنيّا علىٰ قواعد العربية وضوابط الشريعة ومطابقاً لأحوال النبي ﷺ"

(كشف الظنون كاتب چلپي : ٣٢٣، أيضاً: أبجد العلوم : ٤٣٦)

درایتِ حدیث اس علم کا نام ہے، جو حدیث کے مفہوم پر عربیت اور ضوابط شرعیہ اور آنحضرت ﷺ کے حالات کی روشنی میں بحث کرتا ہے۔

متقدمین ائمہ بھی درایت کا یہی مفہوم سمجھتے تھے، اگر ہر عقل کو درایت کی سند دے کر احادیث پر محاکمہ یا تنقید شروع کر دی جائے، تو علوم کا حلیہ بگاڑ دیا جائے گا اور امان اٹھ جائے گی، کوئی فن بھی جہلاء کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رہ سکے گا۔

عمادی صاحب کا مضمون آپ کے سامنے ہے اور حضرات اہل قرآن کی تمام مساعی جو قرآن و سنت کی تخریب میں وہ فرما رہے ہیں، یہ جہل مرکب کی زندہ مثال

ہے، ﴿وهم يحسبون أنهم يحسنون صنعا﴾ [1]

اللہ تعالیٰ ان حضرات کی رہنمائی فرمائے، ان حضرات کی نظر میں درایت کا یہ مفہوم ہے کہ

''ہر آدمی جسے تھوڑا بہت علم ہو، اردو تراجم پڑھ سکتا ہو، عربی کے مبادی سے واقف ہو، وہ قرآن وسنت پر طبع آزمائی شروع کر دے اور اپنی ربوبیت کے نظام کی منادی شروع کر دے!''

مولوی عبداللہ چکڑالوی سے پرویز صاحب تک اس سینہ زوری اور فن سے بے خبری میں سب برابر ہیں۔ ﴿فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا﴾ [2]

دس درایتی شبہات:

عمادی صاحب کو ''حدیث افک'' بلحاظ درایت کی ''تحقیق'' میں خود بھی اپنی کمزوری کا احساس تھا، ان کا سارا مدار مصنوعی درایت پر تھا، لیکن عمادی صاحب کا شاہکار بھی تارِ عنکبوت سے کچھ زیادہ ہی کمزور معلوم ہوتا ہے۔

پہلا شبہ:

افک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا اہم واقعہ تھا ان کو لڑائی کا نام کیسے یاد نہ رہا؟ انھوں نے '' في غزوة غزاها '' اپنے چاروں شاگردوں سے واقعہ بیان کیا، یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا عمادی صاحب اس حدیث کو ''موضوع'' کہتے ہیں۔

ازالہ:

یہ آپ کو کس نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غزوہ کا نام بھول گئی تھیں؟ کیا عدمِ ذکرِ شے یا نسیان کو مستلزم ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مختلف اوقات میں

---

[1] الکهف: ١٠٤

[2] النساء: ٧٨

اپنے چار یا پانچ تلامذہ سے اس واقعہ کے بعض حصص حسبِ ضرورت یا حسبِ سوال ذکر فرمائے، جنھیں امام زہری رحمہ اللہ نے اپنے تلامذہ کی سہولت کے لیے یک جا مرتب فرما دیا، غزوہ کا نام یا مقام کی ضرورت نہ تلامذہ کو محسوس ہوئی، نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا ذکر فرمایا، بھول کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ غزوہ کے نام کا تذکرہ نہیں ہے، واقعہ کی کسی کڑی کے ذکر نہ کرنے سے پوری حدیث جھوٹی یا موضوع قرار پائے، عجیب درایت ہے، قوت فکر کے فقدان کی مثال اس سے بہتر شاید ہی ملے!

آپ نے تیمّم کی حدیث میں، جسے آپ صحیح سمجھتے ہیں، خود تسلیم کیا ہے کہ:

"اس حدیث میں سفر کی تعیین نہیں، اس لئے کہ حالات سفر بیان کرنا مقصود نہیں۔" (طلوع اسلام: ۵۵)

ٹھیک اسی طرح یہاں غزوہ کی تعیین مقصود نہ تھی۔

یہ عجیب منطق ہے، حدیث تیمّم میں سفر کا تعین نہ ہو، تو عمادی صاحب کے نزدیک صحیح، مگر حدیث إفک میں غزوہ کا نام نہ آئے، تو درایتاً موضوع، چہ خوش!

پھر آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ غزوہ کا تعین نہیں ہوا؟ پھر واقعات کا تعین دو طرح ہوتا ہے:

☆ کبھی مقام اور وقت کے تعین سے۔

☆ کبھی واقعات کے ذکر سے۔

جیسے عام الفیل، عام الرمادہ قحط کا سال، بڑی طاعون وغیرہ، جب تک سنہ ہجری مقرر نہیں کیا گیا، واقعات ہی سے اوقات کا تعین ہوتا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی غزوہ کے تعین میں منافقین کی نزاع اور سورہ

منافقوں کا تذکرہ کیا اور تیمّم کی فرضیت میں ہار کے گم ہونے کا ذکر فرمایا۔

بدوی قوموں میں اوقات کا تعین واقعات اور حوادث کی بنا پر ہوتا ہے، غرض حدیث افک میں وقت اور غزوہ کا تعین بھی موجود ہے۔

اہم واقعات کا بھولنا:

یہ بھی غلط ہے کہ اہم واقعات بھول نہیں سکتے، نسیان ایک قسم کا نقص اور بیماری ہے، بیماری کے لیے کوئی قانون نہیں، ہر چیز کا بھولنا ممکن ہے۔

① حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنبی کے تیمّم کا واقعہ بھول گئے، عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے یاد دلانے پر بھی ذہن میں نہ آیا، حالانکہ تیمّم کے لیے تمرّغ ایک اچنبا واقعہ تھا۔[1]

② متعة الحج کی اجازت تمام صحابہ کے لیے ایک حادثہ تھا، أشھر الحج میں عمرہ پر ان کو سخت تشویش تھی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے بھول گئے اور متعة الحج سے زمانہ خلافت میں روکا۔[2]

③ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے مطلقہ ثلاثہ کے متعلق اپنا ذاتی واقعہ بتایا کہ سکنیٰ اور نفقہ نہیں ملنا چاہیے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لا ندري أنسيت أم حفظت"[3]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب التيمم، باب المتيمم هل ينفخ فيهما، رقم الحديث (٣٣١) صحيح مسلم، كتاب الحيض، باب التيمم، رقم الحديث (٣٦٨) سنن أبي داود، كتاب الطهارة، باب التيمم، رقم الحديث (٣٢٢)

[2] صحيح مسلم: كتاب الحج، باب المتعة بالحج والعمرة، رقم الحديث (١٢١٧) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نسیان کی بنا پر نہیں، بلکہ مصلحت کی بنا پر یہ حکم جاری کیا تھا، دیکھیں: سنن النسائي (٢٧٣٥) لیکن ان کے اس فتویٰ کو ان کے صاحبزادے تک نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، دیکھیں: سنن الترمذي (٨٢٤)

[3] صحيح مسلم، كتاب الطلاق، باب المطلقة ثلاثا لانفقة لها، رقم الحديث (١٤٨٠) سنن أبي داود، كتاب الطلاق، باب من أنكر ذلك على فاطمة بنت قيس، رقم الحديث (٢٢٩١)

اس قسم کے بیسیوں اہم واقعات ہماری زندگی میں آتے ہیں، جو ذہن سے اتر جاتے ہیں، اقرباء اور اعزہ کی موت، پیدائش، نکاح ایسے اہم واقعات ذہن سے اتر جاتے ہیں، یہ روزمرہ کا تجربہ ہے۔

کسی واقعہ کی صحت کے لیے اس کی تاریخ، مقام، وقت کا تذکرہ کوئی شرط نہیں، یہ آپ کی خودساختہ درایت ہے، جو تجربہ کی کسوٹی پر صحیح نہیں اتر سکتی۔

قرآن عزیز نے آنحضرت ﷺ پر تہمت کا ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے:

﴿ما كان لنبيٍّ أن يغل ومن يغلل يأت بما غل يوم القيامة﴾ ❶

''نبی چوری نہیں کرتا، جو چوری کرے گا، وہ قیامت کے دن چوری سمیت آئے گا۔''

آنحضرت ﷺ کی ذات پر تہمت لگی، نہ لڑائی کا ذکر، نہ تاریخ کا بیان، یہ کیسے ممکن ہوگیا؟ نہ شخص کا ذکر جس نے تہمت لگائی!!

عمادی صاحب! یہ عجمی قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر گئے، سازش کامیاب ہوگئی، اتنے اہم واقعہ کی تاریخ تک نہیں بتائی، کہیں یہ آیت بھی موضوع تو نہیں؟!

معلوم ہے قراء سبعہ میں سے پانچ عجمی ہیں، آپ کے اس قانون سے قرآن عجمیوں کی نذر ہو رہا ہے، آپ کے پہلے قاعدہ میں ایک بھی عقل و درایت کی بات نہیں، جس پر کوئی غور کی زحمت کرے۔

رہی آپ کی توجیہ کہ منافقین نے اس وقت غزوے کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا، اسے دوسرے وقت پر ڈال دیا۔ وہ آپ کے بھائی ہیں اور ہم مذہب، غالباً آپ کے مشورہ سے ایسا کیا ہوگا اور آپ کو بتا دیا!

---

❶ آل عمران: ١٦١

دوسرا شبہ:

تمنا صاحب نے دوسرا شبہ پیدا کیا ہے کہ خالی محمل اونٹ پر کیسے رکھا گیا؟ ساربانوں کو یہ محسوس ہونا چاہیے تھا کہ محمل خالی ہے، چونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے ساربان محسوس نہیں کر سکے، لہٰذا حدیث موضوع ہے۔ (مختصراً)

ازالہ:

یہاں تمنا صاحب نے بے خبروں کی طرح بے ضرورت اجتماعات کا سلسلہ قائم کر دیا ہے، حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سوال کا جواب دے دیا ہے کہ عورتیں اس وقت ہلکی پھلکی تھیں۔ [1] جو سفر کی مشغولیت اور کوائف کو سمجھتا ہے اور مسافر کی نفسیات کو جانتا ہے، اسے حدیث کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی، جس شخص نے حج کا سفر اونٹوں پر کیا ہے، شغدف پر سوار ہوا ہے، قافلہ کی روانگی کے وقت مسافروں اور ساربانوں کے شور و شغب کو دیکھا ہے، اسے حدیث کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوگی۔

آج بھی بوریاں گم ہوتی، بستر ضائع ہوتے اور بھاری سامان تلف ہوتے دیکھا گیا ہے، ہمیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں ذرا بھی تعجب محسوس نہیں ہوتا۔

آج جب بسیں، موٹریں چل رہی ہیں، چیزیں گرتی بھولتی رہتی ہیں، گنی ہوئی سواریاں بس سے بچھڑ جاتی ہیں، کراچی اور جدہ کی بندرگاہوں پر منوں بھولا بسرا ہوا

[1] صحیح البخاري، کتاب المغازي، باب حدیث الإفك، رقم الحدیث (۳۹۱۰) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مندرجہ ذیل الفاظ سے مذکورہ اشکال کی مکمل نفی ہوجاتی ہے:

"وكان النساء إذ ذاك خفافا لم يهبلن ولم يغشهن اللحم إنما يأكلن العلقة من الطعام فلم يستنكر القوم خفة الهودج حين رفعوه وحملوه وكنت جارية حديثة السن فبعثوا الجمل وساروا"

مال ملتا ہے۔

معلوم نہیں عمادی صاحب کس دنیا میں بستے ہیں؟ پندرہ بیس سیر بوجھ کا بھولنا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا، رات میں اترنا، اپنے سامان کے پاس سونا، رفقاء کے ساتھ کھانا کھانا ایک حقیقت ہے اور یہ بھی حقیقت اور روز مرہ کے معمولات سے ہے۔ قضائے حاجت، نماز، وضو کے لیے آنحضرت ﷺ سے نہ اجازت کی ضرورت تھی، نہ اس میں کوئی تشویش ہے، نہ آنحضرت ﷺ کا مزاج اس قدر ہلکا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے رات چلتے محمل میں آوازیں دیتے رہیں کہ ہوشیار رہنا!

جو لوگ سفر کے عادی ہیں، وہ ان کوائف کو سمجھتے ہیں، اس میں کوئی بھی مشکل بات نہ تھی، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے عمادی صاحب کو یا تو ازدواجی زندگی سے سابقہ ہی نہیں پڑا یا پھر یہ تعلق کسی شریف خاندان میں نہیں ہوا، باہم بے اعتمادی کی وجہ سے عورتیں آنے جانے کی اجازت چاہتی ہوں گی، مولانا! میں بیت الخلاء جارہی ہوں، گھبرایئے گا نہیں! واپسی پر بھی اطلاع دیتی ہوں گی، نوٹ فرما لیجیے گا میں آ گئی! شریف گھرانوں میں یومیہ معمولات کا نہ احتساب ہوتا ہے، نہ اذن اور اطلاعات کی ضرورت!

قرینہ نمبر ۲ کی شقوں پر غور کرتے وقت مجھے ہنسی بھی آئی اور ندامت بھی ہوئی، اس لئے محسوس ہوا عمادی صاحب اس معاملہ میں معذور ہیں۔

بھول انسانی فطرت ہے:

بھول کے لیے کوئی قاعدہ نہیں، انسان منوں بوجھ بھول سکتا ہے، حدیث پر تو آپ کو یقین نہیں، قرآن پر غور کریں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے شاگرد کے ساتھ ایک نیک دل آدمی کی ملاقات کے لیے جا رہے تھے، نشان کے طور پر ایک مچھلی ہمراہ لے جا رہے تھے، آپ حضرات تو اسے مردہ نہیں سمجھتے ہوں گے، اس لیے لازماً برتن، پانی

مچھلی کا بوجھ پندرہ بیس سیر سے کم نہیں ہوگا۔

قرآن فرماتا ہے:

﴿ أرأ يت إذ أوينا إلى الصخرة فإني نسيت الحوت وما أنسانيه إلا الشيطان أن أذكره واتخذ سبيله في البحر عجبا ﴾ [1]

حضرت! ہم جب پتھر کے پاس ٹھہرے، میں شیطانی وسوسہ سے مچھلی بھول گیا اور وہ عجیب انداز سے پانی میں کود گئی۔

جس قدر احتمال آپ نے محمل اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بھول کے پیدا کیے ہیں، وہ سب یہاں ذہن میں لے آیئے اور پھر غور کیجیے کہ عجمی قرآن پر بھی ہاتھ صاف نہیں کر گئے؟ حدیث اور قرآن دونوں ہی سازش کا تختہ مشق تو نہیں بنے؟

ائمہ تاریخ کا خیال ہے کہ قراء سبعہ سے عرب صرف دو ہی تھے:

”وليس في هؤلاء السبعة من العرب إلا ابن عامر و أبو عمرو “

(الجواهر المضيئة:٢/ ٤٢٣)

عمادی صاحب کی نمبر۲ کی شقیں انتہائی مضحکہ خیز ہیں، ادارہ ”طلوع اسلام“ میں شاید کوئی سنجیدہ اور سمجھ دار نہیں جو ایسے مضامین کی اصلاح کرے!

پھر عمادی صاحب کا اسے خلاف دستور کہنا بھی غلط ہے، دستور دونوں طرح ہے، پردہ کے پابند گھرانوں میں اب بھی دستور ہے، مستورات شادیوں اور عام تقریبات کے وقت ڈولیوں میں بیٹھ جاتی ہیں، پھر کہار ڈولی اٹھا لیتے ہیں، یہی دستور محمل میں بھی ممکن ہے۔

سوم:

قرینہ نمبر۳ میں تمام رات محمل میں گزارنے وغیرہ احتمالات بالکل دیوانہ پن

---

[1] الكهف: ٦٣

ہے، حدیث میں صراحت موجود ہے:

" فقمت حين آذن بالرحيل "

میں اس وقت قضاءِ حاجت کے لیے گئی، جب آپ نے کوچ کا اعلان فرما دیا۔

رہا صحابیات کا ساتھ جانا جہاد کے سفروں میں جہاں کبھی بے پردہ ہونا پڑے، کبھی کندے پر مشکیزہ اٹھا کر زخمیوں کو پانی پلانا پڑے، مریضوں کی دیکھ بھال کرنا پڑے، یہ وضع داری محض تکلف ہے، خصوصاً جب کہ جنگل میں لشکر سے زیادہ دور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تمنا صاحب کا قرینہ نمبر۳ بالکل ہوائی انداز کا ہے اور جذباتی، عملی زندگی میں اس کی کوئی وقعت نہیں، یہ کوئی تقریب نہیں کہ سہیلیاں جمع ہو کر جائیں، ایسے سفروں میں ہر آدمی اپنی ضروریات کا خود کفیل ہوتا ہے۔

چہارم:

قرینہ نمبر۲ تغیر الفاظ کے ساتھ نمبر۳ کا اعادہ ہے، اس کا جواب قرینہ نمبر۲ کے جواب میں عرض کر آیا ہوں کہ شریف گھرانوں میں اتنی بے اعتمادی نہیں ہوتی کہ روزانہ کے معمولات میں آمد و رفت کی اجازت اور اطلاع دی جائے، اگر اجازت کا یہ غیر معمولی التزام ہوتا تو شاید روایت مشتبہ ہوتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ:

" فقمت حين اذن بالرحيل، فمشيت حتى جاوزت الجيش، فلما قضيت شأني أقبلت إلىٰ رحلي، فلمست صدري فإذا عقد لي من جزع أظفار قد انقطع، فرجعت فالتمست عقدي، فحبسني ابتغاؤه "

کوچ کا اعلان ہوتے ہی قضاءِ حاجت کے لیے لشکر سے باہر چلی گئی، فراغت کے بعد میں اپنے ڈیرے کے پاس آ گئی، میں نے گلا ٹٹولا تو ہار نہیں تھا، میں اسی وقت واپس گئی اور اس کی تلاش ہی نے مجھے وہاں باہر روکے رکھا۔

بالکل فطری اور طبعی انداز ہے، جانے کی اجازت سفر کی نفسیات کے خلاف ہے، مدینہ واپسی پر ام مسطح کے ساتھ جانا وہ بھی اتفاق ہے، نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے بلایا، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ساتھ بھیجا، گو بیماری کی وجہ سے ایسا ہونا اتفاق ہو گیا۔

پنجم:

قرینہ نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے مضمون نگار پر دورے کی کیفیت طاری ہے، جب حدیث میں موجود ہے:

" أتينا الجيش بعد ما نزلوا موغرين في نحر الظهيرة "

ہم ظہر کے وقت لشکر میں پہنچے۔

پھر فرمایا:

" آذن ليلة بالرحيل "

رات کو کوچ ہوا۔

دوپہر کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لشکر میں پہنچ گئی، مغرب کے وقت تلاش، عشاء کی نماز، رات خیمہ میں آپ کے ساتھ کھانا کھانا، جو اس کی خرابی کا اثر معلوم ہوتا ہے، کوچ آخر شب، نزول دوپہر، احتمالات سب بے کار اور بے محل ہیں۔

ششم:

حدیث افک میں رواۃ نے غزوہ کا ذکر کیا ہے، آپ اپنے معتوب امام المغازی محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کا طریق ملاحظہ فرمائیں:

" فلما كان غزوة بني المصطلق أقرع بين نسائه كما كان يصنع فخرج سهمي " (روض الأنف: ۲/ ۲۲۰)

غزوہ بنی المصطلق میں قرعہ ڈالا گیا، تو میرا نام نکل آیا۔

عمادی صاحب کی عقل پر رحم آتا ہے، اپنی کم علمی کا جرم بے چارے حدیث کے سر تھوپ رہے ہیں، رات کے وقت کوچ کا وقت بھی اسی محمد بن اسحاق کی روایت میں مرقوم ہے:

"حتى إذا كان قريباً من المدينة نزل منزلا فبات به بعض الليل ثم آذن في الناس بالرحيل" (أيضاً: ٢/ ٢٢٠)

مدینہ منورہ کے قریب آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا، رات کا کچھ حصہ آرام فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے کوچ کا اعلان فرمایا۔

ظاہر ہے کہ پڑاؤ کرنے کے بعد قافلہ سو جائے، تو وہ کوچ آخر شب ہی کو کر سکتا ہے اور اس سفر میں منافقین کی شرارت کے سبب ایک موقع پر پورے چوبیس گھنٹے حضور ﷺ نے پڑاؤ کی اجازت نہیں دی،[1] ایسے حالات میں نیند اور سفر کی کوفت کا تقاضا ہے کہ ساتھی آرام کر لیں۔

عمادی صاحب فرماتے ہیں:

''راوی بڑا چالاک ہے، اس نے یہ نہیں بتایا کہ چاندنی رات تھی یا اندھیری رات تھی؟''

عمادی صاحب! اگر عقل کو چور نہیں لے گئے، تو اتنا سوچیے کہ یہ بھی کوئی وضع کی دلیل ہو سکتی ہے؟ تیمم کے متعلق آپ نے جس حدیث کو صحیح مانا ہے، رات کی کیفیت اس میں بھی مرقوم نہیں، صرف ہار مل جانے کا وقت مرقوم ہے، آپ عقل کا علاج کرائیے!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: مجھے ہار مل گیا، سو اب اس حماقت نوازی سے کیا فائدہ کہ دانے بکھرے یا نہیں؟ ہار کہاں سے ٹوٹا؟ ہاتھ تو آلودہ نہیں ہوا؟ اس یا وہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: سيرة ابن هشام (٢/ ٢٩٠) تاريخ الطبري (٢/ ١٠٩) البداية والنهاية (٤/ ١٥٧)

گوئی کا نام آپ کے ہاں درایت ہے؟!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار دو دفعہ گم ہوا ہے، ایک دفعہ بنی المصطلق میں، دوسرا واقعہ غزوہ ذات الرقاع میں ہوا۔

سید صاحب کا خیال ہے دوسرا واقعہ بھی اس سفر میں ہوا۔ اگر یہ خیال درست ہوتو ظاہر ہے کہ ہار کی لڑیاں کمزور تھی، سید صاحب کی سی دقت نظر آپ کو کہاں نصیب؟ رہے آپ کے شبہات، وہ تارِ عنکبوت ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غیب دان نہیں تھیں، جو معلوم ہوتا کہ ہار ٹوٹ جائے گا، تو ہار گوندنے کا سامان لے کر چلتیں اور یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایسے عقل فروش اصحاب سے سابقہ پڑے گا!

طحاوی کی ایک روایت سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا ہی سفر تھا:

" قالت: أقبلنا مع رسول الله ﷺ في غزوة له حتى إذا كنا بالمعرس قريباً من المدينة نعست من الليل وكانت علي قلادة تدعى السمط تبلغ السرة فجعلت أنعس فخرجت من عنقي فلما نزلت مع رسول الله ﷺ لصلوة الصبح قلت يا رسول الله خرت قلادتي من عنقي. فقال: أيها الناس إن أمكم قد ضلت قلادتها فابتغوها " (معانی الآثار: ١/ ٦٦)

ہم کسی غزوہ سے واپسی پر مدینہ کے قریب نماز صبح کے لیے اترے، رات کو اونگھنے میں میرا ہار جو ناف تک لمبا تھا، میرے گلے سے نکل گیا، میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرا ہار گم ہوگیا ہے، حضور ﷺ نے لوگوں سے فرمایا، تمہاری ماں کا ہار گم ہوگیا ہے، تلاش کرو، چنانچہ ہار مل گیا۔

اس حدیث میں نہ زہری ہیں نہ ابن اسحاق، البتہ ابن لهیعه [1] ہیں، بقول

---

[1] اس سند میں ابن لهیعه سے عبداللہ بن وہب روایت کرتے ہیں، جن کی ابن لهیعه سے روایت صحیح ہوتی ہے، کیونکہ ان کا ابن لهیعه سے سماع قبل از اختلاط ہے۔ (الضعفاء للعقیلی: ٢/ ٢٩٥) لیکن اس سند میں ابن وہب سے روایت کرنے والے " أحمد بن عبدالرحمن بن وهب " متکلم فیہ ہیں، دیکھیں: تهذيب التهذيب (١/ ١٤٧)

عمادی صاحب یہ بھی بڑے چالاک نکلے، نہ غزوہ کا نام لیا ہے نہ رات کے متعلق بتایا کہ رات چاندنی تھی یا اندھیری رات؟ نہ یہ بتایا ہے کہ لڑائی میں کتنے آدمی شریک تھے؟ نہ یہ بتایا کہ تلاش کے لیے کون کون گیا؟ نہ یہ بتایا ہے کہ ہار کس کو ملا اور کتنی جستجو کے بعد ملا اور اس چالاک راوی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ صبح کتنے بجے ملا اور راوی کیسے گیا؟ اور راوی نے یہ بھی چالاکی کی ہے کہ پتہ نہیں دیا کہ ہار سونے کا تھا یا چاندی کا یا جزع کا؟ اور چالاکی ملاحظہ ہو کہ یہاں ذات الجیش کی بجائے معرس کہہ دیا ہے!

عمادی صاحب قبلہ! آپ بھی معذور ہیں، اپنی عقل درست نہ ہو تو ساری دنیا چالاک بن جاتی ہے، ورنہ رواۃ بے چارے متدین تھے، ان کو کیا معلوم تھا کہ ایسے عقل مند آئندہ درایت کی آڑ میں اس طرح حملہ آور ہوں گے، آپ کی مسکنت تو آپ کی درایت سے ظاہر ہے!

آپ فرماتے ہیں:

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جہاد میں رہیں، ان کو ہار کی کیا ضرورت تھی اور پھر عاریتاً لینا تو عزت نفس کے خلاف تھا۔"

جس دوسری حدیث کو آپ نے صحیح مانا ہے، جو بواسطہ امام مالک رحمہ اللہ تیمم کے متعلق مروی ہے، اس غزوہ میں بھی ہار موجود تھا، "بعض أسفارہ" سے مراد "غزواتہ" ہونا چاہیے، طحاوی کی روایت بواسطہ ابن لہیعہ میں "غزواتہ" کی تصریح ہے۔

پھر یہ ہار بھی مستعار تھا، جب عاریت کا ذکر زہری کی روایت میں آ جائے، تو روایت درایتاً موضوع، جب عاریت کا ذکر ہشام کی روایت میں آئے، تو روایت درایتاً صحیح، اشخاص سے دشمنی ہے یا کسی اصول کا تتبع؟

" حدثنا زكريا بن يحيىٰ قال حدثنا عبدالله بن نمير قال حدثنا

هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة أنها استعارت من أسماء قلادة فهلكت فبعث رسول الله ﷺ في طلبها[1] " الخ (پ:۲،۱/ ۲۱۹)

میں نے ہار عاریتاً لیا تھا، جو اس سفر میں گم ہوگیا۔

وضع کے یہ دونوں قرائن حدیث تیمّم میں موجود ہیں، یہ امام مالک اور ہشام بن عروہ سے مروی ہیں، جسے آپ نے صحیح مانا ہے۔ (طلوع: ۵۰)

عمادی صاحب! ائمہ حدیث کے خلاف لکھنا آسان نہیں، یہ طلوع اسلام کا دفتر نہیں، جہاں پر جہالت اور حماقت کا عنوان ''مخصوص انداز'' ہے،[2] آپ کے ان قرائن کو قبول کرلیا جائے تو نہ قرآن عجمی سازش سے بچتا ہے نہ حدیث، اس درایت کو حماقت کے مترادف سمجھنا چاہیے!

ہفتم:

اس قرینہ کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اثناءِ سفر میں بالکل نظر انداز کر دیا، نماز وغیرہ کے اوقات میں بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق دریافت نہیں فرمایا۔

عمادی صاحب کا یہ پیرا محض تصنع اور لفاظی ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں، اس کا جواب ۴، ۵ میں عرض ہو چکا ہے۔

عمادی صاحب نے جو حدیث صحیح بخاری سے خود نقل فرمائی ہے، اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خود رات کو پڑاؤ کے بعد رات کے آخری حصہ میں آپ

---

[1] صحيح البخاري: كتاب التيمم، باب إذا لم يجد ماء ولا ترابا، رقم الحديث (٣٢٩)

[2] یہ ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے، جو تمنا عمادی کے مضمون سے قبل مجلّہ ''طلوع اسلام'' میں لکھے گئے تھے کہ ''علامہ تمنا عمادی مدّظلہ نے اپنے مخصوص انداز میں ان روایات سے پردے اٹھا کر حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔'' (طلوع اسلام: ۳۳، بابت اگست وستمبر ۱۹۶۴ء)

نے کوچ فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے ہار کی وجہ سے بچھڑ گئیں، صبح کی نماز راستہ میں آئی، آغاز دوپہر ہی میں حضرت عائشہ پہنچ گئیں، ابن اسحاق کے الفاظ اس طرح ہیں:

" فانطلق سريعا يطلب الناس فوالله ما أدركنا الناس وما افتقدت حتى أصبحت ونزل الناس فلما اطمأنوا طلع الرجل يقود بي " (روض الأنف مع ابن هشام: ۲/ ۲۲۰)

صفوان بن معطل قافلہ کی تلاش میں بہت تیز چلا، صبح تک نہ ہم قافلہ میں پہنچے نہ میرے فقدان کا کسی کو احساس ہوا، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، لوگ اتر کر مطمئن ہوئے ہی تھے، صفوان مجھے لے کر پہنچ گیا۔

ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت سے واپس آئیں، تو ہار کے فقدان کا احساس ہوا، اسی وقت واپس گئیں، قافلہ حسب دستور چلا گیا، صرف نماز فجر راستہ میں آئی، پڑاؤ کے بغیر اگر قافلہ راستہ میں ٹھہرے، تو پورا سامان نہیں اتارا جاتا، اونٹ لدے کھڑے رہتے ہیں، سواریاں اتر کر نماز پڑھتی ہیں، ایسے وقت میں حسب گنجائش عورتیں نماز مردوں کے ساتھ پڑھیں یا الگ، جماعت ہو یا اپنی اپنی نماز ادا کریں، بہر حال قافلہ کی گنتی نہیں ہوتی، نہ ہی ایسے سفر میں سب اچھا کا دستور ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد لازماً ہر ایک کو خود اپنے اونٹ کی طرف جانا چاہیے، اس لئے اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف غلس [اندھیرے] میں توجہ نہ ہو تو بالکل ممکن ہے، ہر وقت محمل کے ساتھ مرد چمٹے رہیں، یہ کوئی معقول طریقہ نہیں، قافلہ اترنے کے بعد جب سامان سنبھالا گیا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گمشدگی کا پتہ چلا، معاً صفوان بن معطل پہنچ گئے، منافقین کو بات ہاتھ آئی، انھوں نے شور مچا دیا، اس میں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی اعتراض ہے، نہ صفوان رضی اللہ عنہ پر، منافقین کو اعتراض ہو سکتا تھا سو ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دستور کے مطابق شریفانہ طور پر اپنی ذمہ داری کو پورا فرمایا،

اللهم صل وسلم عليه وآله وأزواجه أجمعين !

ہشتم:

عمادی صاحب نے قصہ افک کے وضع کا آٹھواں قرینہ یہ بیان فرمایا ہے کہ رواۃ نے پورے سفر میں نماز اور اس کے اوقات کا ذکر نہیں کیا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ (معاذ اللہ) حدیث کا واضع بے نمازی تھا، اس لئے اس نے اس قصہ کے تذکرہ میں نماز اور اس کے اوقات کو نظر انداز کر دیا، لہٰذا یہ پورا قصہ وضعی ہے، محدثین کو سادگی کی وجہ سے اس درایت غامضہ کا علم نہ ہو سکا اور عمادی صاحب نے نہایت دانشمندی سے اس کا کھوج لگا لیا!

ہماری نظر میں عمادی صاحب بھی کافی سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں، درایت کے شوق میں بسا اوقات علم اور عقل سے دست کش ہو جاتے اور ایسی بہکی بہکی باتیں کر جاتے ہیں، جنھیں سن کر شرم سی محسوس ہوتی ہے۔

أولاً: اس قصہ میں بے شک نمازوں کے اوقات کا بالاستیعاب ذکر نہیں، نہ ہی اس کی ضرورت تھی، ضرورت کے لحاظ سے حدیث کے بعض طرق میں نماز صبح اور تیمّم کا تذکرہ موجود ہے، جب مقصد اور موضوع کلام اور ہو، تو خواہ مخواہ نمازوں کا تذکرہ خلاف دانش ہوتا اور اگر یہ تذکرہ آجاتا تو شاید عمادی صاحب اس تفصیل اور تذکرہ ہی کو وضع کا قرینہ قرار دے لیتے!

ثانیاً: قرآن مجید میں انبیاء اور صلحاء کے کئی اسفار کا ذکر موجود ہے، لیکن نماز کا نام تک نہیں لیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلا سفر مدین کی طرف، سفر کی انتہاء پر مدین کے ایک نیک آدمی سے ملاقات ہے، اس کی لڑکیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان الفاظ میں سفارش فرمائی:

﴿ يآ أبت استأجره إن خير من استأجرت القويُّ الأمين ﴾ [1]

ابا جان ! اسے کام کاج کے لیے گھر میں بطور مزدور رکھ لیجئے، یہ قوت اور امانت کے لحاظ سے بہترین آدمی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے یہاں بطور اجیر دس سال قیام فرمایا، پھر بمع اہل و عیال سسرال سے واپس ہوئے، راستہ میں اہلیہ نے سردی محسوس فرمائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ دیکھی اور فرمایا:

﴿ قال لأهله امكثوا إنِّي آنست نارا لعلي آتيكم منها بخبر أو جذوة من النار لعلكم تصطلون ﴾ [2]

بیوی کو فرمایا: تم یہاں ٹھہرو، میں آگ لاتا ہوں، تا کہ تم اس سے تاپ سکو۔

وادی مقدس سے نبوت ملنے کے بعد مصر پہنچے، پورے مصر میں نماز کا کوئی ذکر نہیں، معلوم ہوتا ہے عجمی سازشی نے قرآن عزیز پر بھی ہاتھ صاف کر لیا، عمادی صاحب کی درایت کا تقاضا تو یہی ہے، یا پھر موسیٰ علیہ السلام بزعم عمادی صاحب بے نماز ہوں گے!

عمادی صاحب بے خبر نہ ہوں گے، منکرین حدیث کا ایک گروہ موجودہ نماز کو بھی عجمی سازش کی پیداوار سمجھتا ہے، اس قوم کی درایت کا خدا حافظ، ایک نماز کو عجمی پیداوار سمجھتا ہے اور دوسرا حدیث کو اس لئے موضوع کہتا ہے کہ اس میں نماز کا ذکر نہیں! ﴿ مالكم كيف تحكمون ﴾ [3]

سورہ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ایک شاگرد کی ایک علمی مہم کا ذکر ہے، جو مجمع البحرین تک کئی دن جاری رہی، پھر اس نیک آدمی کی معیت میں

---

[1] القصص: ٢٦

[2] القصص: ٢٩

[3] الصافات: ١٥٤

مظاہر قدرت دیکھنے کے لیے معلوم نہیں کتنی مدت سفر کیا، پھر یہ سفر معلم اور متعلم کی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ختم ہوگیا، لیکن پورے سفر میں نماز کا ذکر نہیں، حالانکہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام بھی نبی تھے اور ان کا میزبان بھی نبی معلوم ہوتا ہے:

﴿ فوجدا عبدا من عبادنا آتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علما ﴾ [1] (کہف)

ان کی ملاقات ہمارے ایسے بندے سے ہوئی، جسے ہم نے اپنی رحمت اور علم سے نوازا تھا۔

لیکن سفر کی پوری سرگزشت میں نماز کا کوئی تذکرہ نہیں۔ کیا فرماتے ہیں حضرات مدعیان درایت! یہاں بھی یہ عجمی قراء قرآن پر تو اپنا کام نہیں کر گئے؟

اس کے ساتھ ہی ذوالقرنین کے سفر کا تذکرہ ہے، [2] جو فتوحات کے سلسلہ میں مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال اور حدود چین تک فرمایا، قرآن نے اس کی ضروری تفصیلات اور اس وقت کے بین الاقوامی حالات کا تذکرہ کیا ہے اور ذوالقرنین کی دینی، قومی اور ملی خدمت کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

عمادی صاحب فرمائیں! ذوالقرنین بے نمازی تھا یا قرآن بھی فارسی سازش کا شکار ہوگیا؟

قرآن عزیز نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سفر کا ذکر فرمایا، جو وطن مالوف سے شروع ہوا اور براستہ مصر فلسطین پر منتہی ہوا، اس میں حضرت لوط علیہ السلام بھی شریک سفر تھے، ایک عظیم ابتلاء کے بعد ہجرت کا سفر پیش آیا، لیکن کہیں نماز کا ذکر نہیں ملتا، حضرات مدعیان درایت ارشاد فرمائیں! یہ وضع کا قرینہ قرآن میں کہا سے آ گیا؟

---

[1] الکھف: ٦٥

[2] دیکھیں: الکھف: ٨٣ وما بعدہ

سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کا سفر مذکور ہے، قرآن عزیز نے یوسف علیہ السلام کے علم وفہم، زہد وتقویٰ کا تفصیلی تذکرہ، قید، براءت، جیل کے وعظ، پھر تمکن فی الارض، عفت اور قحط میں سات سال تک راشن کی تقسیم فرمائی اور عزیز مصر کے عہدہ تک پہنچے، مگر نماز کا تذکرہ نہیں۔ عمادی درایت کا تقاضا تو یہی ہے کہ سورہ یوسف کو وضع وتخلیق سے متاثر سمجھ لیا جائے!

قرآن عزیز میں انبیاء اور صلحاء کے سفروں کا تذکرہ چونکہ مقصود نہ تھا، اس لیے واقعہ ذکر ہوا، نماز کا ذکر نہیں، عمادی صاحب یا تو قرآن کو موضوع اور مختلق سمجھیں یا پھر اپنی اس درایت کو کسی پرانے قبرستان میں دفن فرمادیں!

اور ہاں عمادی صاحب! امام مالک رحمہ اللہ اور ہشام بن عروہ رحمہ اللہ کی روایت میں بھی صرف صبح کی نماز کا ذکر ہے، باقی سارے سفر میں نماز کا ذکر نہیں، لیکن اس کو آپ نے صحیح تسلیم کیا ہے!

اصل بات یہ ہے کہ عدم ذکر سے عدم شے لازم نہیں آتا، تاریخی حوادث میں غیر متعلق واقعات کا تفصیلی تذکرہ کوئی عقل مند نہیں کرسکتا۔

نہم:

عمادی صاحب فرماتے ہیں:

اس تنہائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رونا چاہیے تھا، غش کھا کر گرنا چاہیے تھا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نیند کیسے آ گئی؟ حدیث میں چونکہ ان واقعات کا ذکر نہیں بلکہ نیند کا ذکر ہے، اس لیے حدیث موضوع ہے۔

عقل کے دشمنوں سے کیا عرض کیا جائے؟ ایسے مواقع میں رونا اور گھبرانا انتہائی حماقت ہے، جذبات پر کنٹرول سب سے بڑی خوبی ہے، ام المومنین رضی اللہ عنہا نے

صبر ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اسی ماحول میں رک گئیں اور یہی خیال درست تھا، گم شدگی کے احساس میں یقیناً تلاش کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم وہاں آئیں گے، پھر مدینہ کے قریب ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ گھبراہٹ بھی نہ تھی، یہ دارالحرب نہ تھا، جہاں آبرو خطرہ میں ہوتی، یقیناً اس ماحول کے لوگ مسلمان تھے یا اسلام سے مانوس، صفوان نہ بھی ملتا تو علاقہ کے لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ضرور پہنچاتے، اس لیے فی الواقعہ گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی، البتہ تخلف کا طبیعت پر اثر ہوگا، پہنچنے کے اسباب کے ظاہری فقدان کا فکر ضرور تھا، ایسے وقت اونگھ اور غنودگی بالکل فطری چیز ہے۔

عمادی صاحب! کبھی کبھی قرآن پڑھا کیجیے:

﴿ إذ يغشيكم النعاس أمنة منه وينزل عليكم من السماء ماء ليطهركم به ﴾ ❶

﴿ ثم أنزل عليكم من بعد الغم أمنة نعاسا يغشىٰ طائفة منكم ﴾ ❷ (۳/ ۱۵۳)

عین ہنگامہ کارزار میں اہلِ ایمان پر نیند اور اونگھ مسلط فرما دی گئی۔

عمادی صاحب! فکر کیجیے، قرآن پر بھی عجمی ہاتھ صاف کر گئے، لالہ زار زمین جس پر نعشوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، مومن آرام فرما رہے ہیں۔

فرمائیے! یہ آیت تو موضوع اور مکذوب نہیں؟ آپ کے خیال میں انھیں ماتم کرنا چاہیے تھا!

دہم:

پھر نماز کا ذکر چھیڑا ہے اور پہلے ۸، ۹ میں نماز نہ پڑھنے کی خود تردید کی ہے،

❶ الأنفال: ١١

❷ آل عمران: ١٥٤

مگر گم شدگی کی صبح کے متعلق فرماتے ہیں:

”بلکہ فجر کی نماز تک نہیں پڑھی۔“

خدا جہالت سے بچائے عدم ذکر سے عدم وجود کہاں ثابت ہوا؟ یقیناً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نماز پڑھی ہوگی، ترک کا احتمال ہی نہیں اور نہ ذکر کی ضرورت تھی، ۷، ۸، ۹، ۱۰ میں تکرار محض ہے اور طول کلام۔

عمادی صاحب نے اس مضمون میں ائمہ حدیث کو خبیث، منافق، بے دین، بے نماز، بہتان تراش، چالاک، وضاع، کذاب، خبیث النفس وغیرہ قسم کی گالیاں دی ہیں، اگر قصاص لیا گیا تو آپ کو تکلیف ہوگی، قلم سب کے ہاتھ میں ہے۔

ایک گزارش:

عمادی صاحب نے بعض معاملات کے ذکر نہ کرنے کی وجہ سے ائمہ حدیث کو بے ایمان، خبیث، چالاک، خبیث النفس تک کہا ہے، حالانکہ یہ الفاظ کا تنوع ہے، محدثین حسب مواقع احادیث مختصر یا مفصل بیان فرما دیتے ہیں، اس میں کوئی بد دیانت یا خبیث نہیں ہوتا، بلکہ وہ اقتضاءِ حال کے مطابق تنوع فرماتے ہیں، اہل فن اسے سمجھتے ہیں، جاہل اور ناواقف اس سے بعض اوقات پریشان ہوتا ہے۔

صحیح بخاری مع کرمانی كتاب بدء الخلق حدیث نمبر (۳۱۷۳) میں قصہ افک کو پورے اختصار سے ذکر فرمایا، کئی چیزیں چھوڑ دیں ہیں:

”حدثنا محمد بن سلام أخبرنا ابن فضيل حدثنا حصين عن سفيان عن مسروق“

اس میں نہ زہری ہیں نہ ابن اسحاق، مسروق کے سماع کی بحث کے سوا سند بالکل صحیح ہے اور مسروق کے سماع کا مسئلہ بھی ”سألت أم رومان“ کی صراحت سے

حل ہو جاتا ہے۔

آپ اپنی لاعلمی اور بے مائیگی پر بھی کبھی سوچا کیجئے، جب آپ اس فن سے بے خبر ہیں، تو آپ کو کس طبیب نے کہا ہے کہ آپ اس میں ضرور دخل دیں؟ پرویز صاحب اس باب میں خوب ہیں، وہ فن کی کسی چیز پر گفتگو نہیں فرماتے، لیڈرانہ انداز سے بالا بالا گزر جاتے ہیں اور آپ پر ''مخصوص انداز'' میں طنز کر جاتے ہیں۔

دوسری حدیث:

عمادی صاحب نے اس عنوان کے تحت حدیث تیمّم کا ذکر فرمایا ہے اور شکر ہے کہ اسے تسلیم کیا ہے، مگر ساتھ ہی فکری اختلال میں مبتلا ہو گئے ہیں، وہ یہ فیصلہ نہیں فرما سکے کہ تیمّم کا واقعہ بھی غزوہ بنی المصطلق میں ہوا یا کسی دوسرے موقعہ پر؟ اور یہ فیصلہ ان کے بس کی چیز بھی نہیں ہے، بہر کیف چند مسائل میں ان کا ذہن کچھ صاف بھی ہوا ہے۔

زہری کی روایت میں غزوہ کا نام مرقوم نہ ہونے کی وجہ سے عمادی صاحب اسے وضعی قرار دیتے ہیں، لیکن اس حدیث میں غزوہ کا نام مرقوم نہ ہونے کے باوجود اسے تسلیم فرماتے ہیں، کیونکہ یہ امام زہری سے مروی نہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس لیے بھی صحیح ہے کہ اس میں ہار کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ملکیت ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ ''کتاب التیمم'' کی تیسری حدیث میں اس طرح مروی ہے:

" حدثنا زكريا بن يحيىٰ قال حدثنا عبدالله بن نمير قال حدثنا هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة أنها استعارت من أسماء قلادة فهلكت فبعث رسول الله ﷺ رجلا فوجدها فأدركتهم

الصلوۃ ولیس معھم ماء" الخ (۱/ ۲۱۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی بہن اسماء رضی اللہ عنہا کا ہار مستعار لیا اور وہ اسی جگہ گم ہوا جہاں پانی نہیں تھا۔

ہار مستعار لینے کے باوجود حدیث تیمّم صحیح رہ سکتی ہے، تو امید ہے کہ عمادی صاحب امام زہری کو بھی معاف فرما دیں گے۔

ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند [1]

نیز عمادی صاحب ہشام بن عروہ کی روایت کو بھی تسلیم فرمالیں، تو ایک اور مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے، اس کے دو راوی زکریا بن یحییٰ اور عبداللہ بن نمیر کوفی ہیں، اور جس حدیث کو عمادی صاحب نے تسلیم فرمایا ہے، اس کے پہلے راوی عبداللہ بن یوسف مدنی نہیں ہیں، غالباً کوفی ہوں گے یا شامی، [2] اس سے اتنا تو ثابت ہوگا اگر عمادی صاحب کو معلوم نہ ہو، تو کوفی بھی سچ بول سکتے ہیں اور ان کی حدیث صحیح ہو سکتی ہے۔

نیز فرمایا ہے کہ مستعار ہار کی روایات صحیح سے خارج ہیں، صحاح میں نہیں، عمادی صاحب کو یہ تو معلوم ہوگا کہ صحیح بخاری بھی صحاح ہی میں ہے اور یہ بخاری کی روایت ہے، عمادی صاحب کے مطالعہ کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ فرماتے ہیں:

> "افک والی مکذوبہ روایت جو صحیح بخاری میں ہے، اس میں تو یہ ذکر نہیں کہ وہ ہار منگنی کا تھا، اپنی بہن حضرت اسماء سے منگنی کا مانگ کر پہن کر آئی تھیں، یہ صحاح سے باہر کی روایت میں ہے۔"

حالانکہ یہ روایت صحیح کے "کتاب التیمّم" میں تیسری روایت ہے۔

ادھار طلب کرنا:

---

[1] یہ گناہ آپ کے شہر میں بھی ہو رہا ہے!

[2] وہ مصری ہیں، لیکن اصلاً دمشقی تھے، دیکھیں: تقریب التھذیب (ص: ۳۳۰) تھذیب التھذیب (۶/ ۷۹)

پہلے بھی اور یہاں بھی عمادی صاحب نے بہت زور دیا ہے کہ مانگنا عزت نفس کے منافی ہے، ممکن ہے یہ کسی حد تک درست ہو، لیکن غریب معاشروں میں کام ہی عاریت پر چلتے ہیں، آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا، تو درع گروی تھی اور وہ بھی یہودیوں کے پاس،[1] زندگی میں حضرت ﷺ نے کئی دفعہ قرض لیا، اب بڑے بڑے سرمایہ دار بنک کے مقروض ہیں، حکومتیں مقروض ہیں، اسے "أبغض الحلال" کہیے، مگر ہے حلال، آپ کے پاس وضع کی مشین موجود ہے، ان احادیث کو موضوع کہہ دیجیے، اہل علم تو سوچے بغیر یہ جراءت نہیں کر سکتے۔

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہار اپنی بہن سے لیا ہے، یہاں عزت نفس کا سوال حماقت ہے، عزیز و اقارب میں یہ سلسلہ کبھی معیوب سمجھا ہی نہیں گیا، عمادی صاحب شاید آسام یا افریقہ کے جنگلوں میں رہتے ہوں گے!

پھر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ہار جہیز میں ملا تھا، یہ کوئی بحث نہیں، ہار متعدد ہو سکتے ہیں، ہوسکتا ہے ہار اصلاح کے لیے یا زیتون سے دھونے کے لیے دیا ہو، کیونکہ جزع کا ہار زیتون میں صاف کیا جاتا ہے، یہ یہاں بے ضرورت بحث ہے، مستعار والی روایت بخاری کی ہے۔

اس کے بعد صفوان بن معطل کے متعلق ابو داود[2] کی روایت کی تضعیف کے متعلق بے ضرورت بحث چھیڑ دی ہے، اگر "الصحابه كلهم عدول" بطور اصول اہل سنت درست ہے، تو یہ بحث بے سود ہے، اگر آپ اس اصول کو قبول نہیں فرماتے اور روافض اور خوارج کی طرح آپ ان پر تنقید درست سمجھتے ہیں، تو پہلے اسی اصل پر

---

[1] صحيح البخاري: كتاب البيوع، باب شراء النبي ﷺ بالنسيئة، رقم الحديث (١٩٧٢)
صحيح مسلم: كتاب المساقاة، باب الرهن، رقم الحديث (١٦٠٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٥٩)

بحث فرمائیے، پھر ابو داود کی حدیث پر بحث ہو سکے گی۔

جہاں تک عمادی صاحب کے شبہات کا تعلق ہے، ان پر روایتاً اور درایتاً بحث ہو چکی ہے۔

''کسر رہ گئی!''

عمادی صاحب کا مضمون '' قصہ افک'' کے متعلق جو کچھ تھا، وہ آپ کے سامنے ہے، لیکن '' طلوع اسلام'' کے ادارہ میں کوئی صاحب فرماتے ہیں، عمادی صاحب کے شاہکار میں کسر رہ گئی، وہ فرماتے ہیں:

'' لیکن جب تک روایت کا باقی حصہ سامنے نہ لایا جائے، اس سازش کی گہرائی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔''

اب یہ حضرت گہرائی کی پیمائش کے لیے تشریف لائے ہیں، یہ پیمائش تقریباً پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، یہ حضرت قرآنی تعلیمات سے بے خبر اور ذہانت سے خالی معلوم ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

> '' سورہ نور میں تہمت کی سزا اسّی درے مقرر کی گئی ہے اور ایسے شخص کی شہادت مقبول نہیں، الزام کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی ضرورت ہوگی، معلوم ہوتا ہے مدینہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا اور یہ ہدایات اسی واقعہ کو سامنے لا کر دی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کا واقعہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے کسی کے متعلق ہوتا، تو قرآن اس کا بیان تصریحاً کرتا۔''

(ص: ۵۵ مختصراً)

قرآن عزیز نے یہاں پر عام حکم فرمایا ہے، جس میں ازواج مطہرات اور ''المحصنات المؤمنات'' برابر شامل ہیں:

﴿ والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا بأربعة شهداء فاجلدوهم

ثمانين جلدة ﴾[1] (الآية)

جو پاکباز عورتوں پر تہمت تراشی کریں اور چار گواہ مہیا نہ کر سکیں، تو اس کو اسّی کوڑے لگائیں جائیں۔

﴿ إن الذين يرمون المحصنات الغافلات المؤمنات لعنوا في الدنيا والآخرة ولهم عذاب عظيم ﴾[2] (۲۲/ ۲۳)

جو لوگ بے خبر پاکباز مومن عورتوں پر الزام لگاتے ہیں، ان پر اللہ کی لعنت ہے اور بہت بڑا عذاب۔

علامہ طلوعی فرماتے ہیں کہ

''مدینہ میں کوئی واقعہ ہوا ہوگا، لیکن ازواج مطہرات سے اس کا تعلق نہیں''

سمجھ میں نہیں آتا کہ ''طلوع اسلام'' کا منشاء کیا ہے؟ ظاہر ہے قرآن حکیم نے تہمت تراش حضرات کے خلاف ملک کے شرفاء کو ایک قانونی تحفظ دیا ہے، قرآن کے عمومی قانون کا منشاء یہ ہے کہ:

''یہ تحفظ خاندان نبوت اور تمام شرفاء مسلمین کے لیے برابر ہے۔''

کیا ''طلوع اسلام'' کا منشاء یہ ہے کہ:

''خاندان نبوت اس تحفظ سے مستثنیٰ ہے؟ ان کے خلاف منافقین کو حق ہے کہ وہ تہمت تراشی کریں اور ان مقدس انسانوں کو بدنام کریں۔''

خیال یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی یہ مفہوم پسند نہیں کرے گا۔

قصہ افک میں اس اس کے سوا کچھ نہیں کہ خاندان نبوت کے ایک مقدس فرد کو ایسے آبرو باختہ افراد سے سابقہ پڑا، قانون نے مقدور بھر اس کی حمایت کی، اپنے

---

[1] النور: ٤

[2] النور: ٢٣

آدمیوں کو بھی سزا سے مستثنیٰ نہیں کیا، عبداللہ بن ابی (منافق) کو اتنا گندہ کیا کہ قیامت تک اس پر لعنتیں برستی رہیں گی۔ اس استثناء کا معنی یہ ہوگا کہ:

''آپ حضرات کی ہمدردیاں عبداللہ بن ابی کے ساتھ ہیں، عقیدتاً وہ آپ سے قریب ہے!''

مقام نبوت اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی حجیت سے وہ بھی گھبراتا تھا، اور آپ بھی اس سے پریشان ہوتے ہیں۔ ﴿رأيت المنفقين يصدون عنك صدودا﴾ [1] یا پھر آپ یہ چاہتے ہوں گے کہ خاندان نبوت پر دشمنوں کی طرف سے بھی کوئی الزام نہ آئے، ان کی آبرو دنیا میں چاند کی طرح صاف ہو۔

لیکن یہ آرزو قطعی غیر دانشمندانہ ہے، دشمنوں کی زبانوں پر کیسے کنڑول کر سکتے ہیں؟

قصہ افک میں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ہے، تمام انبیاء علیہم السلام پر ان کے مخالفین نے مختلف تہمتیں لگائیں، ساحر، کاہن، شاعر، مجنون، کذاب، مفتری ایسے ایسے الزام لگائے گئے، اسے کون روک سکتا ہے؟

آپ کی عقلمندی یہ ہے کہ آپ منافقین کی زبانیں تو روک نہ سکے، آپ نے حقائق کا انکار کیا، اور امت کے مخلص خدام کے خلاف بدزبانی شروع کر دی اور عبداللہ بن ابی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اکابر امت پر تہمت تراشی کی، جو اپنوں اور بیگانوں کی نظروں میں مضحکہ ہے، ﴿فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا﴾ [2]

آپ نے اتنا نہ سوچا کہ منافقین اور مخالفین کی کذب بیانیوں اور بہتان تراشیوں سے تو اہل حق کی آبرو بڑھتی ہے، ان کے درجات بلند ہوتے ہیں، اعمال میں اضافہ ہوتا ہے، گناہ دھلتے ہیں، آپ حضرت کا یہ وطیرہ فکری پریشانیوں اور عقل و

---

[1] النساء: ٦١

[2] النساء: ٧٨

شعور کی تاریکیوں کی زندہ مثال ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عقل عطا فرمائے، علم تو محنت کی چیز ہے، اس کے لیے بھی کوشش فرمائیے!

دوسرا شبہ:

ان حضرات نے دوسرا شبہ یہ قرار دیا ہے کہ:

''آنحضرت ﷺ نے اس حدیث کے بموجب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پروا نہیں کی، ان کو صفائی کا موقعہ نہیں دیا''، وغير ذلك من الخرافات!

اس عقلمند نے اتنا نہیں سوچا کہ تہمت کے ظہور کے بعد اس کی نوعیت فوجداری کیس کی ہو جاتی ہے، جس کے بعد لازماً جو مجرم ثابت ہو جائے، اسے سنگین سزا دینا واجب ہے، متہمہ بیمار ہے، آپ کی یہ خواہش ہے کہ مریضہ کو تفتیش میں رکھا جائے یا پھر بلا تحقیق تہمت لگانے والوں کو اسی کوڑے لگا دیئے جائیں!

پھر فرما دیں گے حدیث موضوع ہے، بلا تحقیق سزا دے دی گئی۔

اتنا بڑا سنگین فوجداری کیس ایک ماہ میں مکمل ہو گیا، ملزم کو صفائی کی ضرورت نہیں پڑی اور اسے باعزت بری کر دیا گیا اور عدالت پر کنبہ پروری، خویش نوازی کا الزام دشمن بھی نہ دے سکے، حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اور مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ کو حد قذف لگ کر معاملہ پوری طرح صاف ہو گیا۔[1]

تم لوگ آنحضرت ﷺ کو مغل بادشاہ سمجھتے ہو یا کوئی راجہ، رانی یا شہزادی کے تیور بدلے دیکھ کر قتل عام کا حکم دے دے اور آپ حضرات پھر منافقین کی طرح مذاق اڑاتے اور ایسی احادیث کو وضعی کہنے لگیں، جو کیا گیا، یہی مقتضائے عقل و انصاف تھا!

اہل حق کی نظر میں قصہ افک انسانی مساوات کا شاہکار ہے اور معاملہ فہمی اور

---

[1] دیکھیں: سنن أبي داود: كتاب الحدود، باب في حد القذف، رقم الحديث (٤٤٧٤)

عاقبت اندیشی کی زندہ تصویر اور آنحضرت ﷺ کی انصاف پسندی اور صداقت کی بیّن شہادت اور آنے والی دنیا کے لیے انصاف اور تدبر کی زندہ مثال، جس نے کفار کی شرانگیزی اور منافقین کی شرارت پسندی کا خاتمہ کر دیا، منافق دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے!

سچ ہے:

﴿ يضل به كثيرا ويهدىٰ به كثيرا وما يضل به إلا الفٰسقين﴾ [1]

﴿ فمالهم عن التذكرة معرضين ۝ كأنهم حمر مستنفرة ۝ فرت من قسورة ۝ بل يريد كل امرئ منهم أن يوتىٰ صحفا منشرة ۝ كلا بل لا يخافون الآخرة ﴾ [2]

---

❶ البقرة: ٢٦

❷ المدثر: ٤٩۔ ٥٣

مسئلہ درایت وفقہ راوی کا تاریخی وتحقیقی جائزہ

یہ مقالہ دراصل مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمہ اللہ کی کتاب " حسن البیان فیما في سیرۃ النعمان " پر لکھا گیا مقدمہ ہے، جس میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے درایت و فقاہت راوی کی آڑ میں احادیث نبویہ کے استخفاف واستحصال کا جائزہ لیا ہے۔

قبل ازیں یہ مقدمہ بنارس انڈیا سے علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے مقالات پر مشتمل کتاب ''حجیت حدیث'' میں بھی شائع ہو چکا ہے، یہ مقدمہ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو تحریر کیا تھا۔

مسئلہ درایت وفقہ راوی کا تاریخی وتحقیقی جائزہ

عرصہ ہوا میں نے ایک مضمون حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے تجدیدی اثرات کے متعلق لکھا تھا، جس میں عرض کیا گیا تھا کہ آج سے قریباً چار سو سال پہلے گو حکومت مسلمان تھی، لیکن تقلیدی جمود نے فکر ونظر پر پہرے بٹھا رکھے تھے، حضرت مجدد سرہندی رحمہ اللہ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تک یہ جنگ جاری رہی، اس جمود کو توڑنے میں برصغیر کی جماعت اہلحدیث نے بہت بڑا کردار ادا کیا، مضمون کئی اقساط میں شائع ہوا تھا۔ [1]

انھیں دنوں برادرم محترم مولانا رئیس احمد صاحب جعفری کا ایک مکتوب ''الاعتصام'' میں شائع ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ اہلحدیث کوئی مکتبِ فکر نہیں، بلکہ یہ اس مقدس گروہ کا نام ہے، جنھوں نے فنِ حدیث کی تدوین فرمائی، حفظ اور ضبط وکتابت سے اس کے مختلف گوشوں کی حفاظت فرمائی۔ جعفری صاحب کا یہ ارشاد اور استفسار برادرانہ تھا، میں نے اس وقت جو مستحضر تھا، اس کی روشنی میں جواب عرض کر دیا تھا۔ [2]

---

[1] یہ مضمون ''الاعتصام'' (۲۴ نومبر ۱۹۶۱ء، شمارہ: ۱۷، جلد: ۱۳) کی متعدد اقساط میں ''تحریک اہلحدیث کا مدّ وجزر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی کے اثرات'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جو بعد ازاں کتاب ''تحریک آزادیٔ فکر'' میں اشاعت پذیر ہوا۔

[2] حضرت سلفی رحمہ اللہ کا مضمون ''تحریک اہلحدیث کا مدّ وجزر'' ہفت روزہ الاعتصام میں بالاقساط جاری تھا کہ اسی دوران مولانا رئیس احمد جعفری کا ایک مکتوب ''الاعتصام'' (۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء) میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے مسلک اہلحدیث سے متعلق اپنے بعض تحفظات کا اظہار فرمایا۔ حضرت سلفی رحمہ اللہ نے ''الاعتصام'' (۲۶ جنوری ۱۹۶۲ء) میں جعفری صاحب کے مکتوب کا جواب لکھا، جسے مذکورہ بالا موضوع ←

....

← سے تعلق اور افادیت کے پیشِ نظر ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

''مولانا رئیس احمد جعفری کے جواب میں''

مکرمی! السلام علیکم

''تحریک اہلحدیث کا مدو جزر'' کے عنوان سے چند گزارشات ''الاعتصام'' میں بالا قساط شائع ہو رہی ہیں، ڈاک سے معلوم ہوتا ہے بعض علمی حلقوں میں یہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جا رہی ہیں، برادر گرامی مولانا رئیس احمد جعفری کا ایک مکتوب ۲۹ دسمبر ۶۱ء کے ''الاعتصام'' میں ان گزارشات کے متعلق شائع ہوا ہے۔

جعفری صاحب کا تاثر یہ ہے کہ:

میں ان تمثیلی مسائل میں شاید امام شافعی رحمہ اللہ کا حامی ہوں، اس لئے میں نے مسائل میں دلائل پر بحث کی بجائے ''فریاد و فغاں'' سے کام لیا ہے، یا ''نالہ جانکاہ'' پر اکتفا کیا ہے۔

جعفری صاحب اگر مقالہ کی چند باقی اقساط ملاحظہ فرما لیتے، تو انھیں معلوم ہوتا کہ یہ مقالہ ان مسائل کی تحقیق کے لیے نہیں لکھا گیا، بلکہ اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ان فروع میں تحقیق کے دامن سے وابستگی کے بعد کوئی شخص جو راہ چاہے اختیار کرے، لیکن تلخ نوائی نہیں ہونی چاہیے، پھر اگر اقران ایک دوسرے کے متعلق کچھ فرمائیں، تو یہ بھی قابل برداشت ہے، اقران میں اصاغر و اکابر کا تعلق نہیں ہوتا، لیکن یہ بے حد معیوب ہے کہ ملا جیون رحمہ اللہ ایسے متاخر حضرات امام شافعی رحمہ اللہ ایسے اکابر کے متعلق ایسی تلخ زبان استعمال کریں، یا ابن العربی امام شافعی رحمہ اللہ کے علم و فضل کے لیے ممتحن قرار دے جائیں، یا ابن حزم رحمہ اللہ ایسے محقق اور بے خوف امام کے دامن کو اندلس کے بعض مالکی علماء تار تار کرنا شروع کر دیں، خصوصاً درسیات میں تو اس قسم کا مواد قطعاً نہیں آنا چاہیے، اس سے طلباء میں بے ادبی کے جراثیم پیدا ہوں گے۔

جعفری صاحب نے حفظ مراتب سے اغماض فرماتے ہوئے امام شافعی کی کتاب لأم ←

....

← کا تذکرہ بھی فرما دیا، کتاب الأم کے بعض مقامات میری نظر میں ہیں، لیکن میں انھیں اس قبیل سے نہیں سمجھتا، تاہم مناظرہ سے بچتے ہوئے قبول کرتا ہوں کہ یہ انداز جہاں ہو، جس نے اختیار کیا ہو، میں چاہتا ہوں تشدد کے جواز کے لیے دلیل نہ قرار دیا جائے، بلکہ اس عادت کو روکنے کی کوشش کی جائے۔

اس ضمن میں میں ائمہ حدیث اور ناقدین رجال کو مستثنیٰ سمجھتا ہوں، اس فن کا مدعا یہی ہے کہ رجال کے حسن و قبح سے آنے والوں کو آگاہ کیا جائے، امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک روایت تاریخ صغیر میں سفیان سے نقل کی ہے، جس میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا تذکرہ نامناسب طور پر ہوا ہے، یہ بحث تو آپ فرما سکتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں، اس کی نسبت سفیان کی طرف درست نہیں، لیکن نقل روایت پر اگر اعتراض کیا جائے، تو فن کی افادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ یقیناً بعض جگہ اُقران نے اُقران کے متعلق بعض تلخ حقائق کا اظہار فرمایا ہے، اس پر اصول روایت کے لحاظ سے اہل فن بحث کر سکتے ہیں، لیکن نقل روایت پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا جعفری کی نزاکت طبع کا مجھے پورا پورا احساس ہے، لیکن فن کی افادیت اور ائمہ فن کی ذمہ داریوں کا احساس اس سے بھی زیادہ ضروری ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے تاریخ صغیر (ص: ۱۵۸) پر حمیدی رحمہ اللہ کی ایک رائے نقل کی ہے، جو اس سے بھی تلخ ہے، لیکن بخاری کی حیثیت ناقل کی ہے، نقل علم پر کوئی قدغن نہیں لگایا جا سکتا، ورنہ امانت علم میں خیانت کا ارتکاب ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ مولانا جعفری صاحب فن رجال کی طرف زیادہ توجہ دیں، انھیں محسوس ہوگا کہ فن کی ذمہ داریوں کا کیا تقاضا ہے، حمیدی اور سفیان دونوں کی آراء کو تحقیق کے بعد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی جلالت قدر کے پیش لفظ غلط کہا جا سکتا ہے، لیکن نقل روایت پر کسی کو مطعون نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ ان روایات سے مشاہیر ائمہ کی رفعتوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اس قسم کا مواد ابن عبدالبر کی کتاب جامع بیان العلم، خطیب کی تاریخ بغداد، امام نسائی کی ←

....

← ضعفاء وغیرہ میں موجودہ ہے، بعض دوسرے اہل علم کے متعلق بھی بعض نقول ملتی ہیں، ان روایات پر فنی بحث کی جا سکتی ہے، لیکن نقل روایت پر احتساب نہیں کیا جا سکتا۔ لأن العلم أمانة !

مولانا جعفری کے ارشادات سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں کہ قول پر نظر ہونی چاہیے، قائل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ اسلام کی خاطر افراد کو خواہ وہ کتنے ہی جلیل القدر کیوں نہ ہوں، نظر انداز کیا جا سکتا ہے، یقیناً ائمہ سے عقیدت اسلام کی ترجمانی ہی کی بنا پر ہے۔ ''اصل مقصد بہرکیف اسلام ہے'' اس جرم کی سزا بے چارے اہل حدیث صدیوں سے برداشت کر رہے ہیں۔

غرض اس مقالہ میں نہ ان مسائل کی تحقیق ہی مقصد ہے، نہ امام شافعی رحمہ اللہ کی حمایت، نہ کوئی ''نالۂ جانکاہ'' مطلوب، آپ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے قول عمداً متروك التسميه کو وزنی فرمایا ہے، میرا رجحان یہ نہیں، البتہ جمہور کے بوجھ سے بچ کر احادیث کی روشنی میں امہات الأولاد کا مسئلہ سوچنے کے قابل ہے، وہ بھی محض علمی طور پر، اگر علماء میں تلخ نوائی چل نکلنے کی وجہ سے آپ اسے جائز قرار دیتے ہیں، تو آپ کو حق ہے، لیکن ادباً گزارش ہے کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔

اہل حدیث اور اس کا مفہوم:

رہا اہلحدیث کے متعلق آپ کا فرمان، تو اس کے بارہ میں عرض ہے کہ لفظ اہلحدیث فن حدیث کے خدام پر ہی بولا جاتا ہے، اس لحاظ سے اہلحدیث اور محدث مرادف ہیں:

والمحدث من يشتغل بالسنة النبوية! (شرح نخبه لابن حجر)

یہ خدمت تو ظاہر ہے کہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر نے انجام دی ہے، احناف، شوافع، حنابلہ، موالک، یہ سب حضرات سنت کو حجت مانتے ہیں، اس لئے قدرتی بات ہے کہ وہ سنت کی خدمت کریں گے، حافظ طحاوی رحمہ اللہ، علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ، شیخ الاسلام نابلسی رحمہ اللہ، علامہ ترکمانی رحمہ اللہ اور حافظ زیلعی رحمہ اللہ کی فنی خدمات کو کون نظر انداز کر سکتا ہے؟ اس معنیٰ سے یہ لوگ اہلحدیث بھی ہیں ←

....

← اور محدث بھی، ممکن ہے اس میں قلت و کثرت کا فرق ہو، بعض أتباع ائمہ نے دوسرے بعض سے حدیث کی طرف کم توجہ دی ہو، احناف کے متعلق شوافع اور موالک کا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ فیصلہ کرنا ائمہ رجال یا ائمہ تاریخ کا کام ہے۔

جعفری صاحب کے ارشاد کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک فکر سے جن اہل علم نے حدیث کی خدمت بلحاظ فن کی ہے، وہ سب اہلحدیث ہیں، لیکن حریت فکر اور فکری جمود سے اجتناب کے لحاظ سے یہ مکتب فکر تمام مکاتب فکر سے دیرینہ ہے اور اسلام کے مفہوم سے بہت قریب، معلوم ہے کہ اسماء تعارف کے لیے ہوتے ہیں، ان کا مقام تعریفات میں فوائد و قیود کی طرح ہوتا ہے، اختلاف فروع میں ہو یا اصول میں، ان کے لیے عنوان کی ضرورت ہوتی ہے، اصل نام تو اسلام ہے، صحابہ کے مقام کے متعلق جب خوارج اور روافض نے غلو کی راہ اختیار کی، تو ان میں اعتدال کی راہ کا نام اہل سنت متعین ہوگیا۔ اسی طرح جب فقہی جمود اور تقلید ائمہ میں غلو کی صورت اختیار کی گئی، تو اعتدال اور حریت فکر کی راہ کا نام ''اہل حدیث'' یا ''اصحاب الحدیث'' قرار پایا، صحابہ میں جب فتنوں کا دور شروع ہوا، تو لوگوں نے ''عثمانی'' یا ''علوی'' کے نام اپنے طبعی رجحان کے لیے بطور عنوان مقرر کیے، تو بعض صحابہ نے اس غلو سے بچنے کے لیے اپنے لیے ''محمدی'' کا عنوان مقرر کیا۔ [ابو داود: ٤٧٤٩]

مولانا جعفری سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ ائمہ اربعہ کے دورِ امامت کا آغاز تو کہیں دوسری صدی کے اواخر میں ہوتا ہے، اس سے پہلے لوگ صحابہ اور تابعین کی موجودگی میں اہل علم کی اقتداء بلا تعیین کرتے تھے اور اشخاص کی بجائے ان کی نظر دلائل پر ہوتی تھی، غیر معلوم مسائل میں اپنے اپنے وقت کے اہل علم کی طرف رجوع کرتے تھے، اسی طریق کو اس جمود کے بالمقابل اصحاب الحدیث کے عنوان سے تعبیر کیا گیا۔ حدیث: لا تزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق ". [بخاری: ٦٨٨١] کی تشریح میں سفیان بن عیینہ نے اس طائفہ کا نام ''اصحاب الحدیث'' رکھا ہے۔ ←

....

➔ حافظ خطیب بغدادی کی کتاب " شرف أصحاب الحدیث " اور ابن قتیبہ کی کتاب " تأویل مختلف الحدیث فی الرد علی أعداء أهل الحدیث " اسی مکتبِ فکر کی غماز ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں اس مکتبِ فکر کے تمام بزرگ فنِ حدیث کے خادم تھے، اس لیے ان میں خدمت مکتبِ فکر اور خدمتِ فن بیک وقت جمع ہوئے اور عموماً جمع ہی رہے، اس لیے دونوں کے لحاظ سے یہ عنوان ان حضرات پر منطبق ہوگیا، اس سے بعض ظاہرین حضرات کو مغالطہ ہوا کہ یہ عنوان صرف خدمتِ فن سے مخصوص ہے، حالانکہ یہ مکتبِ فکر بھی ہے، اہلحدیث حضرات پر چونکہ فقہی جمود کا وقت کبھی نہیں آیا، خدمتِ فن اور حریتِ فکر ان میں عموماً جمع رہی اور فقہی مسائل میں ان کا تعلق تمام مشہور مکاتبِ فکر سے برابر رہا، یہ حضرات سب کے ہونے کے باوجود کبھی کسی کے دامن سے وابستہ نہیں رہے، ایسے لوگوں کا صحیح عنوان "اہلحدیث" یا "اصحاب الحدیث" ہی ہوسکتا ہے، جس کا تذکرہ تقریباً دوسری صدی کے ابتدا ہی سے شروع ہوگیا، رجال کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً یہی مکتبِ فکر تھا، چنانچہ ربیع بن صبیح اسی فکر کے داعی تھے، جو عہد بنو امیہ میں ہندوستان تشریف لائے، محمد بن قاسم کے ساتھ جو لشکر ساحل دیبل پر وارد ہوا، ان کا تعلق اسی مکتبِ فکر سے تھا، یہی لوگ فتوحاتِ سندھ کے ہیرو اور پیشرو تھے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے مکاتبِ فکر کا تو اس وقت کوئی اتہ پتہ ہی نہیں تھا۔

خباب بن فضال، اسرائیل بن موسیٰ اور ابومعشر بن نجیح سندھی کے نام ہندوستان کے اہلحدیث کی صفِ اول میں لئے جاسکتے ہیں۔

ابوبکر محمد بن حسن فورک ۴۰۶ھ ائمہ تاویل کے ذکر میں فرماتے ہیں:

" وخصوا بتقبيح ذلك الطائفة التي هي الظاهرة بالحق لسانا وبياناً وقهرا وعلواً وإمكانا الطاهرة عقائدهم من شوائب الأباطيل وشوائب البدع والأهواء الفاسدة وهي المعروفة بأنها أصحاب الحديث وهم فرقتان: فرقة منها أهل النقل والرواية الذين تشتد عنايتهم بنقل في السنن وتتوفر دواعيهم على تحصيل طرقها وحصر أسانيدها والتمييز بين صحيحها وسقيمها ويغلب عليهم ذلك ويعرفون به وينسبون إليه "۔ ➔

....

➜ وفرقة منها يغلب عليهم تحقيق طرق النظر والمقاييس والإبانة عن ترتيب الفروع على الأصول ونفي شبه الملبسين عنها وإيضاح وجوه الحجج والبراهين على حقائقها۔

والفرقة الأولىٰ كالخزانة للملك، والفرقة الأخرىٰ كالبطارقة التي تذب عن خزائن الملك المعترض عليها والمتعرضين لها." اھ

(مشكل الحديث لابن فورك، ص: ۳)

"مؤولین اور ملحدین نے اس گروہ کی عیب جوئی زبان اور بیان سے پورے قہر اور تکبر سے شروع کر دی، جو ہمیشہ سے حق کا حامی رہا ہے، ان کے عقائد اباطیل اور بدعات سے پاک ہیں، یہ گروہ اصحاب الحدیث کے نام سے مشہور ہے، اس جماعت کے دو حصے ہیں:

ایک حصہ نے نقل روایت اور ترویج سنن کا ذمہ لے لیا ہے، ان کی توجہ طرق احادیث اور اسانید کے حصر اور جمع کی طرف ہے اور صحیح اور سقیم میں تمیز کے ماہر ہیں، ان کا یہی مشغلہ ہے، جس کی طرف وہ منسوب ہیں اور دوسرے گروہ کا مشغلہ نظر و فکر کی تحقیق اور قیاسات کی صحت اور فروع کی ترتیب اصول کی روشنی میں اور وساوس اور شبہات کا دفعیہ اور حجج و براہین کی تحقیق اور توضیح ہے۔

پہلا گروہ گویا حکومت کا خزانہ ہے اور ادلہ شرعیہ کے نقود ان کی تحویل میں ہیں اور دوسرا گروہ ان فوجی افسروں کی طرح ہے، جو اپنے خزانوں کی حفاظت کے سلسلے میں ہر وقت گوش بر آواز ہے کہ نہ ان خزائن کو کوئی نقصان پہنچ سکے، نہ ہی ان کی طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھ سکے۔"

گویا عمل کے لحاظ سے اہلحدیث کے فرائض تین حصص میں منقسم ہیں، احادیث اور سنن کی حفاظت بلحاظ روایت اور عقائد سنت پر مؤولین اور ملحدین کے شبہات کی دیکھ بھال کرنا اور فقہی فروع کو قیاس صحیح اور اصولی قواعد پر پیش کر کے اس طریق پر سنت کی حفاظت کرنا کہ نظر و قیاس کی طغیانیاں کتاب و سنت کی نصوص کو کہیں بہا نہ لیجائیں۔ گویا فن روایات، علم کلام، فقہ اور اصول فقہ، مناظرہ اور ان کے لوازم، تمام فنون ان کی جولان گاہ ہیں، ائمہ حدیث اور سنت کے عساکر ان تمام میدانوں میں حسب ضرورت نقل و حرکت میں مشغول ہیں، شوافع، موالک اور حنابلہ کو علی الاطلاق اہلحدیث سمجھنا بالکل سطحی نظریہ ہے، جو ➜

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

← جامد تقلید کے شیوع اور عروج کے بعد وضع کیا گیا۔

ورنہ اہلحدیث یا اصحاب الحدیث ایک ایسا مکتبِ فکر ہے، جس نے تدوین سنت کے علاوہ دین کے ہر محاذ پر اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کیے ہیں، میں نے اس لفظ کے مفہوم، اس کے تاریخی تذکار اور اس کے مختلف مناہج پر خدمات کا تذکرہ بقدرِ ضرورت سابقہ گزارشات میں کر دیا تھا، غالباً آنے والی اقساط میں جناب ملاحظہ فرمائیں گے۔

میں جعفری صاحب کا ممنون ہوں، انھوں نے ایک مخلص اور نیک دل ساتھی کی طرح میری فروگزاشتوں پر توجہ دلائی۔ علی اللہ أجرہ !

اختصار کے باوجود معاملہ سمع خراشی کی حد تک پہنچ گیا، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد اسماعیل/ گوجرانوالہ

اس سے پہلے جماعت اسلامی کے بعض نشریات میں بھی اس قسم کے خیال کا اظہار فرمایا گیا تھا، ایک مضمون حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا بھی ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوا، مولانا وسیع النظر عالم ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہے، فنون پر بھی نظر ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اصابت فکر سے بھی نوازا ہے، مولانا نے اس مضمون میں گویا مولانا مودودی صاحب بألقابہ کے بعض مضامین کو ان کی نوک پلک درست فرما کر ذرا علمی انداز میں شائع فرمایا تھا، مگر ان حضرات کے یہ ارشادات ''تحقیقی'' تھے، ان کا نہج مناظرانہ نہیں تھا، مگر مجھے اس سے محسوس ہوا کہ علمی حلقوں میں مسلک اہلحدیث کے متعلق یہ غلطی عام ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ائمہ حدیث نے ابتدا ہی سے اپنے آپ کو'' فرقہ'' کی حیثیت نہیں دی تھی، اپنے تشخص اور نظریات کی حفاظت تو کی، لیکن فرقہ پروری کا انداز اختیار نہیں فرمایا، بلکہ دوسرے فرقوں کے ساتھ اختلاف کے باوجود رواداری اور اسلامی وحدت کو ہمیشہ قائم رکھا اور کوشش فرمائی کہ غلط نظریات پر تنقید کے ساتھ اسلام یا سنت کے ساتھ ترادف میں فرق نہ آئے اور کسی فرد واحد کو ایسی ترجمانی کا موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ اسلام کے پورے سیاہ وسفید کا مالک ہو جائے، اس کی اطاعت واجب، اس کی مخالفت گناہ تصور ہونے لگے، میں نے محسوس کیا کہ عام علمی حلقے شاید دیانت داری سے ''اہلحدیث'' کو ایک فرقہ سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کی دعوت سازج اسلام کے سوا کچھ نہیں، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بعض کتابیں اور رسائل شائع ہوئے، جن میں جماعت اہلحدیث کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تھا اور ان پر کڑی اور تلخ تنقید کی گئی تھی، یہ لٹریچر زیادہ تر دیوبندی مکتب فکر کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

مولانا تھانوی کا خواب:

اسی کے قریب دیوبندی حلقوں میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ کا ایک خواب بہت مشہور ہے، مولانا تھانوی صاحب نے طالب علمی کے زمانہ میں حضرت مولانا الشیخ محمد نذیر حسین صاحب قدس اللہ روحہ کے درس میں جانے کا ارادہ فرمایا، تو انھیں خواب آیا کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھ میں چھاچھ ہے اور وہ طلبہ کو پلا رہے ہیں۔

خواب کی تعبیر واضح اور ظاہر تھی کہ علمی تشنگی اور تحقیق ونظر کے لیے انسان کی فطرت میں جو طبعی سوز ہے، اس کا علاج دہلی کے درس میں ملے گا، تقلید و جمود کی سوزش اور جلن کا علاج مولانا نذیر حسین صاحب مرحوم کی چھاچھ میں پنہاں ہے، لیکن مولانا تھانوی نے ماحول کے تاثر اور اپنے رجحان طبع کے مطابق سمجھا کہ چھاچھ میں روغن نہیں، اس لئے وہ میاں صاحب کے فیوض سے محروم رہے۔ ان کے خیال میں دہلی کے درس میں فقہ و درایت نہیں ہوگی، یہ وہی عامیانہ خیال تھا، جو عموماً ائمہ حدیث اور اہلحدیث کے متعلق ان حلقوں میں کافی مشہور ہے، حضرت مولانا نے بھی خواب کے متعلق اسی ماحول میں سوچا، انسان ماحول کا غلام ہے، ماحول سے بالا ہوکر سوچنا ارباب تجدید کا وظیفہ ہے، ہر آدمی اس طرح نہیں کرسکتا۔

غرض اہلحدیث و ائمہ حدیث کے متعلق ان بزرگوں کے ذہنوں میں راسخ ہے کہ علماء حدیث اور فقہاء حدیث تفقہ فی الدین سے آشنا نہیں ہیں، یہ غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ جماعت اہلحدیث نے مسلک کی تبلیغ میں ہمیشہ تساہل برتا، ہم اور ہمارے مبلغ اپنے مواعظ اور تقاریر میں صلح کل پالیسی اختیار فرماتے رہے، تلخی، تیزی، بدزبانی یقیناً بری چیز ہے، لیکن اچھے لفظوں میں حقیقت کی وضاحت میں تساہل کرنا عیب ہے، قادیانی، منکرین حدیث اپنے خیالات کے اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرتے، لیکن ہم

لوگ ہمیشہ صلح پسندی میں حقیقت پسندی سے گریز کر جاتے ہیں، اب تو کچھ ایسے حضرات پیدا ہوگئے ہیں، جو کہ اہلحدیث کے ذکر سے بھی شرماتے ہیں، اس لئے عوام میں ایسی غلط فہمیاں پیدا ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، حق اور صداقت کے اظہار میں شرم نہیں محسوس کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا تھانوی مرحوم اور ان کے ہم مشرب بزرگوں کا وہم ہے کہ میاں صاحب مرحوم اور ان کے ہم مسلک علماء میں ظاہریت غالب ہے، تفقہ اور گہرائی نہیں، حالانکہ میاں صاحب مروجہ فقہ حنفی میں اس وقت کے اکابر علماء احناف سے زیادہ مہارت رکھتے تھے، مولانا تھانوی تو اس وقت طالب علم تھے، مولانا عبدالحیٔ صاحب لکھنوی ایسے اکابر میاں صاحب کے تفقہ، دقت نظر اور وسعت علم کے معترف تھے، مرحوم کے فتاویٰ میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (۱/۱۰۳)

ایک دو نئے مولوی صاحبان:

ہمارے قریب شیخوپورہ میں ایک دیوبندی بزرگ اقامت پذیر ہیں، ان کی ایک کتاب کسی دوست نے عنایت فرمائی، کتاب کے ابتدائی اوراق پھٹے ہوئے ہیں، نام معلوم نہیں ہوسکا، بظاہر یہ کتاب حکیم محمد اشرف سندھو مرحوم کی کتاب "نتائج التقلید" کے جواب میں لکھی گئی ہے، افسوس ہے کہ لب ولہجہ کے لحاظ سے یہ کتاب بھی مرحوم حکیم صاحب کی کتاب سے اچھی نہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے ان ہی دو چیزوں پر زور دیا ہے کہ اہلحدیث کوئی مکتب فکر نہیں، یہ محض حفاظ حدیث کا ایک گروہ ہے، جن کا مشغلہ حفظ متون اور اسانید کا ضبط ہے، دوسرے یہ کہ ان لوگوں میں تفقہ اور درایت نہیں، تیسری اہم لغزش مولانا نے یہ فرمائی کہ وہ فقہ سے مراد یہ جزئیات سمجھتے ہیں، جو مروجہ متون اور شروح میں پائی

جاتی ہیں، ابتدائی اوراق میں فقہاء صحابہ اور تابعین کا ذکر فرمایا اور یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ بزرگ کس معنی سے فقیہ ہیں؟ جب کہ اس وقت یہ مروجہ فقہیں اور ائمہ اجتہاد موجود ہی نہ تھے، نہ یہ متون موجود تھے اور نہ شروح، چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"اسی طرح ہمارے زمانہ کے اہل حدیث اپنے آپ کو فرقہ بناتے اور بتاتے ہیں، اگر یہ ایک فرقہ ہے، تو عہد نبوت سے لے کر انگریز کے عہد حکومت تک اہل سنت کی متعدد شاخوں میں اس فرقہ کو کوئی نہیں جانتا، بلکہ مسلمانوں پر (؟) اہل علم پر (؟) اس فرقہ کا وجود انگریز کے جبر و استبداد کا ایک پہلو (؟) اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کا ایک فکر ہو سکتا ہے۔"

(ص: ۳۱ بلفظه)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"اہل حدیث، اہل کلام، اہل اصول، اہل تفسیر، اہل معانی، اہل ادب، اہل تاریخ فن کے مدارس اور علم کے طبقات ہیں، مذاہب اور مسالک نہیں ہیں، مفسرین کو اہل تفسیر، متکلمین کو اہل کلام، مؤرخین کو اہل تاریخ، محدثین کو اہل حدیث کہا گیا اور کہنا چاہیے، مگر اہل کلام، اہل تاریخ، اہل معانی، اہل تفسیر کی طرح اہل حدیث بھی مذہبی فرقہ نہیں ہے۔" (ص: ٤٣ بلفظه)

"کتاب و سنت کے معانی کو اہل حدیث محدثین نہیں جانتے تھے، ان کا وظیفہ صرف اس قدر تھا کہ علم حدیث کی روایت کرتے، مگر معانی کو تالا لگا ہوا تھا، فقہاء نے حدیث کے معانی بیان فرمائے اور لگا ہوا تالا کھولا۔"

(ص: ۳۲ بلفظه)

مولانا کی زبان اور استدلال میں علمی ثقاہت نہیں، جس کی ایک پڑھے لکھے آدمی سے امید ہونی چاہیے، یہ درست ہے کہ "نتائج التقلید" کی زبان اور لہجہ بھی خاصہ تلخ

ہے، مرحوم حکیم صاحب سے انتقام لے لیتے، مگر ائمہ حدیث پر اتہام انصاف نہ تھا۔

ایک اور مولانا فرماتے ہیں:

''اہلحدیث سے وہ حضرات مراد ہیں، جو حدیث کے فہم و حفظ اور اس کے اتباع و پیروی کے جذبہ سے سرشار اور بہرہ ور ہوں، اہل حدیث کا مفہوم جو غیر مقلد حضرات کی طرف سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ ترک تقلید ہے، سراسر غلط، سولہ آنے باطل اور سو فیصد بے بنیاد ہے۔''

(طائفہ منصورہ: ٤١)

یہی مؤلف صاحب ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''چونکہ غیر مقلدین حضرات کو فقہ اور اہل فقہ سے تنفر اور عناد ہے، اس لئے وہ کسی طرح طائفہ منصورہ کی حدیث کے مصداق نہیں ہو سکتے، جس میں تفقہ فی الدین کے الفاظ سورج کی شعاعوں کی طرح چمک رہے ہیں اور اس کا اصل اور صحیح مصداق صرف وہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کا ملکہ عطا فرمایا ہے اور وہ ائمہ دین اور ان کے مقلدین ہیں۔'' انتھی ملخصاً

(طائفہ منصورہ: ١٨)

کسی شخص کی فقہیات کو من وعن اور کلی طور پر قبول نہ کرنا دوسری بات ہے اور فقہ سے نفرت دوسری بات، شتان بینھما، اہلحدیث میں پہلی بات تو ہے، دوسری سے براءۃ کا اظہار کرتے ہیں۔ قیاس کو حجت ماننے کے بعد فقہ سے نفرت کا کوئی مطلب نہیں، فقہ الحدیث میں ائمہ حدیث کے ضخیم ذخائر موجود ہیں، پھر نفرت کیسے؟ بعض مسائل پر تنقید ضرور ہوئی ہے اور یہ گناہ مقلدین فقہاء اربعہ بھی متون اور شروح میں فرماتے ہیں، اگر اس کا معنی نفرت ہے تو ؎

ایں گناہ است کہ در شہر شما نیز کنند [1]

---

[1] یہ ایسا گناہ ہے جو تمہارے شہر میں بھی کیا جاتا ہے۔

مجھے مؤلف محترم کے اس سوء ظن اور مطاعن سے غرض نہیں، وہ جو چاہیں فرمائیں، کتاب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً خون کے دباؤ کے مریض ہیں، اسی لئے پوری کتاب بلا وجہ ناراضگی اور پراگندہ خیالی کا مجموعہ ہے۔

ان حوالہ جات سے مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات تفقہ فی الدین سے صرف مروجہ فقہی جزئیات اور متعارف دفاتر فقہ سمجھتے ہیں، حالانکہ آیت کا نزول بہت پہلے ہے، جس تفقہ فی الدین کی تعریف قرآن اور سنت میں فرمائی گئی ہے، اس سے محدثین اور علماء اہل حدیث کو وافر حصہ ملا ہے، مگر وہ ان آراء الرجال کو دین نہیں سمجھتے، بلکہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان سے استفادہ فرماتے ہیں اور تفقہ فی الدین کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر یہی مؤلف امام ترمذی کی شافعیت کے تذکرہ میں مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ سے الجھنے کی کوشش فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں:

> امام ترمذی، امام شافعی کی مخالفت کے باوجود شافعی ہیں، اولاً اس لئے کہ اہل علم مقلد، نرے لکیر کے فقیر نہیں ہوتے، وہ دلائل کی صحت وسقم کو پرکھتے اور جانتے ہیں اور کمزور دلائل میں اپنے امام کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔'' اھ

(طائفہ: ۱۱٤)

اہلحدیث بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے، یہ واقعتاً معلوم ہے کہ ان مسالک کے دلائل بسا اوقات کمزور ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ دینا کوئی برائی نہیں بلکہ خوبی ہے، اس صراحت کے بعد اہلحدیث پر ناراضگی بے معنی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: ''بایں ہمہ وہ اصولی طور پر مقلد ہی ہوتے ہیں،'' ہماری ادباً یہ رائے ہے کہ ''بایں ہمہ یہ اصولی طور پر غیر مقلد ہیں،'' بحث لفظی سی رہ گئی، آپ خواہ مخواہ ''غیر مقلد'' حضرات پر ناراض ہوتے رہیں، حقیقت تو کھل گئی، آپ نے عملاً امام ابو یوسف، امام محمد، امام طحاوی کے متعلق اقرار فرما لیا کہ وہ اپنے

امام کی فقہیات میں پورے مقلد نہ تھے، ولا نعني بترك التقليد إلا ذلك!

ہمارا اتنا ہی گناہ ہے کہ اشخاص کے بجائے دلائل پر انحصار کرتے ہیں، غرض یہ پوری کتاب تضاد اور پراگندہ خیالی کا مجموعہ ہے۔

ان گزارشات سے نہ مؤلف کی تردید مطلوب ہے، نہ اس کتاب کا جواب، ہماری گزارش صرف اس مغالطہ کا ازالہ ہے، جو فقہ کے مفہوم کی تخصیص سے ائمہ حدیث کے متعلق پیدا ہوا یا پیدا کیا گیا۔

آیات اور احادیث میں جہاں فقہ کا لفظ آیا ہے، اسے اس معنی پر محمول فرمائیں، جس سے وہ قرون اولیٰ میں منطبق ہو سکے، جو فقہیں اس وقت موجود ہی نہ تھیں، انھیں مراد لینا دھوکہ ہوگا، فروع کے استنباط کا مشغلہ ہمیشہ رہا، لیکن قرون خیر میں کوئی شخص کسی دوسرے کی فقہ کا پابند نہ تھا، واجب یا فرض کہنا تو بڑی بات ہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإنا نعلم بالضرورة أنه لم يكن في عصر الصحابة رجل واحد اتخذ رجلا منهم يقلده في جميع أقواله فلم يسقط منها شيئا وأسقط أقوال غيره فلم يأخذ منها شيئا ونعلم بالضرورة أن هذا لم يكن في التابعين ولا تابعي التابعين فليكذبنا المقلدون برجل واحد سلك سبيلهم الوخيمة في القرون الفضيلة على لسان رسول الله ﷺ." (الإعلام: ۱/ ۲۲۲)

"ہم قطعاً جانتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں، جو ایک ہی آدمی کے فقہی اقوال کو کلی طور پر قبول کرے اور دوسرے کے اقوال سے کوئی استفادہ نہ کرے، ارباب تقلید ایک ہی آدمی بتا کر ہماری تکذیب فرمائیں!" (إعلام، مطبوعہ ہند)

علماءِ حق اور اہلحدیث نے ان فقہیات کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی، جب ان آراءِ رجال اور متعارض فقہیات کو اغلال وسلاسل کی صورت دے دی گئی اور ایک مجتہد کے ساتھ وابستگی واجب قرار دے دی گئی، آج بھی ان فقہیات کو اپنے مقام پر لے آیئے اور انھیں علماء کے افادات اور افکار سمجھیے، ان کے قبول کو واجب نہ فرمایئے، تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ سوال فقہیات سے نفرت یا ان کے رد وقبول کا نہیں، سوال صرف اس قدر ہے کہ ایک مجتہد کی تمام فقہیات کو واجب القبول کس نے بنایا؟ یا قرون خیر میں آنحضرت ﷺ کے بعد کون بزرگ تھے، جن کی ساری فقہیات پر یقین اور عمل واجب قرار دیا گیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ائمہ اجتہاد نے بھی اس التزام سے روکا، بعض خلفاء نے امام مالک رحمہ اللہ سے فرمایا کہ مؤطا کو پوری عباسی قلمرو میں آئین کی حیثیت دے دی جائے، امام نے اس کا انکار کر دیا،[1] اگر اس تقلید وجمود کے لیے شرعی بنیاد ہوتی، تو امام مالک خلیفہ کی اس استدعا کو ضرور قبول فرما لیتے، ان مولانا صاحب کا ایک اور گرم گرم پیراسن لیجیے اور ان حضرات کے علم اور اخلاقی رفعت کی داد دیجیے، فرماتے ہیں:

> ”نہایت تعجب ہے اور سخت حیرت ہے کہ بالکل نو احداث جماعت اور کل کی پیداوار جب مذاہب اربعہ پر تنقید کرتی ہے، تو اس کو چوتھی صدی کے بعد کی بدعت قرار دیتی ہے، (ہم نہیں بلکہ ملاحظہ ہو: حجۃ اللّٰہ (۱/۱۲۲) اور قوت القلوب (۲/۳۶)[2] اور اپنا رشتہ جناب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ سے جا ملاتی ہے اور اپنے گھر کا یہ راز اور بھید بھولے سے بھی نہیں بتاتی کہ اس کا بانی مبانی

---

[1] دیکھیں: تقدمۃ الجرح والتعدیل (۱/ ۲۹)

[2] نیز امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یہ بدعت تو صرف چوتھی صدی میں پیدا ہوئی، جس کی رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے مذمت صادر ہوئی ہے۔“ (الإعلام: ۲/ ۲۰۸)

کون تھا؟ علماء ہند نے اس کے متعلق کیا کہا اور علماء حرمین نے کیا فتویٰ دیا ہے؟ پہلے یہ کس نام سے موسوم تھی اور اہلحدیث کا لقب کب سے اختیار کیا؟ تف ہے اس دیانت پر، حیرت ہے اس تعصب پر اور تاسف ہے اس پردہ پوشی پر، مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد"

میں کسی چیز کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، آپ جو سمجھتے ہیں سمجھیں، جو کہنا چاہتے ہیں کہیں، نواب صاحب اور مولانا محمد حسین مرحوم کی رائے کیوں بدلی؟ آپ کے اکابر کا اس میں کہاں تک دخل تھا؟ حرمین کے فتوؤں میں حاجی امداد اللہ، مولانا خیر الدین ، مولوی رحمت اللہ مرحوم کیرانوی نے کیا کردار ادا کیا اور ۱۸۵۷ء کے محاربہ میں آپ کے اکابر نے کیا اقدام کیا؟ یہ تاریخ کی امانت ہے، اسے نہ ہلایئے، اللہ ہماری اور ان سب بزرگوں کی خطائیں معاف فرمائے، ان کی موت کے بعد ان گندے کپڑوں کو اپنے حال پر رہنے دیجیے۔ ۱۸۳۱ء کے بعد آپ کے اکابر برسوں کہاں رہے؟ تحریک حریت پوری صدی کن ہاتھوں میں رہی؟ یہ تاریخی حقائق ہیں، آپ کی تف اور تاسف سے حقائق نہیں بدل سکتے، انبالہ کیس میں انگریز کی نظروں نے کن حریت کے پروانوں پر ہاتھ اٹھایا؟ لاہور کے جیل خانہ میں منوں بیڑیوں کے بوجھ کن گلوں اور پاؤں کی زینت رہے؟

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری!

مجھے آپ کی تیزی سے دکھ ہوا، جب آپ اس داستان کو جانتے ہی نہیں، تو اس جوش میں کیوں آتے ہیں؟ امید ہے آپ تاریخ کے اس حصہ کو نہیں ہلائیں گے، رہے نام! تو آپ ہی سوچیں، آپ پہلے مسلمان تھے، پھر اہل سنت ہوئے، پھر حنفی

ہوئے، اب دیوبندی ہیں، آئندہ معلوم نہیں کیا ہوں گے؟ اس ضمن میں ماتریدی، اشعری، قادری کے بعد شاید اشرفی اور کیا کیا بن جائیں؟!

اللہ کے عطیے:

علم، عقل، تفقہ، صحت، قوت، تیقظ، معاملہ فہمی، فراست، قوت تکلم اور حافظہ وغیرہ یہ خدا تعالیٰ کے احسانات ہیں، جو اس نے نوع انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، ہر انسان پر ان اوصاف کی نوازش فرمائی گئی، کوئی انسان ان سے محروم نہیں، لیکن پوری نوع انسان اس میں مساوی نہیں، انبیاء علیہم السلام سے عامۃ المسلمین تک، ملوک اور اصحاب ثروت سے عامۃ الناس تک ان انعامات سے بقدرِ تحمل مستفیض ہیں، مختلف طبقات ان انعامات الٰہیہ سے بہرہ ور ہیں۔ ﴿ تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض﴾ [1] میں تفاوت مراتب اور اس فرق کی صراحت فرمائی ہے۔ ﴿ نرفع درجات من نشاء وفوق كل ذي علم عليم﴾ [2] میں علمی مراتب میں تفاوت کو ظاہر فرمایا ہے، باقی انعامات کا بھی یہی حال ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک شخص مروجہ فقہ پڑھتا رہے، تو وہ فقیہ رہے، لیکن معاً جب وہ حدیث پڑھنا شروع کرے، تو فقہ اس سے رخصت ہو جائے، خود حنفی علماء جو عمر کا معتد بہ حصہ اس مروجہ فقہ میں صرف کر دیتے ہیں، معاملات میں انتہائی بے سمجھ ہوتے ہیں، وہ مروجہ متون اور شروح کو کتاب وسنت کی طرح مانتے ہیں، ہمارے یہ تقلید پسند حضرات یہاں حکیم اور عطار کی مثال دے کر عموماً خوش ہوتے ہیں، وہ مثال بھی فرق مراتب کی حد تک درست ہے، لیکن طبقات کی تقسیم کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہے، مروجہ فقہاء اور فقہ کے ماہرین بھی عملاً عطار ہی نظر آتے ہیں۔

ایک دیوبندی عالم نے ابن جوزی کی کتاب سے جو اوصاف کسی حدیث کے

---

[1] البقرة: ٢٥٣

[2] يوسف: ٧٦

غلط کار طالب علم کے ذکر فرمائے ہیں، آپ کے قرب و جوار میں آپ کے ہم مسلک حضرات میں بدرجہ اتم موجود ہیں، جناب نے ابن جوزی کی نقد العلم والعلماء میں جو باب اہلحدیث کے متعلق تھا، شوق سے پڑھ لیا ہے، ابن جوزی نے فقہاء کی حیلہ سازیوں کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں، امید ہے معاملہ برابر ہی رہے گا، شیطان کی گرفت سے نہ اہلحدیث بچ سکتا ہے نہ آپ کا فقیہ، إلا من رحم اللّٰہ!

قدرت کے ان مواہب پر اگر بنظر تفقہ غور فرمایا ہوتا، تو شاید اس موضوع پر اتنے ورق سیاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، ہم میں سے کوئی بھی یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ شیطانی وساوس سے کلیتاً محفوظ ہے، إلا من عصمه اللّٰه، نہ ہی کسی فقیہ کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہر لحاظ لغزش سے مبرا ہے۔

فقہ کیا ہے؟

لغت میں فقہ کے معنی علم اور فطانت ہے اور عرف شرع میں ایک فن کا نام ہے، جس میں فرعی مسائل کی جزئیات مذکور ہوتی ہیں اور علم دین کو بھی فقہ کہتے ہیں:

" الفِقه بالكسر: العلم بالشيء والفهم له والفطنة وغلب على علم الدين لشرفه" (قاموس: ج ٤) ❶

"الفقه: فهم الشيء، قال ابن فارس: وكل علم لشيء فهو فقه والفقه على لسان حملة الشرع علم خاص وفَقِهَ فِقهاً من باب تعب إذا علم وفقُه بالضم مثله وقيل بالضم إذا صار الفقه له سجية." (المصباح المنير: ج ٢) ❷

"الفقه: هو التوصل إلى علم غائب بعلم شاهد، فهو أخص من

---

❶ القاموس المحيط (ص: ١١٥١)

❷ المصباح المنير للفيومي (٢/ ٤٧٩)

العلم، قال اللّٰہ تعالیٰ ﴿فما لهؤلاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا﴾ ﴿ولكن المنافقين لا يفقهون﴾ إلى غير ذلك من الآيات، والفقه: العلم بأحكام الشريعة، يقال: فقه الرجل فقاهة إذا صار فقيها.“ (راغب: ۲۹۱) [1]

اس کے قریب قریب أقرب الموارد اور مجمع البحار میں مرقوم ہے:

”فَقِه بالكسر إذا فهم وعلم وبالضم إذا صار فقيها عالما وجعله العرب خاصا بعلم الشريعة وتخصيصا بعلم الفروع منها.“

(مجمع البحار: ج ۳)

باقی معانی کے علاوہ مطلقاً علم اور علم الفروع کو بھی فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ تعبیریں متاخرین نے فرمائیں، جب مروجہ فقہ مدون ہوئی، لغت سے ظاہر ہے کہ فقہ کسی خاص فن میں محصور نہیں، بلکہ اس لفظ کے معانی اور محمل متعدد ہیں، ہر علم ”فقہ“ کہلا سکتا ہے اور اس تفقہ کے مراتب مختلف ہیں۔

شرعی اصطلاح:

اصطلاح شریعت میں فقہ کا لفظ مختلف مقامات پر بولا گیا ہے، ہشام بن عبیداللہ فرماتے ہیں:

”من لم يعرف اختلاف الفقهاء فليس بفقيه“

(جامع بيان العلم لابن عبد البر: ۲/ ۴۶)

”یعنی جو علماء کے اختلافات کو نہیں جانتا، وہ فقیہ نہیں کہلا سکتا۔“

قتادہ فرماتے ہیں:

”من لم يعرف الاختلاف لم يشم الفقه بأنفه“ (جامع: ۲/ ۴۶)

---

[1] مفردات القرآن (۲/ ۲۰۱)

''یعنی جو علماء کے اختلافات کو نہیں جانتا، اس نے فقہ کو سونگھا بھی نہیں۔''

حارث بن یعقوب فرماتے ہیں:

" إن الفقيه كل الفقيه من فقه في القرآن وعرف مكيدة الشيطان."
(جامع ابن عبدالبر: ٢/ ٤٦)

''یعنی فقیہ وہ ہے، جو قرآن کو سمجھے اور شیطان کے فریبوں کو پہچانے۔''

امام مالک سے پوچھا گیا: کیا علماء کے اختلافات سے اہل الرائے کے اختلافات مراد ہیں؟ فرمایا: صحابہ کے اختلافات مطلوب ہیں۔ ❶

مجاہد فرماتے ہیں: ''الفقيه من خاف الله ." (جامع: ٢/ ٤٩)

آنحضرت ﷺ سے بروایت حضرت علی منقول ہے:

" ألا أنبئكم بالفقيه كل الفقيه قالوا بلىٰ قال من لم يقنط الناس من رحمة الله ولم يؤيسهم من روح الله ولم يؤمنهم من مكر الله ولا يدع القرآن رغبة عنه إلى ما سواه، ألا لا خير في عبادة ليس فيها تفقه الخ " (جامع: ٤٤) ❷

یعنی فرمایا: ''میں تمہیں بتا دوں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ صحابہ نے فرمایا: ضرور بتائیے، فرمایا: جو آدمی لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے اور اللہ کی تدبیر سے عوام کو بے خوف نہ کرے، قرآن سے نفرت اور ما سوا کی طرف توجہ نہ کرے، عبادت بلا تفقہ عبث ہے۔'' اھ

---

❶ جامع بیان العلم (٢/ ١٠٣) نیز دیکھیں: الفقيه والمتفقه (٢/ ١٥٧)

❷ حافظ عبدالبر رحمہ اللہ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: " لايأتي هذا الحديث مرفوعاً إلا من هذا الوجه وأكثرهم يوقفونه على علي رضي الله عنه " یہ حدیث صرف اس سند سے مرفوع آتی ہے اور اکثر رواۃ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بیان کرتے ہیں، علاوہ ازیں اس مرفوع سند میں إسحاق بن أسيد راوی ہے، جس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " فيه ضعف " (تقريب التهذيب: ١٠٠)

ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں (ص: ۴۳ تا ۴۹) لفظ فقہ کے مفہوم کا تذکرہ بڑے بسط سے فرمایا ہے، آنحضرت ﷺ کا دوسرا ارشاد گرامی ہے:

"رب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه إلى من هو أفقه منه" [1]

ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فسمى الحديث فقها مطلقا وعلما." (جامع: ۲۷) [2]

"اس میں حدیث کو فقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔"

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ليس الفقه بكثرة المسائل ولكن الفقه يؤتيه الله من يشاء من خلقه." (جامع: ۲/ ٤٥)

"یعنی فقہ زیادہ مسائل جاننے کا نام نہیں، بلکہ فقہ اللہ کی عطا ہے، جسے وہ چاہے دیدے۔"

ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے جامع بیان العلم کے (۱/۴۳) سے (۱/۴۹) تک فقہ اور علم کے متعلق بے حد مفید مواد جمع فرمایا ہے، اہل علم کو اسے غور سے پڑھنا چاہیے، فقہ، علم، حکمت اور رائے کا مفہوم سمجھ میں آ جائے گا اور کچھ تعجب نہیں کہ فرح بالعلم کے جراثیم دماغ سے نکل جائیں!

"الفقه معرفة النفس مالها وما عليها" اھ (فقه أكبر: ۱۰)

"یعنی نفس کی ذمہ داریوں کے سمجھنے کا نام فقہ ہے۔"

---

[1] سنن أبي داود (٣٦٦٠) سنن الترمذي (٢٦٥٦) سنن ابن ماجه (٢٣٠) اس حدیث کو امام ترمذی اور حافظ منذری نے "حسن" اور امام ابن حبان، مقدسی، عراقی اور البانی رحمہم اللہ نے "صحیح" قرار دیا ہے، امام سیوطی اور بعض دیگر اہل علم نے اسے متواتر احادیث میں شمار کیا ہے، دیکھیں: كشف الخفاء للعجلوني، برقم (٢٨١٣) نظم المتناثر (ص: ١٤)

[2] جامع بيان العلم (٢/ ٦١)

یونانی علوم کی اشاعت کے بعد جب متکلمین نے مناظرات کا آغاز کیا اور تاویلات کی گرم بازاری ہوئی، تو علم الکلام کو بھی ''فقہ'' سے تعبیر کیا گیا، ''فقہ اکبر'' جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، اسی دور کی کتاب ہے، اسی لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔

فقہ الاجتہاد:

ائمہ اجتہاد رحمہم اللہ کے اجتہادات جب رائج ہوئے، تو ان کے اَتباع نے ان اصولوں کی روشنی میں مزید فروع کی تخریج فرمائی اور یہ اثرات اساتذہ سے تلامذہ تک اپنی طبعی افتاد سے پہنچے اور ائمہ اربعہ کے ساتھ اور بہت سے ائمہ اجتہاد کی فقہیں بھی مروج ہوئیں اور جن پر عمل ہوتا رہا، ان کا نام بھی فقہ قرار پایا اور تلامذہ اساتذہ سے اسے وراثتاً لیتے رہے، بتدریج اس تعلق نے جمود کی صورت اختیار کی، تو اس فقہ کی دو صورتیں ہوگئیں، فقہ المجتہدین یعنی ائمہ اجتہاد کی مجتہدانہ مسائل جو کتاب وسنت سے براہ راست پیش آمدہ مسائل کا استنباط فرماتے تھے، ادلہ شرعیہ کی روشنی میں ان پر غور ہوتا اور وقت کے مسائل کو حل فرمایا جاتا، اس میں باہم اختلاف بھی ہوتا، غلطی کا امکان بھی ہوتا، اساتذہ، تلامذہ بحث ونظر کے بعد کسی ایک دوسرے کی رائے کو قبول فرماتے، کبھی اپنی اُپنی رائے پر قائم رہتے، لیکن حسن ظن اور محبت کے تعلق بدستور قائم رہتے ، اس مجتہدانہ فقہ کی عمر ائمہ اجتہاد کے بعد بڑی مختصر رہی، جلدی اس پر جمود طاری ہوگیا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ نے چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اس کا اندازہ فرمایا ہے، اس کے بعد جمود کا دور آ گیا اور تحقیق عیب شمار ہونے لگی، اذہان کے خمیر میں احساس کہتری سمو دیا گیا، لوگ اپنی لاعلمی، کم فہمی کا فخریہ اقرار کرنے لگے اور ائمہ اجتہاد کی طرح نصوص سے براہ راست استنباط ختم کر دیا گیا۔

فقہ التقلید:

قریباً چوتھی صدی کے بعد ادلہ تفصیلیہ سے استدلال بتدریج متروک ہو گیا، فقہ کے مروجہ متون کو من وعن قبول کر لیا گیا، عام طور پر شروح میں اصل ادلہ سے بہت کم تعرض کیا گیا، پہلے بزرگوں سے جو کچھ منقول تھا، اس پر اکتفا کر لیا گیا، استدلال اور استنباط کی راہ ترک کر دی گئی، یہی متقدمین کی استنباط شدہ فروع کافی سمجھے گئے اور جزوی تعبیر کو جو کسی امام نے فرمائی شریعت سمجھ لیا گیا، اصل ادلہ یعنی قرآن و سنت اجماع اور قیاس ان سے تعرض صرف مجتہد کا وظیفہ طے پایا، ادلہ اجتہاد کے دروازوں پر چوتھی صدی کے بعد تالا لگا دیا گیا، رسالہ حمیدیہ میں ہے:

”لكن من عصر أربع مائة من الهجرة النبوية على صاحبها أزكى صلوة و سلام قال بعض العلماء الأعلام كما ينقل من علماء الحنفية أن باب الاجتهاد قد انسد من ذلك التاريخ“ اھ (ص: ۳۳۸)

یعنی ۴۰۰ھ میں بعض علماء حنفیہ سے منقول ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا، یعنی یکم محرم ۴۰۰ھ سے فکر و اجتہاد کے دروازہ پر تالا پڑ گیا!

یہ رسالہ ایک بہت بڑے ترکی عالم شیخ حسین آفندی الجسری نے سلطان عبدالحمید خان کے دورِ حکومت میں ان کے لیے لکھا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ فقہ الاجتہاد جو مجتہدین کا وظیفہ تھا، ختم ہو گئی، علماء حدیث میں تو تفقہ کا امکان باقی رہا، لیکن حضرات احناف نے تفقہ کا دروازہ بند کر دیا، جو حضرات اہلحدیث پر فہم و تفقہ کا دروازہ بند فرماتے ہیں، وہ اپنے لیے محرم ۴۰۰ھ سے فقہ الاجتہاد کی راہیں مسدود فرما چکے ہیں، زیادہ سے زیادہ آپ کے ہاں ”فقہ التقلید“ باقی ہو گی، یعنی پہلے بزرگوں کی مظنون مسائل پر قناعت کر لینا، لیکن یہ فقہ قطعی قابل فخر نہیں، آیندہ اگر ممکن ہوا، تو عرض کیا جائے گا کہ یہ فقہ جو آپ کے مدارس میں سالہا

سال تک پڑھی جاتی ہے، انتہائی سطحی ہے اور اس کے اکثر مسائل ظاہریت اور حشویت پر مبنی ہیں، پہلے بزرگوں کے بعض قواعد اس فقہ کی بنیاد قرار پا گئے۔

اب جو فقیہ سمجھے جاتے ہیں، وہ بے چارے ان فروع سے آگے بڑھنے کی جراَت نہیں کرتے، کنز، قدوری، ہدایہ، مختصر الوقایہ، شرح الوقایہ وغیرہ کتب فقہ میں جس طرح جزئیات مرقوم ہیں، انھیں من وعن قبول کر لیا گیا ہے، ان کی صحت یا سقم سے بحث کا کسی کو حق نہیں دیا گیا، یہ قطعی حرفیت ہے اور ظاہریت، ابن حزم اور ان کے رفقاء نے جو طرز عمل حدیث کے ظاہر الفاظ سے روا رکھا، وہی ہمارے ان متاخرین فقہاء نے ان متون اور شروح کے ظواہر سے برتا، دوسروں کو حشوی اور ظاہری کہنے والے خود آراء رجال اور متقدمین اور متاخرین کے فہم پر قانع ہو گئے، فقہ کی ان دونوں قسموں کا تذکرہ فقہ کی کتابوں میں بصراحت موجود ہے:

"واعلم أن الفقيه عند الأصوليين هو المجتهد فقط لا غير كما يشهد به تعاريفهم للفقه وعند الفقهاء الحافظ للفروع وأقلها ثلث" (القول المأمول في فن الأصول: ٧)

"یعنی فقیہ صرف مجتہد کو کہا جاتا ہے، لیکن فقہاء کے نزدیک جو کم از کم تہائی جزئیات جانتا ہو، فقیہ ہو سکتا ہے۔"

البحر الرائق میں ہے:

"فالحاصل أن الفقه في الأصول من علم الأحكام من دلائلها فليس الفقيه إلا المجتهد عندهم وإطلاقه على المقلد الحافظ للمسائل مجاز وهو حقيقة في عرف الفقهاء بدليل انصراف الوقف والوصية للفقهاء إليهم" اهـ.[1]

---

[1] دیکھیں: رد المحتار (١/ ٨٦)

خلاصہ یہ ہے کہ ''ائمہ اصول کے نزدیک فقیہ مجتہد کا دوسرا نام ہے، مقلد پر جسے فقہ کے کچھ مسائل حفظ ہوں، فقیہ کا لفظ مجازاً بولا جاتا ہے، جیسے اگر فقہاء کے لئے وصیت کی جائے، تو دونوں پر صادق آئے گی۔''

اس صراحت کے بعد دیوبند یا بریلی کے مدارس میں جو لوگ فقہ کے مروجہ متون اور شروح پڑھتے ہیں اور ادلہ شرعیہ سے ان اجتہادات کی صحت کا موازنہ نہیں فرماتے، یہ سب حضرات ظاہری اور حشوی ہیں، یہ مروجہ متون اور شروح و حروف پر اعتماد اور یقین رکھتے ہیں۔ ادلہ تفصیلیہ سے فہم و استدلال کا ان پر'' تالا بند'' ہے، جب تک مروجہ تقلید سے برأت کا اعلان نہ فرمائیں، ہمارے یہ جدید مصنف اور ان کے رفقاء غور فرمائیں فقہ سے محروم اہلحدیث ہیں یا آپ حضرات؟ '' تالا بند'' تو آپ حضرات نے خود فرما دیا، وجوب تقلید کے بعد تالا کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

صاحب مسلّم الثبوت فقہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

" الفقه حكمة فرعية شرعية فلا يقال على المقلد لتقصيره عن الطاقة ." (۱/ ۵، طبع مصر)

'' فقہ فروع شرعیہ حقیقیہ کا نام ہے، پس مقلد کو فقیہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اسے حقیقت تک رسائی کی ہمت ہی نہیں۔''

نہ اسے اجازت ہے کہ ادلہ تفصیلیہ میں فقہ و درایت کی روشنی میں غور کرے۔

مسلّم الثبوت کے مصنف منہیات میں فرماتے ہیں:

" اعلم أن الفقه في القديم كان متناولا لعلم الحقيقة وهي علم الإلٰهيات وعلم الطريقة وهي مباحث المهلكات والمنجيات وعلم الشريعة الطاهرة ومن ثم عرفه أبو حنيفة بمعرفة النفس ما لها وما عليها وسمى كتابه في العقائد بالفقه الأكبر وقال الله

تعالى ﴿ليتفقهوا في الدين﴾ ثم لما تصدى قوم بالبحث عن العقائد وسموا العلم الكافي بذلك بالكلام اختص الفقه بالمطالب العلمية الشاملة للتصوف أيضا وهو علم الأخلاق ومن ثم قال بعض المحققين في شرح المنهاج إن تحريم الريا والحسد من الفقه وصار هذا عرفا واستمر عليه زمان مديد ثم حدث في زمان لاحق اختصاص الفقه بالأحكام الظاهرة ومن ثم ترى كتب الفقه للمتأخرين خالية من علم الطريقة" اهـ (مسلّم الثبوت: ٥ مصر)

''یعنی فقہ کا لفظ ابتدا میں الٰہیات اور علم طریقت پر بولا جاتا تھا، اسی لئے امام صاحب نے فرمایا: یہ نفس کی ذمہ داریوں کی معرفت کا نام ہے اور امام صاحب نے اپنی کتاب کا نام ''فقہ اکبر'' رکھا ہے، علم کلام کے بعد یہ لفظ تصوف اور اخلاق پر بھی بولا جانے لگا، اسی لئے ریا اور حسد کی حرمت کو فقہ کہا گیا ہے، مدت تک یہی عرف رہا، پھر عرصہ کے بعد یہ فقہ الفروع پر بولا جانے لگا۔'' اھ

فقہ کا یہ مفہوم گویا مدتوں بعد مشہور ہوا اور متاخرین نے اسے بطور اصطلاح استعمال فرمایا، اب اس کی اس قدر شہرت ہوئی کہ قرون خیر اور متقدمین کے مفاہیم کا عرف عام میں استعمال متروک ہوگیا۔

غزالی فرماتے ہیں:

" اعلم أن منشأ التباس العلوم المذمومة بالعلوم الشرعية تحريف الأسامي المحمودة وتبديلها ونقلها بالأغراض الفاسدة إلى معان غير ما أراده السلف الصالح والقرون الأولى وهي خمسة ألفاظ الفقه والعلم والتوحيد والتذكير والحكمة فهذه أسام محمودة والمتصفون بها أرباب المناصب في الدين

ولكن نقلت الآن إلى معان مذمومة فصارت القلوب تنفر عن مذمة من يتصف بمعانيها لشيوع إطلاق هذه الأسامي عليهم، اللفظ الأول: الفقه فقد تصرفوا فيه بالتخصيص لا بالنقل والتحويل إذ خصصوه بمعرفة الفروع الغريبة في الفتاوى والوقوف على دقائق عللها واستكثار الكلام فيها وحفظ المقالات المتعلقة بها فمن كان أشد تعمقا فيها وأكثر اشتغالا بها يقال: هو الأفقه، ولقد كان اسم الفقه في العصر الأول مطلقا على علم طريق الآخرة ومعرفة دقائق آفات النفوس ...... إلى أن قال: ويدلك عليه قوله تعالى: ﴿**ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم**﴾ وما يحصل به الإنذار والتخويف هو هذا الفقه دون تفريعات الطلاق والعتاق واللعان والسلم والإجارة فذلك لا يحصل به إنذار ولا تخويف بل التجرد له على الدوام يقسي القلب وينزع الخشية منه" الخ

(إحياء علوم الدين: ١/ ٢٤)

''یعنی شرعی علوم میں مذموم اور ناپسند علوم کا اختلاط اور التباس اس لئے ہوا کہ علوم کے اچھے نام جو زمانہ سلف میں بولے جاتے تھے، اپنی فاسد اغراض کے لیے بدل دیئے گئے اور ان کو ایسے مطالب پر بولا گیا، جن پر قرون خیر میں ان کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، نہ ہی ائمہ سلف ان الفاظ سے یہ مطالب مراد لیتے تھے، یہ پانچ نام ہیں، فقہ، علم، توحید، تذکیر، حکمت، یہ بہت اچھے نام ہیں، ان کے جاننے والوں کا دین میں بہت بلند منصب تھا، لیکن اب ان کو مذموم معانی پر بولا جانے لگا، اب ان سے اور ان کے جاننے والوں سے دل نفرت کرتا ہے، کیونکہ ان ناپسندیدہ معانی پر ان کا اطلاق عام ہوگیا ہے، فقہ کے مفہوم میں نقل

اور تحویل کی بجائے ان لوگوں نے تخصیص پیدا کر دی ہے، اب اسے فتوؤں میں فقہ غیر معروف اور تعجب انگیز فروع پر بولا جاتا ہے، اس پر طویل گفتگو اور بال کی کھال اتارنے اور ان کے علل اور وجوہ میں تعمق کا نام فقہ رکھ دیا گیا ہے، جو ان میں زیادہ وقت ضائع کرے، اسے ''أفقہ'' کہا جاتا ہے، حالانکہ قرون اولیٰ میں یہ لفظ نفس کے امراض کی پہچان اور علوم آخرت کی معرفت پر بولا جاتا ہے، امام فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ: ﴿ لیتفقهوا في الدین ولینذروا قومهم إذا رجعوا إلیهم ﴾ سے ظاہر ہے کہ دین کے فہم سے جو اِنذار اور خوف پیدا ہوتا ہے، اسے فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے، طلاق، عتاق، لعان، سلم، اجارہ وغیرہ مسائل کے جاننے سے یہ اِنذار ہوتا ہے نہ خوف، بلکہ صرف ان مسائل میں مشغولیت سے دل اور سخت ہو جاتا ہے اور خشیت الٰہی اس سے مفقود ہو جاتی ہے، اسی طرح حکمت سے فلسفہ، توحید سے صفات باری کی نفی، علم سے یونانی علوم یا علم کلام، تذکیر سے قصہ گوئی کا پیشہ مراد لے لیا گیا اور اصل مفہوم بالکل ہی نظر انداز ہو گیا۔''

امام غزالی رحمہ اللہ کے اس ارشاد کا تذکرہ علامہ کاتب چلپی (۱۰۶۷ھ) نے کشف الظنون (۲/ ۹۱) نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے أبجد العلوم (۲/ ۵۶۰) اور علامہ سید محمد علی الپشاوری نے القول المأمول في فن الأصول (ص: ۷) میں اور طاش کبریٰ زادہ (۹۶۳ھ) نے مفتاح السعادۃ (۲/۳) وغیرہ کتب میں اجمال اور تفصیل سے فرمایا ہے اور غزالی کی اس رائے پر کوئی تنقید نہیں فرمائی، بلکہ اسے پسند فرمایا اور اسے حقیقت پسندی کی نگاہ سے ذکر فرمایا ہے۔

ہمارے یہ بزرگ جب محدثین اور فقہاء حدیث اور ان کے اُتباع پر فقہ و درایت سے بے خبری کا الزام دیتے ہیں، تو ان کی مراد متعارف اور فنی فقہ ہوتی ہے،

جس نے ان حضرات کی درس گاہوں میں صنعت و حرفت کی شکل اختیار کر لی ہے، نزول قرآن کے وقت نہ ان فقہی جزئیات کا کوئی وجود تھا نہ فقہ کے ان دفاتر کا، استنباط اور استخراج مسائل کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن اسے فقہ سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا، نہ اس کی پابندی واجب سمجھی جاتی تھی، معلوم نہیں کہ یہ فن اگر کسی کو نہ بھی معلوم ہو، تو اس میں کیا عیب ہے؟ دنیا میں کئی حرفتیں اور پیشے ہیں، کئی علوم ہیں، جن کو آپ حضرات نہیں جانتے، اگر یہ "أبواب الحیل" نہ معلوم ہوں تو کیا حرج ہے؟ پھر اس فن اور ان جزئیات فقہیہ کے فہم میں بھی تفاوت ہے، کئی لوگوں میں انتہائی ظاہریت ہوتی ہے، بعض ذرا گہرائی میں چلے جاتے ہیں اور جب سے جامد تقلید کا شوق حضرات علماء کے اذہان پر محیط ہوا ہے، اس وقت سے ظاہریت اور حشویت عروج پر ہے، تحقیق اور دقت نظر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ اجتہاد مجتہدانِ امت کے سوا باقی لوگوں کے لیے چوتھی صدی کے بعد ممنوع قرار پا چکا ہے۔

ایسے ہی ائمہ حدیث کا معاملہ ہے، فقہیات میں ان میں سے بعض کا مقام اتنا اونچا ہے کہ مروجہ فقہوں کے ماہران کی رفعتوں کو نہیں پا سکے، یہ حضرات نہ صرف فقہ الحدیث کے ماہر ہیں، بلکہ مروجہ فقہوں پر ان کی نظر بہت ہی عمیق ہے، وہ ان مروجہ فقہی مذاہب پر بڑی غائر تنقید فرماتے ہیں، بخاری، ترمذی، بیہقی، ابن خزیمہ اور ابن ابی شیبہ وغیرہم کی دقت نظر اہل علم میں مشہور ہے، اس لئے یہ "تالا بند" کا مسئلہ کسی علمی گروہ سے مخصوص نہیں، کم و بیش تمام طبقات میں سادہ لوح اور ظاہرین بھی پائے گئے ہیں، یہ عطّار اور حکیم کی مثال بھی اسی نوعیت کی ہے، مروجہ فقہی مسالک احناف، شوافع اور موالک میں بھی بڑے بڑے "عطّار" موجود ہیں۔ قدرے سن بھی لیجیے:

(1) طہارت کے ابواب میں پانی کی طہارت کا مسئلہ کس قدر سطحی ہے، پانی کی

مقدار میں دہ دردہ کا تعین بالکل غیر فقہی ہے، جن مآخذ سے یہ مقدار اخذ کی گئی ہے، اس میں بھی تفقہ اور درایت نہیں پائی گئی، بعض آثار میں گندے کوڑے کرکٹ کو کنویں کے منہ سے دس ہاتھ دور رکھنے کی ہدایت سے مقدار کا تعین اور پانی جیسی سیال چیز کو اس پر قیاس کرنا اس میں کون سی فقہ ہے؟ شوافع کا استدلال اس سے بہت بہتر ہے۔

۲ پھر کنویں کے پانی کی مقدار کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا اور بعض غیر مستند آثار پر اس کی بنیاد رکھنا بالکل ظاہریت ہے، کنویں کے پانی کے لیے عشر فی عشر کا اندازہ ملحوظ رکھ لیا جاتا، تو بھی مقدار میں اجمال بلکہ اہمال ہوتا، لیکن مسئلہ اس قدر بے تک نہ ہوتا۔ (قاضی خاں: ۱/ ۷، شامی: ۱/ ۱۱۷)

۳ موطوءۃ لونڈی سے اثبات نسب کے لئے دعوی کی ضرورت پر زور اور مشرق، مغرب میں کسی عورت سے نکاح کرنے اور ملاقات کے متعلق یقین ہو کہ نہیں، تو بھی نسبت ثابت ہو جائے گی۔ (شامی: ۲/ ۹۷۴) یہ درایت کی کون سے قسم ہے؟ اور پھر اس پر حدیث "الولد للفراش "[1] سے استدلال بڑی شنیع قسم کی ظاہریت ہے، ابن حزم رحمہ اللہ کی ظاہریت بھی اس کے سامنے سرنگوں ہوگئی!

۴ ذکوان مولیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قرآن کریم دیکھ کر امامت کراتے تھے،[2] اسے عمل کثیر کی وجہ سے ناپسند کیا اور نماز کو فاسد قرار دیا گیا،[3] لیکن عورت کے اندام نہانی

---

[1] صحیح البخاري: کتاب البیوع، باب تفسیر الشبھات، رقم الحدیث (۱۹٤۸) صحیح مسلم: کتاب الرضاع، باب الولد للفراش والتوقي الشبھات، رقم الحدیث (۱٤٥۷)

[2] صحیح البخاري (۲/ ۱۸٥، مع الفتح) امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اثر تعلیقاً مجزوماً بہ ذکر کیا ہے، لیکن امام ابن أبي شیبہ (۲/ ۱۲۳) اور امام بیہقی رحمہما اللہ (۲/ ۲٥۳) نے اسے موصولاً بیان کیا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ھو أثر صحیح " دیکھیں: تغلیق التعلیق (۲/ ۲۹۱)

[3] بدائع الصنائع للکاساني (۱/ ٥٤۳)

کو غلط انداز سے دیکھے، تو نماز میں کوئی خلل نہ ہوگا۔ (قاضی خان: ۱/ ۱۱۱)

یہ کہاں کا تفقہ ہے؟ ان جزئیات کو پوری عقیدت سے قبول فرما کر محدثین کو عطّار کہنا دانشمندانہ اندازِ فکر نہیں۔

۵ محرمات اُبدیہ سے نکاح کے بعد منہ کالا کرنے کے بعد شبہ فی المحل کی بنا پر اسے حد سے بچانا اور "ادرؤا الحدود بالشبهات" کی بنا پر بحث کرنا، اس میں ہمیں تو تفقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ (قاضی خان: ۱/ ۳۲۴)

۶ خمر کے متعلق جس وسعت سے فقہ حنفی نے پرمٹ دیئے ہیں اور خمر کی مختلف اقسام کے احکام جس حوصلہ مندی سے نافذ فرمائے، اس سے حدیث "يسمونها بغير اسمها" [1] کی تصدیق ہوتی ہے، مگر تفقہ فی الدین کا اس سے ثبوت نہیں ملتا، عام حلال وحرام میں احتیاط کے لحاظ سے احناف خاصے نیک نام تھے، لیکن یہ نیک نامی اور احتیاط شراب میں قائم نہیں رہ سکی، بلکہ اہل علم میں غیر محتاط روش کی نظیر بن گئی۔

۷ نکاح حلالہ کو ناجائز اور حرام سمجھنے کے باوجود یہ فتویٰ کہ اس سے پہلے خاوند کے لیے بیوی حلال ہو جائے گی، [2] غایت درجہ کی سطحیت ہے، اس کی تائید نہ روایت سے ہوتی ہے اور نہ درایت سے، اس تاویلی زنا کا جواز تقلید ہی کی بنا پر ہوسکتا ہے!!

اس قسم کی سینکڑوں جزئیات مروجہ فقہ کے دفاتر میں موجود ہیں، جو عقل وشعور

---

[1] سنن أبي داود (٣٦٨٨) سنن النسائي (٥٢٥٨) سنن ابن ماجه (٤٠٢٠) اس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "جید" قرار دیا ہے، (فتح الباري: ١٠/ ٥١) نیز اسے امام حاکم، ذہبی اور البانی رحمہم اللہ نے "صحیح" قرار دیا ہے، حافظ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٥/ ٨٣)

[2] الهداية (ص: ٢٥٧)

کے دامن کو بڑے زور سے جھنجھوڑتی ہیں، بجز تقلید اور عصبیت کے ان کے قبول کے لیے ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔

ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ فقہ حنفی کے سارے مسائل سطحی اور عدم احتیاط پر مبنی ہیں، بلکہ بعض مقامات میں انتہائی تفقہ اور گہرائی سے کام لیا گیا ہے اور بڑی محتاط روش اختیار فرمائی گئی ہے، اس لئے دور اندیش اور محقق علماء کی رائے ہے کہ ان مروجہ مسالک سے کسی مسلک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے، "خذ ما صفا ودع ما کدر" ❶ پر عمل ہونا چاہئے، ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كما أن المكيين والكوفيين لا يجوز تقليدهم في مسئلة المتعة والصرف والنبيذ ولا يجوز تقليد بعض المدنيين في مسئلة الحشوش وإتيان النساء في أدبارهن بل عند فقهاء المحدثين أن من شرب النبيذ المختلف فيه حُدّ" اھ (إعلام الموقعين: ٣/ ٢٥١ طبع منيريه)

یعنی متعہ اور بیع صرف اور نبیذ کے جواز میں اہل مکہ اور علماء کوفہ کی تقلید درست نہیں، اسی طرح مدینہ کے بعض علماء کی تقلید مسئلہ حشوش اور إتيان النساء فی الدبر میں درست نہیں، بلکہ فقہاء محدثین کا خیال ہے کہ جو شخص مختلف فیہ نبیذ پیئے گا، اس کو حد لگے گی۔"

ظاہر ہے تمام مسالک اور مذاہب میں بعض مسائل پوری تحقیق اور احتیاط سے تخریج کئے گئے ہیں اور بعض بالکل سطحی ہیں، ان میں دقت نظر ملحوظ ہے نہ احتیاط، ائمہ حدیث پر طعن سے پیشتر تمام مذاہب کی فقہوں میں ایسے امور پر غور کر لینا چاہیے، ممکن ہے شکایت کا موقعہ نہ رہے، بعض اہلحدیث علماء نے بھی مروجہ فقہ کی روش پر بعض کتب تصنیف فرمائیں، جیسے نواب وحید الزمان، نواب صدیق حسن خان، ان میں

❶ صاف ستھری چیز کو پکڑو اور پراگندہ چیز کو چھوڑ دو۔

بھی اس قسم کا غیر محتاط مواد آ گیا ہے، جو یقیناً قابل قبول نہیں۔

یہ راہ ہی ایسی ہے، جس میں لغزش کا امکان یقینی ہے اور جہاں تک فہم و فراست کا تعلق ہے، اس میں مراتب کا تفاوت تمام طبقات میں پایا جاتا ہے اور جہاں تک ''تالا بند'' کا تعلق ہے، اہل علم کے مختلف طبقات سے کوئی طبقہ کلیتاً محروم نہیں، طعن سے پہلے پورے ماحول پر غور فرما لینا مناسب ہے، جس فنی فقہ پر اس قدر ناز کیا جا رہا ہے، اس کا جاننا کوئی خاص خوبی ہے، نہ اس سے محرومی کوئی بڑا عیب ہے، فنی فقہ کے جاننے والوں میں بعض حشوی اور ظاہر پرست، بعض دقیق النظر، اسی طرح ائمہ حدیث میں دونوں قسم کے لوگ ہیں، یہ کوئی قانون نہیں جو آپ حضرات کے نوک قلم پر بار بار آ رہا ہے، آپ لوگوں کی جدید تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرات سے اکثر حشوی اور ظاہری ہیں، یہ الگ بات ہے کہ آپ کی ظاہریت فقہ کے شروح اور متون میں محصور ہے اور امام داود اور ابن حزم رحمہما اللہ کی ظاہریت قرآن و سنت تک محدود ہے!

الدرایۃ:

لفظ درایت کے لغوی معنی اور متعارف معانی اور جدید اصطلاح میں فرق ہے، لغت میں اس کے متعدد مصادر ہیں:

" دراه درى به يدري دريا و درية ودرية ودريانا ودَريانا ودُريا ودراية وهي الأكثر في الاستعمال (ياتى) علمه أو توصل إلى علمه بضرب من الحيلة" (محيط المحيط)

آخر میں فرمایا:

" علم الدراية علم الفقه و أصول الفقه" (۱/ ۸۳)

منجد، القاموس المحیط ، المصباح المنیر وغیرہ کتب لغت میں اس کا

معنی علم یا مخصوص توجہ سے کسی چیز کا جاننا مرقوم ہے، علم فقہ یا اصول فقہ یہ مخصوص انداز ہے دینی علوم میں غور و تدبر کا۔ اس کا عرفی مفہوم بھی اس کے قریب قریب ہے:

" العلم بدراية الحديث وهو علم باحث عن المعنى المفهوم من ألفاظ الحديث وعن المراد منها مبنيا على قواعد العربية و ضوابط الشريعة ومطابقا لأحوال النبي ﷺ " اھ

(كشف الظنون: ١/ ١٢٣)

"یعنی اس علم میں احادیث نبویہ کے معانی اور مقاصد سے عربی زبان کے قواعد اور شریعت کے ضوابط اور آنحضرت ﷺ کے حالات کے مطابق غور کیا جاتا ہے۔"

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ أبجد العلوم میں فرماتے ہیں:

" وقال الشيخ شمس الدين الأكفاني السخاوي: دراية الحديث علم تتعرف منه أنواع الرواية وأحكامها وشروط الرواية وأصناف المرويات واستخراج معانيها ويحتاج إلى ما يحتاج إليه علم التفسير من اللغة والنحو والتصريف والمعاني والبيان والبديع والأصول ويحتاج إلى تاريخ النقلة " (٢/ ٤٨٣)

"یعنی علم درایت حدیث سے روایت کے اقسام، شروط اور احکام اور مرویات کی اقسام اور ان کے معانی کا استخراج ہوتا ہے اور اس میں لغت، نحو، صرف، معانی، بیان اور بدیع کی اسی قدر ضرورت ہے، جس قدر علم تفسیر میں اور ناقلین حدیث کے متعلق تاریخی معلومات یعنی موالید اور وفیات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔"

علامہ احمد بن مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ (۹۶۲ھ) علم درایت کے متعلق فرماتے ہیں:

"هو علم يبحث فيه عن المعنى المفهوم من ألفاظ الحديث وعن المعنى المراد منها مبنيا على قواعد العربية وضوابط

الشريعة مطابقا لأحوال النبي ﷺ."

"اس کا موضوع احادیث نبویہ بلحاظ معانی اور مقاصد ہے، اس کی غایت آداب نبویہ کے ساتھ تخلق ہے اور علوم عربیہ اس کے مبادی ہیں، یعنی اس علم میں آنحضرت ﷺ کے حالات اور عربی علوم کی روشنی میں احادیث کے معنی اور مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔"

اوپر کی تعریفات سے فن درایت کے متعلق چند معلومات حاصل ہوتے ہیں:

① درایت کوئی مدون فن نہیں، بلکہ عربی زبان اور اس کے متعلقات اور اصول فقہ و اصول حدیث میں مزاولت اور مہارت سے خود بخود ایک ذہن پیدا ہوتا ہے، جس سے حدیث کے مفہوم کی بعض پیچیدگیاں بعض وقت حل ہو جاتی ہیں۔

② روایت اور رجال کے مباحث میں بھی اس سے فائدہ ہو سکتا ہے، لیکن اس کا زیادہ تر تعلق معانی اور مفہوم سے ہوتا ہے، بعض تاریخی مباحث بھی اس سے حل ہو سکتے ہیں، رجال کی موالید اور وفیات، اتصال ، انقطاع، ارسال، اعضال وغیرہ کے متعلق بھی اس سے روشنی پڑتی ہے، گو ان مباحث کا براہ راست تعلق اصول حدیث سے ہے۔

③ ناقلین تاریخ سے نسخ کے مباحث میں بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، گو اصل اس کا اصول فقہ سے تعلق ہے۔

④ حدیث کا طالب علم خوب جانتا ہے کہ حدیث کے رواۃ اور اسانید کے متعلق ائمہ حدیث نے کس قدر محنت فرمائی ہے اور ان کے حالات کی کس قدر چھان پھٹک کی ہے۔

تاریخ بھی ہمارے پاس اسی قسم کی اسانید کے واسطہ سے پہنچی ہے، تاریخ طبری، البدایہ والنہایہ اور مسعودی وغیرہ میں اسانید کا خاصا التزام کیا گیا ہے،

لیکن یہ رواۃ اور اسانید، احادیث کے رواۃ اور اسانید کا مقابلہ نہیں کر سکتے ، نہ ہی اس پر اس قدر محنت کی گی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حدیث حجت شرعی ہے اور تاریخ شرعاً حجت نہیں۔

ائمہ اسلام میں بعض صرف محدث ہیں، بعض مؤرخ اور اخباری ہیں، بعض دونوں فنون کے ماہر ہیں، دونوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں، لیکن دونوں کا ذوق ہر مقام پر مختلف ہوتا ہے، جب وہ حدیث اور اس کے رواۃ پر بحث کرتا ہے، اس کی شان اور انداز تحقیق اخباری اور تاریخی انداز سے مختلف ہوتا ہے، اگر اخباری روایات احادیث کے خلاف آ جائیں، تو ائمہ حدیث اسے تعارض نہیں سمجھتے ، تطبیق کی بجائے وہ حدیث کو ترجیح دیتے ہیں اور بات بھی معقول ہے۔

فن درایت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات درایت کی وجہ سے ایسے قرائن جمع ہوجاتے ہیں، جن کی بنا پر اخباری روایات کو حدیثی روایات پر ترجیح دینا درست معلوم ہوتا ہے، درایت کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں اہم فائدہ یہی ہے۔

محض شخصی عقل اور تجربہ، قرائن کی بنیاد نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اساس پھر بھی روایت اور واقعات پر ہونی چاہیے، عقلی استحالات ایک مستند قصہ کی تغلیط کے لیے کافی نہیں، بلکہ اگر صحیح روایات کی تغلیط محض عقلی احتمالات سے کی جائے، تو اس کا مطلب روایت اور رواۃ دونوں کی تکذیب ہوگا اور اگر ان قرائن کی بنیاد کوئی دوسری حدیث ہو، تو اعتماد روایت پر اور قرائن ترجیح کا موجب ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ سنت کو اس فن کی ضرورت چند وجہ سے ہوئی، چونکہ روایت بالمعنی کے متعلق ائمہ میں پہلے ہی سے اختلاف تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ

روایت بالمعنی کا رواج عام تھا، حدیث کا ایک طالب علم جانتا ہے کہ ایک حدیث کس قدر مختلف الفاظ سے مروی ہوتی ہے، خود قرآن عزیز پہلے انبیاء کی تاریخ کو متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں ذکر فرماتا ہے، اسے روایت بالمعنی ہی کہا جا سکتا ہے۔ ائمہ حدیث اس اجازت کے بعد یقین فرمانا چاہتے تھے کہ کہیں حدیث کا اصلی مقصد ہی اختلاف تعبیرات کی وجہ سے پریشانی کی نذر نہ ہوجائے، اس لئے انھوں نے فن درایت کو عربی علوم کی اساس پر قائم فرمایا۔

فقہاء عراق:

حضرات عقلاء عراق نے دو فتوے اور بھی دیئے، جن کی بنا پر درایت کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی، نماز میں فارسی قرأت کا مسئلہ حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب تھا،[1] مطولات میں اس کے متعلق رجوع اور اقرار دونوں امر منقول ہیں اور قائل اور مخالف دونوں فریق موجود، گو ائمہ حدیث بلکہ دوسرے ائمہ اس کے قائل نہیں، تاہم اہل علم کی محفل میں یہ مسئلہ مابہ النزاع ضرور ہے، اس سے روایت بالمعنی کے جواز کو مدد ملتی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ علوم عربیہ اور اس کے متعلقات کی روشنی میں مضبوط احتساب کیا جائے کہ اصل مقصد گم نہ ہونے پائے۔

علماء عراق نے فخریہ فرمایا کہ ہم مراسیل کو بھی حجت سمجھتے ہیں، شامی نے ابواب وصیت میں فرمایا کہ اگر کوئی آدمی اہلحدیث کے نام پر کوئی چیز وقف کرے، تو یہ وصیت حنفی طالب علموں کو بھی شامل ہوگی، کیونکہ یہ مرسل کو بھی حجت سمجھتے ہیں (رد المحتار: ۳/ ٥٦٥) اہلحدیث بننے کا شوق بڑا مبارک ہے اور وقف پر قبضہ بھی خوب! لیکن بحث تو یہ ہے کہ مرسل کو علی الاطلاق حدیث کہنا درست ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ نے ”الرسالة“ میں یہ بحث مفصل ذکر فرمائی ہے۔ (الرسالة: ٤٦٢)

[1] الهداية (ص: ٤٧) بدائع الصنائع (١/ ٢٩٦) نیز دیکھیں: فتح الباري (١٣/ ٥١٧)

اور واضح فرمایا ہے کہ مرسل کو حدیث کہنا یا سمجھنا کہاں تک درست ہے، کل ممکن ہے کوئی عالم زور بیان میں یہ فرما دیں کہ اصل اہل حدیث ہم ہیں، کیونکہ ہم موضوع احادیث کو بھی مانتے ہیں، تو ہم ان بزرگوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟!

صورت جو بھی ہو، ان وجوہ کی بنا پر محدثین اور ائمہ سنت کا یہ خطرہ ایک حقیقت معلوم ہوتا ہے، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ان فتوؤں کی زد اور نقصان سے بچنے کے لیے کچھ پابندیاں عائد کی جائیں، تاکہ نقل احادیث میں علماء کی طغیانیاں اصل مقصد کو بہا کر نہ لے جائیں اور مراسیل، مقطوعات کی آڑ میں موضوع اور مختلق چیزیں آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہ ہو جائیں، اس لئے اس حفاظتی تصور کا نام علم درایت رکھا گیا اور زیادہ تر اس کا انحصار لغت اور علوم لسانیہ پر رکھا گیا، تاکہ روایت کا مفہوم صحیح طور پر آگے منتقل ہو، مراسیل کی طرح کوئی غلط اور غیر یقینی نوشتہ آنحضرت ﷺ کی طرف نسبت نہ پا جائے۔

فقہ راوی:

جن مقاصد کے لیے بعض اہل علم نے درایت کی ضرورت کو محسوس فرمایا، انہی مقاصد کے لیے فقہاء عراق نے فقہ راوی کی قید لگائی، تاکہ نصوص کا مفہوم صحیح ادا ہو اور روایت بالمعنی میں اس سے مدد مل سکے اور آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی صحیح تعبیر مخاطب تک پہنچ سکے، گو درایت اور فقہ کے مصطلح مفہوم میں فرق ہے، لیکن مفہوم کے ادا میں ان دونوں ذرائع سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور یہ واقع میں صحیح بھی ہے اور ضروری بھی، لیکن ائمہ حدیث اور فقہاء محدثین اس قسم کی قیود سے بے نیاز تھے، اسانید کے ضبط اور متون میں مختلف الفاظ کے حفظ و ادا سے ان کے طبائع میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ فنی لطافتوں کے علاوہ ذوقی طور پر سمجھتے تھے

اور ہر صاحب فن کا اپنے فن میں یہی حال ہوتا ہے، وہ فن کی لطافتوں کو ذوق سے سمجھتے ہیں، معلوم ہے موجدین فنون نے فنون کتابوں سے نہیں پڑھے، ہاں ذوق کی سلامتی ان فنون کی ایجاد کا موجب ہوئی، اصول فقہ، اصول حدیث، معانی، بیان وغیرہ تمام فنون تصنیف وتالیف اور تدوین سے پہلے ذوق سلیم ہی کے مرہون تھے۔

لیکن حدیث جن لوگوں کا فن نہیں تھا، حفظ وضبط میں ان کا انداز محدثانہ نہ تھا، ان حضرات نے ذوق کا کام ان فنون سے لیا اور پوری نیک دلی سے احادیث نبویہ اور ان کے مفاہیم اور مقاصد پر غور کیا، فجزاهم الله أحسن الجزاء، علماء اپنے اپنے انداز سے خدمت کرتے رہے اور ان اصول وقواعد کی راہ میں کوئی بے اعتدالی راہ نہ پاسکی۔

بے اعتدالی کا دور:

جب یونانی علوم نے اسلامی علوم پر یورش کی اور غیر مسلم اہل علم اسلام سے مانوس ہوئے، اسلامی علوم وعقائد ان کے خیالات وعقاید سے متصادم ہوئے، تو بے اعتدالی کی راہیں پیدا ہونا شروع ہوئیں، یہ اصطلاحات جن مقاصد کے لیے وضع کی گئی تھیں، ان کے بالکل خلاف استعمال ہونے لگیں، صفات باری تعالیٰ کی تاویل کا نام تفقہ اور درایت رکھ لیا گیا اور ائمہ سنت کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا گیا، حق گوئی کا نام حشویت، حرفیت، ظاہریت رکھ کر ان کو بدنام کیا گیا، ان کی بلا تاویل سادہ روش کو غیر فقہی کہہ کر ان کے خلاف بد اعتمادی کی فضا قائم کی گئی، فقہاء اسلام نے جن لوگوں کے لیے یہ اصطلاحات ایجاد کی تھیں، وہ بھی تاویل میں اس طغیانی اور تخریب عقائد میں اس اندھیر کے قائل نہ تھے۔

فلاسفہ اسلام اور متکلمین نے اپنے جدید افکار سے اسلام اور اس کے عقائد

میں تشکیک پیدا کر دی ، بجائے اس کے کہ درایت اور تفقہ سے روایت بالمعنی کی امکانی اغلاط سے بچا جاتا، تاویل سے بھی گزر کر تحریف کی سرحدوں کو عبور کرنا شروع کر دیا گیا، امام سرخسی (۴۹۰ھ) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلق ابن عباس اور یزید بن اصم کی دو متعارض احادیث میں اپنے مسلک کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما یزید بن اصم سے زیادہ فقیہ تھے:

" وهذا الترجيح ليس إلا باعتبار تمام الضبط من الفقيه و كان المعنى فيه أن نقل الخبر بالمعنى كان مشهورا فيهم فمن لا يكون معروفا بالفقه ربما يقصر في أداء المعنى بلفظه بناءاً على فهمه ويؤمن مثل ذلك من الفقيه ." (أصول سرخسى : ١/ ٣٤٩)

"یعنی یہ ترجیح اس لئے دی گئی کہ فقیہ راوی مفہوم کو بہتر ضبط کر سکتا ہے، چونکہ صحابہ میں روایت بالمعنی عام تھی، غیر فقیہ راوی کبھی حقیقت تک رسائی سے قاصر رہتا ہے اور فقیہ راوی کے متعلق یہ خطرہ نہیں ہوتا۔"

اس وقت یہ ظاہر کرنا مطلوب نہیں کہ یہ ترجیح درست ہے یا محل نظر؟ گزارش صرف اس قدر ہے کہ فقہ راوی کی شرط درایت کی طرح روایت بالمعنی کی مضرت سے بچنے کے لیے تھی، لیکن آہستہ آہستہ اسی فقہ راوی کی بنا پر بیسیوں احادیث کو ذبح کر کے رکھ دیا گیا اور بیسیوں ثقہ رواۃ بلکہ صحابہ کو اس مصطلح تفقہ اور درایت کی بنا پر غیر مستند قرار دے دیا گیا، حضرت امام ابوحنیفہ کو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی گئی۔
(شامی : ١/ ٥٧)

نقد روایات اور فقہ:

اس میں کچھ شک نہیں کہ فقہاء حنفیہ اور ائمہ اصول میں فقہ راوی کی شرط تنقید

روایات میں کافی مشہور ہے، امام سرخسی ایسے اکابر رجال بھی فقہ راوی کی بنا پر تنقید اور ترجیح کا بکثرت تذکرہ فرماتے ہیں، نکاح میمونہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے یزید بن الاصم کے متعلق فرماتے ہیں: "البوال علی عقبه" یزید بن الاصم کے متعلق علماء رجال کا خیال ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، صحابی نہ بھی ہوں، تو اکابر تابعین سے ہوں گے،[1] ان بزرگوں کے متعلق یہ اندازِ تنقید اچھا معلوم نہیں ہوتا، ابن سعد فرماتے ہیں: "ثقة كثير الحديث"[2]

فقہ راوی کی زد سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے اکابر صحابہ بھی نہیں بچ سکے، بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تو بہت زیادہ تختہ مشق رہے،[3] ان ہی حضرات سے سن کر روافض اور منکرین حدیث نے پاکباز صحابہ پر طعن و تشنیع کرنا شروع کر دیا اور عجیب یہ ہے کہ فقہ کا ان حضرات کے ہاں کوئی پیمانہ نہیں کہ کتنی فقہ ان حضرات کو نقل روایت میں مطمئن کر سکتی ہے؟ فقہ سے محروم تو صحابہ میں سے کوئی نہ تھا، جب کوئی پیمانہ معین نہ ہو، اس قسم کی جرح مذاق بن کر رہ جائے گی، یقین ہے کہ یہ حضرات ارادتاً صحابہ کی بے ادبی کرنا نہیں چاہتے، لیکن عیسیٰ بن ابان اور امام سرخسی سے لے کر بزدوی اور ملا جیون تک تمام اصاغر و اکابر یہ وظیفہ کریں کہ حضرت

---

[1] حافظ علائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ذكره بعضهم في الصحابة والصحيح أنه تابعي وحديثه مرسل" (جامع التحصيل: ٣٠٠) نیز دیگر اہل علم نے بھی انھیں تابعی قرار دیا ہے، دیکھیں: الثقات للعجلي (٢/٣٦٠) الإصابة (٦/٦٩٣) تهذيب التهذيب (١١/ ٢٧٣)

[2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٧/٤٧٩)

[3] دیکھیں: أصول البزدوي (ص: ١٥٩) أصول السرخسي (١/٣٤٠) أصول الشاشي (ص: ٢٧٥) نیز دیکھیں: توضيح الكلام (٢/٤٢)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فقیہ نہیں، تو عزت کیا رہی؟ غالبًا یہ تاثر روافض اور معتزلہ سے لیا گیا ہے، دوسرے ائمہ بھی مجتہد اور فقیہ ہیں، لیکن کسی کو صحابہ پر اس طرح حرف گیری کی جرأت نہیں ہوئی، یہ جامد تقلید کے مصائب ہیں۔

عشق زینہا بیش کر دست کند

فقہ راوی کا اثر:

متقدمین نے یہ شرط روایت بالمعنی کے خطرات سے بچنے کے لیے لگائی تھی، حالانکہ روایت بالمعنی کا رواج صحابہ میں عام تھا، تدوین کے بعد تو الفاظ جو بھی تھے، محفوظ ہو گئے، اب تو وعظ و تقریر میں ہو سکتا ہے روایت بالمعنی کی ضرورت کبھی ہو، درس و تدریس اور تدوین اور روایت میں اس کی ضرورت ہی نہیں، تاہم متاخرین فقہاءِ حنفیہ نے جو اعتزال سے متاثر تھے، انھوں نے اسے بڑا غلط برتا، یونانی نظریات کا نام فقہ رکھا گیا، متکلمین کی موشگافیوں کو فقہ سمجھا گیا، اعتزال کی گمراہیوں کو ہدایت سے تعبیر کیا گیا، مامون کے دور سے متوکل کے زمانہ تک ائمہ سنت پر جو ابتلا آیا، وہ اسی قسم کی فقہ کا نتیجہ تھا، یہ فقہ ائمہ اربعہ سے پہلے شروع ہو چکی تھی، احناف میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، بشر مریسی ۲۲۸ھ قاضی عیسیٰ بن ابان ۲۲۱ھ، قاضی بشر بن ولید کندی اسی قسم کی فقہ کے پیداوار ہیں، بشر مریسی وہی بزرگ ہیں، جنھوں نے مامون کے دربار میں شیخ عبدالعزیز کنانی سے خلق قرآن پر مناظرہ کیا، امام احمد رحمہ اللہ نے ''کتاب السنة'' میں ان کے متعلق عجیب انکشافات فرمائے ہیں:

'' أخبرت عن يحيىٰ بن أيوب قال كنت أسمع الناس يتكلمون في المريسي فكرهت أن أقدم عليه حتى أسمع كلامه لأقول فيه بعلم فأتيته فإذا هو يكثر الصلوة على عيسىٰ بن مريم عليه السلام فقلت له إنك تكثر الصلاة على عيسىٰ فأهل ذلك هو

ولا أراك تصلي على نبينا ونبينا أفضل منه؟ فقال لي ذلك كان مشغولا بالمِرآة والمشط والنساء" (۱/ ۳۰)

''یعنی یحییٰ بن ایوب فرماتے ہیں: یہ لوگ بشر مریسی کے متعلق باتیں کرتے تھے، میں نے ذاتی علم کے بغیر کوئی اقدام مناسب نہ سمجھا، میں نے دیکھا کہ وہ حضرت مسیح پر بہت درود پڑھتا تھا، میں نے کہا، حضرت مسیح بے شک درود کے اہل ہیں، لیکن آنحضرت ﷺ ان سے افضل ہیں، اس نے کہا وہ شیشہ، کنگھی اور عورتوں ہی میں مشغول رہتے تھے۔''

بشر کی زندقت کا تذکرہ الفوائد البھیہ (ص: ۲۶) اور الجواھر المضیئۃ (۱/۱۶۴) میں بھی مرقوم ہے اور اسی طرح میزان الاعتدال (۱/ ۱۵۰) میں ہے:

" بشر بن غياث المريسي مبتدع ضال لا ينبغي أن يروى عنه تفقه على أبي يوسف فبرع وأتقن علم الكلام ثم جرد القول بخلق القرآن وقال قتيبة: بشر المريسي كافر."

''یعنی بشر مریسی بدعتی گمراہ ہے، اس سے روایت درست نہیں، امام ابو یوسف سے فقہ پڑھی، مہارت کے بعد خلق قرآن کا قائل ہوگیا۔''

قاضی بشر بن ولید کندی خلیفہ معتصم باللہ کی طرف سے قاضی مقرر ہوئے، آخر میں خلق قرآن کے مسئلہ میں توقف کرنے لگے۔ (میزان الاعتدال: ۱/۱۵۲)

حالانکہ اکابر اہل سنت اس وقت جیل خانوں میں تھے، قاضی عیسیٰ بن ابان نے فقہ راوی کو اچھالا اور احادیث میں ترجیح کی اس شرط سے بے حد کام لیا، روایت بالمعنی سے پیدا ہونے والے خطرات سے بچنے کے لیے جو اصل وضع فرمایا گیا، وہ خود ایک مستقل خطرہ بن گیا اور ان اعتزال پسند فقہاء نے آنحضرت ﷺ کے عشاق اور ان کی بہت سی مرویات کو ذبح کرکے رکھ دیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مصراۃ کے متعلق

حدیث ان حضرات کی نظر میں آ گئی، [1] ورنہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کی تلاش میں حجاز کے پہاڑ چھان مارتے، نماز کی جگہوں کے ساتھ پیشاب کے مواقع کا بھی تتبع فرماتے، ان کی فقہ پر کوئی حرف نہیں آیا، حالانکہ یہ مواقع نہ عبادات تھے نہ عادات، بلکہ محض اتفاقات تھے، لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیچارے حدیث مصراۃ کی وجہ سے ہر اصول فقہ کے طالب علم کی زبان پر ان کے غیر فقیہ ہونے کا وظیفہ جاری ہے، [2] ولیس ذلك إلا من آفات التقلید والجمود!

فقہ راوی کی شرط اور اکابر حنفیہ:

---

[1] ''حدیث مصراۃ'' سے مراد وہ حدیث ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اونٹ اور بکری کا دودھ روک کر مت بیچا کرو، جس شخص نے ایسا جانور خرید لیا، وہ دو چیزوں میں مختار ہے، اگر اسے وہ جانور پسند آ جائے، تو اپنے پاس رکھ لے اور اگر اسے وہ جانور پسند نہ آئے، تو واپس کر دے اور اس جانور کے ساتھ کھجور کا ایک صاع بھی ادا کرے۔ (صحیح البخاري، برقم (۲۰٤۱، ۲۰٤۳) صحیح مسلم، برقم (۱۵۱۸) ''مصراۃ'' ایسے دودھ دینے والے جانور کو کہا جاتا ہے، جسے فروخت کرنے سے چند دن قبل دھویا نہیں جاتا اور دودھ نہیں نکالا جاتا، تاکہ فروخت کے وقت اس کی قیمت بڑھ سکے۔

[2] چنانچہ قاضی ابوطیب طبری اسی طرح کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم جامع منصور میں بیٹھے ہوئے تھے کہ خراسان کا ایک حنفی نوجوان آیا اور اس نے مصراۃ (دودھ روکا ہوا جانور) کے بارے میں سوال کیا اور دلیل کا بھی مطالبہ کیا، جواب دینے والے نے جواب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مصراۃ کے بارے میں حدیث سے استدلال کرتے ہوئے اسے جواب دیا، تو وہ حنفی نوجوان کہنے لگا: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی تو حدیث مقبول نہیں ہوتی! قاضی ابوطیب کہتے ہیں کہ ابھی اس نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ مسجد کی چھت سے ایک بہت بڑا سانپ گرا، جسے دیکھ کر لوگ بھاگ گئے اور وہ نوجوان بھی بھاگ گیا، سانپ بھی اس نوجوان کے پیچھے بھاگنے لگا، تو لوگوں نے اسے کہا: توبہ کر لو! توبہ کر لو! چنانچہ اس نوجوان نے کہا: میں توبہ کرتا ہوں، تو سانپ غائب ہو گیا اور اس کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ (المنتظم لابن الجوزي: ۹/ ۱۵۵، تاریخ الإسلام للذهبي: ٤/ ۳۵٤، سیر أعلام النبلاء: ۲/ ٦۱۹) حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: '' إسنادها أئمة '' یعنی اس سند کے رواۃ بھی امام ہیں۔

ہمارے مدارس کا یہ حال ہے کہ وہ فقہ راوی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں، جیسے کسی آیت کا مفہوم بیان فرما رہے ہیں یا کوئی متواتر حدیث، حالانکہ قدماء احناف کے ہاں اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں، وہ نقد روایت یا ترجیح میں اس شرط کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے، أصول بزدوی میں فقہ راوی کا ذکر فرماتے ہوئے مثال کے طور پر دو غیر فقیہ بزرگوں کا تذکرہ فرمایا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، اس کے بعد اس شرط کا فائدہ ذکر فرمایا:

"ووجه ذلك أن ضبط حديث النبي صلى الله عليه وسلم عظيم الخطر وقد كان النقل بالمعنى مستفيضا فيهم فإذا قصر فقه الراوي عن درك معاني حديث النبي صلى الله عليه وسلم وإحاطتها لم يؤمن أن يذهب عليه شيء من معانيه." [1]

(أصول بزدوی: ٦٩٩)

"یعنی حدیث کے نقل کا معاملہ خطرناک ہے اور صحابہ میں روایت بالمعنی کا رواج عام تھا، اگر راوی فقیہ نہ ہو، تو ممکن ہے کہ حدیث کے مفہوم میں لغزش ہو جائے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ صحابہ کو غیر فقیہ کہنے سے ان کی تحقیر مطلوب نہیں، بلکہ امام صاحب بسا اوقات بعض شرائط سے غیر فقیہ صحابہ کی احادیث قبول فرما لیتے تھے:

فإن محمدا يحكي عن أبي حنيفة في غير موضع أنه احتج بمذهب أنس بن مالك وقلده فما ظنك في أبي هريرة." [2]

(اصول بزدوی: ٧٠٠)

امام محمد فرماتے ہیں: امام صاحب کبھی انس بن مالک کی بھی تقلید فرما لیتے تھے

---

[1] أصول البزدوي (ص: ١٥٩)

[2] مصدر سابق

اور وہ ابوہریرہ سے زیادہ غیر فقیہ تھے۔"

تعجب ہے کہ اس خطاب کے لیے یہی بے چارے دو یا تین صحابہ مثال کے طور پر ملے ہیں، باقی ایک لاکھ کے پس وپیش غالباً سب فقیہ ہوں گے!

اصول بزدوی کے شارح عبدالعزیز بن احمد بخاری (۷۳۰ھ) فرماتے ہیں:

" اعلم أن ما ذكرنا من اشتراط فقه الراوي لتقديم خبره على القياس هو مذهب عيسى بن أبان واختاره القاضي الإمام أبو زيد وخرج عليه حديث المصراة وخبر العرايا وتابعه أكثر المتأخرين، فأما عند الشيخ أبي الحسن الكرخي ومن تابعه من أصحابنا فليس فقه الراوي بشرط لتقديم خبره على القياس بل يقبل خبر كل عدل ضابط إذا لم يكن مخالفا للكتاب والسنة المشهورة يقدم على القياس قال أبو اليسر: وإليه مال أكثر العلماء لأن التغيير من الراوي بعد ثبوت عدالته وضبطه موهوم."[1] (۲/ ۷۰۳)

"یعنی روایت کی ترجیح اور تقدیم کے لیے فقہ راوی کی شرط صرف قاضی عیسیٰ بن ابان اور بعض متاخرین کا مذہب ہے، ابوزید دبوسی نے اسے پسند فرمایا اور مصراۃ اور عرایا کی حدیث کو اسی اصل پر تخریج کیا اور شیخ ابوالحسن کرخی اور ان کے اَتباع اس شرط کو قبول نہیں فرماتے، ان کا خیال ہے کہ عادل اور ضابط راوی کی خبر بہر حال قیاس پر مقدم ہوگی۔ ابوالیسر فرماتے ہیں: اکثر فقہاء حنفیہ کا یہی مذہب ہے، کیونکہ ثقہ راوی کی روایت کے بعد معنی کی تبدیلی کا سوال محض وہم ہے۔"

امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ وہ مصراۃ کی حدیث کو صحیح سمجھتے تھے، بالکل انہی خیالات کا اظہار شارح حسامی نے "غاية التحقيق" میں کیا ہے۔ (ص: ۱۶۵، ۱۶۶)

[1] كشف الأسرار عن أصول فخر الإسلام البزدوي (۲/ ۵۵۸)

صاحب دراسات اللبیب نے اس مقام پر عجیب پر مغز اور مختصر بحث فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں:

① فقہ راوی کو تحمل اور صدق روایت میں کوئی اثر نہیں۔

② صحابہ میں یہ امکان ہی نہیں کہ روایت بالمعنی میں ایسی غلطی کریں، جس سے حدیث کا مقصود فوت ہو جائے۔

③ جو لوگ آنحضرت ﷺ کے الفاظ ضبط کرنے کی کوشش فرماتے تھے، کیسے ممکن ہے کہ معنی ادا کرنے میں وہ غلطی کریں؟

④ وہ لوگ اہل زبان تھے، ان سے ادائے معنی میں غلطی کا احتمال کہاں ہو سکتا ہے؟ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جیسا دانشمند آدمی جس کی طرف بوقت ضرورت عبادلہ ایسے فقہاء صحابہ رجوع فرماتے تھے۔

⑤ آنحضرت ﷺ نے ان کے حق میں حفظ کے لیے دعا فرمائی، جس کا یہ اثر ہوا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے اس کے بعد نسیان نہیں ہوا،[1] (اگر یہ حفظ بلا فہم ہو یا غلط فہمی کا امکان موجود ہو، تو اس دعا سے کیا فائدہ؟)

⑥ جو لوگ صحیحین کے رجال کے خصائص کو جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ان میں ادنیٰ اور معمولی آدمی بھی آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی غلط تعبیر نہیں کر سکتا۔

⑦ آخر میں فرماتے ہیں: ” ولهذا قال شيخ الحنفية صاحب الكشف والتحقيق في التحقيق: ولم ينقل عن أحد من السلف اشتراط الفقه من الراوي فثبت أنه قول مستحدث بمثل هذا لا ينسب إلى أبي

[1] صحيح البخاري: كتاب العلم، باب حفظ العلم، رقم الحديث (١١٩) صحيح مسلم: كتاب فضائل الصحابة رضی اللہ عنهم، باب من فضائل أبي هريرة الدوسي رضی اللہ عنه، رقم الحديث (٢٤٩٢)

حنيفة رحمه الله" اهـ (دراسات اللبيب: ٣١٥، ٣١٦)

''یعنی شیخ ابن ہمام جو احناف میں محقق بھی ہیں اور صاحب کشف و کرامت بھی، فرماتے ہیں کہ فقہ راوی کی شرط ائمہ سلف میں کسی سے بھی منقول نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ یہ من گھڑت بات ہے، ایسی بات امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔ اھ

حقیقت بھی یہی ہے کہ حدیث کی صحت میں فقہ راوی کو کوئی دخل نہیں، اس کے لیے حفظ و ضبط کے بعد صدق اور مروؤت کی ضرورت ہے، فقہ راوی کا مفہوم سے تعلق ہے، اگر حدیث کا متن مختلف الفاظ سے مروی ہو، تو فقہ راوی کی بنا پر بعض الفاظ کو ترجیح دی جا سکتی ہے، لیکن فقہ راوی کی بنا پر نہ کوئی متن گھڑا جا سکتا ہے، نہ کسی صحیح متن کا انکار کیا جا سکتا ہے، اس شرط سے شرح معانی میں کام لیا جا سکتا ہے، اس کی بنا پر اقرار یا انکار حدیث کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں، صحابہ کا مقام تو اس سے کہیں بلند ہے کہ قاضی عیسیٰ بن ابان، سرخسی اور دبوسی ایسے عجمی حضرات ان کی زبان دانی پر بحث کریں!

پھر فقہ کے مراتب مختلف ہیں، اس کی حیثیت کلی مشکک کی ہے، یہ کسی مقام پر بھی رد و قبول کے لیے معیار نہیں قرار پا سکتی، تاوقتیکہ اس کے لیے مقدار اور پیمانہ مقرر نہ کر لیا جائے، ایسی غیر معین اور غیر موقت چیز کو معیار قرار دینا خود درایت کے خلاف ہے اور پھر احناف نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روزہ میں دن کو بھول کر کھانے کے متعلق اپنا لی ہے، [1] حالانکہ وہ بھی قیاس کے خلاف ہے!

---

[1] یعنی جس حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا لے یا پی لے، تو وہ اپنا روزہ پورا کرے، کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے۔ صحیح البخاري، برقم (١٨٣١) صحیح مسلم، برقم (١١٥٥)

یہ پرانی درایت اور فقہ ہے، جسے اہل علم نے ابتداءً اچھے مقاصد کے لیے تجویز کیا، اس کا جو حشر ہوا اور جس قدر غلط مقاصد اس سے حاصل کیے گئے، وہ سابقہ گزارشات سے جنھیں بڑے اختصار سے عرض کیا گیا، ظاہر ہے۔ اب نئی درایت پر غور فرمایئے، جس کی تاسیس ہمارے ملک کے نیچری حضرات نے فرمائی، بعض علماء نے جان کر یا سادگی سے اس درایت کی تائید کی اور اب پورے لا دینی مقاصد کے لئے اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

نئی درایت:

سابقہ درایت یا فقہ علمی دور کی پیداوار تھی، اہل بدعت سے تو بحث نہیں، اہل علم نے اس کا استعمال خاصی احتیاط سے کیا اور اسے معیار کا مقام نہیں دیا اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف اس سلسلہ میں جو کچھ منسوب کیا گیا، وہ قابل تأمل ہے، حضرت امام کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔

اب ایک نئی درایت اور اس کا پس منظر ملاحظہ فرمایئے، جو حال ہی کی پیداوار ہے، علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کا اصل فن تو تاریخ تھا، لیکن ابتدائے عمر میں وہ حنفیت کے بہت بڑے حامی تھے، سیرۃ النعمان ان کے اسی دور کی یادگار ہے، مولانا شبلی مرحوم ان ایام میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بھی متعلق تھے، جس کے بانی مرحوم آنریبل سر سید احمد خان صاحب تھے۔

یہ وہ دور تھا جب مغل حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ختم کرنے کے لیے انگریز نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا اور جس بے دردی سے اس نے عوام، علماء، سیاستدان، شعراء و اصحاب قلم اور تجار کو پھانسیاں دیں، دار پر لٹکایا، ان ہیبت ناک مظالم کی نظیر شاید دور

ماضی میں نہ مل سکے، ملک میں خوف و ہراس اور نفرت کے جو جذبات انگریز کے خلاف دلوں میں موجود تھے، شاید وہ صدیوں تک دلوں سے محو نہ ہو سکتے۔

انگریز نے اس کے متعلق صحیح طریق عمل کے بجائے ملک میں تفریق، خلفشار اور فرقہ پروری کی راہ اختیار کی اور یہ انتقامی جذبہ انبالہ کیس سے قاضی کوٹ سازش کیس تک جاری رہا، جس میں زیادہ تر علماء اہلحدیث ہی ان ستم آرائیوں کا شکار ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز مشنری آئے، جن کی سرپرستی مغربی حکومتیں سیاسی مصالح کی بنا پر اور مسیحی عوام عقیدت کی نظر سے کر رہے تھے، ان لوگوں نے بڑے وسیع پیمانے پر اسلام کے خلاف جارحانہ حملے شروع کیے، دوسری طرف آریہ سماجی تحریک بھی انھیں اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں آ گئی، تیسری طرف قادیانی نبوت نے اپنے مخصوص علم کلام کا ہمرنگ زمین جال پورے ہندوستان میں پھیلا دیا، مذہبی آزادی کے موہوم دعویٰ کی بنا پر شیعہ، سنی بریلوی گروہ باہم الجھ گئے اور پورا ملک میدان کارزار بن گیا، رسائل، اخبارات اور تردیدی لٹریچر اور مناظرات کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ بظاہر ملک میں گھمسان کا رن محسوس ہوتا تھا، انگریز کی سیاست پوری طرح کامیاب ہوئی، ۱۸۵۷ء کے مظالم بالکل طاق نسیاں کی نذر ہو گئے، ۵۷ء کے فسادات سے جو عارضی اتحاد ہوا تھا، وہ ذہنوں سے محو ہو گیا، اس ضمن میں علماء حق اور اہل توحید نے بالکل ظاہر قرآن و سنت کی روشنی میں اپنا فرض ادا کیا، تقریر و تحریر سے حقیقت واضح فرمائی، اس کے ساتھ بنگال سے پشاور اور بالاکوٹ تک انگریز کے خلاف سیاسی جنگ بھی ہوتی رہی، انگریز کو پوری ایک صدی شمالی سرحدوں پر پریشان رکھا گیا۔

سر سید اور ان کے رفقاء:

سر سید احمد خاں بألقابہ اور ان کے چند رفقاء سیاسی طور پر انگریز کے حامی تھے،

لیکن مذہباً اس کے خلاف تھے، ان حضرات نے مشنریوں، سماجیوں اور غیر مسلم گروہوں کے خلاف ہزاروں صفحات لکھے، نیت کا علم تو اللہ کو ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ان غیر مسلم حملوں سے مرعوب ہو گئے، ظواہر کتاب و سنت کے بجائے ان حضرات نے تاویل اور حقائق کے انکار کی راہ اختیار فرمائی، قادیانی لٹریچر کا انداز بھی قریباً یہی تھا۔

سر سید کی نیچر اور شبلی کی درایت:

ان حضرات نے اساسی طور پر عقل کو حَکَم قرار دیا، جو چیز ان کی عقول سے بالا ہوتی، اس کا انکار کر دیتے اور بڑی سنجیدگی سے فرماتے: ''یہ نیچر اور فطرت کے خلاف ہے!'' یہ نیچر اور فطرت عموم اور شمول کے لحاظ سے درایت اور فقہ راوی سے کچھ ملتی جلتی تھی، نہ اس ''فقہ و درایت'' کا کوئی پیمانہ تھا، نہ اس ''نیچر اور فطرت'' کا کوئی اصل اور مقدار ہے، اندھے کی لاٹھی ہے، جس طرف گھوم جائے، گھوم جائے۔ سر سید بألقابہ اور ان کے رفقاء نے اس کا استعمال قرآن پر بھی کیا اور حدیث پر بھی، قرآن سمجھ میں نہ آتا، تو حسب منشا تاویل کرتے اور حدیث کا انکار کر دیتے اور ''نیچر'' کا معیار ہر آدمی تھا، یہ نام بھی کچھ غیر علمی اور دینی حلقوں میں غیر متعارف بلکہ غیر مانوس تھا، یورپ زدہ حضرات نے شاید پسند کیا ہو، دینی حلقوں میں اسے قطعی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، بلکہ رد و تردید کا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا سر سید بڑے پختہ کار تھے، وہ اس اختلاف پر برہم نہیں ہوئے، اپنی کہتے رہے۔

علامہ شبلی وقت کے مشاہیر سے تھے، ان کا تاریخی مطالعہ بہت سے ہم قرن علماء سے بہتر تھا، وہ حنفی مذہب کے اس خلا کو محسوس فرماتے تھے، جو قلت حدیث اور کثرت آراء کی وجہ سے دینی حلقوں میں مسلّم تھا، دوسرے ائمہ کی حدیثی خدمات

سے بھی یہ بات بہت واضح تھی، احناف اس میدان میں بڑی دیر سے تشریف لائے، دوسرے ائمہ اور ان کے أتباع اور ائمہ حدیث بہت آگے نکل چکے تھے، یہاں پورا کارخانہ تقلید و جمود کے سہارے چل رہا تھا، اس لئے انھوں نے ان شخصی آراء کی ترجمانی لفظ ''درایت'' سے فرمائی اور اسے نہ صرف حدیث کا نعم البدل فرمایا، بلکہ احادیث کے انکار و تاویل کے لیے حربہ کے طور پر استعمال فرمایا، یہ لفظ علمی حلقوں میں مانوس تھا اور پرانی اصطلاح بھی تھی، پھر یہ سر سید کے ''نیچر اور فطرت'' سے بہتر تھی، مولانا نے صرف اس کی تعریف میں کچھ تصرف فرمایا، اس سے غالباً سر سید کو بھی کچھ سہارا ملا، قلت حدیث اور آراء پسندی کے خلاء کے لئے بھی اس سے ''معذرت'' کا کام لیا۔

درایت کی تعریف:

مولانا شبلی درایت کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:

''درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے، تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔''

1. دیکھئے اس تعریف میں وہ قیود نہیں، جن سے مفہوم یا معنی کی تصحیح میں مدد مل سکے، یعنی عربیت میں مہارت کا کوئی تذکرہ نہیں۔
2. ''جب کوئی واقعہ'' کے الفاظ سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس سے حدیث کے واقعات مراد ہیں یا عام دنیوی حوادث، بظاہر آپ کا انداز تاریخی حوادث کی تحقیق کے متعلق معلوم ہوتا ہے، جو بلا سند ہم تک پہنچیں اور محض خرص و تخمین سے صحت کا اندازہ لگانا پڑے۔
3. پھر ''اقتضاء طبیعت'' بالکل مہمل جملہ ہے، طبائع کے اقتضاء میں اتنا ہی اختلاف

ہے، جس قدر خود انسانی طبائع میں، اقتضاء طبائع کے تابع ہے، یہ تنقید کا معیار کیسے ہوگا؟ بے دین طبائع کے تقاضے دینی طبائع سے مختلف ہوں گے، عالم اور بے علم کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے، بچے، جوان بوڑھے، تاجر، مزدور، بادشاہ، غریب، آقا اور غلام سب کے تقاضے مختلف ہوں گے، ان تقاضوں کی صحت خود محل نظر ہے، یہ کسی دوسری چیز کے لئے قانون کیسے بن سکیں گے؟

④ ہر زمانہ کے خصائص الگ الگ ہوتے ہیں، قرون خیر کے خصائص بعد کے قرون سے کافی حد تک مختلف ہیں، قرون خیر کے واقعات کی نسبت اس وقت کے عقلی قرائن سے تو سمجھ آ سکتی ہے اور اس وقت کے اہل علم نے یقیناً ان عقلی قرائن کو ملحوظ رکھا ہوگا، لیکن اس وقت کے حوادث کو آج کے قرائن سے کیسے پرکھا جائے؟ جب کہ زمانہ کی خصوصیات بالکل مختلف ہیں!

⑤ ہر واقعہ میں منسوب الیہ کے حالات کا جائزہ واقعہ کے سمجھنے میں واقعی مفید ہوسکتا ہے اور عقلی قرائن کے ساتھ نسبت اور تعلق فہم میں معاون ہوسکتا ہے، لیکن یہ شرط بہت ہی مجمل ہے، جب واقعہ ہو، قدرتی طور پر حقیقت پسند طبائع قرائن اور منسوب الیہ کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں، لیکن یہ جائزہ اور عقلی قرائن کا استعمال صدیوں کے بعد نہیں ہونا چاہیے، ایک شاگرد اپنے استاد سے ایک حدیث نقل کرتا ہے، اس وقت کے لوگ ان ناقلین کو ذاتی طور پر جانتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی آراء سے مفید معلومات حاصل ہوسکتے ہیں، لیکن صدیوں کے بعد جب کہ افکار اور اذہان اور ان پر غور وفکر کا معیار ہی بدل چکا ہو، اب آپ گڑے مردے اکھاڑنا شروع کریں، ہم قرن اور رفقاء ہی حالات کا صحیح تجزیہ کر سکتے ہیں۔

⑥ پھر عقلی قرائن کیا چیز ہیں؟ اگر کتاب و سنت اصل ہیں، تو معیار ان کو ہونا چاہیے، عقل بھی وہی درست ہوگی، جو اس پیمانہ میں ناپی جائے، سرسید احمد خاں

نے نیچر اور عقل کو اتنی اہمیت دی کہ قرآن کو بھی اس سے ناپنا شروع کر دیا، انبیاء کے معجزات ان کی عقل میں نہ آ سکے، انھوں نے انکار کر دیا، احادیث جو ان کے فہم سے بالا تھیں، ان کا قتل عام کیا، اس لیے عقلی قرائن پر جب تک پابندی نہ لگائی جائے، اس فتنہ سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا اور پھر اصل قرآن و سنت نہ رہے، بلکہ تم لوگ اصل ٹھہرے، جن کی عقل کو کتاب و سنت کی تصریحات کے لیے حَکَم قرار دیا گیا، گویا قرآن و سنت کے مفہوم کا تعین ہماری عقل کرے گی، جس کا نام سر سید نے فطرت اور قانون قدرت رکھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ تانگہ گھوڑے کے آگے جوت دیا گیا، جن کی عقول کی اصلاح و تربیت کے لیے قرآن و سنت نازل فرمائے گئے تھے، وہی عقل قرآن اور سنت پر مسلط کر دی گئی۔

یہ الٹی بہ نکلی برہمن کو بہا لائی

معلوم ہوتا ہے مولانا شبلی سر سید سے متاثر ہوئے، مولانا نے سر سید سے جو تاثر لیا، انھوں نے اسے اصطلاحاً علمی انداز دیا، معلوم نہیں سر سید بألقابہ نے اس سے کیا اثر لیا؟ واقعات کچھ اس طرح بدلتے رہے کہ مولانا شبلی نے علی گڑھ کالج کو خیر باد کہا اور تصنیف و تالیف کے لیے انھوں نے فرعی فقہیات کے بجائے کلام اور تاریخ کی راہ اختیار کی اور دوبارہ فرعی مباحث کی طرف رخ نہیں فرمایا، لیکن ان کے اس نظریہ سے علماء حدیث کی تنقیص کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اس لئے اہلحدیث حلقوں نے کئی کتابیں لکھیں، جس میں درایت کے اس مفہوم کا علمی محاسبہ کیا گیا اور اس پر کڑی تنقید کی، زیر طباعت کتاب حسن البیان فیما في سیرۃ النعمان، الإرشاد في أمر التقلید والاجتهاد مؤلفہ مولانا ابو یحییٰ شاہ جہان پوری، سیرۃ البخاری اور اس کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔ چونکہ مرزا قادیانی کا بھی حدیث کے متعلق اسی قسم کا انداز تھا، اس

لئے "إشاعة السنة النبويه" میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم و مغفور نے اس کا بڑا مفصل علمی محاسبہ فرمایا، کیونکہ انکار حدیث کے لیے یہ بڑی سہل اور قریبی راہ تھی۔

اسی اثناء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی، مولوی حشمت علی نے حدیث کا انکار کیا اور یہ تحریک ملتان، گجرات، ڈیرہ غازی خاں وغیرہ مقامات میں کچھ چل نکلی، یہ لوگ چونکہ نہ تو عالم تھے، نہ اچھی زبان لکھ سکتے تھے، اس لیے قریباً یہ تحریک ناکام ہوگئی، اب اس کی نوک پلک درست کر کے اپ ٹو ڈیٹ طور پر اسے مسٹر پرویز چلا رہے ہیں، لیکن ابتداء ہی سے اس تحریک کے لیڈروں کا نہ ظاہری کیریکٹر ہے نہ اخلاص، غالب امید یہ ہے کہ اس سے بد مذہبی اور بے دینی ضرور بڑھے گی، لیکن تحریک ناکام ہوگی، سنت کا نام نہیں مٹ سکے گا۔ یورپ زدہ طبقہ حدیث کا انکار کرتا ہے، اس فن کو مشکوک سمجھتا ہے، لیکن اہل قرآن کہلانا پسند نہیں کرتا، البتہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ سے گریز کے لیے ان لوگوں کی آڑ لیتا ہے۔

درایت اور برادران احناف:

حنفیت کی بریلوی شاخ کا زیادہ تر زور بدعات کی ترویج اور گانے پر ہے، ان کو استدلال اور معقولیت سے کچھ زیادہ تعلق نہیں، وہ زیادہ کام جذبات اور نعروں سے لیتے ہیں اور مولانا شبلی، سرسید اور حضرات دیوبند کو وہ وہابی سمجھتے ہیں، اس لئے وہ اس مصنوعی درایت سے بہت کم متاثر ہوئے، اس درایت سے معجزات، کرامات اور فقیروں کے فرضی قصوں کا بھی خاتمہ ہوتا تھا، اس لئے انھوں نے اسے قابل قبول نہیں سمجھا، بلکہ حضرات دیوبند کے سنجیدہ اور دور اندیش بزرگوں نے اس درایت کو اہلحدیث ہی کی طرح ناپسند کیا اور اس کے خلاف لکھا، أصح السیر مؤلفہ مولانا دانا پوری میں اس قسم کا مواد کافی ملتا ہے، لیکن آج کل نو آموز دیو بندی اہل قلم اس نے

متاثر ہوئے اور یہ اس لئے کہ اس نظریہ سے احناف میں قلت حدیث سے جو خلا تھا، اسے درایت سے پاٹنے کی کوشش کی گئی ہے، فقہاء کے لیے اس مصنوعی اور ظاہری تفوق سے یہ حضرات مطمئن ہوگئے اور یہ غور نہ فرما سکے کہ دراصل یہ انکار حدیث کا زینہ ہے، جماعت اسلامی کی قیادت اور احناف کا یہ گروہ اس درایت کو بہت اچھال رہا ہے، ''مسلک اعتدال'' ایسا مسموم لٹریچر ان حضرات کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

درایت کا اثر مروجہ فقہ پر:

حالانکہ درایت کا اثر جس قدر حدیث پر پڑتا ہے، اس سے کہیں زیادہ فقہ حنفی کے بعض ابواب اور حصص پر پڑتا ہے، مثال کے طور پر ابواب طہارت میں پانی کے مسئلہ پر غور فرمائیے، ہمارے ملک میں مدت سے اس کے بعض مسائل پر بحث چل رہی ہے، مثلاً پانی کی طہارت کا مسئلہ جس کا قدرے ذکر اوپر بھی آچکا ہے:

① ماء کثیر کی مقدار میں احناف اور شوافع میں اختلاف ہے، احناف دہ در دہ کے متعلق فرماتے ہیں اس پر نجاست کا اثر نہیں ہوتا اور شوافع قلتین کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ نجاست سے متاثر نہیں ہوتا، جب تک اس کے اوصاف ثلاثہ نہ بدل جائیں، موالک کسی مقدار کے قائل نہیں، درایت کا فیصلہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کسی چیز میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، اسے کیوں پلید کہا جائے؟ قلیل اور کثیر میں امتیاز درایت کے خلاف ہے، اگر سنت کو ان قیود وسلاسل سے آزاد رکھا جا سکے، تو حدیث قلتین اصول روایت پر تنقید کے بعد قابل قبول ہوگی، احناف کی مقدار غیر منصوص ہے، پھر نجاست اور طہارت کا فیصلہ روایت کے خلاف ہوگا۔

② تالاب اور کنویں میں نجاست کے لحاظ سے جو فرق کیا گیا ہے، بالکل درایت

کے خلاف ہے، کیا برتن کی ہیئت کو بھی طہارت اور نجاست میں دخل ہے؟ یعنی برتن گول اور گہرا ہو، تو ٹنوں پانی ادنیٰ نجاست سے پلید ہوجائے اور برتن طویل اور عریض ہو، تو وقوع نجاست سے رنگ ، بو اور مزہ کے بدلنے کا انتظار کیا جائے، یہ تفریق قطعاً خلافِ درایت ہے، حکم نجاست پانی کی مقدار پر ہونا چاہیے، برتن کی وضع کیسی کیوں نہ ہو۔

۳ پھر تطہیر کے لئے ڈولوں کا تعین آثار سے ثابت ہو یا اہل علم کے ارشادات سے، درایت کا اس میں کوئی فرق نہیں، فرض کیجئے آپ پلید کنویں کی تطہیر کے لیے بیس ڈول مقرر فرماتے ہیں، انیسواں ڈول آپ نکال رہے ہیں، اس وقت ڈول پلید ہے، ڈول کا پانی پلید ہے، کنواں پلید ہے، کنویں کی دیواریں پلید ہیں، ڈول سے جو پانی گر رہا ہے، وہ پلید ہے، جب بیسواں ڈول اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے، کنویں کی ساری فضا طاہر مطہر ہوجاتی ہے، یہ بیسواں ڈول تمام گندے جراثیم کو بیک جنبش ختم کر دیتا ہے، درایت کی کسوٹی پر تو یہ طہارت سمجھ میں نہیں آتی!

صاحب ہدایہ کا ارشاد ہے:

"مسائل البئر مبنية على اتباع الآثار دون القياس ." (۱/ ۴۵)

"کنویں کے مسائل کا انحصار آثار پر ہے، قیاس پر نہیں۔"

سوال یہ ہے آیا یہ آثار درایت کی زد میں نہیں آتے؟ صحیح مرفوع احادیث تو درایت کی وجہ سے محل نظر ہوں اور جن آثار کے متعلق اتنا بڑا مقتدر عالم فیصلہ دے کہ یہاں قیاس کو کوئی دخل نہیں، وہ کیسے قابل عمل ٹھہریں گے؟ قیاس اور درایت کے مفہوم میں اصطلاحاً فرق ہوسکتا ہے، مقاصد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، پھر امام کے دونوں مقتدر شاگرد کنویں کو جاری پانی کا حکم دیتے ہیں۔ (شامی: ۱/ ۲۱۷)

امام صاحب اور قیاس:

علماء نے ایسے مسائل کا تذکرہ فرمایا ہے، جہاں امام ابوحنیفہ نے قیاس کو صرف اس لیے ترک فرمایا کہ وہ نص کے خلاف تھے، مثلاً:

① رمضان المبارک میں بھول کر کھا پی لینا، قیاس چاہتا ہے کہ روزہ ٹوٹ جائے، امام صاحب نے فرمایا کہ نہیں ٹوٹتا، کیونکہ احادیث میں آیا ہے۔[1] (مناقب امام اعظم رحمہ اللہ ضمیمہ الجواهر المضیئة : ٧٤)

② امام صاحب رحمہ اللہ کا خیال تھا کہ انگلیوں کی دیت کم و بیش ہے، قیاس کا یہی تقاضا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ انگلیاں برابر ہیں۔[2]

③ قیاس کی بنا پر امام صاحب کا خیال تھا کہ حیض زیادہ سے زیادہ پندرہ دن ہوسکتا ہے، جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ حدیث اس کے خلاف ہے، تو امام کے نزدیک حیض کی آخری میعاد دس دن رہ گئی۔[3]

④ امام صاحب عید کے پس و پیش نوافل پسند نہیں کرتے تھے، جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت علی گھر پر نوافل پڑھتے تھے، تو امام صاحب نے رجوع فرما لیا۔[4]

---

❶ دیکھیں: صحيح البخاري، برقم (١٨٣١) صحيح مسلم، برقم (١١٥٥)

❷ صحيح البخاري: كتاب الديات، باب دية الأصابع، رقم الحديث (٢٥٠٠) نیز دیکھیں: فتح الباري (١٢/ ٢٢٥) المغني لابن قدامة (٩/ ٦٣٢)

❸ دیکھیں: بدائع الصنائع للكاساني (١/ ١٥٥)

❹ نماز عید کے بعد عید گاہ میں نوافل پڑھنا ثابت نہیں ہے، لیکن نماز عید کے بعد گھر پر نفل نماز پڑھنا درست ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید سے قبل کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن جب واپس گھر جاتے، تو دو رکعت نماز ادا کرتے۔ سنن ابن ماجه، برقم (١٢٩٣) مسند أحمد (٣/ ٣٦) مستدرك حاكم (١/ ٢٩٧) اس حدیث کی سند کو حافظ ابن ملقن، ابن حجر، بوصیری، سیوطی، زرقانی اور البانی رحمہم اللہ نے ''حسن'' اور امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

متذکرہ مسائل مولانا شبلی مرحوم کی'' درایت'' کے یقیناً خلاف ہیں، قرائن کے مقتضیات میں زیادہ تر قیاس ہی کارفرما ہے اور پھر قیاس تو ائمہ اربعہ اور ائمہ حدیث کے نزدیک شرعی حجت ہے، اس کے لئے اہل علم کے نزدیک کچھ اصول وضوابط ہیں اور جس درایت کا ذکر مولانا شبلی فرماتے ہیں، اس کا ذکر احناف، شوافع، موالک، حنابلہ کسی نے بھی نہیں فرمایا، اس کا ذہن یا تصور سرسید احمد خاں نے دیا، الفاظ علامہ شبلی مرحوم نے دیئے، کم فہم اور نو آموز علماء نے صرف اس لئے اپنا لیا کہ مولانا شبلی نعمانی نے اس درایت کا ذکر ائمہ حدیث کی تنقیص میں کیا ہے اور فقہاء حنفیہ کی جس سے (بظاہر) برتری اور تفوق ثابت کرنے کی سعی کی ہے، آج کل کے دیوبندی لٹریچر میں اس درایت کا تذکرہ بڑی کثرت سے ہوتا ہے اور یہ حضرات نہیں جانتے کہ یہ درایت انکار حدیث اور انکار معجزات کے لئے چور دروازہ ہے، ائمہ سنت اور ان کے اَتباع سے کسی نے بھی اس درایت کا تذکرہ نہیں فرمایا اور اشارات کھینچ تان کر پیدا کیے گئے ہیں، وہ قانون اور اصل کے طور پر نہیں، بلکہ ضمنی اور وقتی تذکرہ ہے اور بس......!

حسن البیان اور حسن البیان والے:

زیر نظر دور کی دوسری کتابیں جو علماء اہل حدیث کے قلم سے نکلیں یا محقق دیوبندی علماء نے لکھی ہیں، ان سب میں اس درایت پر تنقید فرمائی گئی اور اسے ناپسند کیا گیا اور انکار حدیث کے کھٹکے کا اظہار کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو: أصح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری، سیرت بخاری مولانا مبارک پوری، الإرشاد مولانا حکیم ابو یحییٰ شاہجہان پوری اور بحر زخار وغیرہ) ان سب بزرگوں نے اس درایت کے خطرات کو محسوس فرمایا اور یہ حسن البیان آپ کے سامنے ہے اور اس کے مباحث آپ کی نظر میں، کتاب کے بعض مباحث میں اختصار کی وجہ سے ممکن ہے وقتی طور پر تشنگی محسوس ہو

اور بعض مقامات میں مناظرانہ تنقید کا انداز بھی آ گیا ہے، مگر "سیرت النعمان" میں جو انداز علامہ مرحوم نے اختیار فرمایا، یہ تقابل ایک طبعی امر تھا، تاہم درایت اور فقہ راوی سے جو خطرہ محسوس کیا، وہ بالکل صحیح تھا، شبلی صاحب نے ائمہ حدیث کے متعلق جو تصور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مستحسن نہ تھی، اس لئے فن حدیث کے ساتھ عقیدت مندانہ وابستگی رکھنے والوں کا اسے برداشت کرنا آسان نہیں تھا، تفقہ، فقہ راوی، استحسان، استصحاب حال وغیرہ مصطلحات اصل سنت کے ذخائر پر بے اعتمادی کی مختلف تعبیرات ہیں، قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا جس طرح ذکر فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارباب فقہ و درایت ان ہی ہتھیاروں سے آسمانی ہدایات کی مخالفت کرتے رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی اساسی تعلیمات پر تعجب کا اظہار کرتے رہے ہیں:

﴿ أجعل الآلهة إلهاً واحدا إن هذا لشيء عجاب﴾ [1] (سورہ ص)

اتنے آلہہ کی جگہ ایک اللہ عجیب ہے، فقہ و درایت، عقل و دانش اسے قبول کرنے سے اباء کرتے ہیں۔

﴿ أبشرا منا واحداً نتبعه إنا إذا لفي ضلال وسعر۝ أألقي الذكر عليه من بيننا بل هو كذاب أشر ﴾ [2] (سورہ قمر)

"کیا ہم اپنے ایک ہم جنس کی اطاعت کریں، یہ تو عقل و شعور کے خلاف ہے، کیا ہمارے ہوتے اس کو نبوت مل جائے، یہ جھوٹ اور شرارت پسندی کی بات ہوگی۔"

توحید اور نبوت ایسے مسائل اس وقت کی فقہ و درایت پر گراں گزر رہے تھے، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ان کا انتخاب دونوں ان کے لیے تعجب کا موجب تھا، حضرت

---

[1] سورۃ ص: ٥

[2] سورۃ القمر: ٢٣، ٢٥

شعیب علیہ السلام نے جب ذات حق کی معرفت اور حقوق العباد کے تحفظ کے متعلق اپنی قوم سے خطاب فرمایا اور ان کو ان معاصی سے روکا، تو اس وقت کے دانش مند اور دولت مند لوگوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا:

﴿ أصلاتك تأمرك أن نترك ما يعبد آباؤنا أو أن نفعل في أموالنا ما نشاء ﴾[1] (سورہ ہود)

''کیا تمہاری نماز کا یہی مطلب ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی عادات کو چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں حسب منشاء لین دین نہ کریں۔''

آسمانی احکام اور انبیاء علیہم السلام کی راہ میں وقت کے دانشمندوں کا انداز فکر و درایت ہمیشہ حائل رہی۔

قیاس، درایتِ قدیمہ، تفقہ، فقہ راوی، درایت جدیدہ، استحسان، استصحاب حال، مصالح مرسلہ یہ ایسی اصطلاحات ہیں کہ ان کی افادیت کے ساتھ قرآن اور سنت کے فیصلوں کو مسترد کرنے کے لیے چور دروازوں کا استعمال ہمیشہ کیا گیا، ائمہ سنت کو تقلید، حشویت اور حرفیت کے طعن دے کر امت پر تاویل کی راہ کھول دی گئی، ان فسادات میں فقہاء اور حکام برابر کے شریک ہوئے، ہزاروں ائمہ دین قتل کیے گئے اور سینکڑوں جیل خانوں کی تاریکیوں میں سالہا سال تک دادِ صبر دیتے رہے، علماء حدیث ہی سب سے زیادہ مبتلائے مصائب رہے، وقت کی ستم ظریفیاں ملاحظہ فرمائیے کہ اس دور کے دانشمند اور درایت پرور بشر مریسی اور اس قماش کے لوگ محقق اور مجتہد سمجھے جاتے تھے اور امام ابو یوسف، امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام مالک، امام شافعی اور تمام ائمہ سنت اور حفاظ حدیث کو مقلد اور حشوی کہا جاتا، تاہم وہ پھر بھی علم و بصیرت کا دور تھا، علماء حق کی اس وقت کثرت تھی، ان خرافات کے باوجود بھی لوگ

[1] هود: ۸۷

اہل حق کی قدر کرتے تھے۔

آج کی درایت:

لیکن سرسید و علامہ شبلی مرحوم کے ازدواج سے جو درایت پیدا ہوئی، یہ نہ تو کسی علمی ضرورت کا تقاضا ہے، نہ یہ اہل علم کا دور ہے، ہوا و ہوس کی ان طغیانیوں میں اندھے کے ہاتھ میں لاٹھی دے دی گئی ہے، جسے بلا تامل گھمایا جا رہا ہے۔

كبهيمة عمياء قاد زمامها
أعمى على عوج الطريق الحائر

حضرت مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ:

حضرت علامہ شبلی نعمانی اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کے حالات میں ایک گونہ مناسبت معلوم ہوتی ہے، شبلی مرحوم نے سیرۃ النعمان کے علاوہ شاید ایک آدھ رسالہ فرعی اختلافات پر لکھا ہو، اس کے بعد انھوں نے قلم کا رخ اس طرف سے بالکل پھیر دیا، باقی عمر علمی اور تعلیمی خدمات میں صرف فرمائی، ندوۃ العلماء کی تاسیس فرمائی، جس میں فقہی تنگ نظری اور فرعی مسائل پر عصبیت نما مباحث بالکل نہیں تھے، ادب اور تاریخ کی خدمت اس درس گاہ کا اہم کردار تھا اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں بھی بقیہ عمر میں ان کی توجہ علم کلام اور تاریخ کی طرف ہوگئی، خاص طور پر سیرت النبی ان کا دل پسند موضوع تھا، جس کی تکمیل ان کے وفادار اور محقق تلمیذ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے فرمائی۔ رحمهما الله رحمة واسعة وجعل الجنة مثواهم!

یہی حال حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی قدس اللہ روحہ کا تھا، ابتداءِ عمر میں زیر طباعت کتاب ''حسن البیان'' لکھی، هداية المعتدي اور ایک

آدھ رسالہ شاید شیعہ کے متعلق لکھا اور رہوار قلم بالکل رک گیا، مولانا کے حقیقت پسند مزاج نے محسوس فرمایا کہ ان مذہبی، فقہی اور فرقہ وارانہ منازعات کی اصل علت ہندوستان میں انگریز کی بالا دستی ہے، جب تک یہ دیو ملک میں کارفرما ہے، ملک میں امن ممکن نہیں، اس ضمن میں مولانا کے سامنے دو پروگرام تھے، سیاسی اور تبلیغی، سیاسی کے لیے دو طریق کار تھے، اول تحریک مجاہدین کی سرپرستی، جو اس وقت انگریز کے مظالم کی وجہ سے انڈر گراؤنڈ ہو چکی تھی، اکابر دیو بند اس سے تعلق توڑ چکے تھے، اکابر پٹنہ اپنی زندگیاں اس راہ میں وقف کر چکے تھے اور لاکھوں روپیہ مرحوم کی وساطت سے تحریک کو ملتا تھا، مرحوم خود بڑے دولت مند اور بڑے زمیندار تھے، ان کا تعلق اچھے کھاتے پیتے خاندان سے تھا، واجبی ضروریات کے بعد پوری آمدن تحریک مجاہدین میں صرف فرماتے تھے، مرحوم کے یہ خیاں تحریک عدم تعاون سے برسوں پہلے تھے۔

دوسرا طریقہ انگریزی مال کے بائیکاٹ کا تھا، خود موٹا گاڑھا کھدر گھر کا بنا ہوا پہنتے، سردیوں میں کشمیری شال استعمال فرماتے، قلم سے لکھتے، نب اور انگریزی قلم کا استعمال سخت نا پسند فرماتے، مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم تبلیغی امور میں ان کے شریک کار تھے، مولانا نے تبلیغ کے لئے آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی تاسیس، مدرسہ سلفیہ آرہ (بہار) کی سرپرستی فرمائی، ساتھ ہی انگریز کے خلاف جہاد کا محاذ بھی برابر کھولے رکھا۔

مولانا مرحوم کے مزاج میں عجیب تنوع تھا، ایک طرف وہ ان حضرات کے ساتھ اہلحدیث کانفرنس کی سٹیج پر کام کرتے، دوسری طرف مولانا افضل الٰہی وزیر آبادی رحمہ اللہ صوفی ولی محمد مرحوم فتوحی والد اکبر شاہ آف سخانہ، مولوی الٰہی بخش بمبانوالہ، قاضی عبدالرحیم صاحب، قاضی عبید اللہ، قاضی عبدالرؤف (قاضی کوٹ) اور

مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کے ساتھ جماعت مجاہدین کا کام کرتے تھے اور یہ کام اس راز داری اور خوبصورتی سے ہوتا تھا کہ انگریز کی عقابی نگاہیں برسوں اس کا سراغ نہ لگا سکیں۔ معلوم نہیں یہ اطلاع کہاں تک درست ہے کہ مرحوم کی گرفتاری کے احکام اس دن پہنچے، جب مرحوم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر جنت کے دروازے پر پہنچ کر داخلہ کی اجازت کے لیے دستک دے رہے تھے اور ﴿ طبتم فادخلوها خالدين ﴾[1] کی آواز کے منتظر تھے، پولیس جنازہ دیکھ کر واپس آ گئی، اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الجنة، آمین!

میں نے مرحوم کو پہلی دفعہ وزیر آباد میں دیکھا، جمعہ کے دن مولانا فضل الٰہی صاحب رحمہ اللہ کے ہاں کھانا تناول فرما کر مسجد اہلحدیث میں آئے، مرحوم حضرت الاستاذ الامام مولانا الشیخ حافظ عبدالمنان صاحب نے ممبر خالی فرما دیا، میری عمر غالباً اس وقت دس گیارہ سال ہوگی، وعظ میں عجیب رقت تھی، غالباً وعظ اخلاص فی العمل کے موضوع پر تھا، میں صغرسنی کے باوجود انتہائی رقت محسوس کر رہا تھا اور پورے مجمع پر یہ کیفیت طاری تھی، مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ ارشاد ان کے متعلق بالکل حرف بحرف صحیح تھا۔

اثر لبھانے کا پیارے تیرے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو، تیری زبان میں ہے

اس کے بعد مولانا کئی دفعہ تشریف لاتے رہے، زیارت ہوتی رہی، لیکن بچپن کی وجہ سے استفادہ کی جرأت نہ ہو سکی۔ وكان أمر الله قدرا مقدورا!

پھر میں ۱۶۔ ۱۹۱۷ء میں دہلی آیا، وہاں بھی زیارت کا موقعہ ملتا رہا، عموماً مجلس میں خاموشی ہوتی، یہ مبارک مجلس گلہ اور قہقہہ دونوں سے خالی ہوتی، آخری زیارت علی

---

[1] الزمر: ۷۳

گڑھ اہلحدیث کانفرنس کے اجلاس میں ہوئی۔

مدراس کانفرنس میں غالباً کسی نے یہ شعر پڑھا ؎

کیا خوب ہوتا وہ بھی گر آج زندہ ہوتے
عبدالعزیز نامی ''حسن البیان'' والے

پوری مجلس اشک بار ہوگئی، حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم اکثر یہ شعر پڑھتے اور آنکھیں برسنے لگتیں، مرحوم کو مولانا رحیم آبادی رحمہ اللہ سے والہانہ محبت تھی اور وہ ان کی رفاقت پر ہمیشہ فخر فرماتے۔

آہ ! یہ مقدس گروہ ﴿فمنهم من قضىٰ نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا﴾ [1] کے خدائی قانون کے مطابق اپنی وفاداریاں نباہ کر اللہ کے پیارے ہوگئے، اب یہ بوجھ ایسے کندھوں پر آگیا ہے، جن کے دامن میں سیاہ کاریوں اور غلط نوازیوں کے سوائے کچھ بھی نہیں، '' كبرني موت الكبراء ''کا منظر سامنے ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ اخلاص اور حسن عمل کی نعمت سے نوازے اور توفیق دے کہ عمر کی یہ آخری گھڑیاں ایمان اور اخلاص کے ساتھ ختم ہوجائیں۔

کوس رحلت بکوفت دست اجل
اے دو چشمم وداع سربکنید
اے کف دست ساعد و بازو
ہمہ تودیع یک دگر بکنید
از فریب و فسوں ایں دنیا

---

[1] الأحزاب: ٢٣

من نہ کردم شما حذر بکنید
برہمن اوفتادہ دشمن کام
آخر اے دوستاں گذر بکنید

هذا آخرما أردنا إيراده في هذه المقالة والمقام يقتضي التفصيل
وصلى الله على سيدنا محمد وآله وأصحابه وسلم!

ابوالخیر محمد اسماعیل سلفی، چاہ شاہاں گوجرانوالہ
(۸شوال ۱۳۸۵ھ) (۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء)

مقدمہ "نصرة الباري في بيان صحة البخاري"

یہ مضمون دراصل حضرت سلفی رحمہ اللہ کا ایک مقدمہ ہے، جو انھوں نے مولانا عبدالروف جھنڈا نگری رحمہ اللہ کی کتاب " نصرة الباري في بيان صحة البخاري" کے لیے لکھا تھا۔

ان سطور میں حضرت سلفی رحمہ اللہ نے مقام رسالت، تدوین حدیث کے مختلف ادوار، صحیح بخاری کا مقام و مرتبہ، احادیث صحیحین کی قطعیت وغیرہ امور پر روشنی ڈالی ہے اور آخر میں منکرین حدیث کے معیار صداقت کے مطابق احادیث نبویہ سے دو ایسی واقعاتی شہادتیں پیش فرمائی ہیں، جو نظریہ انکار حدیث کے ابطال اور فساد پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ مقدمہ ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ مذکور کتاب کے اولین ایڈیشن مطبوعہ دہلی سے معلوم ہوتا ہے۔

مقدمہ

"نصرة الباري في بيان صحة البخاري"

الحمد لله العلي العظيم والصلوة والسلام الأتمان على نبيه الكريم خاتم الأنبياء الهادي إلى المنهج القويم وعلى أتباعه السادة الغرر الهداة إلى الصراط المستقيم وآله وأصحابه الكبائر العظام الذين كل منهم قائد وزعيم.

عرف میں حدیث کا لفظ قرآن عزیز اور آثار نبویہ پر بولا گیا ہے، آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور افعال و اجتہادات اور خاموشیاں آثار میں شامل ہیں، مسائل کے استنباط و استخراج میں ان آثار کو اساسی حیثیت حاصل تھی اور ہے، قرآن مجید کے فہم میں آنحضرت ﷺ کا جو مقام تھا وہ کسی دوسرے کو حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اگر کوئی دوسرا شخص یہ مقام حاصل کر سکے، تو آنحضرت ﷺ کا اصطفاء اور انتخاب عبث ہوگا، نبی اور غیر نبی میں کوئی جوہری امتیاز نہیں رہے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون ﴾ (١٦/ ٤٤) [1]

"ہم نے تم پر قرآن صرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اسے بیان کرو اور لوگ اسے سوچیں۔"

"لِتُبَيِّنَ" میں تعلیل سے جو حق آنحضرت ﷺ کو دیا گیا ہے، اگر یہ حتمی

[1] النحل: ٤٤

مقام کسی کو انفراداً یا چند افراد کو بطور مرکز ملت دیا جائے، تو آیت کے دونوں فقروں میں ربط نہیں رہے گا، تعلیل کا مقصد یکسر ختم ہو جائے گا، اس مقام عظیم کا استحقاق نہ کسی قرآنی معاشرہ کو دیا جا سکتا ہے اور نہ فقہی اور اجتہادی معاشرہ کو، اس مقام کی وضاحت قرآنِ عزیز نے مختلف وجوہ سے کی ہے:

① ﴿ أطيعوا الله وأطيعوا الرسول ﴾[1] میں دو اطاعتوں کا تذکرہ عطف کے ذریعہ کیا گیا ہے، جس کا اولین مفہوم تغایر اور استقلال ہے، یعنی آنحضرت ﷺ کی اطاعت قرآنِ عزیز کی نظر میں بالاستقلال فرض ہے، صیغہ امر سے بھی اولاً یہی مفہوم ہوتا ہے۔

② ﴿ وإذا قيل لهم تعالوا إلى ما أنزل الله وإلى الرسول رأيت المنافقين يصدون عنك صدودا ﴾ (٤/٦١)[2]

''جب ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحی اور آنحضرت ﷺ کی طرف بلایا جائے، تو تمھیں معلوم ہوگا کہ منافق تمہارے نام سے رکتے اور بدکتے ہیں۔''

③ اس مقصد کی وضاحت سورۂ نساء میں ایک اور انداز سے فرمائی ہے، جس میں اخلاق اور تشریع کی حد سے گزر کر تعزیر اور تادیب کا انداز اختیار فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ إن الذين يكفرون بالله ورسله ويريدون أن يفرقوا بين الله ورسله ويقولون نؤمن ببعض ونكفر ببعض ويريدون أن يتخذوا بين ذلك سبيلا ۝ أولئك هم الكفرون حقا وأعتدنا للكافرين عذاباً مهينا ۝ والذين آمنوا بالله ورسله ولم

---

[1] النساء: ٥٩

[2] النساء: ٦١

يفرقوا بين أحد منهم أولئك سوف يؤتيهم أجورهم وكان الله غفوراً رحيما﴾ (٤/ ١٥٠ تا ١٥٢) [1]

''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق قائم رہے، وہ کہتے ہیں ان میں بعض پر ایمان لائیں گے اور بعض کا انکار کریں گے اور وہ ایمان و کفر کے درمیان راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یہ لوگ یقیناً کافر ہیں اور اہل کفر عذاب کی رسوائیوں میں مبتلا ہوں گے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے لئے اطاعت و انقیاد میں فرق نہیں کرتے، ان کے اجر ان کو ملیں گے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش ان کے شامل حال ہوگی۔''

ان آیات کریمات سے چند مسائل ثابت ہوتے ہیں:

① اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا مقام ایمان اور کفر میں یکساں ہے، جو شخص رسول کے ساتھ کفر کرے، وہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک مومن نہیں ہوسکتا، اسی طرح خدا کے ساتھ کفر کر کے پیغمبر پر ایمان ناممکن ہے۔

② ذات کے لحاظ سے خدا اور رسول جدا جدا ہیں، اطاعت و انقیاد میں جدائی نہیں ہے، اطاعت و انقیاد میں تفریق کو قرآنِ عزیز نے قطعی کفر فرمایا ہے: ﴿أولئك هم الكافرون حقا﴾

③ منافق، رسول کی اطاعت سے انحراف کر کے تیسری راہ بنانا چاہتے ہیں، قرآنِ عزیز کا ارشاد ہے کہ یہاں تیسری راہ کوئی نہیں۔

④ اسی تفریق سے بچنا اور خدا اور اس کے رسول کی بیک وقت یکساں اطاعت کرنا، یہ اصل ایمان ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت اور غفران اور آخرت کی کامیابی اسی قسم کے ایمان پر منحصر ہے۔

---

[1] النساء: ١٥٠، ١٥١، ١٥٢.

۵ حدیث اور قرآن میں توافق ہو تو حدیث سے انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب قرآن خاموش ہو یا اس میں اجمال ہو اور سنت اس کی تفصیل کرے، یا قرآن، حدیث سے متعارض ہو تو تعارض کی صورت میں قرآن پر عمل ہوگا، ائمہ سنت اس پر متفق ہیں کہ خاموشی اور اجمال کی صورت میں اہل سنت کے نزدیک سنت پر عمل فرض ہے، حجیت شرعی کا یہی مفہوم ہے۔

رسول کا تذکرہ بلحاظ رسول اور بلحاظ اطاعت اور رسول کا اس اطاعت میں استقلال، اس کی مخالفت میں تہدید اور کفر کا لزوم، اعمال کا حبط، عذاب الٰہی کی وعید قرآنِ پاک میں بار بار آئی ہے۔

لمبی سورتوں میں یہ تذکرہ مختلف عنوانوں سے متعدد مقامات میں آیا ہے، سورۂ اعراف، سورۂ نساء، سورہ.احزاب میں اطاعتِ انبیاء کی تاکید کثرت سے آئی ہے۔[1]

اس لئے اطاعت کا اس کے سوا کوئی مفہوم نہیں کہ ان کی زبان سے جو ثابت ہو اور صحیح طور پر ہم تک پہنچ جائے، اس کے خلاف کوئی محدث ہو یا کوئی مجتہد، مجدد ہو یا فقیہ اس کی بات متروک ہوگی۔

اسی طرح کوئی مرکز ملت ہو یا کوئی خود ساختہ قرآنی معاشرہ یا قرآنی نظام، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، اس دنیا کا کوئی علم علمِ نبوی سے متعارض اور متصادم نہیں ہوسکتا، بلکہ اگر آنحضرت ﷺ کا ارشاد قرآن کے کسی اجمال کی تفصیل ہو یا کسی حکم کی

---

[1] امام ابوبکر آجری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تیس سے زیادہ مقامات پر اطاعت رسول کا ذکر کیا ہے، اسی طرح امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تقریباً چالیس مقامات پر اطاعت رسول کو واجب قرار دیا ہے۔ (مجموع الفتاوی: ۹/ ۲٦۱) تفصیل کے لیے دیکھیں: النساء (۱۳، ۱٤، ۵۹، ٦٤، ٦۵، ٦۹ و ۸۰، ۱۳٦) الأعراف (۱۵۷، ۱۵۸) الأحزاب (۲۱، ۳٦، ۷۰، ۷۱)

تشریح اور وضاحت ہو، تو آنحضرت ﷺ کا ارشاد قرآن کے اجمال میں قاضی ناطق ہوگا۔ کما قال الأوزاعي ❶

پہلا دور:

اسی اصل کی بنا پر زمانہ نبوت ہی میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی طرف صحابہ رضی اللہ عنہم نے توجہ مبذول فرمائی، کاروباری لوگ نوبت بنوبت ان دروس و اسباق میں شامل ہوتے، دروس کے حلقوں میں بیٹھتے، احادیث لکھتے، املاء کی مجالس منعقد ہوتیں، احادیث کا سماع اور ضبط ہوتا۔ [مجمع الزوائد للحافظ الهيثمي: ۱/ ۳۷۹]

فارغ البال حضرات پورا وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گزار دیتے احادیث لکھتے، یاد کرتے۔ ❷ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی کتاب ''صادقہ'' اسی دور کی کتاب ہے، جو پوری کی پوری مؤطاء اور الجامع الصحیح للامام محمد بن

---

❶ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " الكتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب " حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ اس اثر کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: " يريد أن تقضي عليه وتبين المراد منه " یعنی فہم قرآن کے لیے سنت کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، جتنی کہ فہم سنت کے لیے قرآن مجید کی ضرورت ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اصول و مسائل اجمالاً بیان کیے گئے ہیں اور حدیث و سنت اس کی تشریح و تفسیر ہے، بعینہ یہی قول امام مکحول رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے، (جامع بيان العلم: ۲/ ۳٦۸) اسی طرح امام اوزاعی رحمہ اللہ امام یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں: " السنة قاضية على الكتاب وليس الكتاب قاضيا على السنة " (سنن الدارمي: ۱/ ۱۵۳، جامع بيان العلم: ۲/ ۳٦۹)

❷ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائی تجارتی معاملات میں مصروف رہتے تھے اور ہمارے انصاری بھائی کاشت کاری میں مشغول رہتے تھے اور ابوہریرہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چمٹا رہتا تھا، بنابریں وہ ایسے مواقع پر حاضر ہوتا تھا، جہاں دوسرے حاضر نہیں ہوتے تھے اور اسے وہ چیزیں یاد تھیں، جو دوسروں کو یاد نہیں تھیں۔ (صحيح البخاري، برقم: ۱۱۸)

اسماعیل البخاری میں آ گئی ہے۔ ❶

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک کتاب حیدر آباد دکن میں اب چھپی ہے اور عجیب یہ ہے کہ اس نسخہ میں اور ان احادیث میں جو محدثین نے اپنی کتابوں میں ضبط فرمائی ہیں، کوئی فرق نہیں، یعنی زمانہ نبوت میں جو کچھ لکھا گیا تھا، تیسری اور چوتھی صدی تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، وہ بالکلیہ محفوظ تھا۔ ❷

مرکز ملت:

مرکز ملت کی اگر کوئی تجویز ان حضرات کے ذہن میں ہوتی، تو حدیث کی جمع و تدوین کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ سارے سیاہ و سفید پر مرکز ملت کا قبضہ ہوتا، کیونکہ وہ مختار ہے، جب چاہے اساسی اور بنیادی مسائل کو بدل دے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ

---

❶ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی کتابتِ حدیث اور ان کے صحیفہ صادقہ کے متعلق مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: دوام حدیث (۱/ ۱۳۲)

❷ صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہ کی احادیث حرف بحرف مسند احمد بن حنبل میں موجود ہیں، (مؤلف) یہ صحیفہ ایک سو اڑتیس (۱۳۸) احادیث پر مشتمل ہے، جو مسند احمد (۲/ ۳۱۲ تا ۲/ ۳۱۹) رقم الحدیث (۸۱۱۵ تا ۸۲۵۲) میں موجود ہے اور یہ حفاظت حدیث کی بہت بڑی دلیل ہے۔ چنانچہ اس صحیفہ کی افادی حیثیت کے متعلق محدث العصر حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ہمام بن منبہ کا صحیفہ جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے، اس میں صرف ایک واسطہ ہے، یعنی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی، یعنی آنحضرت کی وفات کے ۴۸ سال بعد اور یہ صحیفہ قطعاً اس سے پہلے کا ہے، اس میں ۱۳۸ حدیثیں ہیں، یہ سب کی سب ایسی ہیں، جو مسند احمد اور صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں آ چکی ہیں، ان کے دیکھنے سے حدیث کی حفاظت کا پتہ چلتا ہے، وہ صحیفہ شائع ہو چکا ہے، یہ احادیث جن الفاظ کے ساتھ ہمام بن منبہ کے صحیفہ میں ہیں، اسی طرح صحیحین وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی کے صحیفہ کی احادیث کس طرح تیسری صدی کے مجموعوں میں بعینہ نقل در نقل ہو کر آئی ہیں کہ ان میں کسی قسم کی کمی و بیشی نہیں ہوئی۔" (دوام حدیث: ۱/ ۱۴۱)

تمام بنیادی مسائل اور ارکان میں کمی کرے یا اسے بالکل منسوخ قرار دے دے، پھر سچ تو یہ ہے کہ قرآن کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہتی، پرویز صاحب کی تفسیر سنئے:

’’نبی اکرم اور خلافت راشدہ میں خدا اور رسول کی اطاعت سے مفہوم مرکز ملت کے فیصلوں کی اطاعت تھا اور بس۔‘‘ (مقام حدیث: ۱/ ۲۵)

زمانہ نبوت اور خلافتِ راشدہ تک مرکز ملت کے مجہول نظریہ کا کوئی نشان نہ تھا، اسی لئے احادیث کے جمع و حفظ اور لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

دوسرا دور:

قرآن عزیز کی تفسیر اور احادیث کی عملی تشریحات کے لئے صحابہ کے فتوے یعنی موقوف روایات اور مراسیل کو بھی جمع کیا گیا ہے، موطا مالک اور مصنف ابن ابی شیبہ کے انداز کی کتابیں تصنیف ہوئیں، مگر ان موقوفات کو بھی کبھی احادیث کا ہم پایہ نہیں سمجھا گیا، انھیں شخصی آراء کی حیثیت دی گئی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ’’نحن رجال وهم رجال‘‘[1] فرما کر موقوف روایات کی قیمت کو واضح کر دیا، امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے: ’’كيف أتبع رجالا لو عاصرتهم لجادلتهم‘‘ میں ان لوگوں کی اتباع کیسے کروں، اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو ان سے بحث کرتا۔ اس مواد سے صرف اس دور کا اندازِ فکر معلوم ہوتا ہے، طریقۂ استدلال کا پتہ چلتا ہے، آج بھی موقوف اور علماء کے فتووں سے اسی حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ودونه خرط القتاد![2]

---

[1] الإحكام لابن حزم (٤/ ٥٧٣) مختصر المؤمل (ص: ٦٢)

[2] وگرنہ یہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

تیسرا دور:

اس دور میں حدیث کے تمام اقسام صحیح، حسن، ضعیف، مرسل کو جمع کر دیا اور تحقیق کے لئے طالب علم کو کھلا چھوڑ دیا گیا، جسے مستند سمجھے، اس سے استدلال کرے جو تحقیق کے خلاف ہو، اسے نظر انداز کر دے، سیوطی، دیلمی، ابن عدی، طبرانی وغیرہ نے اور بھی اندھیر کر دیا کہ موضوع اور مختلق ذخائر کو جمع کر دیا، بعض کتابوں میں ان پر اجمالی کلام کا بھی احساس نہیں فرمایا، اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ وضاع بھی مل گئے اور ان کے کرتوت سے بھی آگاہی ہوگئی، چور بھی ملا، چوری بھی برآمد ہوگئی، لیکن یہ فائدہ اہل علم اور رجال سے متعارف لوگوں کو ہوا، عوام کے لیے یہ قطعاً غیر مفید ثابت ہوا، بریلوی اور شیعہ حضرات کا سارا کاروبار اسی عظیم ذخیرہ سے چلتا رہا۔

امام محمد بن اسماعیل البخاری:

سیوطی رحمہ اللہ تو بہت بعد کے ہیں، امام بخاری سے پہلے جرح وتنقید کا رواج ائمہ حدیث میں موجود تھا، امام بخاری رحمہ اللہ خود ائمہ جرح وتعدیل میں سے ہیں، اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کے ارشاد کے مطابق امام بخاری کی توجہ اس طرح ہوئی،[1] انھوں نے فیصلہ فرمایا کہ چند شرائط کے مطابق ایک مستند ذخیرہ ضعاف اور مراسیل سے الگ کر دیا جائے، عمل کرنے والوں کو اسی میں سہولت ہوگی، امام بخاری نے یہ مجموعہ "الجامع الصحیح" سولہ سال میں مرتب فرمایا،[2] جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے، انسانی حدود کے اندر یہ کوشش بے حد کامیاب ہے، اسی محنت کی بدولت امام کو "جبل الحفظ" اور "إمام الدنیا" (حافظہ کا پہاڑ، دنیا کا امام) کا خطاب دیا گیا۔

ایام تصنیف سے صحیح بخاری علماء فن کی بحث ونظر کا تختہ مشق رہی، موافق

[1] هدي الساري (ص: ۷)

[2] هدي الساري (ص: ٤٨٩)

مخالف دونوں نے صدیوں اس پر طبع آزمائی کی، کسی نے تنقید و استدراک کے چھاج میں پھٹکا، کسی نے حمایت کی اور ان جرحوں کا جواب دیا، ان تمام مراحل کے بعد اسے ''أصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ'' کہا گیا، نقاد حضرات میں عقل پرست بھی تھے اور حفاظ بھی، محدث بھی تھے اور صوفی بھی، اس میں اکاذیب ابراہیم کی احادیث بھی تھیں اور موسیٰ علیہ السلام کے تھپڑ کا قصہ بھی تھا، بقول امام ابن قتیبہ دینوری بعض اہل علم نے انہی احادیث سے استدلال کیا اور بوقت ضرورت کذب و تعریض کی اجازت کا فتویٰ دیا،[1] اس وقت کے بدعت نواز سنت کی مخالفت کے باوجود اس طرح بدزبانی نہ کر سکے، جو ادارہ ''طلوع اسلام'' اور منکرینِ حدیث کا طرۂ امتیاز ہو رہی ہے، علم و جہل میں یہی فرق ہے۔ (ملاحظہ ہو: مقام حدیث: ۱/ ۶۱)

حدیث پر اعتراضات مختلف ادوار میں ملاحظہ فرمایئے، آپ کو تعجب ہوگا کہ ایک عقل پرست اسے خلاف عقل کہتا ہے، دوسرا اسے اقتضائے وقت کے مطابق سمجھ کر استدلال کرتا ہے، ایک صاحب بعض احادیث کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں، دوسرے ان کے ہم پایہ اور ہم پیشہ صحیح اور عقل کے بالکل مطابق سمجھتے رہے۔

ان علم و عقل کے یتامیٰ اور مساکین کا ہمیشہ سے یہی حال رہا، اپنی بے علمیوں اور بدعملیوں کو چھپانے کے لئے سنت پر اعتراضات کر ڈالتے ہیں، لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ تمہارے علم و عقل کو معیار کی سند کس نے دی ہے؟

غرض امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے وقت کے تمام معیاروں کو سامنے رکھ کر صحیح احادیث کا انتخاب فرمایا، حدیثی، فقہی، عقلی، قرآنی تمام معیاری چیزیں امام کے سامنے ہیں، ان معیاری شروط کو سامنے رکھ کر امام نے قریب چار ہزار احایث بحذف مکررات انتخاب فرمائیں، باقی کو مسترد نہیں فرمایا، بلکہ ان کا تذکرہ باقی کتب میں فرمایا، جس میں یہ کڑی شرائط نہیں ہیں۔

---

[1] تاویل مختلف الحدیث (ص: ۳۵)

چنانچہ اس دورِ واپسیں کے مجدد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ جنھوں نے ہند و پاکستان کے جہلستان میں کتاب و سنت کو رواج دیا، قرآن کی تعلیمات سے لوگوں کو آشنا فرمایا، تقلید و جمود کے ظلمستان میں تحقیق کے چراغ جلائے اور بدعت کے اندھیروں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، صحیحین کے متعلق فرماتے ہیں:

" أما الصحيحان فقد اتفق المحدثون على أن جميع ما فيهما من المتصل المرفوع صحيح بالقطع وأنهما متواتران إلى مصنفيهما وأنه كل من يهون أمرهما فهو مبتدع متبع غير سبيل المؤمنين وإن شئت الحق الصراح فقسهما بكتاب ابن أبي شيبة وكتاب الطحاوي ومسند الخوارزمي وغيرها تجد بينها وبينهما بعد المشرقين "اھ (حجة الله البالغة: ١/ ١٠٦)

"صحیح بخاری کے متعلق محدثین متفق ہیں، ان میں متصل اور مرفوع احادیث قطعاً صحیح ہیں اور ان کی اسناد ان کے مصنفین تک متواتر ہیں، جو ان میں نقطہ چینی کرے اور ان کے مقام کو حقیر سمجھے، وہ بدعتی ہے اور اہل ایمان کی راہ سے اس کی راہ جدا ہے، اگر آپ حق کی مزید وضاحت چاہیں، تو مصنف ابن ابی شیبہ، معانی الآثار طحاوی اور مسند خوارزمی سے ان کا مقابلہ کریں، آپ ان میں زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔" اھ

شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس جچی تلی رائے پر لاکھوں منکرین حدیث قربان کیے جا سکتے ہیں، یہ بیچارے علم اور بصیرت دونوں سے محروم ہیں، تُک بندی اور ہفوات کے ماہر ہیں، ان کے ہاں اسی کا نام علم و بصیرت ہے، اسی کا نام تجدید و اجتہاد ہے!

اب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے پر غور فرمائیے:

" ولهذا كان أكثر متون الصحيحين مما يعلم علماء الحديث

علما قطعیا أن النبي صلى الله عليه وسلم قاله تارة لتواتره عندهم وتارة لتلقي الأمة له بالقبول." (فتاویٰ ابن تیمیہ: ١/ ٤٠٩)

''صفاتِ رواۃ کی بناء پر صحیحین کے اکثر متون کے متعلق قطعی علم ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، یہ قطعیت کبھی تواتر کی وجہ سے ہوتی ہے، کبھی امت کی قبولیت کی وجہ سے الخ۔''

بلکہ اگر خبر واحد کو بھی امت کی طرف سے قبولِ عام حاصل ہو جائے، تو ائمہ اَربعہ اور اشاعرہ کے نزدیک موجب علم ہوگی۔ (ابن تیمیہ، حوالہ مذکورہ)

منکرین حدیث کا اصل یہ ہے کہ فرامین نبوی کو شرعاً حجت ہی نہیں جانتے، مولوی اسلم جیراج پوری اور تمنا عمادی وغیرہ عموماً بحث پھیلانے کے لیے فنی مباحث کو لے آتے ہیں، پرویز وغیرہ اسے پرانا طریقہ سمجھتے ہیں، یہ حضرات اپنی عقلوں کو احادیث کی تنقید کے لیے معیار سمجھتے ہیں، تفسیر قرآن کے لیے ان کے ہاں معیار صحت وہ ہفوات ہیں، جو ان حضرات کے قلم سے ٹپک جائیں!

ایک معیار:

منکرین حدیث کہا کرتے ہیں کہ صداقت کا سب سے بڑا معیار واقعات ہیں، اگر کوئی چیز واقعات کے مطابق ہے، تو اس سے بڑی کوئی سند نہیں، اگر یہ معیار درست ہے تو حدیث کی صداقت کے لیے اس روشنی میں غور کرنا چاہیے، حدیث میں آنحضرت ﷺ کی دو پیش گوئیاں اہل قرآن کے متعلق منقول ہیں، جو پوری کی پوری درست ہوئی ہیں:

① ابو رافع، مقدام بن معد یکرب اور عرباض بن ساریہ کی یہ حدیث مسند احمد، ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، دارمی وغیرہ سب کتب حدیث میں مروی ہے:

لا ألفين أحدكم متكئاً على أريكته يأتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه فيقول لا ندري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه ." (مشکوۃ: ۱/ ۲۹) ❶

"تم سے کوئی آدمی اپنی چارپائی پر دراز ہوگا، جب اسے میرا حکم ملے گا، یا جس چیز سے میں نے روکا ہے، اسے اس کا علم ہوگا، وہ کہے گا ہم نہیں جانتے، ہم صرف قرآن کی اطاعت کرتے ہیں۔"

یاد رہے کہ ہندوپاک میں انکار حدیث سب سے پہلے مولوی عبداللہ چکڑالوی نے کیا، حدیث میں ان کا حلیہ بتایا گیا ہے، ان کی ٹانگیں بیکار ہوگئی تھیں، چل پھر نہیں سکتے تھے، تمام دن چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے، یہ عارضہ ان کو زہر کھانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ اہل قرآن حضرات غور فرمائیں، حدیث واقعات کے کس قدر مطابق ہے، اول المنکرین کا حلیہ کس خوبی سے بیان فرمایا ہے؟ اسے تو واقعاتی شہادت کے طور پر ضرور تسلیم کرنا چاہیے!!

۲ دوسری حدیث ہمارے شہر گوجرانوالہ کے متعلق ہے، ہم شاہد ہیں، ہم نے اس حدیث کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ونحن على ذلك من الشاهدين!

ابن وضاح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے قیامت کی علامات کا ذکر فرماتے ہوئے دو فرقوں کا ذکر کرتے ہیں:

---

❶ سنن أبي داود (٤٦٠٥) سنن الترمذي (٢٦٦٣) سنن ابن ماجه (١٣) سنن البيهقي (٧/٧٦) مذکورہ بالا الفاظ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہیں، مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ کی روایت دوسرے الفاظ کے ساتھ مروی ہے، دیکھیں: أبو داود (٤٦٠٤) مسند أحمد (٤/١٣٠) حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی الگ حدیث ہے، جس سے سنت نبوی اور سنت خلفاء راشدین کا التزام و اعتصام ثابت ہوتا ہے، دیکھیں: أبوداود (٤٦٠٧)

”حتى تبقى فرقتان من فرق كثيرة تقول إحداهما ما بال الصلوت الخمس لقد ضل من كان قبلنا إنما قال الله أقم الصلوة طرفي النهار وزلفا من الليل لا تصلوا إلا ثلاثا وتقول الأخرى إيمان المؤمنين بالله كإيمان الملائكة ما فينا كافر ولا منافق حق على الله أن يحشرهما مع الدجال.“ اھ (الاعتصام للشاطبی: ۱/ ۹۰) [1]

”بہت سے فرقوں سے صرف دو فرقے باقی رہ جائیں گے، ایک کا خیال ہوگا کہ نمازیں صرف تین ہیں، پانچ نہیں، پہلے والے لوگ گمراہ تھے، قرآن میں دن کے دونوں طرف اور رات کے بعض حصوں میں نماز پڑھنے کا ذکر آیا ہے، دوسرے گروہ کا خیال ہوگا کہ تمام مومن ایمان میں فرشتوں کی طرح ہیں، کوئی کافر یا منافق نہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں کا حشر دجال کے ساتھ فرمائیں گے۔“

مولوی عبداللہ چکڑالوی پانچ نمازیں پڑھتے ہیں، ان کے شاگرد رشید مستری محمد رمضان گوجرانوالہ کہتے ہیں کہ نمازیں صرف تین ہیں، اس سے زیادہ پڑھنے والا گمراہ ہے، ان کے بیان و عمل کی یہاں کی بہت سی جماعت چشم دید شاہد ہے۔ واقعات کی شہادت کی بنا پر کم از کم یہ دو حدیثیں تو یقیناً درست اور سچی ہیں۔ ربنا فاكتبنا مع الشاهدين!

اگر یہ حدیث درست ہے اور واقعات سے توافق واقعی صداقت کا معیار ہے، تو اہل قرآن کی تحریک غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

میرے محترم دوست مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری نے سنت کی نصرت و حمایت میں قلم اٹھایا ہے اور بڑی چھان پھٹک کر کے اس کے لیے مواد فراہم کیا ہے، اللہ تعالیٰ

[1] المستدرك للحاكم (٤/ ٥١٦) اسے امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔

ان کو اس کا اجر دے، عامۃ المسلمین کو توفیق دے کہ وہ اس سے استفادہ فرما سکیں، مخالفینِ سنت کو توفیق ملے کہ وہ اپنے انجام پر غور کریں اور ان نتائج کو سوچیں، جو ان کی تحریک سے اسلام اور مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے، ان کی اس تحریک کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس سے سلف امت کا ایمان اور دانش مندی مجروح ہوتی ہے کہ انھوں نے سینکڑوں سال ایک ایسے فن پر محنت کی، جو دراصل شرعاً کوئی دینی قیمت نہیں رکھتا، یہ لوگ اسے ایمان اور دین سمجھتے رہے، نیز اس تحریک کا انحصار محض سلبی اقدار پر ہے، انکار حدیث میں کوئی ایجابی حقیقت موجود نہیں۔ والسلام علی النبي وآله !

زیر طبع کتب:

التعليقات

على
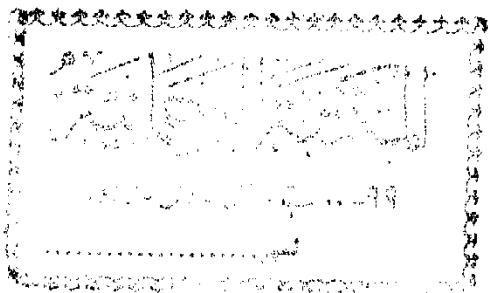
المشكاة

للإمام المحدث الحافظ محمد الكوندلوی

مقالات وفتاویٰ

تالیف

محدث العصر حضرت حافظ گوندلوی رحمہ اللہ

دفاع صحیح بخاری

(صحیح بخاری کے دفاع میں لکھے گئے سات رسائل کا مجموعہ)

تالیف

شیخ الاسلام مولانا ابو القاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ

مجموعہ رسائل

تالیف

حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

إقامة الحجة

علی

من أوجب الزيارة مثل الحجة

تالیف

محدث العصر مولانا بشیر احمد سہسوانی رحمہ اللہ

شرح حدیث ہرقل

(سیرت نبوی کے آئینہ میں)

شرح

حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ

فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی حفظہ اللہ